چونکا دینے والی کہانیاں
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
مارچ 2012

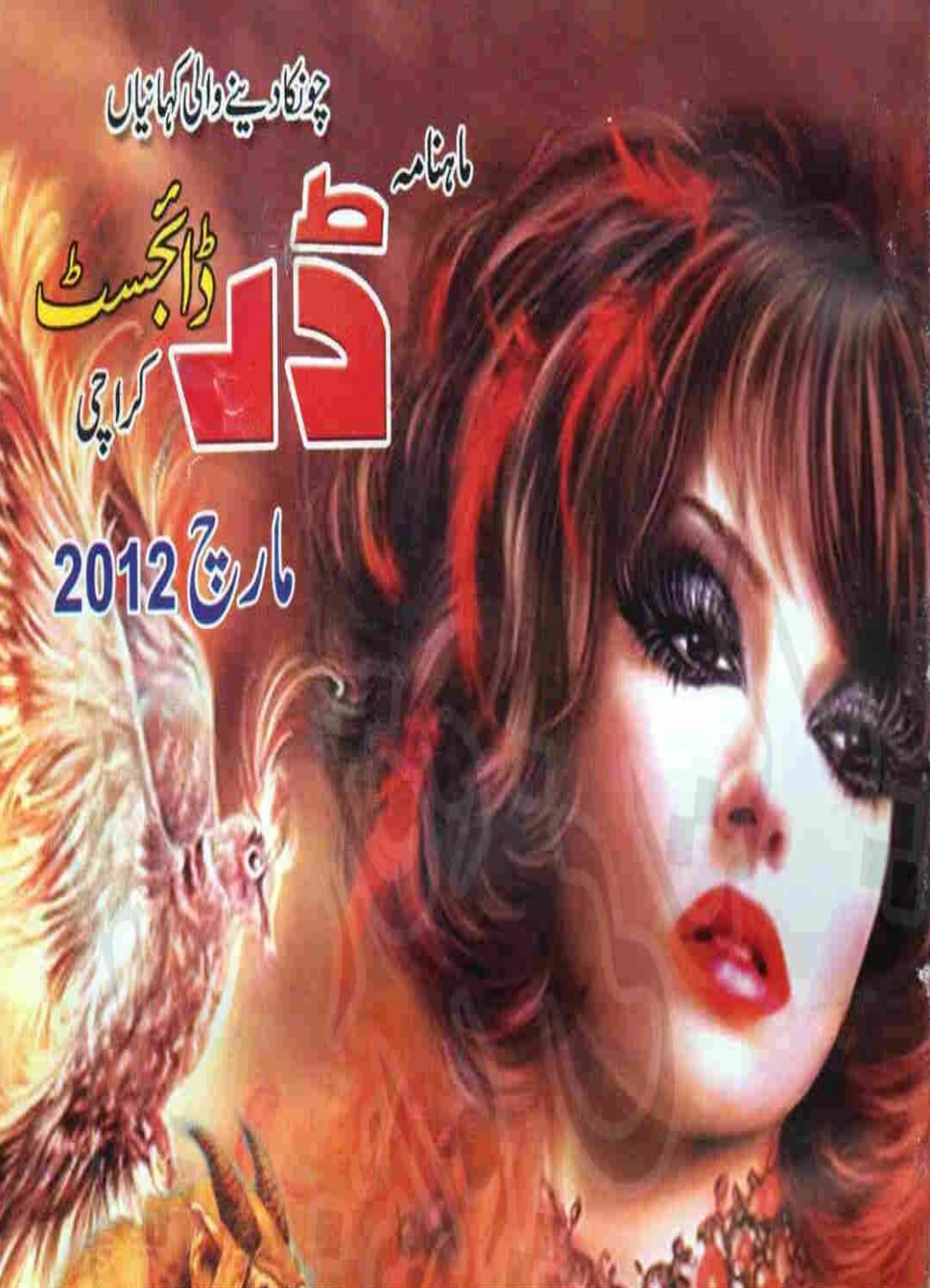

قاسم رضا 16
آخری انجام
خوف و ہراس کے سمندر میں غوطہ زن خیر و شر کی ایک انوکھی اچھوتی حقیقت پر مبنی شاہکار کہانی

عمران سعید 33
فارم ہاؤس
ایک روح کی عشق و محبت چاہت و خلوص کی ..... دل و دماغ پر اثر کرنے والی کہانی

ساجدہ راجا 39
موت کا انتظار
جادوئی دنیا کی ایک لرزہ براندام کرتی اچھوتی انوکھی اور ناقابل فراموش خوفناک کہانی

اے وحید 48
رولوکا
وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

ذیشان اقبال عظمی 73
آخری چوری
روحوں کے نرغہ میں پھنسے ہوئے ایک شخص کا دردناک خوفناک اور لرزہ خیز شاخسانہ

ناصر محمود فرہاد 80
کیتلی
اچنبھے میں ڈالتا ایک خونی حقیقی واقعہ..... جسے پڑھ کر اہل دل دنگ رہ جائیں گے

شعیب شیرازی 91
آنکھیں
کیا خلوص و چاہت اور عشق و محبت کے متلاشی بھی خودغرض ہوتے ہیں؟ ایک دلگداز کہانی

ایم ریاض 101
لنگڑا بھوت
کم عقلی اور ناسمجھی اکثر انسان کو پریشانی سے دو چار کرتی ہے، یہ تو کہانی پڑھ کر ہی پتہ چلے گا

ایم اے راحت 104
شہر وحشت
دل و دماغ کو مبہوت کرتی خوف و حیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر و شر کی انوکھی کہانی

ایس امتیاز احمد 133
روحانی لگاؤ
اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ایک دلگداز و غریب اور حیرت انگیز سبق آموز کہانی

ایس حبیب خان 152
قاتل پیراہن
کیا روحیں بھی پسند ناپسند کا حق رکھتی ہیں، اس حقیقت کو جاننے کیلئے یہ کہانی ضرور پڑھیں

انور فرہاد 197
زندہ بھوت
ایک عجیب و غریب ہوش سے بیگانہ کرتی خوفناک و وحشت ناک اور ناقابل فراموش کہانی

عامر ملک 127
خونی مکڑی
چشم زدن میں ایک دہشت ناک منظر سامنے آیا جس سے لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا

خلیل جبار 147
بری آتما
سنسان اور پرہول رات کے گھپ اندھیرے میں جنم لینے والی ایک خوفناک مگر دلگداز کہانی

ایم الیاس 162
چندرا دیوی
پر تحیر کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ذہن سے محو ہونے والی ایک اچھوتی کہانی

ڈاکٹر اختر ہاشمی 212
شمیکا
اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کیلئے دل پر اثر کرنیوالی ایک زبردست اور حیرت انگیز روداد

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈائجسٹ کتاب مارکیٹ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قرآن کی باتیں

☆ اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں مومنو! تم بھی پیغمبر پر درود اور سلام بھیجا کرو۔
(سورۃ احزاب 33 آیت 56)

☆ اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو۔ بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 195)

☆ (اے محمد) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کس طرح کا مال خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو چاہو خرچ کرو لیکن جو مال خرچ کرنا چاہو، وہ درجہ بدرجہ اہل استحقاق یعنی ماں باپ کو اور قریب کے رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو سب کو دو۔ اور جو بھلائی تم کرو گے، اللہ اس کو جانتا ہے۔
(سورۃ بقرہ 2 آیت 215)

☆ اے پیغمبرؐ لوگ تم سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کے نقصان بڑے فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کونسا مال خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سوچو۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 219)

☆ اے ایمان والوں جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس دن کے آنے سے پہلے پہلے خرچ کر لو جس میں نہ اعمال کا سودا ہو، اور نہ دوستی اور سفارش ہو سکے۔ اور کفر کرنے والے لوگ ظالم ہیں۔
(سورۃ بقرہ 2 آیت 254)

☆ مومنوں جو پاکیزہ اور عمدہ مال کماتے ہو اور جو چیزیں ہم تمہارے لئے زمین سے نکالتے ہیں ان میں سے راہ اللہ میں خرچ کرو۔ اور بری اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرنا کہ اگر وہ چیزیں تمہیں دی جائیں تو بجز اس کے کہ لیتے وقت آنکھیں بند کر لو، ان کو کبھی نہ لو اور جان رکھو کہ اللہ بے پروا اور قابل ستائش ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 267)

☆ اور جو مال تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا دے دیا جائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہیں کیا جائے گا۔
(سورۃ بقرہ 2 آیت 272)

☆ جو لوگ اپنا مال رات اور دن اور پوشیدہ اور ظاہر راہ اللہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں ان کا صلہ رب کے پاس ہے اور ان کو قیامت کے دن نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ غم۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 274)

☆ مومنوں جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں اور اللہ میں صرف نہ کرو گے کبھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے اور جو چیز تم صرف کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 92)

☆ اور اللہ نے تم کو جو نعمتیں بخشی ہیں اور تم پر جو کتاب اور دانائی کی باتیں نازل کی ہیں جن سے وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے ان کو یاد کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔
(سورۃ بقرہ 2 آیت 231)

☆ وہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی، بے شک اس کو بڑی نعمت ملی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو دانا ہیں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 269)

☆ اور اللہ نے تم پر کتاب اور دانائی نازل فرمائی ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھائی ہیں جو تم جانتے نہیں تھے اور تم پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 113)

☆ اور تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکومت کی باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو بے شک اللہ باریک بیں اور باخبر ہے۔ (سورۃ احزاب 33 آیت 34)

☆ اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں جب اس کو درست کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔
(سورۃ حجر 15 آیت 28 سے 29)

☆ اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ وہ میرے رب کی ایک شان ہے اور تم لوگوں کو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 85)

☆ رمضان کا مہینہ، جس میں قرآن اول اول نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل کو الگ الگ کرنے والا ہے تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو، چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 185)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خطوط

قارئین کرام!
السلام علیکم۔

اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب پر اپنا فضل و کرم رکھے اور جائز خوشیوں سے نوازے، دنیا میں اچھے انسان وہی ہیں جو دوسروں کا خیال رکھیں اور اپنی ذات سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائیں، اپنے نفس کا غلام نہ بنیں کیوں کہ نفس انسان کا دشمن ہے۔ حضرت غوث الاعظمؒ نے فرمایا۔ ''اگر تمہاری دعا قبول ہونے میں تاخیر ہو جاتی ہے تو تم اپنے پروردگار پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اللہ نے مخلوق سے سوال کرنے سے منع کر دیا ہے اور اللہ ہی سے دعا کرنے کے لئے کہا گیا ہے، تم سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم آزاد ہو یا غلام ہو اگر تم سمجھتے ہو کہ تم آزاد ہو تو بے دین ہو اور اگر اپنے آپ کو غلام سمجھتے ہو تو دعا کے قبول ہونے میں تاخیر کی وجہ سے اپنے اللہ پر تہمت نہ لگاؤ اور اگر اللہ پر تہمت نہیں لگاتے تو اللہ کی مصلحت پر صبر اور شکر کرو اور اللہ پر تہمت لگانا ظلم کرنا ہے۔ ظلم نہ کرو کیونکہ اللہ ہر شے پر قادر ہے مالک ہے جو چاہے کرے اس کا کوئی علم یا ارادہ ظلم نہیں ہے۔ اگر مالک کا کوئی کام ظاہری طور پر تمہاری منشاء کے خلاف ہو تو اس پر اللہ سے ناراض یا ناخوش ہونا بالکل بے کار ہے یہ ناخوشی اللہ کی راہ سے دور لے جاتی ہے۔ تمہیں چاہئے کہ تم اللہ کی راہ میں جلدی کرو، اس کی توحید کی حفاظت کرو اور ہر حال میں اپنے نفس سے سرکشی کرو۔ اللہ پر تہمت دھرنے کے بجائے اپنے نفس کی برائی کرو۔ نفس، تمہارا اور اللہ کا دشمن ہے، اللہ سے ڈرو، اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا لوگ خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں۔ اللہ کے لئے اپنے نفس کا دشمن ہو جاؤ کیونکہ نفس ہی تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اپنی خواہش سے پرہیز کرو، اللہ کی سلطنت میں خواہش رکھنے والے کے سوا کوئی جھگڑنے والا نہیں۔''

قارئین! نفس کا غلام بڑے سے بڑا ظلم کرتے وقت بھی نہیں ڈرتا، بلکہ قلبی رشتوں کا بھی خیال نہیں کرتا، اور نہ احکام خداوندی کا پاس کرتا ہے، ایک واقعہ یاد پڑتا ہے کہ، مغلیہ تاجدار ہمایوں کے بھائی کامران مرزا نے جب ہمایوں کی علالت کے بارے میں سنا تو بدخشاں سے کمک لے کر کابل جا پہنچا اور قلعے کو مسخر کر کے ہر قسم کا ظلم و جفا کیا۔ ہمایوں اس قلعے میں اپنی بیگم اور بچوں کو بھی حفاظت کے خیال سے چھوڑ گیا تھا۔ شاہی حرم سرا قلعہ کابل ہی میں تھا۔ کامران مرزا نے قلعے کے اکثر بہادروں کو فتح کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جب ہمایوں کو یہ خبر ملی تو وہ بدخشاں سے کابل کے لئے روانہ ہوا۔ وہ اس وقت تک صحت یاب ہو چکا تھا۔ ہمایوں نے کابل پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر کامران مرزا نے امرائے بادشاہی کے اہل و عیال کے ساتھ نہایت ظلم و ستم کیا۔ اس سفاک نے عورتوں کو برہنہ کرنے کے بعد ان کو سر عام بے عزت کیا۔ اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے سر کاٹ کر بادشاہی مورچوں میں پھینکے۔ اس نے یہ حرکت اس زعم غلط سے کی تھی کہ شاید امراء اپنے بچوں کا یہ حال دیکھ کر اپنی بیویوں کو اس طرح بے عزت کئے جانے پر ہمایوں کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ مگر وفاداروں نے اس کی بے حیائی کا کچھ خیال نہ کیا اور قلعے کے محاصرے سے منہ نہیں پھیرا۔ جب کامران مرزا نے دیکھا کہ اس فریب سے بھی کامرانی نہ ہوئی تو شہزادہ اکبر کو بادشاہی توپخانے کے نشانے پر لٹکا دیا۔ وہ اکبر جو مستقبل میں ہندوستان کا شہنشاہ ہونے والا تھا۔ ''بابابابا'' کہہ کر چیخنے لگا۔ مگر ہمایوں ہی کا دل گردہ تھا کہ وہ ضبط کر گیا۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت آٹھ پہرا اکبر کی حفاظت میں تھی۔ اس کا بال بیکا نہ ہوا۔ آخر کامران مرزا اپنی بد اعمالی کے وبال سے لاچار بے قرار ہو کر قلعے سے بھاگ گیا۔ ہمایوں فتح پا کر قلعے میں داخل ہو گیا اور شہزادہ اکبر کو سلامت دیکھ کر خدا کا شکریہ ادا کیا۔ لہٰذا قارئین! اللہ کی رسی کو ہمیشہ مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہئے۔ اس میں ہماری دین و دنیا میں بھلائی ہے، سکندر جب دنیا سے گیا تو خالی ہاتھ گیا، تو ہم اس دنیا سے کیا لے جا سکتے ہیں سوائے اپنے اعمال کے اور ظالم کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

(خالد علی مینجنگ ایڈیٹر)

شائستہ سحر امرپورہ راولپنڈی سے، امید ہے سارا اسٹاف خیریت سے ہوگا، بہت معذرت چاہتی ہوں کئی ماہ بعد حاضر ہوئی ہوں، اپنی مصروفیات کی وجہ سے میں کوئی تحریر نہ بھیج پائی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ڈر ڈائجسٹ سے میرا تعلق ختم ہو گیا جب تک زندگی ہے انشاء اللہ یہ رابطہ برقرار رہے گا۔ میرا ایم اے پارٹ I کا رزلٹ آ گیا ہے خدا کا شکر ہے میں پاس ہو گئی ہوں، اپنی دو نئی کہانیاں ارسال کر رہی ہوں، امید ہے ضرور پسند آئیں گی، کہانیاں مل جائیں تو ضرور بتا دیجئے گا، انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی، نئی تحریروں کے ساتھ اجازت دیجئے۔ خدا حافظ۔

☆☆ شائستہ صاحبہ: بہت بہت مبارک ہو کہ آپ ایم اے پارٹ I میں پاس ہو گئی ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی کے ہر جائز امتحان میں کامیابی نصیب کرے اور خوشیوں سے نوازے، کہانیاں مل گئی ہیں، اس کے لئے شکریہ، آپ پاس ہو گئیں، اور مٹھائی......؟ امید ہے آپ آئندہ اپنے پڑھنے والوں کا خیال رکھیں گی۔

ساجدہ راجا ہندواں سرگودھا سے، میری طرف سے ڈر ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کو سلام، مجھے بہت حیرت ہو رہی ہے کہ دو مہینے سے نہ تو میری کہانی شائع ہوئی اور نہ ہی خط اور غزلیں وغیرہ، میں ہر ماہ باقاعدگی سے خط لکھتی ہوں پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا، مسلسل دو مہینوں سے ایسا کیوں ہو رہا ہے، میں ٹائم پر خط پوسٹ کرتی ہوں اور کہانیاں پہلے ہی آپ کے پاس ہیں، کچھ میں نے ابھی بھجوائی ہیں لیکن جب تک پہلے والی شائع نہیں ہوں گی تو ان کا ٹائم کیسے آئے گا؟ پتہ نہیں کیا بات ہے امید ہے آئندہ شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ آپ [illegible] جنوری کی طرح فروری 2012ء کا شمارہ بھی اپنی مثال آپ تھا خط اور کہانی کی بہت کمی محسوس کی [illegible] ڈر کی سب سے اچھی اور منفرد بات یہ ہے کہ اس میں کہانیاں معیاری اور زیادہ شامل کی جاتی ہیں، [illegible] ڈر بہت اپنا سا لگتا ہے اور سب قارئین کو اپنی فیملی کی طرح بہت اچھا لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈر کو یونہی بلندیوں کی جانب گامزن رکھے، تمام رائٹرز اچھا لکھتے ہیں اس لئے کسی ایک کی تعریف نہیں کی جا سکتی، ڈر کی بدولت ہی مجھ میں لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا جس کے لئے میں ڈر کی شکر گزار ہوں۔ شرف الدین جیلانی صاحب کے تبصرے سے بالکل اتفاق نہیں کروں گی کہ لکھاری انگریزی فلمز دیکھ کر اور اس سے متاثر ہو کر کہانیاں لکھتے ہیں۔ شرف الدین صاحب میں یہ تو ہرگز نہیں جانتی کہ آپ نے ایسا کیوں کہا لیکن اک بات ذہن میں رکھیں کہ ہر لکھاری اپنے اردگرد کے ماحول، باتوں اور دیگر دوسری صورتحال سے متاثر ہو کر کہانی لکھتا ہے۔ اگر اسے اپنے اردگرد کچھ انوکھا لگے تو وہ اس نقطے کو اپنے طریقے سے کہانی کی شکل میں ڈھال لیتا ہے یہ تو خالص اس کا اپنا فن ہوتا ہے اگر ایک موضوع پر اتنا سارا لکھا جائے یا اس پر فلمیں بنیں تو کہیں نہ کہیں تو تھوڑی بہت مشابہت ہو جاتی ہے۔ ہے ناں یہ الگ بات ہے کہ کسی فلم یا کہانی سے متاثر ہو کر بالکل اسی طرح تحریر کر کے اپنے نام سے شائع کروائی جائے تو اس سے بڑی غلط حرکت کوئی اور نہیں ہوگی۔ امید ہے آپ نے برا نہیں مانا ہوگا۔ آخر میں ایک بات کہ آئندہ مجھے ساجدہ شاہین کے بجائے ساجدہ راجا لکھا جائے، مہربانی ہوگی۔

☆☆ ساجدہ صاحبہ: جس ماہ کسی کا خط موصول نہیں ہوتا تو......؟ امید ہے آپ بغور سوچیں گی اور یہ بھی امید ہے کہ شرف الدین صاحب آپ کی تحریر پڑھ کر مطمئن ہو جائیں گے، کہانی شامل اشاعت ہے اور خط کا انتظار۔

فرزانہ عابد لاہور سے، السلام علیکم فروری کا شمارہ خرید ادیکھا، پڑھا بہت زبردست لگا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں کسی بھی ایک کہانی کی تعریف کرنا غلط بات ہوگی۔ ہاں مگر شہر وحشت، اور رولوکا بہت زبردست کہانیاں جا رہی ہیں میں سب سے پہلے ان ہی دو کہانیوں کو پڑھتی ہوں۔ رولوکا تو پورے ڈر ڈائجسٹ کی جان ہے۔ ڈر کے تمام رائٹر حضرات بہت زبردست لکھ رہے ہیں اور بہت محنت سے لکھ رہے ہیں۔ میں ویسے تو بہت سے شمارے پڑھتی ہوں مگر ان میں اور ڈر میں بہت فرق ہے ڈر میں صرف ہارر کہانیاں ہی نہیں بلکہ جاسوسی، اور رومینٹک کہانیاں بھی ہوتی ہیں اس میں اکثر ایسی کہانیاں بھی ہوتی جس کے حصار میں میں کئی دنوں تک کھو جاتی ہوں۔

☆☆ فرزانہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ کی تعریف کے لئے شکریہ آپ نے صحیح فرمایا کہ ڈر کے رائٹر حضرات بہت محنت سے لکھتے ہیں اور ہماری دعا ہے کہ یہ سلسلہ یوں ہی ہمیشہ جاری و ساری رہے۔ آئندہ بھی خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

صبا محمد اسلم گوجرانوالہ سے، السلام علیکم، خیریت کے بعد عافیت کی طالب، مجھے لگتا ہے کہ اس مرتبہ میں لیٹ حاضر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہورہی ہوں اس کے لئے معذرت چاہتی ہوں لیکن میرے اشعار ضرور، ضرور شائع کیجئے گا روزانہ لکھنا سوچتی ہوں مگر ٹائم نہیں ملتا، دراصل میری بہن اور بھائی کی شادی ہے 18 فروری کو دعا کیجئے گا۔ تمام قارئین سے گزارش ہے کہ وہ دعا کریں کہ میرے بھائی اور بہن کی شادی خیر خیریت کے ساتھ اللہ کے فضل و کرم سے نمٹ جائے، ڈر ڈائجسٹ میں تمام قارئین بہت ہی اچھا لکھتے ہیں۔ پتہ نہیں ڈر ڈائجسٹ میں ایسا کون سا جادو ہے جو کوئی بھی ایک مرتبہ پڑھ لے اس کا دیوانہ بن کے رہتا ہے، ڈر ڈائجسٹ میں لکھنے والے تمام قارئین کو Thanks کہنا چاہوں گی کیونکہ سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک لکھتے ہیں۔ آخر میں دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ ہمیشہ ترقی پر ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆ صبا صاحبہ: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی بہن اور بھائی پر اپنا نظر خاص رکھے، ان کی زندگی خوشیوں سے بھر دے، شادی بخیر وخوبی انجام پذیر ہو، خاص بات یہ کہ ٹائم ملتا نہیں بلکہ ٹائم نکالا جاتا ہے، کیوں ٹھیک ہے ناں۔ اللہ نے چاہا تو انشاء اللہ سب خیر وخوبی سے انجام پا جائے گا۔

رضیہ عارف کراچی سے، فروری 2012ء کا ڈر ڈائجسٹ اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ہاتھوں میں آیا، میں کئی ماہ ڈر ڈائجسٹ کی محفل سے دور رہی، اس کے لئے سب سے پہلے معذرت خواہ ہوں۔ کئی ماہ علیحدہ رہنے کا یہ مطلب نہیں کہ میں ڈر سے الگ رہی بلکہ ڈر سے وابستگی برقرار تھی، دراصل گھریلو مصروفیات کچھ زیادہ ہوگئی تھیں۔ ایک تو گھر میں بہن کی شادی اور پھر یہی نہیں بلکہ کئی اور شادیاں بھی آ گئی تھیں اور وہ شادیاں بھی قلبی لگاؤ والی تھیں، ویسے تو ہر ماہ ساری کہانیاں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ سلسلے وار کہانیوں میں چندرا دیوی اپنی پرانی اور روزمرہ کی ڈگ پر چلتی رہی، خود رائٹر کو بھی یہ سوچنا چاہئے کہ صرف ایک ہی موضوع اور لگاؤ انسان کی زندگی میں نہیں ہوتا بلکہ انسانی زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے، ہر دوسرے پیراگراف میں سوائے سیکس کے اور کچھ نظر نہیں آتا، خیر رائٹر صاحب کا اپنا انداز ہے۔ شہر وحشت بھی ایک ہی ڈگر پر سرپٹ بھاگ رہی ہے، سلسلے وار کہانی کے لئے کردار کا چوکس رہنا ضروری ہوتا ہے، میری نظر میں، مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ کہنہ مشق رائٹر حضرات ایک محدود دائرہ میں مقید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ رولوکا ٹھیک ٹھاک بل کھاتی پگڈنڈیوں پر رواں دواں ہے۔ ہر قسط میں ایک نیا پن نظر آتا ہے، نئے حالات واقعات اور تانے بانے الگ ہی محسوس ہوتے ہیں، کئی ماہ سے متواتر ناصر محمود فرہاد صاحب کہانیاں لاتے ہیں مگر بہت خوب اور ایس امتیاز احمد صاحب بھی کسی سے پیچھے نہیں، ان کی کہانیاں بھی قاری کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہیں۔ فروری کے شمارے میں عفریت یا بھوت، لاحاصل، ٹھک ٹھک، شیطانی کھیل، غلطی، حیوان اور موت کی لوری اپنی انفرادیت کی وجہ سے بہت پسند آئیں، کہانی وہی اچھی ہوتی ہے جس میں نیا پن نظر آئے، موضوع کے ساتھ ساتھ انداز تحریر میں بھی واضح فرق ہونا چاہئے۔ آج کل شائستہ صاحبہ نظر نہیں آرہی ہیں لگتا ہے کچھ زیادہ ہی مصروف ہوگئی ہیں، شائستہ صاحبہ پلیز! اپنے چاہنے والوں کا خیال رکھتے ہوئے ڈر ڈائجسٹ میں جلوہ گر ہوجائیں، عین نوازش ہوگی۔ اگر میری کسی بات سے کسی کو تکلیف پہنچے تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں اور شب و روز ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ رضیہ صاحبہ نوازش نامہ پڑھ کر خوشی ہوئی، آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ شائستہ سحر صاحبہ کا خط شامل اشاعت ہے اور اگلے ماہ ان کی کہانی بھی شامل اشاعت ہوگی۔ امید ہے رائٹر حضرات آپ کی باتیں بغور پڑھیں گے اور پھر غور بھی کریں گے۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

سحرش لاہور سے، السلام علیکم، امید ہے کہ سب قارئین خیریت سے ہوں گے آپ کی دعاؤں سے میں بھی بخیریت ہوں، مصروفیت کی بنا پر کچھ عرصہ نہ لکھ سکی، مگر لکھنے کا شوق اپنی جگہ قائم ہے۔ میں نے چونکہ لکھنے کی ابتدا ''ڈر'' سے کی تو میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ جو کچھ لکھوں گی بس ''ڈر'' کے لئے لکھوں گی۔ میرے ایگزام قریب ہیں۔ گزارش ہے کہ دعا کر دیجئے کہ میں اچھے مارکس سے ڈگری لوں۔ آخر میں ڈر کے لئے دعا گو ہوں کہ یہ ترقی کے منازل طے کرے بس گزارش ہے کہ ہمیشہ کوشش کیجئے گا کہ آپ کے ادارے سے کسی کا دل نہ دکھے ہر نئے آنے والے رائٹر کو اسی طرح سراہا کریں۔ شکریہ۔

☆☆ سحرش صاحبہ: یہ اچھی بات ہے کہ ڈر ڈائجسٹ آپ کو پسند ہے، یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ دوسروں کو خوشی پہنچاتے ہیں، وہی

دین و دنیا میں فلاح پاتے ہیں، جو خونی رشتوں میں دراڑ ڈالتے ہیں اللہ کے ناپسندیدہ لوگوں میں سے ہیں۔ کسی کا دل نہ دکھانا بھی عبادت ہے۔

منیر احمد ساغر میاں چنوں سے، السلام علیکم! فروری 2012ء کا شمارا مارکیٹ سے اپنے مقررہ وقت پر مل گیا۔ شمارہ خوب صورت مضامین، کہانیوں اور شاعری سے مرصع تھا۔ ٹائٹل حسب سابق خوب صورت خوفناک تھا۔ قوس قزح میں اپنی شاعری دیکھ کر خوشی ہوئی۔ خطوط میں محمد نوید انجم، رانا ظفر اقبال، آصف شہزاد کی رائے سے میں بھی متفق ہوں۔ میری شاعری پسند کرنے کے لئے قارئین کا شکریہ، کہانیوں میں اس بار قبلائی خان، کھڑکی، رولوکا، چندرا دیوی، شہر وحشت، شیطانی کھیل، حیوان، حیرت انگیز اور عفریت یا موت، کہانیاں اچھی تھیں، بقیہ کا مطالعہ جاری ہے۔ شاعری میں محمد آصف شہزاد الہ آبادی، محمد اسلم جاوید، رانا ظفر اقبال، محمد نوید انجم، محمد بشیر احمد پرواز کے شعر اچھے لگے۔ حکیم خان حکیم، راشد ترین، محمد بشیر احمد پرواز، قدیر رانا کی غزلیں پسند آئیں، نئی شاعری ارسال خدمت ہے۔ امید ہے شائع کرکے شکریہ کا موقع دیں گے۔

☆☆ منیر صاحب: قلبی لگاؤ سے نوازش نامہ لکھنے، کہانیوں اور اشعار کی تعریف کے لئے ویری ویری Thanks، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔ غزل شامل اشاعت ہے۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے، کمرہ گرم کرلیا ہے، دستانے ہاتھوں سے اتار دیئے ہیں، خشک میوہ کے ساتھ گرم اشیا کا ذخیرہ کرلیا ہے۔ ہنستے مچلتے فروری کا ٹھنڈا رسالہ احباب کی محفل میں بلند آواز سے پڑھا جارہا ہے۔ سیزن کی وجہ سے مختصر تبصرہ کیوں کہ صبح چار بجے دکان کھولنی پڑتی ہے، جی ہاں مجھ سمیت ڈر کے قارئین کو مہنگائی کا احساس ہے رسالہ کی قیمت 55 نہیں، پورا نوٹ 60 کردی جائے، ہم قارئین کو اعتراض نہ ہوگا، سیزن کے بعد لطائف اقتباس وغیرہ ارسال کریں گے۔ مستقل کہانیاں سفر طے کررہی ہیں دیگر سب دوستوں نے خوب تر لکھنے کی کوشش کی ہے، ڈر سے جہاں خوفناک کہانی پڑھنے کو ملتی ہے۔ ساتھ ہی ہمیں رہنمائی بھی ملتی ہے۔ ڈر کے دوستوں کو ادارے کو سلام اور دعائیں۔

☆☆ شرف الدین جیلانی صاحب فوراً اچھے اور ادبی لطائف ارسال کردیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند رکھے اور خوشیوں سے نوازے، امید ہے آئندہ ماہ بھی قلبی تبصرہ ارسال کرکے شکریہ کا موقع دیں گے۔

محمد شفیق اعوان شمس آباد حضرو اٹک سے، فروری 2012ء کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، ایک غزل حاضر خدمت ہے اگر اشاعت کے قابل سمجھیں تو اپنے رسالے میں شائع کرکے میرے شعر کہنے کو جلا بخشے۔

☆☆ جناب شفیق صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، غزل شامل اشاعت ہے اور امید ہے شعر کہنے کی آپ کی اسپیڈ بڑھ جائے گی، مگر خوشی میں ڈر ڈائجسٹ کو بھول لئے گا نہیں۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، میں پورے اسٹاف اور قارئین کرام کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں، ماہ فروری کا تازہ پرچہ 2012ء بک اسٹال پر دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا، سرورق بہت ہی خوب صورت تھا ویسے ڈائجسٹ کی ہر کہانی اپنی اپنی جگہ ایسی جیسے انگوٹھی میں نگینہ، ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر پرچے کا بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے ہر لحاظ سے یہ ایک معیاری رسالہ ہے جو کہ قارئین میں بے حد مقبول ہے۔ غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ! یہی جذبہ ہمیں خط تحریر کرنے پر مائل کرتا ہے۔ ویسے تمام سلسلے قرآن کی باتیں، خطوط، قوس قزح اور غزلیں اپنی مثال آپ ہیں۔ اسلم راہی کی تحریر قبلائی خان بہت خوب صورت اور سبق آموز تھی، کہانیوں میں دشمن جاں، غلطی، کھڑکی، حیوان، رولوکا، شہر وحشت، بھوت کی تلاش سے بے حد متاثر ہوا تمام قلمکاروں کو میری طرف سے دلی مبارکباد قبول ہو، غزل ارسال کررہا ہوں پرچے میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں بشرطیکہ آپ کا تعاون ساتھ رہے۔

☆☆ اسلم صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks امید ہے آئندہ ماہ بھی شکریہ کا موقع دینا بھولیں گے نہیں۔

دلکش امیر پوری کہروڑپکا سے، السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ ادارہ ڈر ڈائجسٹ، لکھنے والے اور پڑھنے والے 2011ء کی طرح اس سال بھی پھولوں اور کلیوں کی طرح مسکراتے رہیں، کامیابیاں ان کے قدم چومے، ان کی خوشیوں کو کسی حاسد کی نظر نہ لگے، یہ ہمیشہ تندرست، توانا و چاک و چوبند رہیں، اس کے علاوہ ہم اپنے ملک پاکستان کے لئے دعا گو ہیں، یا اللہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے بہترین اعلیٰ اوصاف ایماندار، بے باک اور نڈر حکمران عطا فرما، اے اللہ اگر یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے تو ہمیں معاف فرما۔ مطلب پرستوں اور حاسدوں سے نجات عطا فرما۔ یا اللہ ہمارے ملک کو ایک ترقی پسند اور امن کا گہوارہ بنا۔ ہمارے ملک سے مہنگائی اور بدعنوانی کو ختم کر۔

☆☆ دلکش صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ جیسی خواہش رکھنے والے سارے لوگوں کی دعا سنے گا، اور ہمارا ملک امن شانتی اور خوشیوں کا گہوارہ بنے گا۔ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا، ماہ فروری 2012ء کا ''ڈر'' ہمارے سامنے ہے، خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ تمام ترسلسلے خوب رہے اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ ہماری غزل نہ لگ سکی؟ Next Issu کے لئے آرٹیکلز ہیں۔ روحانی عاشق، غزل، مراسلہ ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ ہماری طرف سے آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ''ڈر ڈائجسٹ'' کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹر اور تمام خوب صورت پڑھنے والے وویورز کو دعا سلام۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: روحانی عشق بنام روحانی لگاؤ شامل اشاعت ہے، آپ کی دوسری کہانی موصول ہو چکی ہے اس کے لئے شکریہ، غزل بھی شامل اشاعت ہے، امید ہے آئندہ ماہ بھی تجزیہ کے ساتھ نوازش نامہ ارسال کریں گے۔ Thanks۔

ع ک آفاقی میرپور آزاد کشمیر سے، دو کہانیاں بھیجی تھیں، انتقام اور درندہ، میں نے آپ کو سب سے پہلے ایک کہانی بنام ''لاپرواہی چھوڑو اور......'' بھیجی تھی اور اب مزید دو بھیج رہا ہوں۔ ایک ''راز'' دوسری ''پراسرار مجسمہ'' میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم سیریز لکھ سکتے ہیں۔ جس طرح جاسوسی میں جلیل سیریز اور شامی سیریز ہیں۔ پلیز مجھے جواب دیں۔ پراسرار مجسمہ میں نے اس طرح لکھی ہے کہ اس کے کرداروں پر مزید کہانیاں لکھی جاسکتی ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو لکھوں اور میرے نام کی بھی درستگی فرمادیں۔ میرا نام ع ک آفاقی ہے۔ علی آفاق کاشی اور ہیں۔ آپ کی نوازش ہوگی۔

☆☆ ع ک آفاقی صاحب: آئندہ نام میں غلطی نہیں ہوگی، کسی بھی کردار سے کہانی لکھ سکتے ہیں مگر کہانی مکمل ہونی چاہئے، جس طرح آپ نے محبت کی قربانی کہانی بھیجی تھی اگر ایسی کہانی یعنی الگ الگ کردار سے تو ایسی کہانیاں جامع ہوتی ہیں۔ ڈر ڈائجسٹ ہارر رسالہ ہے اس موضوع پر کہانی ہونی چاہئے، امید ہے آپ سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔ شکریہ۔

ثاقب بشیر لاہور سے، جناب ایڈیٹر صاحب! ڈر ڈائجسٹ سے بینائی اور قلب کی وابستگی کی داستان بہت طویل ہے گیارہ سال کی عمر سے تیئس کا ہندسہ بہت جلد طے ہوا، اور وجہ کہانیوں کا معیار ہے خواہ مختصر کہانی ہو یا طویل، پڑھتے پڑھتے لکھنے کا بھی شوق ہوا اور تحریریں آزمائشی طور پر دوسرے رسائل میں بھی چھپتی رہیں اور خود کو اب ڈر ڈائجسٹ کے معیار پر کھرا پایا۔ لکھاری ہونے کی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کے ماس کمیونی کیشن ڈپارٹمنٹ میں بھی دو مرتبہ داخلہ مگر ختم UMT سے ڈگری لے کر کیا ہے۔ خیر، ایڈیٹر صاحب ''معصوم شیطان'' کے عنوان سے ایک تحریر بھیج رہا ہوں۔ امید ہے آپ آئندہ شمارے میں جگہ عنایت فرما کر مزید حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆☆ ثاقب صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم آپ کو ڈر ڈائجسٹ پسند آیا اس کے لئے بہت شکریہ، آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں کیونکہ آپ کی تحریر بہت لیٹ موصول ہوئی اور صرف خط ہی شامل اشاعت ہو سکا، آئندہ ماہ بھی خط لکھنا بھولئے گا نہیں۔

احمد شیر خان کوٹلہ لودھراں سے، ڈر ڈائجسٹ کا ایک پرانا شمارہ دوست کے پاس دیکھا تو میں نے اس سے لے کر پڑھ ڈالا بہت اچھا لگا۔ بک اسٹال پر جا کر دیکھا تو مجھے یہ رسالہ نہ ملا۔ اب میں ایک کہانی اور ایک غزل بھیج رہا ہوں، پڑھ کر جواب دیں کہ کب تک شائع ہوگی۔ اب روایتی ایڈیٹروں کی طرح ہرگز مت کہیے گا کہ کہانی ابھی پڑھی نہیں ایک رسالہ ''فکشن میگزین'' بھی اس ادارے کی طرف سے نکلتا ہے مگر وہ بھی مارکیٹ میں دستیاب نہیں کیا یہ رسالہ اب نکلتا ہے یا نہیں۔ میرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے شہر میں دونوں رسالے یعنی ''ڈر'' اور ''فکشن'' دستیاب نہیں ہوتے۔

☆☆ شیر صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانی اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی، فکشن ہر ماہ مارکیٹ میں آتا ہے، آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

امجد اقبال امجد فیصل آباد سے، جناب خالد صاحب میں آپ کی محفل میں چار سال بعد شرکت کر رہا ہوں۔ اس سارے عرصے میں سب سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اب دوبارہ زندگی کو روٹین پر لے کر آیا تو سب دوستوں میں آپ کی کمی بھی محسوس ہوئی اور فوراً آپ سے فون پر بات کی۔ اور یقین کریں جب میں نے اپنا تعارف کروایا تو آپ نے فوراً ہی پہچان لیا کہ اچھا تو آپ سوئی گیس والے امجد ہیں تو مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے اتنے انسانوں کے ہجوم میں مجھے یاد رکھا۔ آپ کا بہت شکریہ، اور آپ کے لئے اور آپ کے تمام اسٹاف اور ''ڈر'' کے لئے بہت ساری دعائیں، یہ خط میں مارچ کے شمارے کے لئے ارسال کر رہا ہوں اور ساتھ ہی معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کو ''آواز'' کی شکل میں ارسال کر رہا ہوں امید کرتا ہوں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔

☆☆ امجد صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، بڑی خوشی کی بات ہے کہ چار سال بعد بھی آپ نے ڈر ڈائجسٹ کو یاد رکھا اور اب تو ی امید ہے کہ آپ ہر ماہ قلبی لگاؤ کے ساتھ رابطہ رکھیں گے، ''آواز'' آئندہ ماہ متوقع ہے۔

عامر ملک راولپنڈی سے، آداب، امن سکھ اور سلامتی کی تمام دعاؤں کے ساتھ نیا سال مبارک ہو...... کارڈ بھیجنے کا شکریہ، یہ امتیاز ادارہ ڈر ڈائجسٹ کو ہی حاصل ہے کہ رائٹر حضرات کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ اعزازی شمارہ بھیجتے ہیں جبکہ دیگر پرچوں والے تو اعزازی شمارہ تک نہیں بھیجتے۔ خدا کرے یہ خلوص اور چاہت سدا یوں ہی قائم و دائم رہے۔ (آمین) خط کے ہمراہ ایک ترجمہ کہانی ''خونی مکڑی'' ارسال کر رہا ہوں، ایک اور کہانی زیر تحریر ہے جلد ارسال کروں گا۔ اس بار ایک کہانی ''فکشن'' والوں کو بھی بھیجی ہے۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ اس میں لکھاری بھی بچے ہی ہوں گے۔ مگر اس میں تو سب لوگ ہی لکھتے ہیں۔ اس لئے میں نے بھی کہانی بھیج دی ہے۔ دیکھیں وہ کیا سلوک کرتے ہیں۔ ڈر ڈائجسٹ جس کے بارے میں سب ہی کہتے ہیں کہ ''ڈر میرا بھی تو ہے''

☆☆ عامر صاحب: خونی مکڑی شامل اشاعت ہے، لکھیں اور خوب لکھیں جہاں بھی موقع ملے کیونکہ لکھتے لکھتے ایک عام آدمی لکھاری بن جاتا ہے۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی تحریر ارسال کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

محمد آصف شہزاد ٹھینگ موڑ قصور سے، السلام علیکم، امید ہے کہ ڈر کی پوری ٹیم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ بخیریت ہوگی، ڈر فروری 2012ء خریدا، ٹائٹل حسب سابق بہت اچھا تھا، ہارر کہانیوں کے عین مطابق تھا، کہانیوں میں دشمن جاں، رولوکا، مندر کا حصار، ٹھک ٹھک، شہر وحشت، لاحاصل، غلطی، عفریت یا موت، حیرت انگیز، موت کی لوری، بدروح کی تلاش پسند آئیں۔ عفریت یا موت شروع میں اسٹوری اچھی تھی۔ محفل غزل میں قمر جہاں علی پوری کا کلام اچھا لگا۔

☆☆ آصف صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو ڈر ڈائجسٹ اچھا لگتا ہے۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا بھولیں گے نہیں۔

محمد علی کراچی سے، میں ڈر میں بہت سی کہانیاں بھیج چکا ہوں مگر افسوس کہ آج تک کوئی شائع نہیں ہو سکی خیر اس میں آپ لوگوں کی نہیں میری ہی کوئی غلطی ہوگی کہ میری کہانیاں ناقابل اشاعت ہو کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جاتی ہیں۔ خیر اب کوشش کر رہا ہوں کسی اچھے موضوع پر کہانی لکھنے کی باقی رہا ڈر کا سوال تو ہر ماہ کی طرح اس ماہ بھی فروری کا ڈر بہت زبردست رہا خصوصاً میری فیورٹ کہانی رولوکا تو شمارے کی جان ہے اور مجھے حیرت بھی ہے کہ ماشاء اللہ اتنے عرصوں سے ڈر ڈائجسٹ میں شائع ہو رہی ہے مگر اب تک اپنا معیار برقرار رکھا ہوا ہے اس نے، ویسے اس شمارے میں ایک دو اور ایسی کہانیاں ہونی چاہئیں۔ باقی سب کہانیاں زبردست تھیں پڑھ کر بہت مزا آیا۔ پورا ڈر چند ہی دنوں میں ختم ہو جاتا ہے مگر دل ہی نہیں بھرتا اور پھر اتنا لمبا انتظار کرنا پڑتا ہے کہ کب مہینہ ختم ہو اور ڈر کا نیا شمارہ ہاتھ میں آئے۔ خیر خط کافی لمبا ہو گیا ہے اس لئے اگلے ماہ ملاقات ہوگی مجھے امید ہے کہ اب میری بھیجی گئی کہانی ناقابل اشاعت نہیں ہوگی وہ ضرور ڈر میں جگہ پائے گی۔

☆☆ محمد علی صاحب: آپ کی 3 کہانیاں ہمیں موصول ہوئی تھیں مگر ان میں ایڈیٹنگ کی بہت ضرورت تھی۔ اور ویسے بھی جس موضوع پر آپ نے کہانیاں لکھی تھیں وہ بہت پرانے تھے مگر ہمیں امید ہے کہ اس مرتبہ آپ پورے جوش و خروش میں ہیں اس لئے کوئی نیا اور اچھا موضوع ہی لے کر آئیے گا۔ اس لئے ہمیں آپ کی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ اگلے ماہ بھی خط لکھنا نہ بھولئے گا۔ شکریہ

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آخری انجام

قاسم رضا- چنیوٹ

سورج ڈھلنے کا وقت ہوگیا تو وہ افق کی طرف دوڑنے لگا اور سڑک کراس کرتے ہوئے اچانک وہ ایک بس کے نیچے آگیا، بس اسے کچلتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور پھر رک گئی مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ کچلا ہوا شخص اپنی جگہ سے غائب تھا۔

خوف وہراس کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی ایک انوکھی اچھوتی حقیقت پر مبنی شاہکار کہانی

نیکی اور بدی کی جنگ ازل سے چلی آرہی ہے۔ جس میں ہمیشہ نیکی کی جیت اور شر کی شکست ہوتی آئی ہے۔ خیر یا نیکی کے راستے پر چلنے والوں کے راستے میں بہت سی آزمائشیں آتی ہیں لیکن انسان صبر اور استقامت کو اپنا شعار بنالے تو وہ کامیاب ہوجاتا ہے۔

بشیر خان لاہور کا رہائشی تھا۔ تین بھائی تھے نصیر خان، تنویر خان اور خود بشیر خان، تینوں کی شادیاں ہوچکی تھیں اور تینوں کے پاس اولاد جیسی نعمت بھی تھی۔ نصیر خان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا جبکہ بشیر خان جس کی شادی کچھ سال پہلے ہوئی تھی اسے اللہ نے دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ گلاب خان اور شاہنواز خان، اور یہ دونوں ننھے سے پھول اسے اپنی جان سے بھی پیارے تھے۔ تنویر خان کو خدا نے تین بیٹے عطا کئے تھے تینوں بھائیوں کا آپس میں بہت اتفاق تھا۔ تنویر خان سب سے بڑا تھا۔ اس کا باپ شہروز خان جس کی ذاتی گاڑیاں لاہور میں کبھی چلتی تھیں اور اب وقت نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔

کاروبار میں خسارے کی وجہ سے اور کچھ اپنے علاج کے لئے اسے اپنی گاڑیاں بیچنی پڑیں۔ وہ بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ اس کی ٹانگیں کام کرنا چھوڑ گئی تھیں۔ اور وہ چارپائی سے لگ گیا تھا۔ اس کی جینے کی امید بشیر خان کے دو ننھے گلابوں کے آنے سے بڑھ گئی تھی۔ بشیر خان کی بیوی نفیسہ بچوں کو لے کر شہروز خان کے پاس چلی جاتی اور شہروز خان ان سے کھیلتا رہتا۔ بچوں کا پیار اپنے دادا سے بہت زیادہ تھا۔ بولنے کے قابل تو نہیں تھے صرف انگلی سے اشارہ کرتے تھے، اور اب تو وہ بولنے بھی لگے تھے اور چل کر خود دادا کے کمرے میں چلے جاتے۔ تنویر خان کے تینوں بیٹے بھی اپنے چچازاد بھائیوں سے بہت پیار کرتے تھے وہ تھے ہی اتنے پیارے کہ کوئی غیر دیکھے تو اس کا دل بھی ان بچوں کو پیار کرنے کی خواہش کرے۔ بشیر خان اور اس کے دونوں بھائی بھی ڈرائیوری کرتے تھے۔ بشیر خان تو لاہور میں ہی گاڑی چلاتا تھا۔ اس کی 43 نمبر گاڑی سارے لاہور کا چکر لگاتی تھی۔ تنویر خان اور نصیر خان لاہور سے پشاور تک جاتے تھے۔ خان ٹرانسپورٹ میں ان کے باپ شہروز خان کا نام کافی مشہور تھا اور اسی نام کی وجہ سے انہیں کافی معقول تنخواہ پر رکھ لیا گیا تھا۔

شہروز خان کی دواؤں کے ساتھ اس کے گھر کا خرچ بھی کافی سہولت سے چل رہا تھا۔ تینوں بھائیوں میں میرے تیرے والی کوئی بات نہ تھی سب اکٹھا کھاتے تھے۔ زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی اور شاید آگے بھی ایسے ہی گزرتی مگر بشیر خان کے ساتھ ایک برہنہ عورت والا واقعہ

پیش نہ آتا تو۔

بشیر خان کی ڈیوٹی ساڑھے گیارہ بجے رات کو ختم ہوجاتی تھی۔ اور وہ اپنی 43 نمبر کو اڈے پر دوسرے ڈرائیور کو دے کر اور سارا کیش جمع کرا کے گھر آجاتا تھا۔

نصیر خان کا بیٹا حافظ عبدالقدوس رات بارہ بجے تک چینل پر تلاوت سنتا تھا۔ تھیں تو سب کی اولادیں نیک مگر حافظ عبدالقدوس کو قرآن پاک سے والہانہ محبت تھی وہ مدرسے سے پڑھ کر عشاء کے بعد آتا تھا اور جس چینل پر باترجمہ تلاوت لگی ہوتی وہ سنتا رہتا۔ بشیر خان جب بھی ڈیوٹی سے آتا تو عبدالقدوس کے کمرے سے تلاوت کی آواز آرہی ہوتی اور بے اختیار اس کے قدم قدوس کے کمرے کی طرف اٹھ جاتے۔ وہاں گھنٹہ آدھ بیٹھ کر وہ تلاوت سنتا اس کی روح تک قرآن پاک کے الفاظ اترتے اور سارے بدن کی تھکن آنکھوں میں اتر آتی اور وہ سونے چلا جاتا۔ بشیر کا کمرہ چونکہ ساتھ ہی تھا اس لئے عبدالقدوس اس کے جاتے ہی آواز آہستہ کر دیتا یا ٹی وی بند کر دیتا۔

منگل کا منحوس دن تھا۔ جب بشیر خان نے اپنی ڈیوٹی پوری کی اور 43 نمبر کو اڈے پر کھڑی کرنے کے بعد اپنی موٹر سائیکل نکالی اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔ ”سیون اپ“ اسٹاپ سے سیدھا ”شیر پاؤ“ پل کی طرف مڑ گیا پل سے آگے کچی آبادی کے قریب ان کا بڑا سا گھر تھا۔ اس گھر تک جانے کے لئے اسے روزانہ قبرستان سے گزرنا پڑتا تھا۔ ادھر ٹریفک نہیں تھی۔ صبح کے وقت تو یہاں بھی چہل پہل ہوتی تھی۔ مگر رات کو پونے بارہ بجے بندہ تو کیا پنچھی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ قبرستان سے چند میٹر دور اس کی موٹر سائیکل نے چلنے سے جواب دے دیا۔ موٹر سائیکل کا پلگ شارٹ ہوگیا تھا اور یہاں اسے کوئی میکنک بھی ملنے والا نہیں تھا۔ واپس جاتا تو بہت دیر ہوجاتی۔ گھر کا فاصلہ تھوڑا تھا۔ سو بشیر نے پیدل چلنے کا سوچا اور موٹر سائیکل کو کھینچتا دھکیلتا قبرستان میں داخل ہوگیا۔

وہ یہاں سے پہلے بھی گزرتا رہتا تھا۔ مگر اسے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ آج جانے کیا بات تھی کہ قبرستان میں قدم رکھتے ہی ایک پراسراریت کی لہر سی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ اس کے جسم کی تمام حسیات آنکھوں اور کانوں میں جمع ہوگئیں۔ وہ خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتا آگے بڑھتا رہا۔ اسے اپنے آپ پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ ڈر اور خوف جو کبھی اس کے قریب سے بھی نہیں گزرے تھے آج وہ اسی خوف کے شکنجے میں مکمل طور پر جکڑا جاچکا تھا۔ اس کی رگوں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پختونی خون دوڑ رہا تھا اور وہ اس خوف کی وجہ سے اپنے دلیرانہ خون کی شکست نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ بشیر خان نے خود کو سنبھالا اور کافی حد تک کامیاب بھی ہوگیا۔

مگر کوئی چیز تھی جو ماحول کی پراسراریت کی گواہی دے رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار خوف کو جھٹکتا مگر خوف پھر اس پر حاوی ہوجاتا۔ ابھی وہ قبرستان کے وسط میں ہی تھا کہ اسے عجیب سی آواز سنائی دی۔ آواز دائیں طرف سے آرہی تھی۔ آواز کسی عورت کی تھی۔

پکی ٹائیلوں سے بنی قبر کے پیچھے سے وہ آواز آرہی تھی۔ بشیر خان کا تجسس جاگ اٹھا اور خوف کئی قدم دور چلا گیا۔ بشیر خان آہستہ آہستہ قبر کے قریب گیا۔ آواز اب واضح ہوگئی تھی مگر بشیر خان کافی کوشش کے بعد بھی ان الفاظ کا مطلب نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ ہندی زبان سے ملتے جلتے الفاظ تھے۔ بشیر خان تھوڑا اور آگے بڑھا تو وہ روح فرسا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

ایک نوزائیدہ بچے کی کفن میں لپٹی لاش، کھلی قبر اور سب سے دہشت ناک بات کہ وہ عورت بالکل برہنہ تھی۔ اس نے اپنے بال پوری طرح سے کھولے ہوئے تھے اور بچے کا کفن اتار کر کچھ کر رہی تھی۔

پہلے تو بشیر خان نے سوچا کہ چپ چاپ کھسک جاؤں مگر اس کے ضمیر نے اس بات کی اجازت نہ دی۔

وہ عورت اس بچے کی لاش کی بے حرمتی کر رہی تھی۔

ایک مسلمان ہونے کے ناطے بشیر خان کا یہ فرض بنتا تھا کہ وہ اس کو روکے۔ یکا یک بشیر کا پختونی خون جوش میں آیا اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ خواہ یہ عورت کوئی ماورائی مخلوق ہے۔ اسے روکنا ہوگا۔ مگر وہ پہلے دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ عورت کر کیا رہی ہے؟

وہ دبے قدموں قبر کے عقب میں آیا، اس نے دیکھا کہ وہ عورت بچے کو سرمہ لگا رہی ہے اس نے اپنی انگلی سے ایک بندیا سی بچے کے ماتھے پر لگائی اور پھر نامعلوم زبان میں بڑبڑانے لگی۔ پھر وہ بچے کے اوپر بیٹھ کر ساتھ پڑے گھڑے سے پانی اپنے اوپر چھڑکنے لگی۔ اب بشیر خان کی سمجھ میں آئی کہ یہ عورت کیا کر رہی ہے؟

ایسے عمل، اس نے سن رکھا تھا کہ بے اولاد عورتیں کرتی ہیں تاکہ انہیں اولاد ہوسکے۔

بشیر خان نے تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قبر کی اوٹ سے نکل کر اس عورت کو بالوں سے پکڑ لیا اور ایک زوردار جھٹکے سے اس کو بچے کی لاش سے کھینچ لیا۔

"جاہل عورت! یہ کیا شیطانی کام کر رہی ہے۔" بشیر خان کڑک دار آواز میں بولا۔

عورت بدحواس ہوگئی تھی۔ بشیر خان نے ابھی تک اس کے بال نہیں چھوڑے تھے۔

"مم..... مجھے چھوڑ دو۔" عورت نے تکلیف سے بلبلاتے ہوئے کہا۔

"تجھے چھوڑ دوں! تاکہ تو پھر سے یہ گندہ کام کرے۔" بشیر خان کا خوف نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور خوف کی جگہ بے انتہا غصہ نے لے لی تھی۔

"میں تمہیں خوش کردوں گی، تم جتنی دولت چاہتے ہو تمہیں دوں گی، مگر مجھے" عورت کی بات پوری ہونے سے پہلے بشیر خان نے اسے ایک اور جھٹکا دیا۔

"چھوڑ دو مجھے۔" وہ درد سے بلبلا اٹھی۔

"میں تجھے تھانے میں ہی چھوڑوں گا۔" بشیر خان نے محض دھمکی دی اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ چاہتا تھا کہ یہ عورت اس کام سے باز آجائے۔

تھانے کا نام سن کر اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سی اتر آئیں۔ "ایسا مت کرنا سارے خاندان میں میری بے عزتی ہوجائے گی۔" عورت نے ہاتھ جوڑے۔ "تو پھر وعدہ کر کہ آئندہ تو ایسا کوئی گھٹیا کام نہیں کرے گی، کپڑے پہن اور چل میرے ساتھ میں تیرے گھر تجھے چھوڑ آؤں۔" بشیر خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ یہ بات سن کر وہ عورت اٹھی کپڑے پہنے اور بشیر خان کے پاس آکر اس انداز سے کھڑی ہوگئی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ "کچھ کہنا چاہتی ہے۔" بشیر خان نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اگر تم میرے ساتھ نہ آؤ تو مہربانی ہوگی۔"

عورت نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"نہیں میں تیرے ساتھ ضرور جاؤں گا، اور تیرے کسی بڑے سے بات کروں گا تاکہ تو آئندہ ایسا قدم نہ اٹھا سکے۔ بشیر خان نے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ عورت تذبذب کا شکار نظر آنے لگی۔

اچانک وہ بشیر خان کے قدموں میں جھکی۔ بشیر خان نے سمجھا کہ وہ عورت اس کے پاؤں پکڑے گی اور اسے ساتھ نہ آنے کا کہے گی مگر اس کے تمام اندازے غلط ہوگئے جب اس عورت نے جھک کر بشیر خان کے پاؤں کے پاس پڑا گھڑا اٹھایا اور کمال پھرتی سے اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ بشیر خان تیورا کر گرا اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا۔

عورت نے دوپٹے سے اپنا منہ اچھی طرح ڈھانپا اور قبرستان سے باہر بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہاں سے تھوڑی دور آکر وہ ایک رکشہ میں بیٹھی اور رکشہ والے کو "غازی روڈ" جانے کا کہا۔ غازی روڈ اتر کر وہ ایک گلی میں داخل ہوئی، تھوڑا پیدل چل کر وہ بائیں ہاتھ پتلی سی ایک گلی میں مڑی، ساتھ ہی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو اوپر فلیٹ میں جارہی تھیں، وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک دروازہ تھا جو اس کے پہنچتے ہی کھل گیا۔ دروازے کے کھلنے پر اس نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ یہاں پچھلے دو ہفتوں سے آرہی تھی۔ اس نے قدم اندر رکھا کمرے میں رچی عجیب سی بو نے اس کا استقبال کیا۔

سامنے گاؤ تکیہ لگائے ایک پتلا سا شخص بیٹھا تھا۔ وہ کلین شیو تھا اور ٹھوڑی پر دو تین زخموں کے نشان تھے جس کی وجہ سے وہ بہت کریہہ شکل لگتا تھا۔ عورت اس کے پاس جا کر بیٹھی اور کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس شخص نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ "ہم جانتے ہیں سکینہ! تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ کالی طاقتوں کا شکر ادا کرو کہ انہوں نے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا ورنہ عمل کے رکنے سے تمہاری جان کو خطرہ بھی ہوسکتا تھا اور یہ تمہارا پہلا قدم تھا جس کی وجہ سے کالی طاقتیں تمہارے خلاف کوئی ایکشن نہ لے سکیں۔"

"اب میں کیا کروں، آپ ہی کوئی راستہ بتائیں ناگیش بابا۔" سکینہ نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"اب تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس کام کو اس نامراد نے روکا ہے۔ اب وہ کام وہ خود کرے گا۔ تمہارا عمل ضرور پورا ہوگا اور کالی طاقتوں نے چاہا تو تم اولاد کی نعمت سے سرفراز ہوجاؤ گی اگر تم ہمیشہ کی طرح روزانہ مجھے خوش کرو تو۔" آخری جملے پر ناگیش کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "مجھے اولاد کے لئے جو کچھ کرنا پڑے گا میں کروں گی۔" سکینہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

ناگیش اٹھا دروازے کی چٹخنی چڑھائی اور دونوں راز و نیاز میں گم ہوگئے۔

☆.....☆.....☆

بشیر کو ہوش آیا تو وہ عورت وہاں نہیں تھی نہ جانے وہ کتنی دیر قبرستان میں بے ہوش پڑا رہا تھا۔ وہ اٹھا کنپٹی پر ہاتھ رکھا درد کی تیز لہر اس کے سارے وجود میں دوڑ گئی۔ گھڑے کی ٹھیکری نے اس کے سر کو بہت گہرا زخم دیا تھا۔ اس عورت کو ڈھونڈنا بے سود کام تھا۔ سو بشیر خان نے گھر جانے کا ارادہ کیا مگر جانے سے پہلے وہ بچے کو دفنانا نہیں بھولا تھا۔ گھر آکر وہ سیدھا قدوس کے کمرے میں گیا تلاوت سنتا رہا اور پھر اٹھ کر سونے چلا گیا۔ کیونکہ صبح اسے جلدی اٹھنا تھا۔ اور پھر موٹر سائیکل بھی ٹھیک کروانی تھی۔

چار پانچ دنوں میں یہ واقعہ اس کے ذہن سے محو ہوگیا۔ مگر جب بھی چھٹی کے وقت وہ قبرستان سے گزرتا تھا تو اسے وہ عورت یاد آجاتی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے اس عورت کو بھگا دیا ہے بس اب بات ختم ہوگئی ہے۔ مگر اس کی زندگی کا سب سے بھیانک حصہ تو اب شروع ہونے والا تھا جس سے وہ لاعلم تھا۔

منگل کا دن پھر آگیا ڈیوٹی کر کے وہ رات کو گھر میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر تلاوت سننے کے بعد وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی بیوی اور بچے حسب معمول سو چکے تھے۔ وہ بھی سو گیا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ وہ اٹھا، اس نے اپنے بستر کی طرف دیکھا۔ اس کا اپنا ہمشکل وہاں سو رہا تھا۔ وہ باہر نکلا اور خود خود اس کے قدم زمین سے اٹھ گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اڑتا ہوا ایک قبرستان میں پہنچا۔ وہ کوئی اور قبرستان تھا۔ ایک چھوٹی سی قبر کے پاس وہ اترا اور غیر ارادی طور پر ہاتھوں سے قبر کھودنے لگا۔ قبر تازہ تھی چند ساعتوں میں ایک نوزائیدہ بچہ کفن میں ملبوس اس کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے بچے کی لاش ایک طرف رکھی اور قبر کو بڑی مہارت سے بند کردیا۔ بچے کو اٹھا کر وہ پھر سے اڑنے لگا۔ جانے کون سی جگہ تھی۔ سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں اور اس کے کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا کہ ”سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاؤ۔“ وہ اوپر چلا گیا اندر جا کر اس نے ایک شخص اور ایک عورت کو دیکھا۔ وہ شخص اسے دیکھ رہا تھا مگر عورت کی نظروں سے بشیر خان اوجھل تھا۔ عورت پر نظر پڑتے ہی بشیر خان ٹھٹک گیا۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کوئی طاقت اسے اپنے کنٹرول میں کئے ہوئے تھی۔ ”اس بچے کو لے جاؤ اور اپنا عمل پورا کرو۔“ کلین شیو شخص نے عورت کو حکم دیا اور وہ بچے کو لے کر کونے میں موجود حجرے نما کوٹھری میں چلی گئی۔

”تم جاؤ! اب جب تمہاری ضرورت ہوگی بلا لیا جائے گا۔ تمہارا جسم تمہارا انتظار کررہا ہے۔“ بشیر خان اس شخص کی بات سن کر چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ بہت خوفزدہ تھا۔ ”نہ جانے کیسا خواب تھا یہ۔“ بشیر خان نے سوچا اور حالات کا جائزہ لینے لگا۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ محض ایک خواب تھا۔ اور پھر وہ سکون سے سوگیا۔

☆......☆......☆

”صرف چھ منگل اور تمہیں یہ عمل کرنا پڑے گا اور پھر تمہیں ضرور تمہارے مقصد میں کامیابی ہوگی۔ ناگیش نے سکینہ سے کہا وہ ابھی ابھی بچے پر وہ عمل کرکے نکلی تھی جو وہ قبرستان میں کرچکی تھی۔ ”مگر آپ نے کہا تھا کہ اب یہ عمل وہ شخص ہی کرے گا۔ مگر یہاں تو اچانک ہی یہ بچہ آگیا وہ شخص تو نظر نہیں آیا۔“

سکینہ نے حیرانی سے کہا۔

”یہ جب تم نہیں سمجھ سکتی۔ انسان جب سوتا ہے تو روح اس کا جسم چھوڑ دیتی ہے۔ اور وہ شخص بشیر خان بھی سوگیا تھا۔ ہم نے اس کی روح کو قابو کرلیا تھا۔ اب وہ ہر منگل کو ہمیں کوئی نہ کوئی بچہ دے جائے گا اور وہ یہی سمجھے گا کہ یہ سب خواب ہے۔ مگر بچے تمہیں تلاش کرنا پڑیں گے کہ وہ کون سے قبرستان میں دفنائے گئے ہیں اور یاد رکھو کہ بچہ وہ ہو جو پیدا ہونے کے بعد مرگیا ہو۔“ ناگیش نے تفصیل بتائی۔

”اگر یہ کام کبھی کسی وجہ سے رک جائے تو اس کا نقصان بشیر خان کو ہی ہوگا ناں؟ کالی طاقتیں مجھے تو کچھ نہیں کہیں گی؟ سکینہ نے ایک خیال کے آتے ہی پوچھا۔

”ایسی بات کبھی منہ سے نہ نکالنا۔“ ناگیش کو شدید غصہ آگیا۔ ”اس سے نہ صرف تم عتاب میں آؤ گی بلکہ طاغوتی طاقتیں مجھے بھی نہیں چھوڑیں گی۔“

”خدا کرے ایسا نہ ہی ہو۔“ سکینہ نے کانپتے ہوئے کہا۔

”خدا کا نام بیچ میں نہ لو، کالے کام کرنے والے کا کوئی خدا نہیں ہوتا کبھی۔“ ناگیش نے کڑک دار آواز میں کہا۔

”جیسا حکم ناگیش بابا۔“ سکینہ نے دبتے ہوئے جواب دیا۔

”اب اس بچے کی لاش کے ٹکڑے کرو۔ اگلے منگل تک تم نے یہ گوشت کھانا ہے، جاؤ اور گھر جا کر یہ کام کرو۔“ ناگیش نے کہا اور سکینہ نے بچے کو ایک شاپنگ بیگ میں ڈالا اور گھر چلی گئی۔

☆......☆......☆

انسان اور شیطان کی جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ جو انسان ایمان کا پکا ہوتا ہے وہ ابلیس کے بہکاوے میں نہیں آتا اور جن کا ایمان کمزور ہوتا ہے وہ بہت جلد شیطان کے پھیلائے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ خود مجسم شیطان بن جاتے ہیں۔ اور پھر ابلیس یا اس کے چیلے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر کسی دوسرے انسان کو بہکانے کی ڈیوٹی سنبھال لیتے ہیں۔

سکینہ کا شمار بھی ایسے کمزور ایمان والوں میں ہوتا تھا۔ اس کا خاوند اشتیاق بہت نیک صفت آدمی تھا۔ اشتیاق والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور وہ پوش ایریا میں بہت شاندار کوٹھی میں رہتے تھے۔ سکینہ کے ساس سسر بھی بہت اچھے تھے۔ بلقیس بانو روایتی ساس کے بالکل الٹ تھیں۔ مگر پوتے پوتی کی آس کس دادی کو نہیں ہوتی اور وہ بھی جب بیٹا اکلوتا ہو، اسی لئے بلقیس بانو سکینہ کو کبھی کبھی کہہ دیتی تھیں کہ ”بہو ہمیں کھلونا کب دے رہی ہو۔“

ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق میاں بیوی دونوں میں کوئی نقص نہ تھا۔ قدرت کی طرف سے دیر تھی۔ انہی حالات میں سکینہ کو گھر میں کام کرنے والی ماسی نے ناگیش بابا سے ملنے کی تجویز دی۔

سکینہ کئی عامل پیروں فقیروں کے پاس جاچکی تھی۔ اس نے ناگیش کو آزمانے کا فیصلہ بھی کرلیا اور پھر ممتا کی تڑپ نے اسے گناہوں کے دلدل میں اتنا دھکیل دیا کہ وہ چاہے بھی تو اس دلدل سے باہر نہ آسکے۔

بلقیس بانو بہو پر اتنی نظر تو نہیں رکھتی تھیں، نہ ان کے دل میں کوئی میل تھا۔ مگر پچھلے ایک ماہ سے بہو رات کو دیر سے گھر آتی تو بلقیس بانو کے دل میں انجانے وسوسے اٹھتے۔

آج بھی جب وہ رات کے ایک بجے لوٹی تو بلقیس بانو جو کب سے اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں بہو کے آگے آ کھڑی ہوئیں۔

سکینہ بیٹی! ایک بات کروں برا تو نہیں مانو گی۔“ بلقیس نے نرم لہجے میں کہا۔

”جی۔ ب...... بتائیں۔“ سکینہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”بیٹا اتنی دیر گھر سے باہر رہنا ایک عورت کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔“

”ماں جی! میں نائلہ کے پاس گئی تھی۔ اور ٹائم کا پتہ نہیں چلا۔“ سکینہ نے نظریں چراتے ہوئے ایک سہیلی کا نام بتادیا۔

”اچھا کھانا اگر کھانا ہے تو کھالو اور سوجاؤ۔ اس اشتیاق کے بچے کو تو گھر کی فکر ہی نہیں کاروبار میں ایسا مصروف ہوا ہے کہ دو دو ہفتے گھر نہیں لوٹتا۔ بلقیس نے بیٹے کو تصور میں سرزنش کی اور کمرے کی طرف بڑھیں۔

سکینہ جانے کے لئے کمرے کی طرف بڑھی تو بلقیس نے کہا۔ ”یہ شاپر میں کیا لائی ہو؟“

”کچھ نہیں ماں جی! تھوڑی سی شاپنگ کی تھی۔“ سکینہ نے سکون سے کہا مگر اس کے اندر ایک طوفان سا ابل پڑا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ساس نے اصرار کیا تو اسے کیا دکھائے گی ایک بچے کی لاش کے ٹکڑے؟

”اچھا جاؤ آرام کرو۔“ بلقیس کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اور سکینہ نے ایک سکون بھری طویل سانس خارج کی۔ اس نے بچے کا ایک ٹکڑا ابالا اسے نمک مرچ لگایا۔ اور کھانے کے لئے منہ تک لے گئی کہ اچانک کراہیت کی وجہ سے ایک زبردست ابکائی آئی۔ وہ بھاگ کر اٹیچ باتھ میں چلی گئی۔ قے کرنے کے ساتھ ہی وہ سوچتی رہی کہ اگر ایسے ہی چلتا رہا تو شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوگی اور پھر شیطانی طاقتوں کا ڈر اس کے ارادے مضبوط کرنے لگا جو عمل پورا نہ ہونے پر اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرتیں۔

اس خیال کے ساتھ ہی وہ باتھ سے نکلی اور وہ ٹکڑا اٹھا کر اسے کھانے لگی پہلے لقمے نے نیچے جانے میں دیر لگائی اور پھر چند منٹوں میں سارا ٹکڑا اس کے معدے میں تھا۔ اس گھناؤنے کام کے بعد وہ بستر پر سونے چلی گئی۔ طرح طرح کی سوچوں نے اسے گھیر لیا۔ کیا وہ ہر منگل ایک نوزائیدہ بچے کی وفات کا پتہ چلا سکے گی؟ کیا یہ عمل آسانی سے پورا ہوجائے گا؟ اور بھی اس طرح کے ”کیا“ سوچتے سوچتے جانے کب اس پر نیند کی دیوی مہربان ہوئی اور وہ میٹھی نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☆......☆......☆

یہ مہینے کا تیسرا منگل تھا جب بشیر خان نے تیسری بار وہی خواب دیکھا کہ وہ قبرستان سے ایک بچے کی لاش نکال رہا ہے اور پھر وہ وہی سیڑھیاں چڑھتا اور اس کلین شیو شخص کو بچہ دے کر واپس آجاتا۔ بشیر خان پہلے دو خوابوں سے اتنا پریشان نہیں ہوا تھا مگر اب پریشانی اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چہرے سے ٹپک رہی تھی اور پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ اس کے چھوٹے بیٹے گلاب خان کو بخار آ رہا تھا۔ بقول اس کی بیوی نفیسہ کے وہ اسے کب سے جگا رہی تھی مگر وہ اٹھ نہیں رہا تھا۔ بشیر خان نے دوسرے ہی دن ڈاکٹر سے ملاقات کی اسے ساری بات بتائی اور اس سے مشورہ دریافت کیا۔

ڈاکٹر زاہد نے اس کا تمام چیک اپ کیا اور بولا۔

"تمام رپورٹ درست ہے۔ آپ بالکل صحت مند ہیں۔ مگر ایک بات پوچھوں، آپ صاف صاف بتانا۔"

"پوچھئے ڈاکٹر صاحب۔" بشیر خان نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا۔

"میرے پاس ایسے کیس پہلے بھی آئے ہیں جن میں مریض ایک ہی طرح کا خواب بار بار دیکھتا ہے۔ یا تو وہ منظر اس کی زندگی میں آنا ہوتا ہے یا آ چکا ہوتا ہے۔ مگر ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں جن کو خواب میں آگہی دی جاتی ہے زیادہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایک واقعہ کو دیکھ کر اس کا اثر اپنے لاشعور میں چھوڑ دیتے ہیں۔ جب انسان سوتا ہے تو شعور سو جاتا ہے اور لاشعور بیدار ہو جاتا ہے تبھی لاشعور میں بیٹھے خیالات یا گزرے مناظر اسے خواب کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ میں اتنی تفصیل میں اس لئے جا رہا ہوں کہ اگر آپ کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے تو آپ بتا دیں۔" ڈاکٹر زاہد نے بات ختم ہوتے ہی لمبی سانس لی۔ "ایک واقعہ ہوا تو ہے۔" بشیر خان نے جواب دیا وہ تذبذب کا شکار تھا کہ آیا ڈاکٹر زاہد کو بتاؤں یا نہ۔

"آپ سب کچھ مجھے سچ سچ بتا دیں۔ کیا آپ نے کسی قبر کو کھودا ہے؟" یا کسی بچے کو دفنایا ہے؟ آپ کی ہر بات راز رہے گی مگر ان معلومات کی روشنی میں، میں آپ کا علاج بہتر طریقے سے کر سکوں گا۔"

ڈاکٹر زاہد نے تھوڑا آگے جھکتے ہوئے کہا۔

بشیر خان نے قبرستان میں داخل ہونے سے لے کر بے ہوش ہونے تک کے تمام حالات بتا دیئے۔

"یہی وجہ ہے بالکل یہی وجہ ہے کہ وہ واقعہ آپ کے تحت الشعور سے چپک گیا ہے۔" ڈاکٹر زاہد نے مکا مارا۔ اور پھر چند ادویات لکھ کر بشیر خان کو دیں۔ بشیر خان کلینک سے نکلا اور ادویات کی پرچی پھاڑ دی، وہ ڈاکٹروں کی باتوں سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے ایک دو نہیں تین دفعہ یہ خواب دیکھا تھا اور خود اپنی آنکھوں سے قبرستان والی عورت کو دیکھا تھا۔ اسے ڈاکٹر زاہد کی کسی بات پر تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ خواب ہی تھا اور اس کے لاشعور سے چپکا ہوا تھا تو پھر روزانہ نظر آتا۔ اس کے اندازے کے مطابق ہر ساتویں دن یہ خواب آتا اور وہ کسی مختلف قبرستان سے کسی بچے کی قبر کھودتا اور نامعلوم پتے پر نامعلوم شخص کو دے آتا۔ وہ سوچوں میں غرق روڈ پر چلا جا رہا تھا کہ مختار کی آواز نے اسے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ "بشیر خان! آج ڈیوٹی پر نہیں گئے۔" مختار نے قریب آتے ہوئے کہا۔ محلے میں اس کی سبزی کی دکان تھی جہاں اس کا لڑکا بیٹھتا تھا اور مختار سبزی منڈی سے سبزی لانے تک محدود تھا۔

"بس یار تھوڑی طبیعت ناساز ہے۔" بشیر خان نے وجہ بتائی۔

"کسی ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔" مختار از راہ ہمدردی بولا۔

"ڈاکٹر کے بس سے باہر ہے۔" بشیر لاشعوری طور پر کہہ گیا۔

"مگر مسئلہ کیا ہے؟ مختار نے فکر مندی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں یار چھوٹی سی بات ہے۔" بشیر نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"کبھی کہتے ہو چھوٹی سی بات ہے کبھی کہتے ہو ڈاکٹر کے بس سے باہر ہے۔ مجھے بتاؤ بات کیا ہے؟" مختار نے بے چینی سے پوچھا اور پھر بشیر نے اس کے بے پناہ اصرار پر اسے ساری بات بتا دی۔

"آؤ میرے ساتھ! سامنے ہوٹل میں چائے پیتے ہیں اور پھر اس مسئلے کا حل نکالتے ہیں۔" مختار نے کہا اور پھر دونوں ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"اگر ڈاکٹر زاہد کی تشخیص سچ مان لی جائے تو بھابھی کے جھنجوڑنے پر تمہارا نہ اٹھنا کس کھاتے میں فٹ

کریں۔" سوچوں میں گھرے بشیر خان کو مختار کی آواز نے چونکایا۔

"بالکل میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" بشیر خان نے چائے کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس ایک پیر صاحب کا پتہ ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری مشکل وہاں حل ہو جائے اگر تم کہو تو......"

"میں بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔ تم مجھے ان کا پتہ دے دو۔"

بشیر خان نے کہا اور مختار نے ہوٹل والے سے کاغذ پنسل لے کر پتہ لکھ دیا۔

"ایک بات یاد رکھنا یہ پیر صاحب صرف دن کے وقت تعویذ وغیرہ دیتے ہیں، رات کو آستانے پر نہیں ملتے اس لئے تمہیں مغرب سے پہلے ان سے ملنا پڑے گا۔" مختار نے بل ادا کر کے بشیر خان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بہت مہربانی۔" بشیر خان نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ "پیر نواز" کے آستانے پر تھا۔ وہاں بہت رش تھا باری آنے پر وہ اندر جانے لگا تو دروازے کے پاس بیٹھے شخص نے اسے روک لیا۔ "بھیا نئے آئے ہو آستانے کی فیس نہیں دو گے۔"

"کتنی فیس ہے؟" بشیر خان نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"صرف دو سو روپے، کام نہ ہونے پر پانچ سو واپس دیا جائے گا مگر کام ناجائز نہیں ہونا چاہئے۔" باہر بیٹھے شخص نے رجسٹر کھولتے ہوئے کہا۔ بشیر نے دو سو روپے دیئے، نام درج کروایا اور اندر چلا گیا۔ اندر ایک لمبی سفید داڑھی والا شخص سر پر عمامہ باندھے تعویذ لکھ رہا تھا۔ دو اور جوان اندر بیٹھے تھے جو کوئی کام کروانے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ اس شخص نے چہرہ اوپر اٹھایا اور بشیر خان کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ بشیر خان سے پیر صاحب کا چونکنا چھپا نہیں رہا۔ پیر صاحب کی زلفیں کالی اور لمبی تھیں جو عمامہ سے نکلی ہوئی تھیں بھنویں سفید تھیں۔ موچھ داڑھی نے کافی چہرہ ڈھانپا ہوا تھا اور جتنا چہرہ نظر آ رہا تھا اس سے نہیں لگتا تھا کہ پیر صاحب بوڑھے ہیں۔ دونوں جوانوں کو پیر صاحب نے تعویذ دیئے اور وہ باہر نکل گئے ان کی جگہ دو اور آ کر بیٹھ گئے جن میں ایک عورت تھی۔

"تمہارا کام میں نہیں کر سکتا البتہ اصول کے مطابق تم اپنی فیس کے ساتھ تین سو روپیہ اضافی لے کر جا سکتے ہو۔" پیر صاحب نے بنا کچھ کہے سنے ڈائریکٹ بشیر خان کو جواب دیا۔

"مگر آپ نے میری بات تو ابھی تک سنی نہیں۔" بشیر خان نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہم کو سب علم ہے، تمہیں تمہارے خواب پریشان کرتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بیماری نہیں جس کے لئے تمہیں تعویذ دیا جائے۔ کچھ دنوں میں تم خود بخود ٹھیک ہو جاؤ گے۔ جاؤ اور سکون سے اپنے کام پر لگ جاؤ۔" پیر نواز نے اپنی بارعب آواز میں کہا۔ پیر صاحب کا جواب سن کر جہاں بشیر خان کافی مرعوب ہو گیا تھا وہاں اندر آئے دونوں افراد بھی پیر صاحب کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بشیر خان نے پیر صاحب سے مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔ اس نے اپنی فیس واپس نہ لی۔ وہ اب مطمئن نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ سکون سے گھر کی طرف چل پڑا۔

☆......☆......☆

"آج بہت گڑبڑ ہونے والی تھی۔" ناگیش نے سکینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سکینہ ابھی ابھی ناگیش کے پاس پہنچی تھی۔ وہ روزانہ یہاں کا چکر لگاتی تھی اور ناگیش کو اپنے عمل کی رپورٹ دیتی تھی۔

"کیسی گڑبڑ؟" سکینہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ بشیر خان! اسے شک پڑ گیا تھا کہ یہ خواب اسے دکھائی ہی نہیں دیتے بلکہ وہ سچ مچ ایسا کرتا ہے۔" ناگیش نے کہا اور سکینہ بیٹھی بیٹھی یوں اچھلی جیسے قالین میں اسپرنگ نکل آئے ہوں۔

"پھر کیا ہوا؟" سکینہ نے بے تابی سے سوال کیا۔

"ہونا کیا ہے پیر نواز شاہ کے پاس گیا تھا مگر وہاں اس کی دال نہیں گلی۔"

"ناگیش نے مکارانہ انداز میں مسکراتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا۔

"مگر پیر نواز شاہ تو بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کچھ تو کیا ہوگا۔"

"کیا کرے گا وہ مطمئن کر کے بھیج دیا ہے گھر، بشیر خان کو اب ہمیں اگلے منگل کے لئے کچھ ایسا انتظام کرنا ہوگا کہ یہ خواب والا سلسلہ اس کے ساتھ نہ ہو ورنہ وہ پھر کسی پیر فقیر کے پاس جائے گا اور ہوسکتا ہے وہ پیر واقعی پہنچا ہوا ہو جو ہمارے عمل کی راہ میں رکاوٹ ڈال دے۔" ناگیش نے سنجیدگی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا کہ باقی کا عمل میں خود کرلوں۔" سکینہ نے مشورہ دیا۔

"پھر وہی بے وقوفی کی باتیں کررہی ہو اب وہ عمل شروع ہو چکا ہے اور اسی شخص کو کرنا پڑے گا جس نے اسے شروع کیا ہے۔"

ناگیش نے غضبناک لہجے میں کہا۔

"معافی چاہتی ہوں، میں بھول گئی تھی مگر اب کیا کریں گے؟" سکینہ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"اب اس کی روح نہیں بلکہ اگلے منگل، وہ خود آئے گا اور صبح ہونے پر اسے یاد بھی نہ ہوگا کہ وہ رات کے وقت کسی قبرستان میں گیا ہے۔" ناگیش نے اسی مکارانہ مسکراہٹ سے سامنے کھوپڑی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تم گریٹ ہو ناگیش۔" سکینہ نے آگے بڑھ کر ناگیش کو چوم لیا، وہ اب ناگیش سے بالکل بے تکلف ہوگئی تھی۔ پہلے وہ اسے ناگیش بابا کہتی تھی مگر اب بابا کا تکلف نہیں کرتی تھی اور آپ سے تم پر آ گئی تھی۔

ناگیش نے اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھے اور پھر وہ بے تکلفی کی تمام حدیں پار کر گئے۔

دوسرے دن منگل کی صبح تھی۔ بشیر خان کافی خوش تھا کہ ہر منگل اسے خواب آتا تھا مگر اس منگل اسے خواب سے چھٹکارا مل گیا۔ مگر اس کی ساری خوشی چند لمحوں میں کافور ہوگئی جب اس کی نظر اپنے ہاتھوں اور کپڑوں پر پڑی۔ اس کے ہاتھ اور کپڑے مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے اور ہاتھ سے کافور اور کیوڑہ کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کو اچھی طرح علم تھا کہ یہ خوشبوئیں مردے کو لگائی جاتی ہیں۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہوگیا تھا۔ یقیناً اب تک جو ہوتا آیا تھا وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ کوئی شیطانی طاقت ہے جو اس سے ایسے گھناؤنا کام کروا رہی ہے۔ انہی سوچوں میں غرق وہ نہانے کے لئے چلا گیا۔ نہا دھو کر کپڑے پہنے اور ڈیوٹی پر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

بلقیس بیگم بہو کے پراسرار رویے سے کافی پریشان تھیں۔ سکینہ ہر منگل رات کو گھر دیر سے آتی تھی۔ ہر بار اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ ہوتا تھا۔ بلقیس بیگم اب اس سے کچھ پوچھتی تو نہیں تھیں مگر اندر ہی اندر وہ گھل رہی تھیں۔ انجانے وسوسے اسے پریشان کررہے تھے۔ سکینہ اول تو شام ہوتے ہی گھر سے چلی جاتی اور واپس آتی تو ساس کو نظر انداز کر کے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ بلقیس نے اب کی بار پکا ارادہ کرلیا کہ وہ سکینہ کا تعاقب کریں گی اور پتہ چلائیں گی کہ وہ کہاں جاتی ہے؟ اشتیاق کام کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔ ورنہ بلقیس بیگم اسے جانے کا کہتیں۔ شام ہوتے ہی بلقیس بیگم ڈانگ ہال میں آ گئیں۔ اور پھر مغرب کی اذان سنتے ہی وہ وضو کر کے مصلے پر کھڑی ہوئیں۔ انہیں یقین تھا کہ سکینہ ابھی پندرہ بیس منٹ نیچے نہیں آئے گی۔ مگر سکینہ تو جیسے موقعہ کا انتظار کررہی تھی۔ نماز پڑھنے تک سکینہ جا چکی تھی۔ بلقیس بیگم نے اب اس کی واپسی کا انتظار شروع کردیا۔ گیارہ بجے بلقیس بیگم کو سکینہ واپس آتی دکھائی دی بلقیس بیگم اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے اندر آتے دیکھ رہی تھیں۔ جب سکینہ اپنے کمرے میں چلی گئی تو بلقیس بیگم اٹھیں۔ اور کمرے سے نکل کر سکینہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

دروازہ بند تھا۔ بلقیس بیگم نے کی ہول سے آنکھ لگائی تو وہ خوفناک منظر دیکھ کر کانپ کر رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں نے خوفناک منظر دیکھا تھا انہیں اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔ سکینہ ہاتھ میں کسی نومولود بچے کا ہاتھ پکڑے اسے بڑی رغبت سے چبا رہی تھی۔

انہوں نے دوسری بار کی ہول سے آنکھ لگائی تو ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ "دروازہ کھولو بہو۔" بلقیس بیگم نے دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کردیا۔

تھوڑی ہی دیر میں سکینہ نے دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے آپ نے کیا شور مچا رکھا ہے۔" سکینہ نے قدرے غصے سے کہا۔

"مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ تم عورت نہیں ایک ڈائن ہو، میں اپنے بچے کو ڈائن کے ساتھ نہیں رہنے دوں گی، اشتیاق آتا ہے تو میں تمہارا فیصلہ کروائی ہوں۔" بلقیس بیگم کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا گیا اور وہ واپس مڑیں۔

مگر سکینہ اب منزل کے پاس آ کر واپس نہیں پلٹنا چاہتی تھی۔ اسی لئے اس نے شاپنگ بیگ الٹایا۔ بچے کے بچے کھچے ٹکڑے زمین پر گر گئے اور اس نے شاپنگ بیگ ساس کے پیچھے سے ان کے منہ پر چڑھا دیا۔ اس نے یہ کارروائی اتنی جلدی کی کہ بلقیس بیگم سنبھل نہ سکیں۔

"تو میرا فیصلہ کروائے گی بڑھیا! تیری موت کا فیصلہ تو میں کردوں گی۔" سکینہ واقعی ڈائن بن گئی تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر اس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس درندہ صفت عورت کے پیچھے کوئی معصوم اور حسین شکل چھپی ہے۔ بلقیس نے ہاتھوں سے شاپنگ بیگ کو منہ سے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی مگر سکینہ کی گرفت مضبوط تھی۔ موٹے پولی تھین سے بنا شاپنگ بیگ نہ ہی پھٹا اور نہ ہی سرکا۔ بلقیس بیگم نے اپنا پورا زور لگا دیا مگر ایک جوان عورت کے زور کے آگے ناتواں بوڑھی عورت کب تک ٹکتی۔

آخر کار سانسیں معدوم ہوئیں، دھڑکنیں تھم گئیں اور جدوجہد ماند پڑ گئی۔ سکینہ نے پھر بھی کافی دیر شاپنگ بیگ کو بلقیس بیگم کے منہ پر چڑھائے رکھا۔ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد اس نے شاپنگ بیگ کو ساس کے منہ سے ہٹایا تو وہ کانپ سی گئی۔ بلقیس بیگم کی آنکھوں کی بے نور پتلیاں جیسے اسے گھور رہی تھیں۔ ناک اور منہ سے خون نکل آیا تھا۔ ان آنکھوں میں حیرت تھی۔ کئی سوال تھے۔

سکینہ نے جیسے تیسے کر کے ساس کی لاش اس کے کمرے میں پہنچائی اپنے کمرے کو ہر سراغ سے پاک کیا اور پہلے شوہر کو فون لگا کر کمال اداکاری سے بلقیس بیگم کی طبیعت کی خرابی کا بتایا اور پھر اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون لگا دیا۔ اپنی آنکھوں میں گلیسرین ڈال کر وہ ساس کے کمرے میں آ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر صدیقی وہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صدیقی کو پہلی نظر میں ہی پتہ چل گیا کہ بلقیس بیگم گزر چکی ہیں۔ اتنے میں ملازم سکینہ کے سسر مشتاق صاحب کو بھی اطلاع کر آیا۔ جو علیحدہ کمرے میں سوتے تھے اور جب سوتے تھے تو گھوڑے بیچ کر سوتے تھے۔ سکینہ ٹسوے بہائے جا رہی تھی۔ "دل کی دھڑکن بند ہونے سے ان کی موت ہوئی ہے۔ اسے آپ ہارٹ اٹیک بھی کہہ سکتے ہیں۔" ڈاکٹر صدیقی نے تمام چیک اپ کرنے کے بعد کہا اور مشتاق صاحب کو تسلیاں دیتا چلا گیا۔

"بیٹا جو خدا کو منظور تھا اس کے سامنے ہم کچھ نہیں کرسکتے جاؤ اور اشتیاق کو فون کر کے کہو جہاں بھی ہے فوراً گھر آ جائے۔" مشتاق صاحب نے سکینہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئی۔ ایک خبیثانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقصاں تھی۔

☆.....☆.....☆

جیسے جیسے منگل کا دن نزدیک آ رہا تھا۔ بشیر خان کا خوف بڑھ رہا تھا پورا ایک ماہ سے منگل کے دن کا شکار بنتا آیا تھا لیکن اب کی بار وہ ایسا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ لیکن کسی کے چاہنے سے وہ وقت تو نہیں رکتا۔ وہ تو اپنی رفتار قائم رکھتا ہے۔ اسے کسی کی پرواہ نہیں ہوتی کوئی پیچھے رہ جائے تو رہ جائے۔ اور پھر جس دن سے بشیر خان ڈر رہا تھا وہ دن آ گیا۔ سارا دن وہ انہی سوچوں میں گھرا رہا جس کی وجہ سے ایک دو بار اس کی 43 نمبر گاڑیوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ڈیوٹی ختم ہوتے ہی وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ ایک خیال کے آتے ہی اس نے موٹر سائیکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھادی۔ اس کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا تھا۔" اس کے ساتھ یہ شیطانی کارروائی تب ہی ہوتی تھی جب وہ سو رہا ہوتا تھا۔ اور اگر آج وہ سوئے ہی نہ تو؟" اس خیال کے آتے ہی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلنے لگی۔

"بھائی! کوئی جاگنے والی گولی ہے۔" بشیر خان نے میڈیکل اسٹور میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔ "تنویر خان کے بیٹے یعنی بشیر خان کے بھتیجے امتحانات کے دوران ایسی گولی استعمال کرتے تھے اور ساری ساری رات پڑھتے تھے۔ اس قسم کی میڈیسن کا کوئی سائیڈ ایفکٹ بھی نہیں تھا۔ اسی لئے بشیر خان نے اپنے پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ میڈیسن لی تھی۔ وہ جاتے ہی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لائٹ گئی ہوئی تھی۔ اس نے گیس لیمپ جلایا اور گولیوں کے پتے سے ایک گولی نکالی اور کھالی۔ گولی کے کھانے کی دیر تھی کہ اسے نیند آنے لگی اس نے سر کو جھٹکا اور گولیوں کے پتے کی طرف دیکھا۔ سفید رنگ کی لمبی ٹیبلیٹس پیلے رنگ اور گولائی میں تبدیل ہوچکی تھیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ گولیاں اس ساخت اور رنگ کی نہیں تھیں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے تو اس نے لمبی گولی نگلی تھی یہ نیند اڑانے کی ڈبل ڈوز گولی تھی جو تقریباً 6 گھنٹے انسانی دماغ کو ماؤف رکھتی تھی۔ وہ بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ مگر کب تک؟

آخر وہ نیند کے تاریک کنویں میں کود گیا۔

ساڑھے بارہ کا وقت ہوگا۔ بشیر اپنے پلنگ سے اٹھا اور مشینی انداز میں چلتا ہوا دروازے سے باہر نکلا لائٹ آچکی تھی۔ عبدالقدوس کے کمرے سے تلاوت کی روح پرور آواز آرہی تھی۔

مترجم سورۃ الناس کی پہلی آیت کا ترجمہ کررہا تھا اور پھر دوسری آیت پڑھی گئی۔ پھر تیسری، چوتھی آیت پر بشیر خان ٹھٹک کر رک گیا۔ مِــــــــنْ شَرِ الْوَاسْوَاسِ الْخَنَّاسِ o

قرات کی میٹھی آواز بشیر خان کے کان میں پڑی تو اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہوگیا مٹھیاں بھنچ گئیں۔ مترجم کی آواز آئی۔ "اور وسوسے ڈالنے والے شیطان کے شر سے" (اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) بشیر خان کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ اور وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اب اسے نیند محسوس نہیں ہورہی تھی بلکہ وہ اپنے اندر بشاشت محسوس کررہا تھا۔

اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ o

بشیر خان کو اس وقت قرأت کی یہ آواز "ندائے حیات" محسوس ہورہی تھی۔ وہ کھنچتا ہوا خود بخود قدوس کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اور پھر ساری رات ہی وہ تلاوت سنتا رہا۔

☆......☆......☆

پیر نواز شاہ کا آستانہ جمعہ والے دن بھی کبھی بند نہیں ہوتا تھا۔ لوگ دور دور سے آتے تھے۔ اس لئے چھٹی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر یہ اس کی پیری فقیری کی زندگی میں پہلا بدھ تھا کہ اس نے آستانہ بند کیا تھا۔ آنے والے عقیدت مندوں کو پیر صاحب کی طبیعت کی خرابی کا کہہ کر واپس کیا جارہا تھا۔

پیر نواز شاہ اپنے کمرے میں بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا کہ اچانک ہلکے سے جھماکے سے وہاں ایک کالا بھجنگ دیو نما شخص حاضر ہوا۔ اس کے جسم سے اٹھنے والا تعفن بے حد ناگوار تھا۔ مگر پیر نواز کو تو جیسے اس کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

"کہاں مرگیا تھا تو اور کام پورا کیوں نہیں کیا۔" پیر نواز شاہ نے تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ میں روحانی چیزوں سے دور رہتا ہوں۔ اسے میں لانے ہی والا تھا کہ کچھ نامعلوم سے الفاظ مجھے جھلسانے لگے اور میں وہاں سے بھاگ آیا۔ مگر میں بار بار وہاں جانے کی کوشش کرتا رہا۔ اور ہر بار ہی وہ نامانوس سی آواز میرے بدن میں چنگاریاں چھوڑ جاتی۔ ساری رات وہ اس کمرے سے نکلا ہی نہیں تو میں کیا کرتا۔" کالے نے ساری تفصیل بتائی۔

"دفع ہوجا یہاں سے، کسی کام کا نہیں تو۔" پیر نواز نے دھاڑتے ہوئے کہا، اس کے منہ سے کف بہنے لگا۔

اور وہ کالا دیو غائب ہوگیا۔

پیر نواز شاہ کمرے کے وسط میں آیا وہاں سے قالین ہٹایا تو وہاں ایک طاق سا تھا۔ پیر نواز نے اسے اوپر اٹھایا تو سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ اس نے دیوار پر لگے بورڈ سے لائٹ جلائی۔ کمرہ روشنی میں نہا گیا۔

کمرے میں جا بجا بت ہی بت پڑے تھے۔ سب سے بڑے بت کے ڈھیروں ہاتھ تھے اور منہ سے زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ یہ کالی کا بت تھا۔ پیر نواز اس کے قدموں میں گر پڑا۔

"میری زندگی اب تیرے ہاتھ میں ہے، ماتا وہ عمل کسی وجہ سے ادھورا رہ گیا ہے اور اب میری زندگی خطرے میں ہے۔ مجھے بچالے کالی ماں۔ مجھے بچالے۔" پیر نواز گڑگڑانے لگا۔ مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ کالی طاقتیں وقت پڑنے پر اپنے بھگتوں کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔

یکایک ایک طرف سے نیلے رنگ کا کھولتا ہوا لاوہ سا اٹھا اور پیر نواز کے ناک اور کان سے گزرتا ہوا اس کے جسم میں سرایت کرگیا۔ پیر نواز کے جسم سے نیلے رنگ کے آبلے سے پھوٹنے لگے اور وہ کپڑوں کو پھاڑتا ہوا تہہ خانے سے نکل آیا۔ درد کی شدت سے اس کے منہ سے دل دہلا دینے والی چیخیں نکل رہی تھیں۔ اور وہ بھاگتا ہوا باہر لان میں آگیا۔ سورج کی روشنی پڑتے ہی وہ آبلے پھوٹنا بند ہوگئے مگر اس کا جسم کسی چھلنی کی طرح دریدہ ہوچکا تھا۔ درد تھوڑا کم ہوا تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کام کرنے لگی۔

"بشیر خان میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔ تو پل پل موت کے لئے تڑپے گا اور تجھے موت نہیں آئے گی۔" پیر نواز نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

بشیر خان اگر اس وقت اس کے پاس ہوتا تو وہ اسے کچا ہی چبا ڈالتا۔ اس نے اپنے ایک ملازم کے ہاتھ رجسٹر منگوایا جیب سے پنسل نکالی اور اس پر بشیر خان اور اس کے اہل خانہ کے نام لکھے۔ اس کے بھائی اور بھتیجے بھتیجیوں کے نام لکھے۔ پھر ان پر کچھ پڑھتا رہا۔ ملازموں سے کہہ کر صحن میں آگ جلوائی۔ اور بشیر خان اور دیگر کی پرچیاں آگ میں جھونکنے ہی والا تھا کہ اس کے سامنے ایک جھماکا سا ہوا اور ایک فقیر ہاتھ میں عصا پکڑے ظاہر ہوا۔ وہ عجیب سی چال چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اس کے دائیں کندھے پر کاسہ لٹکا ہوا تھا۔ اور بائیں کندھے پر چمڑے کا بنا بگل سا لٹکا ہوا تھا۔ گلے میں رنگ برنگی بڑی موتی کی مالا تھی۔ "اب بھی وقت ہے اپنے کرتوتوں سے باز آجا شاید تجھے معافی مل جائے۔" فقیر کی بارعب آواز گونجی۔

"تو کدھر سے آیا ہے ڈھونگی دفع ہوجا، مجھے میرا کام کرنے دے۔" پیر نواز نے غصے سے کہا۔

"تو نے اب تک بہت گناہ کمائے ہیں۔ مگر ہر انسان پر توبہ کا در کھلا رہتا ہے، موت سے پہلے پہلے۔ جو شخص توبہ کرلیتا ہے اسے خدائے بزرگ و برتر معاف فرمادیتے ہیں۔ چاہے اس کے گناہ پہاڑ جیسے ہوں۔ کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو تنبیہ کی جاتی ہے۔ تیری خوش نصیبی ہے کہ تجھے متنبہ کرنے کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے۔ چھوڑ دے ان معصوموں کو ان کے حال پر، یہ آگ بجھادے تاکہ تو اس آگ سے بچ سکے۔" فقیر نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"بند کر اپنی بکواس اور دفع ہوجا یہاں سے میرا کوئی خدا نہیں۔" پیر نواز نے پرچیاں آگ میں پھینکیں اور پاس پڑی ہوئی اینٹ اٹھا کر فقیر کو دے ماری۔ اینٹ فقیر کے جسم سے ایسے گزر گئی جیسے وہ ہوا کا بنا ہوا ہو۔ فقیر تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیر نواز کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

یکایک ایک بدلی سی سورج کے سامنے آئی اور آبلے پھوٹنے کا عمل پھر سے شروع ہوگیا۔ پیر نواز چیختا ہوا اٹھا اور لان کے دوسرے کونے میں دوڑ گیا وہاں کافی دھوپ تھی۔

دھوپ میں کھڑا رہنا اب اس کی مجبوری بن گیا تھا۔ وہی کالی طاقتیں جو کبھی اس کا ہتھیار تھیں اب اس کے خلاف عمل پیرا تھیں۔ سورج کی روشنی پیر نواز کو کالی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طاقتوں سے تحفظ دیئے ہوئے تھی۔ اندھیرے کی فوج اندھیرا ہونے کا انتظار کررہی تھی۔ پیر نواز کی اب شدید خواہش تھی کہ یہ سورج کبھی نہ ڈوبے اور وہ یہاں اس کی روشنی میں کھڑا رہے۔

مگر قدرت کا نظام اپنے اوقات کے مطابق چلتا ہے اور چلتا رہے گا۔ سورج مغرب کی طرف جھکتا چلا گیا اور آستانے کی دیواروں کے سائے لمحہ بہ لمحہ پیر نواز کی طرف موت کے سائے کی طرح بڑھنے لگے۔ وہ آستانے سے نکلا اور گلی میں ڈھلتی دھوپ میں دوڑنے لگا۔ موت کے خوف نے اس کی تمام حسیات سلب کردی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسے دوڑنے سے وہ دھوپ کے ساتھ رہے گا۔ سائے لمبے ہوتے گئے۔ سورج جھکتا گیا اور.....

☆.....☆.....☆

بسنت کی آمد آمد تھی۔ لاہور شہر ہو اور بسنت پر پتنگوں سے آسمان رنگین نہ ہو یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا اپنی بساط کے مطابق تیاری کررہا تھا۔ ایسے میں تنویر خان اور نصیر خان کی اولاد کیسے پیچھے رہ جاتی پتنگیں لے کر وہ بھی چھت پر آگئے۔ ہر بسنت پر انہیں اچھی خاصی رقم ملتی تھی تاکہ وہ اپنا تہوار خوش اسلوبی سے منائیں۔ پتنگیں وہ دکان سے بھی خرید لیتے تھے مگر کٹی پتنگ پکڑنے میں جو مزہ آتا تھا وہ خریدی ہوئی پتنگوں میں کہاں۔ چھت کی منڈیریں تین تین فٹ اونچی تھیں۔ ایک طرف بجلی کا کھمبا لگا ہوا تھا۔ ٹرانسفارمر تو گھر سے پرے تھا مگر بجلی کی تاریں منڈیر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ سب لڑکے عقل وفہم والے تھے۔ نصیر خان کا بیٹا عبدالقدوس پتنگ اڑاتا تو نہیں تھا۔ مگر دیکھنا بہت شوق سے تھا۔ تنویر خان کا بڑا بیٹا شاہ زیب خان پتنگ اڑاتا سب سے چھوٹا سلیم خان چرخی پکڑتا جب کہ منجھلا جمال خان پتنگیں کٹی ہوئی پکڑتا تھا۔

شاہ زیب کا مقابلہ سامنے والے پڑوسی سے ہورہا تھا۔ شاہ زیب بڑے طریقے سے ڈھیل دے رہا تھا۔ سبھی کی نگاہیں شاہ زیب کی پتنگ پر گڑی ہوئی تھیں۔

جمال خان کی نظر اپنے دائیں طرف پڑی تو ایک بڑی سی خوبصورت پتنگ کٹی جارہی تھی۔ جس کی ڈور دائیں منڈیر پر تھی۔ جمال خان بھاگا اور فوراً سے پیشتر اس ڈور کو پکڑ لیا۔ مگر وہاں نہ کوئی پتنگ تھی نہ ہی وہ ڈور تھی جسے اس نے پکڑا تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ ڈور بجلی کی تار بن گئی اور کئی سو وولٹ کرنٹ اس کے جسم میں داخل ہوگیا۔

دفعتاً سب سے چھوٹے سلیم کی نظر جمال پر پڑی اور وہ چرخی پھینک کر جمال کی طرف بڑھا۔ اب نصیر خان، تنویر خان اور بشیر خان نے بھی اس طرف دیکھا اور بھاگتے ہوئے بہروز کی طرف لپکے۔ شاہ زیب نے بھی پتنگ ہوا کے دوش پر چھوڑ دی اور وہ بھی بھاگا۔ یہ سب افراتفری چند سیکنڈ میں ہوئی تھی۔ سلیم چرخی پھینک کر بھائی کے پاس پہنچا اور اسے بازو سے پکڑ کر چھڑانا چاہا کہ اس کے اندر بھی ایک بھونچال سا آگیا۔ جمال کے تو ناک منہ اور کانوں سے خون جاری ہوگیا تھا۔ تنویر خان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ جبکہ بشیر خان اور نصیر خان ادھر ادھر دیکھنے لگے کہ کوئی لکڑی مل جائے تو سلیم کی جان بچائی جائے۔ شاہ زیب روتا ہوا آگے بڑھنے کی کوشش کررہا تھا اور بار بار عبدالقدوس اسے پکڑ کر پیچھے کررہا تھا۔ عبدالقدوس نے ہاتھ اٹھائے اور سورہ فاتحہ سے قرآن پاک شروع کردیا۔ اس کے اونچے لہجے میں تلاوت کی آواز سنتے ہی بشیر خان اور نصیر خان نے بھی ہاتھ اٹھالئے۔ کوئی لکڑی تو انہیں مل کے نہیں دے رہی تھی اور اب شاید انہوں نے سب خدا پر چھوڑ دیا۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○

آیت مکمل ہوئی ہی تھی کہ لائٹ چلی گئی۔ سلیم کا بے ہوش وجود آگے بڑھتے نصیر خان کی بانہوں میں جھول گیا جبکہ جمال کو بشیر نے قابو کیا۔ اس کی حالت سے نہیں لگتا تھا کہ وہ اب تک زندہ ہے۔ مگر بشیر خان نے اسے اٹھایا اور نصیر خان کے پیچھے بھاگا جو سلیم کو اٹھائے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ نیچے پہنچنے پر جب دوسرے اہل خانہ نے پوچھا تو انہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور ان دونوں کو ٹیکسی میں ڈالا

اور اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔

☆.....☆.....☆

سکینہ جب سے ناگیش کے پاس سے آئی تھی۔ بہت پریشان تھی۔ ہر منگل اس کا عمل پورا ہوا کرتا تھا۔ مگر اس منگل کو بشیر خان بچہ لے کر اس کے پاس نہ آیا تھا۔ اور جہاں وہ پریشان تھی وہاں ناگیش کا بھی برا حال تھا۔ اس نے دو دنوں میں ناگیش کے فلیٹ کے دس چکر لگائے تھے مگر ہر بار اسے ناگیش تو کیا اس کی دھول بھی نہیں ملی تھی۔ صبح کے وقت تو ویسے بھی وہ پتہ نہیں کہاں ہوتا تھا۔ مگر اب وہ راتوں کو بھی نہیں ملتا تھا۔ سکینہ کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے کہ شاید عمل پورا نہ ہونے پر شیطانی طاقتوں نے اس کے ساتھ کوئی الٹا سیدھا کردیا ہو اور اب وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں میرے ساتھ بھی کچھ ایسا نہ ہوجائے۔

تبھی اس کی زندگی نے پلٹا کھایا۔ شروعات ایک الٹی سے ہوئی۔ اشتیاق ماں کی وفات کے بعد سے باہر نہیں جاتا تھا۔ وہ اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے اسے باپ بننے کی خوشخبری سنادی۔ اشتیاق تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی ملازموں سے اور اپنے والد سے داتا صاحب کے مزار پر چلنے کا کہا۔ سب خوشی خوشی چل پڑے۔

داتا دربار پہنچ کر اشتیاق نے لنگر تیار کرنے والے کو دس ہزار روپے دیئے اور کہا لنگر تقسیم کردو۔ سب دربار میں داخل ہوگئے مگر سکینہ نے پاؤں اٹھایا ہی تھا کہ ایسے لگا جیسے آگ کی دیوار سی کھڑی ہے جو نظر تو نہیں آرہی مگر اس کی تپش سے وہ جھلسی جارہی تھی۔ وہ بھاگ کر پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

اشتیاق نے مڑ کر دیکھا اور واپس سکینہ کے پاس آتے ہوئے بولا۔

"اندر چلو یہاں باہر کیوں کھڑی ہوگئی ہو۔"

"مجھ سے چلا نہیں جاتا۔" سکینہ نے بات بنائی۔

"تو میں اٹھا کر لے جاتا ہوں۔" اشتیاق نے کہا اور اپنے ارادے پر عمل کرنا ہی چاہتا تھا کہ سکینہ درشتی سے بولی۔

"میں نے کہا نا کہ میں نہیں جاؤں گی۔"

اشتیاق اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ "جیسے تمہاری مرضی میں اصرار نہیں کروں گا اشتیاق نے کہا اور دربار میں داخل ہوگیا۔

"بہت خوش ہو بچے۔" آواز نے اشتیاق کو پلٹنے پر مجبور کردیا۔ سبز چوغے میں ملبوس وہ کوئی درویش تھا۔ اشتیاق نے ادب سے انہیں سلام کیا۔

"تیری خوش نصیبی ہے کہ تو خدا کے بندے کے دربار میں آیا ہے۔ ورنہ تو بھی اسی گرداب کی لپیٹ میں آجاتا جو تیری بیوی کے لئے میں نے دیکھا ہے۔" فقیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کون سا گرداب بابا آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" اشتیاق نے اضطرابی لہجے میں کہا۔

"سمجھ جاؤ گے، سب کچھ سمجھ جاؤ گے یہ کھالو۔" درویش نے چند الائچی دانے اشتیاق کو دیئے اور پھر گویا ہوا۔ "ایک بات یاد رکھنا اپنی بیوی کے پاس تب تک نہ جانا جب تک وہ اس بچے کو جنم نہیں دے لیتی بعد میں تمہیں اجازت ہے اگر وہ اس قابل رہی تو۔"

آخری جملہ درویش نے مسکراتے ہوئے بہت دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ مگر اشتیاق نے سن لیا اور چاہتا تھا کہ وہ اس بابت اور کچھ پوچھے مگر درویش اس کے دیکھتے دیکھتے غائب ہوگیا۔

لنگر وغیرہ تقسیم کروانے کے بعد وہ گھر لوٹ آئے۔

☆.....☆.....☆

ادھر جمال خان کی موت کی تصدیق ہوگئی تھی اور سلیم خان اب خطرے سے باہر تھا۔ تنویر خان کو ہوش آچکا تھا اس نے رو رو کر برا حال کرلیا تھا۔ اس کی بیوی تہمینہ کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ نصیر اور بشیر خان کی بیویاں اسے تسلی دلاسے دے رہی تھیں۔ مگر جس ماں کا بیٹا چھن جائے اسے کب سکون ملتا ہے۔ رو رو کر اس پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ جمال خان کو دفنا دیا گیا۔ رات ہوگئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تنویر خان کی بیوی تہمینہ تو پہلے ہی بے ہوش تھی۔ ڈاکٹر نے اسے چند گھنٹے آرام کے لئے انجکشن دیا تھا جبکہ دوسرے افراد گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔ تبھی بشیر خان نے شاہ زیب اور دوسرے بچوں سے کہا کہ جا کر سو جاؤ۔ اور وہ اٹھ کر چلے گئے۔

بشیر خان کے دونوں بیٹے شاہ نواز اور گلاب خان دادا کے پاس تھے۔ ان کی ابھی اتنی عمر ہی نہیں تھی کہ وہ سمجھ سکتے کہ گھر میں کیا ہوا ہے۔ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں سب سونے کے لئے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اکیلا تنویر خان گیلری میں اکڑوں بیٹھا گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ دو بجے کا وقت ہوگا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا، نصیر خان کی بڑی بیٹی سنبل آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی۔ تنویر خان نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر گھٹنوں میں سر دے لیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ اسے روکتا کہ رات کے اس وقت بغیر جوتی پہنے بغیر دوپٹہ اوڑھے وہ کدھر جارہی ہے۔ مگر اس وقت وہ دکھ کے دلدل میں ایسے ڈوبا ہوا تھا کہ کوئی جا ہے جو مرضی کرے اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ سنبل چلتی چلتی شہروز خان کے کمرے کے سامنے رکی۔

دروازے کی طرف دیکھا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر آئی اور بغل میں دبا ہوا ہاتھ نکالا اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار سبزی کاٹنے والی چھری پکڑی ہوئی تھی۔ سامنے شہروز خان بیڈ پر لیٹا نیند کے سفر پر رواں دواں تھا، اس کے ایک پہلو میں شاہ نواز خان اور دوسرے میں گلاب خان تھے۔ سنبل آگے بڑھی اور چاہتی تھی کہ گلاب خان کو اٹھالے اسی وقت شہروز خان نے کروٹ بدلی اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔ شہروز خان کا بازو گلاب خان کے اوپر تھا۔ اس نے اردہ بدلا اور پلٹ کر شاہ نواز کی طرف بڑھی مگر پیچھے پڑے گلاس کو کہنی لگی اور وہ ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ شہروز خان اٹھا اور حالات کی نزاکت جو بھانپتے ہوئے اس نے شاہ نواز خان کو اٹھایا اور دوسری سائیڈ پر کرلیا۔

"سنبل بیٹا کیا ہوا ہے تمہیں..... یہ..... یہ..... چھ..... چھ..... چھری۔"

شہروز خان نے چھری پر نظر پڑتے ہی ہکلانا شروع کردیا۔

"یہ بچے مجھے دے دے بڈھے تیری باری ابھی نہیں آئی مجھے مجبور کرے گا تو ان سے پہلے تجھے ماروں گا۔" سنبل کے منہ سے مردانہ مگر بہت دہشت طاری کرنے والی آواز نکل رہی تھی۔

اسی وقت سنبل کے پیچھے ایک فقیر ظاہر ہوا۔ ہاتھ میں عصا پکڑے فقیر سنبل کے پاس آیا اور اسے چوٹی سے پکڑلیا۔

"تو نے جو کچھ کرنا تھا کرلیا اب ہماری باری ہے نکل باہر اس جسم سے۔" فقیر نے بارعب آواز میں کہا اور چٹیا کو جھٹکا دیا۔

"سنبل کے منہ سے مردانہ چیخوں کا طوفان جاری تھا اور پھر ایک دھواں سا نکلا اور ایک کالے مگر دیو قامت شخص کی شکل اختیار کرگیا۔ اس کی آنکھوں میں سیاہ پتلیوں کا نشان بھی نہیں تھا۔ اسی اثنا میں بشیر خان نصیر خان اور تنویر خان بھی کمرے میں آگئے، شور کی آواز سن کر ان کی بھی نیند کھل گئی تھی۔ شاہ نواز خان اور گلاب خان بھی نیند سے جاگ گئے تھے بشیر خان کی بیوی نے انہیں سنبھال لیا۔ فقیر نے عصا کا رخ دیو قامت شخص کی طرف کیا عصا سے نکلنے والی شعاع نے اسے چیخنے کی مہلت بھی نہ دی اور وہ جل کر خاک ہوگیا۔

"میں جانتا ہوں آپ سب حیران ہوں گے کہ اچانک یہ سب کیا ہوا ہے مگر خدا کا شکر ادا کریں کہ میں اس طرف سے غافل نہیں تھا ورنہ اس مردود کا کالا جادو ان بچوں پر بھی اسی طرح حملہ آور ہوتا جس طرح صبح جمال خان پر ہوا ہے۔" فقیر نے سب کی حیرت کو دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔

"بابا ہم آپ سے یہ تو نہیں پوچھتے کہ آپ کو ہمارے نام کیسے معلوم ہیں کیونکہ جس طرح آپ نے ہماری مدد کی ہے آپ کوئی نیک ہستی ہیں مگر اس بات کا

جواب ضرور طلب کریں گے کہ ہم پر کالا جادو کون کرے گا؟ ہمارا تو ایسا کوئی دشمن بھی نہیں ہے۔" شہروز خان نے پوچھا۔ سنبھل اب نارمل حالت میں تھی اور کافی حیران ہورہی تھی وہ اپنے کمرے سے دادا کے کمرے میں آنے کی وجہ سے حیران تھی اور یہاں تک آنے کا اسے علم بھی نہیں ہوا تھا۔

"اس بات کا جواب آپ کو بشیر خان بہتر طریقے سے دے سکتا ہے۔" فقیر نے مسکراتے ہوئے بشیر خان کی طرف دیکھا۔

"میں؟" بشیر خان حیرت سے تکتا رہ گیا۔

"ہاں تم یاد کرو، قبرستان میں جب تم نے اس عورت کو ایک گندے عمل سے منع کیا تھا وہی نیکی تمہارے گلے پڑ گئی، صبح کا حادثہ جو جمال خان کی جان لے گیا وہ بھی کالے جادو کی پیداوار تھا مگر ظلم خواہ کتنا وسیع ہو خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے جب پڑتی ہے تو اچھے اچھوں کے پتے پانی ہوجاتے ہیں۔" فقیر نے کہا۔

"تو کیا وہ خواب جو مجھے آتے رہے تھے واقعی وہ حقیقت تھے؟" بشیر خان نے سوال کیا۔ اب سب اہل خانہ جمع ہوگئے تھے اور بشیر خان اور فقیر بابا میں ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔

"ہاں وہ بلاشبہ ایک حقیقت تھا اور شاید یہ عمل تم سات منگل تک کرتے مگر خدائے بزرگ و برتر کے پاک کلام کی بدولت، عمل آدھے میں رہ گیا جس کی وجہ سے وہ شخص کافی عذاب میں ہے اور اب تم سب اہل خانہ کا دشمن ہوگیا ہے مگر اب وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔" فقیر بابا نے تمام اہل خانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر بابا وہ شخص کون ہے؟" بشیر خان نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس کا ایک روپ خواب میں دیکھ چکے ہو اور دوسرے روپ کا نام ہے۔" پیر نواز شاہ، وہ شخص صبح کو آستانے پر بیٹھ کر پیر بنتا ہے اور رات کو سفلی علم کا ماہر بن کر ناگیش کے نام سے ایک فلیٹ میں موجود ہوتا ہے کام وہ شیطانی عمل سے ہی کرتا ہے خواہ وہ آستانے میں ہو یا اس فلیٹ میں۔"

ان ساری باتوں کی بشیر خان کو ہی پوری طرح سمجھ آرہی تھی، باقی لوگ کچھ بھی نہیں سمجھ پارہے تھے۔

"اب میں چلتا ہوں!" فقیر بابا نے کہا۔ "اور ہاں! صبح تم اپنے کام پر ضرور جانا۔"

فقیر بابا نے بشیر کی طرف اشارہ کیا۔

"مگر بابا گھر میں جوان موت....."

"وہ بھی خدا کی مرضی تھی یہ بھی خدا کی مرضی ہے ایک کام کا آخری انجام رکا ہوا ہے، اس نیک کام کا انجام تمہارے ہاتھوں ہونا چاہئے۔" فقیر بابا نے بشیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور عصا ٹیکتے ہوئے دیوار کی طرف چلے اور دیوار میں غائب ہوگئے۔ فقیر بابا کے جانے کے بعد سب نے بشیر کو گھیر لیا۔ بشیر خان نے تمام روداد سنادی۔ سبھی خدا کا شکر ادا کرنے لگے کہ اللہ کی ذات نے ایک نیک ہستی مدد کے لئے بھیج دی ورنہ جانے کیا ہوجاتا۔

فقیر کی ہدایت کے مطابق بشیر خان اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ سارا دن وہ اسی کشمکش میں رہا کہ نہ جانے کون سا ایسا نیک کام ہے جو اس کی وجہ سے رکا ہوا ہے۔ سارے لاہور کا چکر کاٹتی اس کی 43 نمبر "ٹوکرا اسٹاپ" پر آئی۔ اس کی نظر راستے پر تھی کہ یکا یک ایک جنگلی سور اس کی گاڑی کے آگے آگیا وہ بھاگا ہوا روڈ کراس کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"کچل ڈالو اسے۔ کچل ڈالو۔" مسافروں کی آواز نے اسے انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور کردیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ سور نہ جانے کس کس کو نقصان پہنچاتا۔ بشیر خان نے ایکسیلیٹر پر دباؤ ڈالا اور گاڑی کو زبردست رفتار سے آگے بڑھایا سور کی گردن حیرت انگیز طور پر مڑ گئی اور اس کی آنکھیں بشیر خان کی آنکھوں سے ملیں تو وہ وہیں رک گیا۔ اگر وہ سور چاہتا تو چھلانگ لگا کر ایک طرف ہوسکتا تھا مگر وہ وہیں رکا رہا اور گاڑی کا وزنی وہیل اس پر چڑھ گیا۔ بشیر خان نے ریورس گیئر لگایا اور گاڑی پیچھے کرکے پھر ایک جھٹکے سے اس پر چڑھادی۔ "ایسا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے سے بشیر خان مطمئن ہوگیا کہ اب وہ جانور مر چکا ہے۔ وہ گاڑی سے اترا مگر قدم باہر رکھتے ہی ایک پولیس جیپ اس کے پاس آرکی اور ایک باوردی شخص نے اونچی آواز میں کہا۔

"یو آر انڈر اریسٹ۔"

☆.....☆.....☆

پیر نواز شاہ دوڑتا رہا دھوپ ڈھلتی گئی اور آخر کار سورج ڈوب گیا۔ آبلے پھوٹنے شروع ہوگئے۔ گلیوں سے نکل کر وہ سڑکوں پر آ گیا۔ رات میں لاہور شہر میں کافی گہما گہمی ہوتی ہے۔ ہر شخص اس کی حالت دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ اس کا تمام بدن گردن تک چھلنی بن گیا تھا۔ نیلے مواد نے اس کے چہرے کو نہیں چھیڑا تھا۔ اس کے منہ سے چیخوں کا طوفان بھی جاری تھا۔ کوشش کے باوجود وہ چیخوں پر قابو نہیں پا رہا تھا۔

اسی وجہ سے ارد گرد کے لوگ اسے دیکھ کر توبہ توبہ کر رہے تھے۔ ویسے بھی اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ ٹمیض پھاڑ کر اس نے پہلے ہی ٹکڑے ٹکڑے کر لیا تھا۔ اس کا عمامہ راستے میں کہیں گر گیا تھا اور منہ پر لگی نقلی داڑھی اکھڑ کر جھول رہی تھی مگر اسے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ وہ تو دھوپ کی تلاش میں دوڑا جا رہا تھا اور پھر "کلمہ چوک" کے پاس آ کر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ گر پڑا اور بے ہوش ہوتے ہی سکون کی وادیوں میں اتر گیا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ بے ہوش رہا۔ دھوپ کی حدت محسوس ہوتے ہی اس نے آنکھ کھولی۔ سورج سر پر تھا۔ آبلے پھوٹنا بند ہوگئے تھے مگر وہ جانتا تھا کہ سورج نے سدا سر پر نہیں رہنا۔ اس لئے وہ اٹھا اور اپنی حفاظت کی تدابیر سوچنے لگا۔

اس کی چال میں اب لڑکھڑاہٹ تھی۔ کوئی تدبیر اس کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ سورج ڈھلنے کا وقت آ گیا۔ اس نے افق کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ "ٹوکر اسٹاپ" پر وہ پہنچا تو روڈ کراس کرتے ہوئے اسے ایک گاڑی اپنی طرف آتے دکھائی دی، گاڑی کے ڈرائیور کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ یہ تو بشیر خان تھا جس کے اہل خانہ سمیت اس نے بشیر خان کی موت کی پرچی لکھی تھی مگر بشیر خان زندہ تھا اور گاڑی لے کر اس پر چڑھ رہا تھا۔

پیر نواز نے آنکھیں بند کر لیں۔ بشیر خان نے اس کے جسم کو دو بار کچلا۔ سامنے پان سگریٹ کے کھوکھے پر بیٹھے نوجوان نے یہ حادثہ دیکھا تو جلدی سے پولیس کو فون کر دیا۔ چند لمحوں میں پولیس کی گاڑی پہنچ گئی۔ بشیر خان گاڑی سے اترا تو ایک ٹریفک پولیس افسر نے کہا۔

"یو آر انڈر اریسٹ"

"لیکن میرا جرم کیا ہے؟" بشیر خان بولا۔

"ایک انسان کو بری طرح روند کر تم کہتے ہو کہ تمہارا جرم کیا ہے؟" ٹریفک افسر نے غصے سے کہا۔

"ڈرائیور نے کسی انسان کو نہیں بلکہ ایک جنگلی سور کو مارا ہے۔" ایک معمر شخص گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔

"ہاں ہاں! ہم سب نے خود دیکھا ہے۔" مسافروں نے نیچے اترتے ہوئے پرزور انداز میں کہا۔

سب گاڑی کے اگلے ٹائر کی طرف آئے مگر وہاں کسی انسان کسی جانور تو کیا کسی بھی چیز کا نام و نشان نہیں تھا۔ نہ ہی خون کا قطرہ یا خون کا دھبہ تھا۔

سب حیران ہو رہے تھے کہ انہوں نے خود جنگلی سور کو مرتے ہوئے دیکھا ہے اور اب وہاں کچھ بھی نہیں جبکہ پان سگریٹ والا اور دیگر دکاندار بھی حیران تھے مگر ٹریفک افسر کے پیچھے کھڑے فقیر بابا کو بشیر خان دیکھ رہا تھا جو مسکراتے ہوئے اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

تھوڑے ہی دنوں میں بشیر خان کی زندگی معمول پر آ گئی تھی، ادھر سکینہ کے ہاں بیٹا ہوا جو کئی ٹکڑوں پر مشتمل تھا، جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تو اس کے بعد اس کے شوہر نے دوسری شادی کر لی۔ اسے پاگل خانے میں ڈال دیا گیا اور پھر ایک ماہ کے اندر اندر اس کا ناطہ اس دنیا سے ختم ہوگیا۔

فارم ہاؤس

محمد عمران سعید-لاہور

شاہ بلوط کے درخت کے تنے کے ساتھ گھاس پر دوشیزہ لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک بے خود سی مسکراہٹ موجود تھی اس کے دل کی دھڑکن خاموش ہوچکی تھی۔ زندہ تھی تو بس اس کی بے خود سی مسکراہٹ۔

ایک روح کی عشق و محبت چاہت و خلوص کی.....دل و دماغ پر اثر کرنے والی کہانی

اسٹیون کے مرنے کے تیس دن بعد ہمیں اس کی موت کا پتہ چلا۔ وہ اپریل میں سمندر پار گیا تھا اور یہ جون کے آخری دن تھے جب ہمیں پتہ چلا کہ وہ انجینئروں کی ایک ٹیم کے ساتھ ریلوے ٹریک کی مرمت کرنے کے لئے گیا ہوا ہے کہ ایک جرمن گولے کا نشانہ بن گیا۔ ہم نے میڈی کو حقیقت نہیں بتائی اتنا تو اسے پتہ چل گیا تھا کہ اسٹیون مر چکا ہے لیکن اس کی موت کس دردناک انداز میں ہوئی کس طرح اس کا جسم گولے کی زد میں آ کر کٹ پھٹ گیا، یہ ہم نے اسے نہیں بتایا تھا۔

اسٹیون کی میڈی منگیتر تھی اور بہت زیادہ جذباتی تھی۔ وہ سٹیون سے پیار بھی بہت زیادہ کرتی تھی اس لیے ہم نے اسے اسٹیون کی دردناک موت کا نہ بتایا کہ کہیں وہ اس کا بہت زیادہ اثر نہ لے لے۔ یہ اور بات تھی کہ اسٹیون کی موت کا سن کر وہ مرجھا سی گئی تھی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے چپ سی لگ گئی تھی۔

ایک دن جذباتی لہجے میں بولی" میرے اور اسٹیون کے درمیان موت کی جو اندھی دیوار آ گئی ہے میں اسے توڑ دینا چاہتی ہوں۔

"کیا....." میں نے چونک کر کہا۔

اس وقت جب اس نے یہ بات مجھ سے کی۔ وہ اسٹیون کا ایک خط پڑھ رہی تھی جو سٹیون نے اسے اپنی زندگی میں لکھے تھے۔ وہ پلنگ پر بیٹھی تھی اور اس کے قریب پلنگ پر وہ خطوط بکھرے ہوئے تھے جو اسٹیون نے اپنی زندگی میں اسے لکھے تھے، اس وقت بھی وہ اسٹیون کا ایک خط پڑھ رہی تھی۔ میں اس کا علاج کر رہا تھا کیونکہ گرمیوں کے آخری دنوں میں اس کا ٹخنا فریکچر ہو گیا تھا اور اس کا علاج میری زیر نگرانی ہو رہا تھا۔

"میں اسٹیون سے بات کرنا چاہتی ہوں، اب میں اس سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکتی، مجھ سے اب یہ خاموشی برداشت نہیں ہو رہی۔" وہ دوبارہ بولی۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"میں اسٹیون سے بات کرنا چاہتی ہوں" میڈی نے پھر کہا۔ شاید وہ میری زبان سے کچھ سننا چاہتی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ اپنے پیاروں کو کھو دینا کتنے بڑے غم کا باعث بنتا ہے میں خود بھی اپنے بہت سے قریبی عزیزوں کو کھویا ہے۔ لیکن کیا اس سے وہ واپس آ جائیں گے؟" میں نے ایک طویل آہ بھر کر کہا۔

میڈی نے میری بات پر کوئی دھیان نہ دیا، وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی اس بات کا مجھے چند لمحے بعد پتہ چلا۔

"میری خواہش ہے کہ میں کسی روحانی شخصیت سے ملوں۔" وہ بولی۔ "میں نے سنا ہے کہ وہ شخصیات مرے ہوئے انسانوں کے ساتھ رابطہ کر لیتی ہیں اور ان کے پیغامات ان کے پیاروں تک پہنچا دیتی ہیں۔ کتنا خوش ہوگا۔ اسٹیون جب اسے پتہ چلے گا کہ میں نے اسے یاد کیا ہے۔ اور پھر شاید وہ بھی مجھے جواب میں کوئی پیغام بھیجے۔" میڈی نے کہا۔

"ایسا مت کرنا ....." میں نے اسے کہا۔ "مرے ہوئے لوگوں کو ان کی نئی دنیا میں تنگ نہیں کرنا چاہیے، سکون سے رہنے دو انہیں۔ ان سے رابطہ کر کے انہیں تنگ مت کرو۔" میں نے اس پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے میں بھی یہی سمجھتی تھی۔" میڈی نے جواب دیا۔ "لیکن یہ ایک احمقانہ خیال ہے۔" میڈی نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی "احمقانہ خیال نہیں بلکہ یہ پاگل پن کی باتیں ہیں۔ تم بس اپنے دل کو اتنا سمجھا لو کہ اسٹیون تمہارے دل میں رہتا ہے اور تمہاری یادوں میں زندہ ہے۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر میڈی کے چہرے پر ایک رقت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر وہ بولی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" اس کے بعد اس نے بات کا موضوع بدل دیا۔

یہ بات بعد میں میرے علم میں آئی کہ میری بات کو درست تسلیم کرنے کے باوجود، وہ نہ صرف ایسی کتابوں کا مطالعہ کر رہی تھی بلکہ ایسے لوگوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو روحانی طریقے سے مرے ہوئے لوگوں کی روحوں سے رابطہ کر لیتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

خزاں کا موسم آ گیا تھا ان دنوں زکام کی وبا ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، میں اپنے مقامی علاقے میں موجود لوگوں کے علاج و معالجہ کے سلسلے میں مصروف رہا اور میڈی اپنے ریڈ کراس کے کام میں۔ بعد میں میں نے سنا کہ وہ کیلیفورنیا چلی گئی ہے۔

گرمیوں میں وہ واپس آئی۔ وہ بہت کمزور اور بیمار لگ رہی تھی۔ میں نے اس کا معائنہ کیا لیکن اس کی بیماری اور کمزوری کی کوئی خاص وجہ نہ جان سکا۔ وہ اب پیدل لمبی سیر کو نکل جاتی تھی اور اس کی ممی نے مجھے بتایا کہ وہ سیر کو ہمیشہ اکیلی جاتی ہے اور اگر اسے کہا جائے کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ کسی کو ساتھ لے کر جائے تو وہ ناراض ہو جاتی ہے۔

میڈی کی ممی کے خیال میں یہ اس کا خبطی پن تھا۔ ان کی رائے میں میڈی مانجو لیا کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن دوپہر کو میڈی میرے دفتر میں آئی تو میں اس کی حالت، رنگ روپ، چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بہت خوش اور پہلے سے کم عمر دکھائی دیتی تھی، اس کے چہرے پر جو یاس اور سوگواری کی کیفیت چھائی رہتی تھی وہ اب غائب ہو چکی تھی، میں اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"انسان کی ایسی حالت اس وقت ہوتی ہے جب اسے نئی نئی محبت ہوئی ہو۔" یہی خیال میرے دل میں بھی آ رہا تھا اور میں اپنے دماغ میں میڈی کے جان پہچان کے ان لوگوں کو لا رہا تھا۔ جن کے بارے میں میری یہ سوچ تھی کی میڈی کو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ محبت ہو سکتی ہے۔ لیکن مجھے اپنے دماغ کی فوٹو البم میں ایسا کوئی شخص نظر نہ آیا۔ جس سے میڈی جیسی لڑکی کو محبت ہو سکتی ہو۔ میڈی کی ممی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ہمیشہ ایک ہی سمت سیر کے لئے جاتی ہے۔ اس بات کو ذہن میں لاتے ہوئے میں نے میڈی سے پوچھا۔ "آخر وہ ہمیشہ دریا کنارے والا راستہ سیر کے لئے کیوں منتخب کرتی ہے.....؟"

میری بات سن کر میڈی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ نہیں سمجھ پائیں گے لیکن پھر بھی میں آپ کو بتاؤں گی۔" میڈی نے ہاتھوں میں اپنے دستانے گھماتے ہوئے جواب دیا پھر کہنے لگی۔

"سب سے پہلے تو آپ کو وہ پلاننگ ذہن میں رکھنا ہوگی جو میں نے اور سٹیون نے مل کر زندگی گزارنے کے لیے کی تھی اور وہ پلاننگ یہ تھی کہ جب ہماری شادی ہو جائے گی تو ہم کسی اچھے سے پرفضا مقام پر ایک چھوٹا سا فارم ہاؤس خریدیں گے۔ اسٹیون کا کہنا تھا کہ "ہر آدمی کے پاس اس کا اپنا ذاتی فارم ہاؤس ضرور ہونا چاہیے۔"

اب میں آپ کو اصل بات بتاتی ہوں کہ میں ہمیشہ دریا کی طرف جانے والا راستہ کیوں منتخب کرتی ہوں؟ اس طرف پہلے دن جب میں سیر کے لیے گئی۔ تو دریا کنارے والی سڑک سے میں نے ایک پگڈنڈی جنگل کی طرف مڑتی ہوئی دیکھی۔ پتہ نہیں کیوں میرے قدم اس پگڈنڈی پر مڑ گئے۔ اور پھر مجھے درختوں میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا فارم ہاؤس نظر آیا۔ فارم ہاؤس کی زمین صاف ستھری اور ترتیب سے کاشت کی ہوئی تھی۔

مجھے تجسس محسوس ہوا۔ اور میں اس کی طرف بڑھنے لگی اور پھر ڈاکٹر میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس فارم کا نقشہ بالکل ویسا ہی تھا جس قسم کے نقشے کا اسٹیون مجھ سے ذکر کیا کرتا تھا۔ دیواروں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ چھت پر سرخ پینٹ کیا گیا تھا۔ فارم ہاؤس کے آگے تھوڑی سی زمین پر کاشت کاری بھی کی گئی تھی۔

ایک طرف ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر دودھ کا جگ اور دو گلاس رکھے تھے۔ ایک رسی پر رنگ برنگے کپڑے لٹک رہے تھے۔ میں کپڑوں کو دیکھ رہی تھی کہ فارم ہاؤس کا دروازہ کھلا اور سٹیون باہر نکلا اور پھر....." میڈی اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

میں جو اس کی کہانی سنجیدگی سے سن رہا تھا۔ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "پھر کیا ہوا.....؟"

"کچھ نہیں ڈاکٹر" اس بار میڈی کی آواز میں افسردگی تھی۔

"وہاں اسٹیون نہیں تھا۔" میڈی نے کہا۔ "اور نہ ہی فارم ہاؤس کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ بس میرا خیال تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے ڈاکٹر؟ ایک دن وہ اس فارم ہاؤس کا دروازہ کھول کر باہر ضرور آئے گا، مجھے یقین ہے پھر ہم دونوں اس فارم ہاؤس کی گھاس پر چمکیلی دھوپ میں بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے۔ پھر وہ اخبار پڑھنا شروع کر دے گا اور میں رسی پر لٹکے کپڑے سکھانا شروع کر دوں گی۔ پھر وہ فارم ہاؤس میں کاشت کاری کرے گا سبزیاں کاشت کرے گا اور میں اسے باورچی خانے کی کھڑکی سے ایسا کرتے ہوئے دیکھوں گی۔ مجھے یقین ہے ڈاکٹر! ایک دن ایسا

آئے گا، ایک دن ایسا ضرور آئے گا، اسی لیے میں روزانہ وہاں جاتی ہوں۔" یہ الفاظ کہتے ہوئے میڈی کا چہرہ دوبارہ خوشی سے چمکنے لگا تھا۔

"کیا تمہارے خیال میں یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں تمہارے ساتھ اس فارم ہاؤس کو دیکھنے چلوں....." میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں۔" میڈی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں.....؟" میرا لہجہ ابھی بھی سنجیدہ تھا۔

"کیوں کہ میرا نہیں خیال کہ تم اس فارم ہاؤس کو دیکھ پاؤ گے.....؟" میڈی نے جواب دیا۔

"کیا مطلب.....؟" میں کچھ سمجھا نہیں۔ جب فارم ہاؤس ادھر ہے اور تم روزانہ اسے دیکھنے جاتی ہو اور پھر اسے دیکھتی بھی ہو تو پھر میں اسے کیوں نہیں دیکھ پاؤں گا.....؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ میرے اور اسٹیون کے علاوہ کسی کو نہیں پتہ کہ وہاں کوئی فارم ہاؤس ہے....."

میڈی کی بات سن کر میں دھک سے رہ گیا۔

"یہ.....یہ تم کیا کہہ رہی ہو میڈی....." میرے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ ہلکا سا خوف بھی تھا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں.....جو بھی کہہ رہی ہوں۔" میڈی نے آخری الفاظ زور دے کر کہے تھے۔ پھر وہ اٹھی اور عجیب سے طریقے سے مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے میڈی کے کیس کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ اگر میں کوئی ماہر نفسیات ہوتا تو مجھے یقین تھا کہ میں اس کا اچھے طریقے سے علاج کر لیتا۔ لیکن چونکہ میں ماہر نفسیات نہیں تھا۔ اس لیئے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ شاید وہ خیالوں میں اس فارم ہاؤس کو دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ ہر وقت سٹیون اور اس کے فارم ہاؤس کے متعلق سوچتی رہتی تھی۔ تو شاید اسی کا اس کے ذہن پر اثر ہو گیا تھا۔ جسے وہ حقیقت سمجھ کر انا خوش ہو رہی تھی۔

انمول موتی

دنیا میں ہر انسان یہی چاہتا ہے کہ اسے کامیابی ملے اور وہ اچھی زندگی گزارے لیکن جب مسجد (اللہ کے گھر) سے آواز آتی ہے "حی الفلاح" آؤ کامیابی کی طرف تو اس وقت کوئی نماز پڑھنے کی زحمت نہیں کرتا۔

جس چیز کو انسان ساری زندگی ہر جگہ تلاش کرتا ہے وہ تو خود اسے اپنے پاس بلاتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ پابندی سے روزانہ 5 وقت کی نماز پڑھیں کیونکہ نماز بے حیائی اور برے کاموں سے بچاتی ہے۔ اور ہر انسان کو کامیابی کی راہ دکھاتی ہے۔

(محمد شاہد.....حیدر آباد)

میں نے سب سے پہلے تو یہ کام کیا کہ اس کے دوستوں سے ملا اور انہیں کچھ باتیں سمجھائیں۔ میری نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اس کے دوستوں نے اس کی توجہ اس کی روزانہ کی لمبی سیر سے ہٹانے کی کوشش کی، وہ کبھی اسے موٹر پر سیر سپاٹے کے لئے اپنے ساتھ کسی پر فضا مقام پر لے جاتے تو کبھی سینما دکھانے اور کبھی اس کی اپنے گھر زبردستی کی دعوت رکھ لیتے۔

یہ سب کچھ وہ میری اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کر رہے تھے کہ اس طرح کی مصروفیات میں اس کا دھیان بٹ جائے گا۔ اور وہ اسٹیون اور اس کے خیالی فارم ہاؤس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دے گی۔ چاہے دھیرے دھیرے ہی سہی۔ اور میرا یہ خیال کافی حد تک صحیح بھی ثابت ہوا۔ میڈی بڑی خوشی کے ساتھ ان کے ساتھ جانے پر راضی ہو جاتی لیکن کبھی کبھار ضد میں آ کر انکار بھی کر دیتی تھی لیکن اس کے دوست پھر بھی اسے کسی نہ کسی طرح منا لیتے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دن گزرتے گئے اور میڈی دوستوں کے ساتھ مصروف ہوتی گئی۔ میں بھی بہت خوش تھا کہ میرا طریقہ علاج کامیاب رہا ہے لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔

وہ اگست کا مہینہ تھا موسم قدرے گرم تھا۔ میڈی بغیر کسی کو بتائے گھر سے نکل گئی۔ اس دن بہت زبردست طوفان بھی آیا ہوا تھا۔ میڈی کی ممی کو تب پتہ چلا جب وہ سو کر اٹھیں، جب وہ سوئی تھیں تو میڈی بھی ان کے ساتھ ہی سوئی تھی۔ لیکن جب وہ جاگیں تو میڈی اپنے بستر پر نہیں تھی۔ مجھے اس بات کا پتہ اس وقت چلا جب میڈی کی ممی نے مجھے فون کیا، اس وقت تک طوفان گزر چکا تھا۔ بارش بھی رک گئی تھی۔

میں نے اپنی موٹر نکالی اور دریا کی طرف جانے والے راستے پر ڈرائیو کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ میڈی کو اس کے خیالات پھر اسی خیالی فارم ہاؤس کی طرف لے گئے ہیں۔ میں ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ موٹر کا ایک ٹائر پنکچر ہوگیا۔ میں نے موٹر وہیں چھوڑی اور پیدل ہی آگے چل پڑا مجھے کوئی ایک گھنٹہ چلنا پڑا۔ ایک گھنٹہ چلنے کے بعد میں سڑک پر ٹھیک اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے ایک پگڈنڈی جنگل کی طرف جارہی تھی۔ شاید یہی وہ پگڈنڈی تھی جس کے متعلق میڈی نے مجھے بتایا تھا۔ میرے قدم اس پگڈنڈی پر آگے بڑھنے لگے۔

بادل چھٹ چکے تھے اور سورج نکل آیا تھا۔ تھوڑی ہی دور مجھے درختوں میں گھرے ہوئے ایک فارم ہاؤس کی جھلک دکھائی دی۔ میرے قدم تیزی سے اس فارم ہاؤس کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ فارم ہاؤس حیرت انگیز طور پر بالکل ویسا تھا جیسا میڈی نے مجھے بتایا تھا۔ چھت پر سرخ رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا۔ دیواروں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں، فارم ہاؤس کے سامنے اور دائیں طرف تھوڑے سے رقبے پر سبزیاں اگی ہوئی تھیں۔ چھوٹے سے رہائشی حصے کے سامنے چند فٹ کے فاصلے پر ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں میز پر دودھ کا جگ اور دو گلاس پڑے ہوئے تھا۔ ایک کرسی پر اخبار رکھی تھی۔ ڈوری پر لٹکے ہوئے رنگ برنگے کپڑے ہوا سے جھول رہے تھے۔

میں وہ سب دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا میری آنکھوں کا دھوکا تھا یا پھر میرے دماغ کی خرابی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ میں دھوکے یا خرابی میں سے کوئی ایک چیز چن پاتا۔ وہ ساری خرابی میری نظروں کے سامنے سے آہستہ آہستہ غائب ہونا شروع ہوگئی۔ کچھ ہی دیر میں وہاں فارم ہاؤس نام کی کوئی شے باقی نہ رہی تھی یا شاید کبھی وہاں تھی ہی نہیں۔ ڈوری، پر لٹکے ہوا سے جھولتے رنگ برنگے کپڑے، کرسیاں میز پر رکھا دودھ کا جگ، اخبار، سبزیاں، سب آہستہ آہستہ نظروں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔ بس ایک اونچا شاہ بلوط کا درخت تھا جو سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ اور پھر جونہی میری نظریں درخت کی اونچائی سے ہوتی ہوئی گیلی گھاس پر پڑیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔

میرے رونگٹے خوف سے کھڑے ہوگئے۔ شاہ بلوط کے درخت کے تنے کے ساتھ گیلی گھاس پر میڈی لیٹی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر ایک بے خودی سی مسکراہٹ طاری تھی۔ حیرت اور خوف کے عالم میں، میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر جیسے مجھے اچانک ہوش آ گیا ہو۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے دل پر ہاتھ رکھا اور دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ کوئی دھڑکن سنائی نہ دی۔

میڈی کے دل کی دھڑکن خاموش ہو چکی تھی۔ زندہ تھی تو بس اس کی بے خودی مسکراہٹ جو، اب بھی اس کے چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔ میڈی جا چکی تھی۔ اپنے محبوب اسٹیون کے پاس۔ لیکن ..... کیا ..... اسٹیون خود اسے لینے وہاں آیا تھا۔ اس کا جواب میں تو کیا..... شاید دنیا کا کوئی انسان نہ دے سکے۔

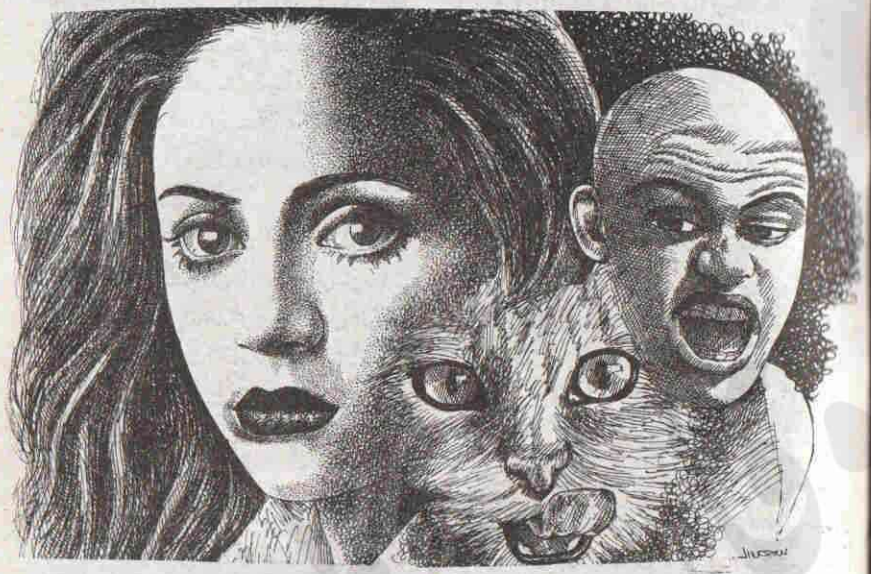

موت کا انتظار

ساجدہ راجا۔ ہندواں سرگودھا

پانی کا وجود پر پڑنا تھا کہ ان کی چیخیں آسمان کو لرزانے لگیں، آگ کے شعلے بلند سے بلند تر ہونے لگے پھر آہستہ آہستہ ان کی چیخیں معدوم ہوتی گئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں وجود جل کر خاکستر ہوگئے۔

جادوئی دنیا کی ایک لرزہ براندام کرتی اچھوتی انوکھی اور ناقابل فراموش خوفناک کہانی

ابھی مجھے اس راستے پر چلتے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی کسی نے مجھ پر نہایت جارحانہ انداز میں حملہ کیا تھا اور مجھے لگنے والا دھکا اتنا شدید تھا کہ میں اچھل کر کئی فٹ دور جا گرا جس کے نتیجے میں مجھے ماتھے پر چوٹ آ گئی۔ جونہی ذرا ہوش بحال ہوا میں نے اس سمت دیکھا جہاں سے مجھ پر حملہ ہوا تھا تو خوف کی ایک تیز لہر میرے اندر سرایت کر گئی۔ اس طرح ایک بہت بڑا اژدھا تھا۔ جو اپنا منہ کھولے آہستہ آہستہ میری طرف آرہا تھا۔

میں شدید خوف اور حیرت کی لپیٹ میں تھا۔ میرے خیال میں یہ تھا کہ شاید کوئی لٹیرا وغیرہ ہو جس کا ارادہ مجھے لوٹنے کا ہو لیکن اتنے بڑے اژدھے کو دیکھ کر میری سٹی گم ہوگئی..... میں نے اژدھے کے متعلق سنا تو بہت تھا لیکن اتنے قریب سے دیکھنے کا اتفاق آج ہوا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اتنا بڑا اژدھا..... میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

میری موت میرے بہت قریب آ گئی تھی۔ اژدھا آہستہ آہستہ میرے قریب آ رہا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کا شکار اس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکے گا اور یہ حقیقت بھی تھی کیونکہ دیو قامت اژدھے سے بچ نکلنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

مجھے میری بدبختی اس راستے پر لے آئی تھی۔ حالانکہ جب بھی مجھے گاؤں جانا ہوتا تھا میں مین روڈ سے گاڑی کے ذریعے جاتا تھا لیکن آج مجھے کوئی گاڑی نہ ملی تو میں نے شارٹ کٹ اختیار کرنے کا سوچا۔ گاؤں شہر سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر تھا اور اس لیے میں نے پیدل ہی جانے کا ارادہ کر لیا۔ اگر گاڑی کے انتظار میں کھڑا رہتا تو رات یہیں ہو جاتی۔

دراصل مجھے اپنے دوست احمر کے گاؤں جانا تھا۔ اس کا گاؤں سرسبز پہاڑی علاقے میں واقع تھا۔ قدرتی مناظر میری فطری کمزوری ہیں اور جیسے ہی مجھے موقع ملتا میں ایسے علاقوں کو دیکھنے نکل پڑتا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا جونہی مجھے چند روز کی چھٹیاں ملیں تو میں احمر کے گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔ احمر میرا کالج کا ساتھی تھی اور اب ہم ایک ہی آفس میں کام کرتے تھے، کسی گھریلو کام کے سلسلے میں وہ پہلے ہی چھٹیوں پہ جا چکا تھا اور میں اس کے بغیر بہت بوریت محسوس کر رہا تھا۔

میں اطلاع دیئے بغیر ہی روانہ ہوا تھا کیونکہ میرا ارادہ احمر کو سرپرائز دینے کا تھا اور اب یہ سرپرائز مجھے مہنگا پڑ گیا تھا۔ کاش میں احمر کو اطلاع کر دیتا تو وہ مجھے ضرور لینے آ جاتا یا کم از کم اس خطرے سے ہی آگاہ کر دیتا۔ میں نے خود کو کوستے ہوئے سوچا لیکن..... اب مجھے صرف اپنی جان بچانا تھی۔

میں کہنیوں کے بل آہستہ سے اٹھا۔ اژدھا میرے نزدیک آتا جا رہا تھا۔ موت اور زندگی کا درمیانی فاصلہ بہت کم تھا اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں؟ اگر ایک بار میں اس کے ہاتھ لگ جاتا تو پھر میرا بچ نکلنا کسی صورت ممکن نہیں تھا، میں نے آس پاس اک نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا وہ پہاڑی علاقہ تھا۔ ایک طرف تو پہاڑ اور دوسری طرف گہری کھائی، اگر ذرا سی بھی بھول چوک ہو جاتی یا پیر پھسلتا تو وہ بات تھی..... پہاڑ سے گرا کھجور میں اٹکا..... میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا اژدھا شاید میرا ارادہ بھانپ گیا تھا اس نے جونہی اپنا غار جتنا منہ کھولا میرے چودہ طبقات روشن ہو گئے اور اس نے اتنی زور سے پھنکارا کہ میری سٹی گم ہو گئی۔ بہر حال میں ٹھہرا نہیں بلکہ پیچھے ہٹتا رہا کیونکہ فی الحال میرا ارادہ اس غار میں قیام کا نہیں تھا، جونہی اژدھا نے تیزی سے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی میں نے اللہ کا نام لے کر دوڑ لگا دی وہ بھی فوراً میرے پیچھے بھاگا۔ میں بہت تیز دوڑا اتنا تو شاید اتھلیٹ بھی نہیں دوڑتے ہونگے۔ یہ حقیقت تھی اور ہے کہ موت جب بھی انسان کے سر پہ آتی ہے تو بزدل سے بزدل انسان بھی بہادر بن جاتا ہے اور موت سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں بزدل تو نہیں تھا لیکن اس وقت میری جو کیفیت تھی اسے میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

پتھریلا علاقہ ہونے کی وجہ سے مجھے بھاگنے میں بے حد دشواری ہو رہی تھی۔ جبکہ اژدھے کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا اور میرا دل سینے سے باہر آنے کو بے تاب تھا۔ میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ بھی رہا تھا اور اللہ کو بھی یاد کر رہا تھا۔ اچانک اژدھا اپنی جگہ سے اچھلا اور مجھے دبوچنے کے لئے میری طرف بڑھا میں نے گھبرا کر جونہی آگے بڑھنا چاہا میرا پاؤں ایک پتھر پر سے پھسلا اور میں اونچائی سے نیچے لڑھکتا چلا گیا۔ میری آنکھوں نے اس وقت جو منظر دیکھا اسے دیکھ کر میں شدید حیرت زدہ رہ گیا میں نے دیکھا جونہی میں نیچے گرا وہ اژدھا اک انسان میں تبدیل ہو چکا تھا اور اس نے بھی میری طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔

نہ جانے کتنا وقت بیت چکا تھا، میری آنکھ اک

عجیب سی آواز سن کر کھلی۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے سارے واقعات یاد آ گئے۔ میں نے گھبرا کر ارد گرد دیکھا اور حیران رہ گیا، میں اس وقت اک بہت بڑے غار میں تھا اور مجھ سے کچھ دور آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن تھا اور بہت سے لوگ اس کے گرد سجدے میں گرے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ آتش پرست ہیں وہ سب اپنی عبادت میں مگن تھے اور میری طرف کسی کی توجہ نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اس وقت کہاں پہ ہوں، میں نے سوچا کہ غار سے باہر نکل کر دیکھتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں میں غار کے دہانے پر تھا لیکن یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ میں جہاں کھڑا تھا اس سے نیچے ہزاروں فٹ کی گہرائی تھی اور وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا میں سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ نہ جانے وہ کون ہے جو مجھے یہاں لایا ہے؟ اور کیسے جبکہ یہاں آنے جانے کا کوئی راستہ بھی نہیں؟ اور نہ جانے یہ لوگ جو آتش پرست ہیں وہ کیسے آئے ہوں گے؟

میں یہ سوچتے ہوئے جیسے ہی پلٹا اپنی جگہ ٹھٹک گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہت خاموشی سے میرے پیچھے آ کر کھڑا ہوا تھا کیونکہ مجھے کسی قسم کی کوئی آہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لمبا قد، پھیلی ہوئی ویران آنکھیں، گال اندر کو دھنسے ہوئے اور چہرے پر چھائی خباثت مجھے کچھ غلط ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔

"تم یقیناً حیران ہو رہے ہو گے کہ تم یہاں کیسے آئے اور کون تمہیں یہاں لایا؟ اس کی کھرکھراتی آواز نے مجھے جھرجھری لینے پر مجبور کر دیا۔ "تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" میں نے کچھ دیر بعد ہمت کر کے پوچھا۔

"میں وہی ہوں جو اژدھے کے روپ میں تمہیں یہاں لایا۔ میرے بارے جلد ہی تمہیں بہت کچھ پتہ چل جائے گا فی الحال تمہیں اتنا بتائے دیتا ہوں کہ میرا نام زنگال ہے اور میں جنات کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں اور تمہیں یہاں لانے کا مقصد تمہیں پتہ چل جائے گا۔ ابھی میرے پیچھے آؤ۔" اتنا کہہ کر وہ ایک طرف چل پڑا، چار و ناچار میں نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ وہ مجھے لیے اک ایسی جگہ آ گیا جہاں گھپ اندھیرا تھا ہمارے وہاں قدم رکھتے ہی ایکدم سے روشنی ہو گئی اور میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ آج بھی مجھے نہیں بھولتا۔

میں نے دیکھا کہ بہت سے انسان زنجیروں میں قید تھے اور کچھ لوگ جن کے ہاتھوں میں لوہے کے گرز نما کوئی چیز تھی ان سے بڑی بے دردی سے ان لوگوں کو پیٹ رہے تھے۔ جیسے ہی گرز ان کے جسم سے ٹکراتا ان کے منہ سے نکلنے والی چیخیں نہایت ہولناک ہوتیں، میں وہاں ایک پل بھی مزید نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ کر باہر آ گیا میرے کان ابھی تک سائیں سائیں کر رہے تھے اور میرا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے حواسوں پر قابو پایا، اتنے میں وہ خبیث بھی میرے پیچھے آ گیا اور آتے ہی مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے بولا۔

"یہ منظر کیسا لگا تمہیں؟ یقیناً پسند نہیں آیا ہو گا، اب میری بات غور سے سنو..... تمہیں یہاں ایک اہم مقصد کے تحت لایا گیا ہے اور جو کام میں تمہیں کہوں گا وہ ہر حال میں تمہیں کرنا ہو گا ورنہ اپنا انجام ان لوگوں سے بھی برا دیکھو گے۔" اس کے لہجے کی حیوانیت نے میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑا دی۔

"اب جو کام میں تمہیں بتانے لگا ہوں اسے توجہ سے ذہن نشین کر لو۔

"میں ایک جنات قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں اپنے قبیلے میں میں نہایت ضدی اور سرکش مشہور ہوں، مجھے کسی پر رحم نہیں آتا، ہر وہ کام کرتا جو کسی کو اذیت دینے کا باعث بنتا ہو، ایک دن اک عامل نے مجھے قید کر لیا اور مجھ سے اپنا ہر گندا کام کروانے لگا جب میں نے اسے ہر طرح سے خوش کیا تو اس نے کہا کہ میں تمہیں اک شرط پر آزاد کروں گا۔ کہ اگر تم مجھے دس معصوم بچوں کا مردہ جسم لا دو اور ان بچوں کو تم اپنے ہاتھوں سے قتل کرو گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں فوراً رضا مند ہوگیا کیونکہ کسی کی جان لینا میرے لئے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ میں فوراً انسانی دنیا میں آ گیا اور ایک بچے کو منتخب کر کے جونہی اسے مارنے کے لئے ہاتھ لگایا مجھے ایک کرنٹ لگا اور میں کسی نامعلوم سی آگ میں خود کو جلتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ جب اذیت حد سے بڑھتی تو میں واپس اس عامل کے پاس آیا اور اسے ساری صورتحال بتائی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ''اس بچے کی گردن میں جو تعویز تھا اس پر نوری کلام لکھا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے چھوتے ہی میرے جسم میں آگ سی محسوس ہونے لگی۔''

''اب میں کیا کروں کیسے دس بچوں کو قتل کر کے تمہارے پاس لے آؤں؟'' میں نے بے بسی سے اس عامل کو مخاطب کیا۔

''اک طریقہ ہے اگر تم کسی انسان کو اس کام کے لئے راضی کرلو اور اسے مال و دولت کا لالچ دو تو پھر یہ کام آسانی سے ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر پھر بھی کوئی راضی نہ ہوا تو۔؟ میں نے کسی خدشے کے پیش نظر کہا تو عامل کچھ دیر چپ ہوگیا اور پھر بولا۔ ''تم ایک ایک کر کے دس آدمیوں کو راضی کرو اگر ان دس میں سے ایک بھی راضی نہ ہوا تو جو گیارھواں ہوگا اسے ہم مجبور کردیں گے اور اس پر ایسا عمل پڑھیں گے کہ وہ خود بخود ہمارا غلام بن جائے گا اور جو ہم کہیں گے وہ وہی کرے گا۔''

اس کے بعد میں نے کوشش شروع کردی لیکن ایک انسان بھی راضی نہ ہوا دس آدمیوں نے انکار کیا تھا اب تم گیارھویں آدمی ہو۔ تم پر اک ایسا عمل پڑھ کر پھونکا جائے گا کہ تم خود بخود یہ کام سرانجام دو گے۔

''زنگال کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ دیکھ کر میرا دل چاہا کہ میں ابھی اسے ختم کردوں اور اس زمین کو اس کے غلیظ وجود سے پاک کردوں کیونکہ وہ سب کو اژدھے کے روپ میں شکار کر کے یہاں لایا تھا۔

''میرے خیال میں تمہیں سب سمجھ آ گئی ہوگی اب میرے ساتھ آؤ۔'' میں اسے انکار کرنا چاہتا تھا لیکن پتہ نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا، میں سحر زدہ سا اس کے پیچھے چلنے لگا۔ میرا دماغ میرے کنٹرول میں تھا لیکن میرا وجود اک ان دیکھی طاقت کے زیر اثر تھا۔ میں اپنی مرضی سے سوچ تو سکتا تھا لیکن عمل نہیں کرسکتا تھا۔ چلتے چلتے ہم اک ایسی جگہ پر آ گئے جہاں سے آسمان صاف نظر آ رہا تھا اور وہ جگہ اک گول دائرے کی صورت میں تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے ان پہاڑوں کو تراش کر ان کو گول دائرے کی صورت میں بنایا گیا تھا اور ان کے درمیان اک عجیب الخلقت آدمی بیٹھا ہوا تھا اس کے آگے اک بڑا سا برتن پڑا تھا جس میں بہت سا خون اور گوشت رکھا ہوا تھا اور اس سے بہت ناگوار سی بدبو اٹھ رہی تھی جو اس جگہ کے ماحول کو بہت بوجھل سا بنا رہی تھی۔ اچانک اس آدمی نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھیں تلوار کی مانند ہیں جو مجھے اندر تک سے کاٹ رہی ہیں۔ اس نے زنگال کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''لے آئے تم گیارھویں آدمی کو؟''

''جی، میرے آقا میں اسے لے آیا ہوں، اب آپ اپنا عمل شروع کیجئے۔'' زنگال نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں اس بوڑھے آدمی کو مخاطب کیا۔

''ہوں۔'' اس بوڑھے عامل نے لمبا ہنکارا بھرا۔ ''تم ایسا کرو اب جاؤ اور اس نوجوان کو یہیں چھوڑ جاؤ۔''

''جو حکم.....'' یہ کہہ کر زنگال فوراً غائب ہوگیا۔ اور میں جو اک سحر میں خود کو محسوس کر رہا تھا اب آزادی محسوس کرنے لگا تھا وہ بوڑھا اب میری طرف متوجہ تھا اور میں آنے والے وقت سے لرزیدہ تھا۔

اچانک وہ بوڑھا اٹھا اور ایک جھٹکے سے میری طرف بڑھا میں ابھی کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ اس نے مجھے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا اس کے جھنجھوڑنے سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری روح میرے جسم سے نکل رہی ہو۔

جوں جوں اس کے جھنجھوڑنے کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا میری اذیت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ میں چیخنا چاہتا تھا لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی

میری روح کو کھینچ کر میرے جسم سے نکال رہا ہو۔ میری آواز تو غائب ہو چکی تھی لیکن میرا سارا بدن پسینے سے بھیگ چکا تھا اور قطرہ قطرہ نیچے ٹپک رہا تھا۔

نہ جانے وہ کیا پڑھ رہا تھا لیکن مجھے اپنا وجود بہت بھاری محسوس ہونے لگا تھا۔ آہستہ سے اس نے مجھے چھوڑ دیا اور میں دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

ہوش میں آنے کے بعد پہلا احساس مجھے یہی تھا جیسے میں کسی وزن کے نیچے دب گیا ہوں جب میرا سانس گھٹنے لگا تو میں نے زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میرے اوپر کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن پھر میرا سانس کیوں بند ہونے لگا تھا اور وہ کیسا بوجھ تھا جو میں نے محسوس کیا تھا۔ میں نے بہت سوچا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ پایا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ جب اس بوڑھے نے مجھے جھنجھوڑا تھا تو اس وقت مجھے اپنا جسم بہت بھاری لگنے لگا تھا اور میں گر کر بے ہوش ہوگیا تھا اور ہوش آنے پر پھر وہی بوجھ جسم پر محسوس ہونے لگا تھا لیکن حیرت انگیز بات تو یہ کہ جیسے ہی میں اٹھ کر بیٹھا تو میں بالکل نارمل تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ کیا اسرار تھا؟ میں سمجھ نہیں پایا۔

اچانک مجھے اک آہٹ سنائی دی، میں مڑ کر دیکھا تو زنگال چہرے پر سفاکی لیے مجھے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے سامنے آتے ہی میں خود کو اک قیدی سا محسوس کرتا تھا میرا جسم مفلوج ہو جاتا تھا اور میں وہی کرتا تھا جو وہ کہتا تھا۔ جیسے ہی اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا میں کسی روبوٹ کی مانند اٹھتا چلا گیا کچھ دور جا کر مجھے اک تالاب نظر آیا جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ زنگال نے مجھے اس میں اترنے کو کہا۔ میں فوراً سے پیشتر اس میں اتر گیا۔ لیکن جونہی میں تالاب میں اترا وہ پانی خون میں تبدیل ہوگیا اور اس سے انتہائی ناگوار بو اٹھنے لگی اور بہت سی انسانی کھوپڑیاں اس میں تیر رہی تھی۔ میں بہت بدحواس ہوگیا میں اس سے نکلنا چاہتا تھا لیکن میرا جسم میرے اختیار میں نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد جب میں مکمل طور پر خون میں لت پت ہوگیا تو زنگال کے اشارے سے باہر نکل آیا۔

''اب میں تمہیں انسانی دنیا میں بھیج رہا ہوں تم نے وہاں سے ہر روز اک بچے کو قتل کر کے لانا ہے اگر تم نے ہمارے حکم پر عمل نہ کیا تو تمہارا انجام بہت بھیانک ہوگا۔'' زنگال کی آواز مجھے کسی کنویں سے آئی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جونہی میں نے اثبات میں سر ہلایا اس نے مجھے آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ اس کی آواز پر میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میں اس وقت اپنی دنیا میں موجود تھا اور میرے آس پاس بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔

''اب تم ایسا کرو قریبی پارک کا رخ کرو اور وہاں سے کسی بچے کو اٹھا کر لاؤ۔'' زنگال کی آواز مجھے اپنے قریب سے سنائی دی۔ میرے لیے انکار کی گنجائش کہاں تھی میں تو مکمل ان کے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے قریبی پارک کا رخ کیا، وہاں بہت سے بچے کھیل رہے تھے، اتنے میں ایک بچہ کھیلتا ہوا میرے قریب آ نکلا، اتنے میں زنگال کی آواز ابھری۔ ''فوراً اس بچے کو اٹھاؤ اور پارک سے باہر کسی ویران جگہ پر لے آؤ۔''

میں نے اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے جونہی بچے کو اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ایک دھماکہ ہوا اور ایک سفید ریش بزرگ میرے سامنے تھے۔

ان کی آنکھوں سے جلال ٹپک رہا تھا انہوں نے میرے ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی بچے کو اٹھایا اور مجھ سے دور لیجا کر چھوڑ دیا۔ پھر گرجدار آواز میں بولے۔ ''تو باز نہیں آیا ملعون؟ کتنی دفعہ تجھے سمجھایا کہ اپنی ان غلط حرکتوں سے باز آ جا لیکن تو نے ہماری بات نہیں مانی، اب ان معصوم بچوں کے خون سے اک بے گناہ انسان کے ہاتھ رنگنا چاہتا ہے۔ تو سن لے اب تیرا کھیل جلد ہی انجام کو پہنچنے والا ہے۔ پہلے ہی تجھے بہت ڈھیل مل چکی ہے لیکن وہ ہماری غلطی تھی۔ اب مزید اس دھرتی کو تیرے بوجھ کی ضرورت نہیں رہی۔ اب تو انتظار کر اپنی موت کا.....!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن جواب میں زنگال کی آواز سنائی نہ دی ''بھاگ گیا بزدل..... کہاں تک بھاگے گا؟ تیری موت تجھے مجھ تک لائے گی۔'' اتنا کہہ کر وہ بزرگ میری طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔ ''نوجوان تو بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا لیکن شکر ہے کہ مجھے بروقت پتہ چل گیا ورنہ ساری زندگی وہ تم سے گھناؤنے کام کرواتے۔ لیکن اب وہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔'' بزرگ نے یہ کہہ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے آنکھیں بند کرنے کو کہا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ہوا میں پرواز کر رہا ہوں تھوڑی دیر بعد مجھے اپنے قدموں تلے ٹھوس زمین کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی بزرگ کی آواز سنائی دی جو مجھے آنکھیں کھولنے کا کہہ رہے تھے میں نے آنکھیں کھولیں اور حیران رہ گیا۔ میں اس وقت ایک نہایت حسین وادی میں موجود تھا۔ سرسبز و شاداب علاقہ، اونچے اونچے پہاڑوں سے بہتے ہوئے چشمے اور خوبصورت پھلوں سے لدے ہوئے درختوں پر پرندے شور مچا رہے تھے۔ ہر طرف پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی میں ان نظاروں میں اتنا محو ہوگیا کہ مجھے بزرگ کی موجودگی بھی خراموش ہوگئی انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں جیسے خواب سے جاگ گیا۔

''بیٹا یہ سب کچھ بعد میں بھی دیکھتے رہنا فی الحال ہمیں اس کم بخت عامل اور خبیث زنگال کا کچھ کرنا ہے اور اس میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ فی الحال تم آرام کرو، میں تمہیں بعد میں تفصیل سے آگاہ کروں گا۔''

میں بزرگ سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا اور مجھے لے کر ایک گھاس پھوس کی بنی ہوئی جھونپڑی میں داخل ہوگیا۔ اندر ضرورت کی ہر چیز موجود تھی ایک طرف کھانا رکھا ہوا تھا۔ کھانے کو دیکھ کر میری بھوک میں اضافہ ہوگیا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ میں نے آخری بار کب کھانا کھایا تھا اور حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ مجھے بھوک کا اس سے پہلے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ بزرگ نے مجھے آرام کرنے کا کہا اور خود باہر چلے گئے ان کے جاتے ہی میں کھانے پر ٹوٹ پڑا..... اتنا لذیز کھانا میں نے زندگی میں نہیں کھایا تھا۔ کھانا کھاتے ہی مجھے نیند نے گھیر لیا۔ میں سونے کا ارادہ کرکے جونہی لیٹا تو میرے جسم پر ناقابل برداشت بوجھ کا اضافہ ہوگیا اور میری سانس بھی رکنے لگی، میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا نیند کا تو اب سوال ہی نہیں تھا۔ میں پریشان ہوگیا مجھے گلے لگا کر انہوں نے جو عمل کیا تھا اس کا اثر ابھی تک باقی تھا ویسے میں بالکل ٹھیک تھا لیکن جونہی لیٹتا میرے اوپر ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہونے اور سانس لینے میں سخت دشواری کا سامنا ہوتا۔ میں نے سوچ لیا کہ اس سلسلے میں اس بزرگ سے ضرور بات کروں گا۔ اب اندر بیٹھنا فضول تھا اس لیے میں باہر آ گیا اور اس حسین وادی کی سیر کرنے لگا، اتنا تو بہرحال میں جان چکا تھا کہ یہ انسانی دنیا ہرگز نہیں ہوسکتی لیکن مجھے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ بزرگ کا رویہ مجھے باور کرا رہا تھا کہ یہاں مجھے کوئی خطرہ نہیں۔

سیر کرتے کرتے میں کافی دور نکل آیا تھا اور تھکن بھی محسوس کرنے لگا تھا، میں نے قریبی چشمے میں نہانے کا ارادہ کیا اور اس میں کود گیا۔ اتنا ٹھنڈا اور صاف ستھرا پانی، مجھے بہت سکون محسوس ہوا تھوڑی دیر بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ میں نے اپنا وہم سمجھا اور تالاب سے باہر نکل آیا لیکن یہ احساس بدستور موجود رہا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ ابھی میں تھوڑی دور آیا ہی تھا کہ میں نے ایک درخت سے لڑکی کو کودتے اور ایک طرف بھاگتے دیکھا وہ بھاگتے بھاگتے پیچھے مڑ کر بھی دیکھ رہا تھا، ایسے جیسے میں اس کے پیچھے تو نہیں بھاگ رہا؟ اب مجھے پتہ چلا کہ وہ احساس غلط نہیں تھا بلکہ یہی لڑکی مجھے دیکھ رہی تھی۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور میں سر

جھٹک کر آگے چلنے لگا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ وہ بزرگ اچانک میرے سامنے آ گئے اور بولے۔ ''کیا بات ہے بیٹا؟ تم سوئے نہیں؟''

جواب میں میں نے ساری بات بزرگ کو بتا دی کہ ''میرے ساتھ کیا ہوتا ہے جب میں سونے کے لئے لیٹتا ہوں۔''

یہ سن کر وہ بزرگ کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے ''اس کم بخت عامل نے تم پر عمل کرکے ایک بد روح کو تمہارے جسم میں داخل کردیا تھا تاکہ تم اس کا ہر حکم مان سکو۔ اب چونکہ تم میرے پاس ہو تو وہ بدروح ہر وقت تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی اور جس وقت تم سونے کے لئے لیٹتے ہو تو وہ تمہارے جسم میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہے جس کی وجہ سے تمہیں وہ بوجھ محسوس ہوتا ہے لیکن تم فکر نہ کرو میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر بزرگ نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کردیا اور پھر مجھ پر پھونک ماری، جیسے ہی انہوں نے پھونک ماری مجھے اپنے سر سے اک بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔

پھر وہ بولے۔ ''وہ کم بخت زنگال اور عامل ضرور کسی سازش میں مصروف ہوں گے، وہ تمہیں پھر سے اپنا قیدی بنانے کے سوجتن کریں گے لیکن تم پریشان مت ہونا یہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہو۔ ابھی تم آرام کرو میں بعد میں آ کر تمہیں وہ طریقہ سمجھاؤں گا جس سے اس ناپاک عامل اور زنگال کا وجود ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہوجائے گا۔'' یہ کہہ کر بزرگ ایک طرف چلے گئے اور میں جھونپڑی کی طرف بڑھ گیا۔

دو دن ہوگئے تھے لیکن بزرگ کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن اس دوران جب بھی میں باہر نکلتا وہ دو آنکھیں مجھے تکتی رہتیں۔ میں بہت متجسس تھا ان کے بارے میں جاننے کے لئے آخر ایک دن موقع مل ہی گیا۔ ہوا یوں کہ میں تالاب کی طرف نہانے کی غرض سے جا رہا تھا کہ مجھے پاس والے درخت کے پیچھے آہٹ سی محسوس ہوئی میں دانستہ اس طرف دیکھنے سے گریز کرنے لگا کیونکہ میں ذہن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں سر جھکائے چلا جا رہا تھا لیکن درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک اپنا رخ درخت کی طرف پھیر لیا مجھے اچانک اپنے سامنے پا کر بھاگنا ہی چاہتی تھی کہ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف پھیر لیا اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں ساکت رہ گیا۔

اتنا حسین چہرہ، میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں ہلکے سے خوف کی جھلک اسے مزید پرکشش بنا رہی تھی وہ سہمی ہرنی کی مانند میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی پھر اسے مزید گھبراہٹ میں مبتلا کرنے کے لئے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ''تم ہر روز میری نگرانی کیوں کرتی ہو۔؟''

جواباً وہ خاموش رہی اور اپنا ہاتھ چھڑوانے کے چکر میں رہی لیکن میں نے اپنی گرفت مزید سخت کرتے ہوئے پوچھا ''میری بات کا جواب دو، ورنہ میں نہیں چھوڑوں گا؟ بتاؤ مجھے کہ تم ہر وقت میرے تعاقب میں کیوں رہتی ہو؟ میں جہاں بھی جاتا ہوں تمہاری آنکھوں کو اپنے تعاقب میں پاتا ہوں۔ بتاؤ مجھے کہ تم کون ہو اور ایسا کس لئے کرتی ہو؟''

جواباً اس نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ ''کسی کو چوری چھپے دیکھنا گناہ تو نہیں..... پھر آپ کیوں مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟'' وہ اپنی دلکش آواز میں بولی۔

''گناہ تو نہیں ہے محترمہ لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی؟''

''ہاں وجہ ہے؟ کیونکہ آپ پہلے انسان ہیں جو مجھے اچھے لگے ہیں ورنہ آج تک کوئی انسان، نہ ہماری دنیا میں آیا اور نہ میں نے دیکھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ انسان کیسے ہوتے ہیں لیکن جب سے آپ کو دیکھا، ہر وقت دیکھنے کو دل کرتا ہے، میں نہیں جانتی کہ ایسا کیوں ہے؟ لیکن جو بھی ہے مجھے اس سے سکون ملتا ہے۔'' وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی اور میں حیران سا اسے تکے جارہا تھا۔

"کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟" میں نے اس حسین جن زادی سے پوچھا۔

"میرا نام شامتا ہے اور میں انہی بزرگ کی بیٹی ہوں جو تمہیں یہاں لائے ہیں۔ اب میں چلتی ہوں بہت دیر ہوگئی ہے۔"

میں جو اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا دل میں ہی رہ گیا اور وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی اور میں اس کے خیالوں میں گم ہوگیا۔

مجھے ان بزرگ کا بہت انتظار تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ نہیں آرہے تھے، میرا ارادہ شامتا سے پوچھنے کا تھا لیکن وہ بھی اب غائب تھی۔

مجھے لگتا تھا کہ میں اس مرض کا شکار ہوگیا ہوں جس کو حرف عام میں لوگ عشق کہتے ہیں۔ شامتا مجھے نظر نہیں آرہی تھی اور میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس روز میں دل کی بے قراری سے گھبرا کر باہر نکل آیا۔ میرا رخ اسی چشمے کی طرف تھا جہاں شامتا سے میری ملاقات ہوئی تھی، میں دل ہی دل میں اس کے ملنے کی دعائیں مانگ رہا تھا اور پھر دعا مقبولیت کا درجہ پا گئی کیونکہ میں نے اس درخت کے پاس شامتا کو کھڑے دیکھا جہاں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں تقریباً بھاگنے کے انداز میں اس کی طرف بڑھا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ "کہاں غائب تھی تم؟ مجھے عشق کی راہ پر ڈال کر خود منہ موڑ کر چلی گئی۔ بتاؤ مجھے کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟" میں تقریباً دیوانہ ہو چکا تھا۔

جواب میں اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور بولی۔ "کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو؟ یا میں اکیلی اس آگ میں جل رہی ہوں؟ میں نے آنے کی بہت کوشش کی لیکن میری کچھ مجبوری تھی جس کی وجہ سے میں نہیں آسکی لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ تمہاری یہ حالت ہو جائے گی ورنہ میں ہر حال میں آتی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو موتی بن کر جھڑنے لگے تھے، جسے میں دیکھ کر مزید بے چین ہوگیا۔

"اچھا اب رونا بند کرو، ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا اور میں بھی رونے لگوں گا۔" میں نے رونی شکل بنا کر کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے اس سے بزرگ کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ "بابا اک خاص عمل میں مصروف ہیں، آج شام تک وہ فارغ ہو جائیں گے۔" اس کے بعد ہم نے بہت ساری باتیں کیں اور سارا دن اک دوسرے کے ساتھ گزارا۔

رات میں وہ بزرگ میرے پاس آئے اور بولے۔ "اب وہ وقت آگیا ہے کہ زنگال اور اس عامل کے ناپاک وجود سے اس دھرتی کو پاک کردیا جائے۔ میں خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑا، انہوں نے مجھے پانی کی ایک بوتل دی اور بولے۔ "میرے لیے انہیں ختم کرنا مشکل نہیں تھا لیکن میں نے جو عمل کیا اس میں مجھے پتہ چلا کہ ان دونوں کی موت ایک انسان کے ہاتھوں ہوگی اور اس عمل میں مجھے ان کو مارنے کا طریقہ بھی بتایا گیا، اس کے مطابق تمہیں وہاں پہنچ کر یہ پانی ان دونوں کی بے خبری میں ان پر چھڑک دینا ہے، ورنہ وہ تم پر پہلے وار کرسکتے ہیں اور پھر تمہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکے گی۔ میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

جب میں نے آس پاس نظر دوڑائی تو حیران رہ گیا، میں انہی پہاڑوں کے درمیان موجود تھا جہاں پہلی دفعہ زنگال مجھے لایا تھا اور وہ بزرگ اس جگہ موجود نہیں تھے شاید باتوں کے دوران انہوں نے مجھے یہاں پہنچا دیا تھا اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا تھا۔

میرے ہاتھ میں پانی کی بوتل موجود تھی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور احاطے میں داخل ہوگیا۔ وہاں پہلے دن کی طرح ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی اور چاند کی روشنی کی وجہ سے ہر چیز واضح نظر آرہی تھی۔ میں دبے قدموں، آگے بڑھا تو میرے کانوں میں ان کی آوازیں سنائی دیں۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میں ان کے بہت قریب پہنچ گیا۔ ان کی پشت میری جانب تھی۔ وہ دونوں اپنی

باتوں میں مگن تھے۔ میں نے آہستہ سے بوتل کا ڈھکن کھولا اور جیسے ہی ان پر پانی پھینکنے کے لئے بوتل کو بلند کیا تو زنگال کی نظر مجھ پر پڑ گئی، اس نے چیخ کر عامل کو متوجہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر کوئی وار کرتے، میں بوتل کا پانی ان پر پھینک چکا تھا۔

پانی کا ان پر پڑتے ہی ان کی چیخیں آسماں کو لرزا رہی تھیں، آگ کے شعلے بہت بلند ہو چکے تھے اور پھر آہستہ آہستہ ان کی چیخیں معدوم ہوتی گئیں اور آخر کار بالکل ختم ہوگئیں شعلوں کے ختم ہوتے ہی اتنے زور کی آندھی چلی کہ پتھر ایک جگہ سے دوسری جگہ پر گر رہے تھے لیکن خوش قسمتی سے مجھے کوئی بھی نہیں لگا۔ دس پندرہ منٹ بعد آندھی تھمی اور انکی راکھ بھی غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور باہر آگیا۔ باہر وہ شفیق بزرگ میرے منتظر تھے ان کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے جیسے ہی میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے مجھے گلے لگا لیا اور میرا شکریہ ادا کیا۔

دوسرے دن میں نے چلے جانا تھا جیسے ہی صبح ہوئی میں اس چشمے کی طرف روانہ ہوگیا مجھے یقین تھا کہ شامتا ضرور میری منتظر ہوگی لیکن وہاں پہنچ کر مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، شامتا وہاں موجود نہیں تھی میں نے متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھنا شروع کردیا لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

اچانک کندھے پر کسی کے ہاتھ کا بوجھ محسوس کر کے میں فوراً پلٹا، میرا خیال تھا کہ وہ شامتا ہوگی لیکن وہاں ان بزرگ کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ان کی آنکھوں میں دکھ کی واضح لہر میں نے دیکھی۔ کچھ دیر بعد وہ بولے۔ "بیٹا تم چلے جاؤ، جس کے تم منتظر ہو، وہ تمہیں نہیں ملے گی۔" بزرگ کا اشارہ شامتا کی طرف تھا۔

میں بے چین ہوگیا اور بولا۔ "کیوں؟ وہ کہاں گئی؟ وہ جانتی ہے کہ آج میں نے چلے جانا ہے تو کیوں نہیں آئی؟" میں نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"شامتا کی شادی ہوگئی ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ یہاں سے بہت دور چلی گئی ہے۔ اب تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گے، اس لیے تم خاموشی سے لوٹ جاؤ اور اسے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔" بزرگ کی بات کیا تھی ایک دھماکہ تھی جس نے میرے وجود سے پرخچے اڑا دیئے۔ میں گم صم سا ان کی طرف دیکھتا گیا انہوں نے مزید بتایا۔ "آج سے بہت سال پہلے کی بات ہے میری اک بہن تھی زومنا" وہ مجھے اپنی جان سے بھی پیاری تھی لیکن وہ ایک آدم زاد کو دل دے بیٹھی اور اپنے قبیلے کی روایات سے انحراف کرنا چاہا تو یہاں کے قانون کے مطابق اسے اذیت کی موت مارا گیا۔ میں بہت رویا بہت فریادیں کیں لیکن یہاں کے قانون کو توڑنا ناممکن تھا۔ اب میری بیٹی بھی وہی تاریخ دہرا رہی ہے مجھے شروع سے ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ تم سے پیار کرنے لگی ہے، اس لیے میں نے اس کے علم میں لائے بغیر اس کی شادی طے کردی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اب پھر زومنا کی تاریخ دہرائی جائے میں بہن کو تو کھو چکا ہوں لیکن بیٹی کو کھونا میرے بس میں نہیں ہے بہت روئی ہے شامتا میرے آگے، میرے پاؤں پکڑے ایک دفعہ تم سے ملنے دوں لیکن اگر میں ایسا کرتا تو وہ شادی کے لئے کبھی تیار نہ ہوتی بیٹا میں نے اس سے بھی معافی مانگی ہے اور اب تم سے بھی معافی مانگ رہا ہوں کہ میں نے جو کیا یہاں کے رسم و رواج سے مجبور ہو کے کیا۔ میری مجبوری سمجھ کر مجھے معاف کردینا۔" آنسو بزرگ کی آنکھوں میں جھلملانے لگے تھے۔

میں چپ چاپ کچھ کہے بنا لوٹ آیا مجھے نہیں پتہ کہ ان بزرگ نے مجھے کبھی میری دنیا میں پہنچایا۔ میری زبان کو چپ سی لگ گئی ہے اتنا تو میں جانتا تھا کہ الگ الگ مخلوق ہونے کی وجہ سے ہمارا ملاپ ناممکن ہے لیکن یوں اچانک بچھڑنے کا تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا وہ پگلی پتہ نہیں کیسے رہ رہی ہوگی، میں جانتا ہوں وہ مجھے کبھی بھول نہیں پائے گی کیونکہ جس آگ میں مجھے تمام عمر جلنا ہے، وہ بھی اس کی تپش سے کیسے بچ پائے گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

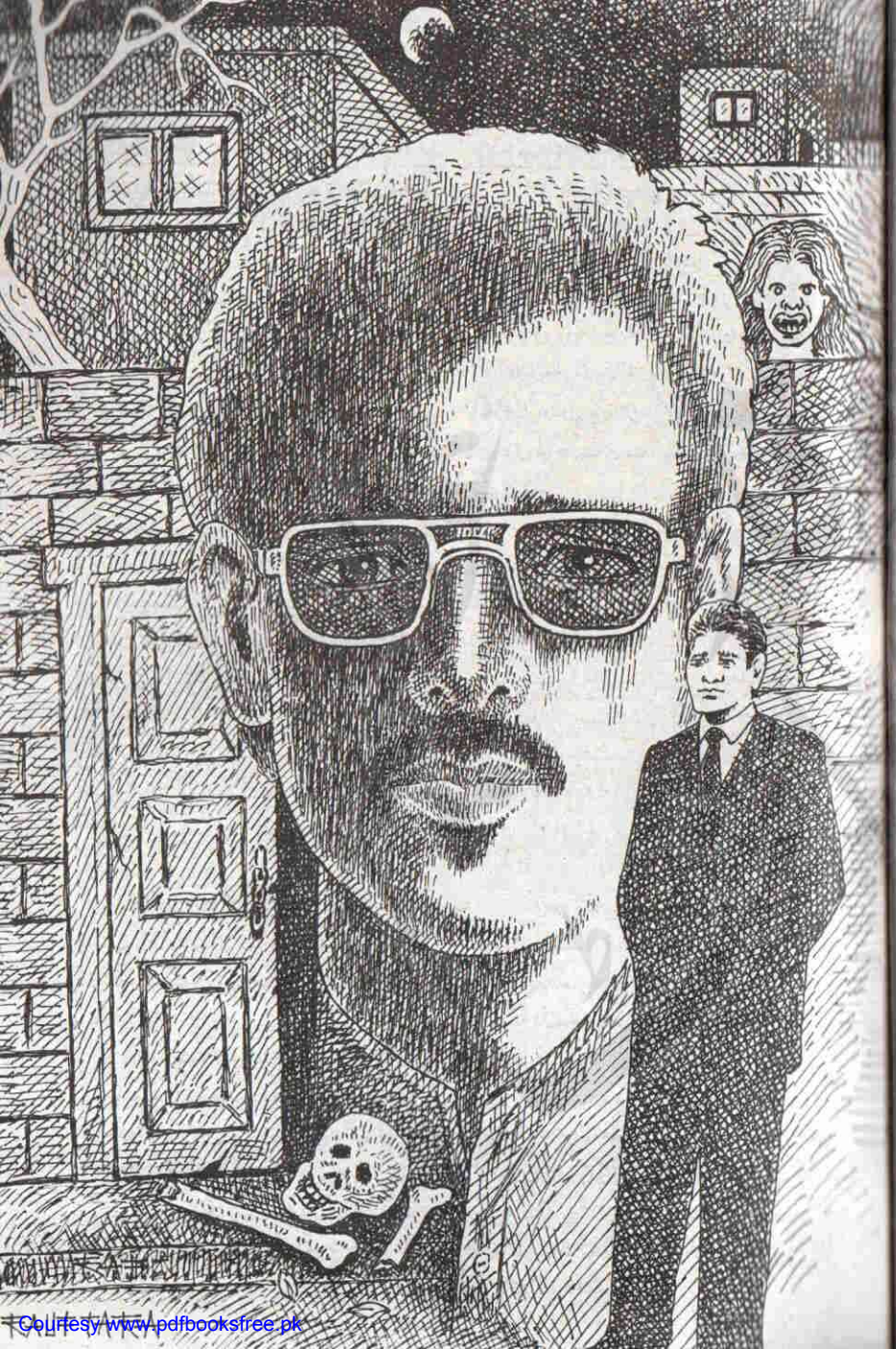

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر:82

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

چاول کی فصل کٹ چکی تھی جس کی رکھوائی کے لئے سلامت کھلیان میں بنی اپنی جھونپڑی میں سویا تھا کہ رات کے گھپ اندھیرے میں اپنے قریب ایک نوجوان لڑکی کو پایا اس لڑکی کا کہنا تھا کہ میں تمہاری چاہت میں بے قرار ہو کر چلی آئی۔ یہ سن کر سلامت گھبرا گیا اور بولا۔ تمہیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو میری عزت خاک میں مل جائے گی تم جلدی سے چلی جاؤ۔ یہ سن کر لڑکی بولی۔ تم عجیب ہو، مرد ہو کر گھبرا رہے ہو اور میں لڑکی ہو کر تمہارے پاس رات کے اندھیرے میں چلی آئی۔ مجھے تمہارے پاس آتے جاتے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا اور پھر وہ لڑکی ہر روز بلاناغہ سلامت کے پاس آنے لگی۔ دونوں جوان تھے جذبات کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتے اور پھر ایک وقت مقررہ پر وہ لڑکی رات کے اندھیرے میں غائب ہو جاتی۔ ایک دن کھیت میں پانی دینے کے تنازعہ پر ایک شخص جمالا، سلامت کا گریبان پکڑ کر بولا۔ کسی صورت میں تمہیں پانی نہیں لگانے دوں گا اور اس نے بہت اودھم مچایا۔ دوسرے دن کھلیان میں بہت اذیت ناک طریقے سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ جمالا کی موت کو دیکھ کر ہر شخص حیران و پریشان تھا جس طرح جمالا کی موت واقع ہوئی تھی اسے دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ کھلیان میں آنے والی لڑکی کا نام مدھو تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سلامت کی صحت بڑی تیزی سے گر رہی تھی۔ ایک دن کھلیان میں غلہ چور آ گئے تو ان سب کی موت بھی بہت ہی کربناک طریقے سے ہو گئی اور پھر سلامت کا کام کھلیان سے ختم ہو گیا اور وہ کھلیان کے بجائے اپنے گھر میں سونے کے لئے آ گیا۔ وہ مدھو کی جدائی میں بستر پر کروٹیں بدلنے لگا۔ کسی پل اسے چین نہیں آ رہا تھا کہ رات کے ساڑھے بارہ بجے کتوں کے بھونکنے کی زبردست آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کتوں نے ناقابل برداشت حد تک بھونکنا شروع کر دیا۔ کتوں کی آوازوں سے پورا گاؤں دہل اٹھا اور پھر ان بھونکتے کتوں کی آوازیں اذیت میں ڈوبتی چلی گئیں۔

(اب آگے پڑھیں)

کتوں کی آوازیں سن کر پورا گاؤں سہم گیا تھا۔ اس گاؤں میں کبھی بھی اس قدر تیز آواز میں کتوں نے بھونکا نہیں تھا۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے گھر سے باہر نکل کر دیکھ لیتا کہ آج کتے کیوں اس قدر آپے سے باہر ہو کر بھونک رہے ہیں؟

اتنے سارے کتوں کی آوازیں یکدم جیسے ان کے گلے میں گھٹ گئی ہوں۔ اب کسی بھی کتے کے بھونکنے کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ گاؤں والوں کے دماغ میں یہ بات بھی گردش کر رہی تھی کہ اچانک یہ سارے کتے کیوں خاموش ہو گئے تھے؟

صبح کی بو پھوٹتے ہی گاؤں کے لوگ اپنے کام کاج کے لئے گھروں سے نکل پڑے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ بارہ تیرہ کتے سلامت کے گھر کے پاس مردہ پڑے ہیں تو وہ لوگ اچنبھے میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر میں سلامت کے والد بھی اپنا دروازہ کھول کر باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کے دروازے کے آس پاس بارہ تیرہ کتے مردہ پڑے ہیں تو دہل کر رہ گئے۔

تھوڑی دیر میں دن کا اجالا چاروں طرف پھیل گیا تو لوگوں نے کتوں کو بالکل مردہ دیکھ کر سارے لوگ دہل گئے، دیکھنے والا ہر شخص سکتے کے عالم میں تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لاکھ ذہن پر زور دینے کے باوجود بھی ہر شخص اچنبھے میں تھا۔ اتنے سارے کتے آخر کیسے مر گئے، اور یہ خبر آناً فاناً پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ رات میں بھونکنے والے سارے کتے شرافت علی کے گھر کے آس پاس مردہ پڑے ہیں تو پورا گاؤں ان کتوں کو دیکھنے کے لئے اس جگہ جمع ہوگیا، ہر آدمی ایک دوسرے سے سوال کررہا تھا۔

"یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ کسی بری آتما نے ان کتوں کو مارا ہے۔" گاؤں کے ایک عمر رسیدہ شخص گردھاری لال نے کہا۔ گردھاری لال کی بات سن کر لوگوں کا ذہن بھوت پریت اور آتما کی طرف ہوگیا۔

"گردھاری جی! آپ کی بات میں صداقت تو ہے، لیکن آتما اور کتوں کا بھلا کیا مقابلہ، میں نے تو اپنی پوری زندگی میں کسی کے بھی منہ سے یہ نہیں سنا کہ کسی آتما نے گاؤں کے سارے کتوں کو مار دیا ہو۔" شرف الدین چاچا نے کہا۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ چوروں یا ڈاکوؤں نے ان کتوں کو مارا ہے تو یقیناً ان کتوں کو برچھی بھالے یا پھر تلوار سے مارا جاتا، اور اس صورت میں کتوں کا خون زمین پر پڑا ہوتا، ان کے جسم پر کٹنے کے نشانات ضرور ہوتے، مگر ان کتوں کے جسم سے ایک بھی قطرہ خون نکلتا نظر نہیں آرہا ہے۔" سلامت کے والد شرافت علی نے کہا۔

"اور یہ بات بھی اچنبھے میں ڈال رہی ہے کہ یہ سارے کتے شرافت علی کے ہی مکان کے سامنے کیوں بھونکنے لگے تھے اور اسی جگہ مردہ ہوگئے۔" ایک شخص نے کہا۔

"یہ بات تو میرے دماغ سے باہر ہورہی ہے کہ ایسا ہوا تو کیوں ہوا؟" گردھاری لال نے کہا۔ "یہ ضرور کسی ہوائی چیز کا کیا دھرا ہے، اور یہ بالکل کسی انسان کا کیا ہوا تو ہو ہی نہیں سکتا۔"

اس جگہ موجود ہر شخص اپنی اپنی بولیاں بول رہا تھا۔ یہ بات تھی بھی حقیقت کہ ایک انسان یا پھر کئی انسان مل کر بھی اس حالت میں ان کتوں کو نہیں مار سکتے تھے۔ انسان تو یقیناً ہتھیار سے ہی مار سکتا تھا۔

سارے کتوں کی گردنیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور ان کی زبانیں باہر کو لٹک گئی تھیں۔

سلامت جو چپ چاپ کھڑا تھا، اس کے لب ہلے اور وہ بولا۔ "گردھاری کاکا اگر آپ کی بات مان لی جائے، تو آپ کو یاد ہوگا کہ کھلیان میں جمالا کی موت اور پھر اس کے بعد کھلیان میں غلہ لٹیروں کا حشر نشر، اور آج ان کتوں کی موت، ہم نے کھلیان والے واقعات کا نتیجہ نکالا کہ کوئی نیک آتما ہے جو کہ کسی کی ذلت، رسوائی، یا پھر گاؤں والوں پر وہ ان دیکھی چیز مہربان ہے اور آج ان کتوں کی حالت جو ہے اس کے متعلق پر ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"سلامت بیٹا! بات تو تمہاری صحیح ہے، ہم پورے گاؤں والے اگر ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھ بھی جائیں تو ان تینوں واقعات کی اصل وجہ نہیں ڈھونڈ سکتے، اصل بات تو کوئی سیانا ہی بتا سکتا ہے اور ہمارے گاؤں میں کوئی اتنا بڑا بدھی مان ہے نہیں۔" گردھاری لال نے کہا۔ "بیٹا سلامت جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا لیکن تمہارے ہی دروازے کے سامنے یہ سارے کتے کیوں مرے؟ خیر اب ان کتوں کو تم نوجوان مل کر کسی بیل گاڑی پر لادو، اور گاؤں سے باہر ایک گڑھا کھود کر انہیں اس گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دو۔" گردھاری لال نے کہا۔

دو تین گھنٹے کے اندر اندر سارے کتوں کو گاؤں کے باہر گڑھے میں ڈال کر ان پر مٹی ڈال دی گئی اور گاؤں کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ اب پورے گاؤں میں چند کتے ہی رہ گئے تھے اور وہ کتے وہاں تھے جہاں دوری پر گھر موجود تھے۔

چند لوگوں نے مشورہ دیا کہ آج رات میں لوگ اپنے اپنے گھروں میں اذان دیں گے، تاکہ اگر کوئی ہوائی چیز گاؤں میں موجود ہے یا پھر اس کے اس گاؤں سے گزر ہوتا ہے تو اذان کی آواز سن کر وہ ہوائی چیز ادھر کا رخ نہیں کرے گی۔ مسلمانوں نے اذان کا طریقہ اپنایا

اور ہندو حضرات اپنے گھر میں بھجن گانے لگے۔ اور یہ طے ہوا تھا کہ تین دن تک متواتر بابلند آواز میں اذان دی جائے، کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا گیا تھا بلکہ بات یہ تھی کہ رات کے کسی پہر بھی جس کی آنکھ کھل جائے وہ اپنے گھر میں اذان دینا شروع کردے۔

رات ہوئی اور پھر وقفے وقفے سے پورے گاؤں میں اذان کی آواز گونجنے لگی۔ ایک دن، دو دن اور تین دن تک متواتر پورے گاؤں میں اذان کی آواز سنائی دیتی رہی۔

چوتھے روز لوگوں نے طے کیا کہ اب یہ ضروری نہیں، اگر کوئی ہوائی چیز ہوگی تو وہ اب گاؤں سے نکل گئی ہوگی اور اب اس طرف کا رخ نہیں کرے گی۔ چوتھی رات بھی بخیر وخوبی سے گزر گئی، کوئی بھی ایسا واقعہ سامنے نہیں آیا جس سے کوئی ڈر خوف محسوس ہوتا۔

ہر شخص اپنے گھر میں بے خوف وخطر میٹھی نیند کے مزے لینے لگا تھا۔

ادھر سلامت کی بے قراری عروج پر تھی۔ رات ہوتے ہی سلامت اپنے کمرے میں ماہیٔ بے آب ہوجاتا اسے مدھو کی جدائی ناقابل برداشت تھی۔ بستر پر لیٹ جاتا مگر پھر بے چین ہوکر بستر پر اٹھ کر بیٹھ جاتا اور پھر بستر پر بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو پلنگ سے اتر کر کمرے میں ٹہلنے لگتا، بار بار اپنے ماتھے پر اپنا ہاتھ مارتا۔ مدھو سے ملے آج آٹھواں دن تھا۔ اس کی بے چینی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس سے برداشت نہیں ہورہی تھی۔

جب سلامت بہت زیادہ تھک گیا تو لالٹین کو بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ سوتے وقت وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیتا تھا۔ بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے آخر کار وہ نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

آدھی رات گزر چکی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی کیونکہ اس نے اپنے چہرے پر کسی کے نرم وملائم ہاتھ کا لمس محسوس کیا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے چہرے پر بھی لایا تو وہ نرم ونازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں آگیا تو اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ "کون؟"

"سرگوشی میں ہی جواب ملا۔ "میں مدھوں ہوں۔"

مدھو کا نام سنتا تھا کہ وہ ہڑبڑا کر اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ "مدھو یہ تم نے کیا غضب کردیا، اگر کسی نے دیکھ لیا یا پھر کسی کو تمہاری بھنک بھی پڑگئی تو میں زندہ درگور ہوجاؤں گا۔ میرا عزت دار باپ شرم سے اپنی جان دے دے گا۔ پورے گاؤں میں ہم ذلیل ہوجائیں گے۔" سلامت بولا۔

"میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئی تھی، یہ آٹھ دن میں نے کس طرح گزارے ہیں یہ میں ہی جانتی ہوں۔ اگر دل چیر کر رکھ سکتی تو میں تمہیں دکھا دیتی۔ تمہاری جدائی مجھ سے ناقابل برداشت ہے۔" مدھو بولی۔

"مگر تم میرے کمرے میں آئیں کیسے؟"

"بس میں چلی آئی۔" مدھو نے کہا۔

"لیکن کمرے کی کنڈی اندر سے لگی ہوئی ہے، باہر دروازے میں اندر سائیڈ تالا لگا ہوا ہے، بابا دروازے کے قریب ہی سوتے ہیں۔ گھر کی دیواریں بھی اتنی اونچی ہیں کہ کوئی مرد بھی اوپر نہ چڑھ سکے، تمہارا میرے کمرے میں آنا، یہ کیسے ممکن ہے؟" سلامت بولا۔

"مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ بس میں آگئی۔ اور میں یہ بھی بتادوں کہ آتے ہوئے مجھے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی کبھی کوئی مجھے دیکھ سکتا ہے۔ تم فکر نہ کرو، دل میں کوئی بھی خیال نہ لاؤ، اگر آج میں نہ آتی تو نہ جانے کیا ہوجاتا؟" مدھو نے کہا۔

"کیا مطلب؟" سلامت بولا۔

"مطلب یہ کہ تمہارے بارے میں سوچ سوچ کر میرا دل پھٹ جاتا۔" اور یہ بول کر مدھو نے سلامت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل کی جگہ پر رکھ لیا۔ سلامت نے محسوس کیا کہ اس کا دل واقعی ایک عام رفتار کے بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"اب تم ہی بتاؤ کہ میرے دل کی کیا حالت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو رہی ہے۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے، جس نے بھی میلی آنکھ سے تمہیں دیکھا تو میں اس کی آنکھ نکال دوں گی۔ کوئی تمہیں تکلیف پہنچا کر زندہ نہیں رہ سکتا، یہ میرا وعدہ ہے، تم سے۔'' مدھو نے کہا۔

''چلو تمہاری باتیں میں مان لیتا ہوں کہ کسی نے تمہیں یہاں آتے دیکھا نہیں اور نہ ہی دیکھ سکتا ہے۔ مگر یہ ممکن کیسے ہوسکتا ہے؟ اصل حقیقت تم بتاؤ! نہیں تو یہ سوچ سوچ کر میرا دل پھٹ جائے گا اور تمہیں میری قسم یہ بتلا دو کہ تم آئیں کیسے؟'' سلامت اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے چہرے کو لیتے ہوئے بولا۔

''تم نے مجھے اپنی قسم دی ہے تو، اب مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ دراصل بات یہ ہے کہ میرے باپو بہت گیان دھیان والے ہیں، جنتر منتر کے ماہر ہیں۔ انہوں نے مجھے چند منتر بتا دیئے ہیں، اور وہ منتر ایسے ہیں کہ جب میں پڑھ کر اپنے اوپر پھونک لیتی ہوں تو میں دوسروں کی نظروں سے غائب ہو جاتی ہوں، اور صرف یہی نہیں بلکہ میں ہوا کی مانند جہاں چاہوں جا سکتی ہوں۔ میرے لئے کہیں بھی آنا جانا کوئی مشکل نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں بے دھڑک تمہارے پاس آتی ہوں، اور آج تمہارے پاس موجود ہوں۔'' مدھو سلامت کے ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''اب تم شانت رہا کرو، کسی پل بھی کوئی بھی مجھے تمہارے پاس آتے سے نہیں دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی میری آواز سن سکتا ہے۔'' رھو نے تفصیل بتائی۔

''تو پھر تم دن میں کیوں نہیں آتی ہو، صرف رات کا کیا چکر ہے؟'' سلامت نے سوال کر دیا۔

''دراصل یہ منتر صرف رات میں کام کرتا ہے، دن کا اجالا پھیلتے ہی یہ منتر بے کار ہو جاتا ہے، یعنی اس کا اثر ختم ہو جاتا ہے، اچھا اب یہ باتیں چھوڑو۔'' مدھو نے سلامت کو مطمئن کر دیا۔

سلامت نے مدھو کی باتیں سن کر ایک لمبا سانس کھینچا۔ وہ تو خود بھی مدھو کی جدائی میں بے چین تھا۔ اس نے مدھو کو پوری طاقت سے اپنی باہوں کے حصار میں بھینچ لیا اور بولا۔ ''اگر یہ بات ہے تو تم نے اپنی جدائی میں مجھے سات دن کیوں تڑپایا۔''

''دراصل ایک رکاوٹ آ گئی تھی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو، سے کو ضائع نہ کرو۔'' اور مدھو نے بھی سلامت کو بھینچ لیا۔ اور دونوں جذبات کی رو میں بہتے ہوئے بہت دور نکل گئے۔ اور آخر جذبات کا طوفان سرد پڑ گیا۔ سلامت نے مدھو کو اپنے آپ سے الگ نہیں کیا کہ اتنے میں مدھو کی رسیلی آواز سنائی دی۔ ''اچھا اب میں چلتی ہوں، اب میرے جانے کا سمے ہو گیا ہے۔ اب تم آرام سے سو جاؤ، کل میں پھر آؤں گی۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم نہیں جاؤ، اور اپنا منتر پڑھ کر سب کی نظروں سے غائب رہو، اور میرے قریب رہو۔'' سلامت بولا۔

''میں نے کہا ناں کہ دن کے اجالے میں غائب ہونے کا منتر کام نہیں کرتا۔ اور دن ہوتے ہی میں اپنی اصلیت کھو دوں گی، جو کہ ہم دونوں کے لئے خطرناک ہوگا۔ تم آرام کرو، اب میں جا رہی ہوں۔'' اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ غائب ہو گئی۔

سلامت اپنا دل مسوس کر رہ گیا، وہ کسی صورت بھی نہیں چاہتا تھا کہ مدھو اس سے ایک پل کے لئے بھی دور ہو جائے مگر بقول مدھو کے ایسی مجبوری تھی کہ وہ چوبیس گھنٹے سلامت کے پاس نہیں ٹھہر سکتی تھی۔

صبح ہوئی اور دن کا اجالا ہر سو پھیل گیا۔ سلامت کی اماں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''سلامت بیٹا! کافی دن چڑھ آیا ہے، دروازہ کھولو، بیٹا دروازہ کھولو۔'' انہوں نے کئی آوازیں دیں مگر سلامت تو بہت گہری نیند میں تھا، کئی آوازوں پر وہ نہیں اٹھا تو اس کے بابا نے دروازہ بہت زور سے پیٹ ڈالا۔

دروازہ پیٹنے کی آواز بہت زور کی تھی کیونکہ اس سے پہلے سلامت اتنی گہری نیند نہیں سوتا تھا اور ویسے بھی اس سے پہلے وہ دروازہ بند بھی نہیں کرتا تھا مگر آج اس قدر مدہوشی کا نیند سویا تھا اور پھر دروازہ نہ کھلنے کی تشویش سے گھر والے گھبرا گئے تھے۔ کافی دیر بعد آخر اس نے

نیند میں لڑکھڑاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

سلامت کو سامنے دیکھ کر گھر والوں کی جان میں جان آئی۔ ''بیٹا خیریت!'' کہ اچانک اس کے بابا کی ناک سے ایک تیز بساند قسم کی بو ٹکرائی۔ جس سے وہ اپنی ناک پر انگلی رکھے ہوئے دروازہ سے باہر کی طرف ہٹ آئے۔

''سلامت تمہارے کمرے میں یہ بو کس قسم کی ہے؟'' بابا نے پوچھا۔

''بابا مجھے تو کسی بھی بو کا پتا نہیں چل رہا ہے اور میرے کمرے میں بو کا کیا کیام؟'' سلامت بولا۔

اتنے میں اس کی امی بھی دروازے پر آ گئیں۔ انہوں نے بھی کمرے سے باہر نکلتی ہوئی عجیب طرح کی بو کا ذکر کیا۔ تو سلامت نے انہیں بھی یہ بول کر ٹال دیا کہ ''آپ لوگوں کو خواہ مخواہ وہم ہو گیا ہے اور مجھے تو بالکل بھی بو نہیں آ رہی ہے۔''

اور آج تو سلامت کے چہرے پر بھی ایسا لگتا تھا کہ کسی نے اس کے پورے منہ پر ہلدی مل دی ہو، بڑے غور سے اس کے بابا نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور پھر واپس آ کر اپنے کمرے میں بیٹھ گئے، لیکن ان کا ذہن نہ جانے کیا کیا سوچنے لگا تھا۔ ان کی تجربہ کار نگاہیں کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہی تھیں، سلامت کی آنکھیں بھی چغلی کھا رہی تھیں کہ سلامت رات بھر سویا نہیں ہے اور صبح ہونے سے پہلے ہی سویا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نیند سے بیدار نہیں ہو رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی آنکھیں بہت زیادہ نیند کی کمی کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔

''بیٹا کیا بات ہے؟ آج کل تم جن حالات سے دوچار ہو، ایسا لگتا ہے کہ جیسے کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہو، جیسے تمہاری کوئی چیز گم ہو گئی ہو، تمہاری آنکھیں ہر وقت متلاشی نظر آنے لگی ہیں، کہاں تم اذان فجر کے وقت اٹھ جاتے تھے اور اب اٹھانے پر بھی تم نیند سے بیدار نہیں ہوتے تمہارے کمرے اور تمہارے جسم سے عجیب طرح کی بساند بو آتی ہے۔ تمہارے جسم سے کمزوری جھلکنے لگی ہے، چہرا بھی دن بدن پیلا پڑتا جا رہا ہے، تمہاری حالت سے تمہارے بابا بہت پریشان ہیں اور یہ ساری باتیں انہوں نے ہی کی ہیں اور ان باتوں سے میں بھی اتفاق کرتی ہوں۔

اگر تمہیں کوئی تکلیف یا کسی قسم کی اندرونی پریشانی ہے تو بیٹا کھل کر بتاؤ۔ بیٹا جوان اولاد کی پریشانی ماں باپ کے لئے بہت اذیت کی ہوتی ہے، میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا، اور پھر مجھے ضرور بتانا، اب تم جا کر غسل کرو، میں تمہارے لئے ناشتہ تیار کرتی ہوں۔''

''ارے امی ایسی کوئی بات نہیں، آپ لوگ پریشان نہ ہوں میں بالکل ٹھیک ہوں، بابا کو بول دیجئے گا بالکل بھی فکر نہ کریں، بس آج نیند نہیں آئی تھی، کافی رات گئے میری آنکھ لگ گئی، اس وجہ سے دروازہ کھولنے میں دیر ہو گئی۔ اچھا آپ ناشتہ بنائیں، میں نہا کر آتا ہوں۔'' سلامت نے کہا اور نہانے کے لئے چلا گیا۔

''نہا کر سلامت آیا، ناشتہ کیا اور پھر کھیتوں کی دیکھ بھال کے لئے چلا گیا، پھر کھیتوں سے ہوتا ہوا آموں کے باغ میں آ کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گیا کیونکہ دھوپ کافی تیز تھی۔ آج وہ ان باتوں پر غور کرنے لگا جن باتوں کی نشاندہی اس کی والدہ نے کی تھی۔ باتوں پر غور کرتے کرتے اس کے دماغ میں مدھو کا خیال آیا۔ اور جو باتیں تھیں ان باتوں کی ذمہ دار صرف مدھو تھی۔

رات میں مدھو کا آنا اور صبح اذان سے پہلے پہلے جانا جس کی وجہ سے وہ رات بھر جاگتا رہتا تھا اور پھر روزانہ مدھو کے پیار میں بے خبر ہو کر جذبات کے رو میں بہتے ہوئے بہت دور تک چلے جانا، یہ ساری باتیں صحت کے لئے مضر تھیں۔ چند منٹ تک اس نے ان باتوں پر غور کیا اور پھر مسکراتے ہوئے اس نے اپنا سر جھٹکا اور اس جگہ سے اٹھ کر اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے چلا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن اس کے ذہن میں مدھو کا خیال گردش کرتا رہا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ دن کے بجائے رات کا وقت کردیتا، اس نے ہاتھ میں بندھی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''اوہ! ابھی تو رات کے بارہ بجنے میں بارہ گھنٹے باقی ہیں، خیر میں کر بھی کیا سکتا ہوں، مدھو تمہارے لئے یہ تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ اپنے دوست عرفان کے پاس چلا گیا۔

''ارے سلامت خیریت تو ہے ناں!'' اتنی گرمی اور دھوپ میں تو کیسے آج راستہ بھول کر آ گیا، اور کافی تھکا ہوا لگ رہا ہے، تو چارپائی پر بیٹھ میں ٹھنڈا پانی لاتا ہوں۔'' یہ بول کر عرفان ٹھنڈا پانی لینے گھر کے اندر چلا گیا۔

جلدی سے عرفان ٹھنڈا پانی لے آیا۔ سلامت نے ٹھنڈا پانی پیا تو اسے کچھ سکون ملا۔

عرفان نے پوچھا۔ ''سلامت کیا بات ہے؟ واقعی تو بہت تھکا تھکا لگ رہا ہے، کیا کہیں دور سے آ رہا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''یار کیا بتاؤں! آج کل اپنے اندر کچھ کمزوری محسوس کر رہا ہوں، تھوڑی دور چلتا ہوں تو نقاہت سے نڈھال ہو جاتا ہوں، ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں اور پھر زیادہ چلوں تو چکر بھی آنے لگتے ہیں۔ بابا بھی میری صحت کے معاملے میں کچھ پریشان ہو گئے ہیں، خیر میں حکیم کے پاس جاؤں گا، دوا لے آؤں گا۔'' عرفان سے سلامت نے کہا۔

''میرا تو مشورہ ہے کہ تو آج ہی حکیم صاحب کے پاس جا کر دوا لے آیا، تیرے چہرے اور جسم سے واقعی لگ رہا ہے کہ تو بہت کمزور ہو گیا ہے۔'' عرفان نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں آج ہی حکیم صاحب کے پاس چلا جاؤں گا۔'' سلامت بولا۔ دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے اتنے میں دن کے ڈھائی بج گئے تو عرفان نے کہا۔ ''تو ہاتھ منہ دھو لے میں کھانا لاتا ہوں۔ آج تیرے ساتھ کھانا کھا کر مجھے بہت مزہ آئے گا، اور ویسے بھی میں نے اندر امی سے کہہ دیا تھا کہ سلامت آیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئیں اور بولنے لگیں۔ ''سلامت کو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دینا۔''

''کھانے وانے کا تکلیف نہ کر، ویسے بھی میں نے آج ناشتہ کافی دیر سے کیا تھا۔ امی بھی گھر پر انتظار کر رہی ہوں گی میں چلتا ہوں۔'' سلامت بولا۔

بیٹھک میں بیٹھے دونوں یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بیٹھک میں عرفان کی امی آ گئیں تو انہیں دیکھتے ہی سلامت نے اٹھ کر انہیں سلام کیا اور بولا۔ ''خالہ آپ کیسی ہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی۔''

''ہاں بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں، مگر یہ تمہیں کیا ہو گیا، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی، کافی دبلے ہو گئے ہو؟ اور تم کھانے کے لئے انکار کیوں کر رہے ہو، چلو خاموشی سے بیٹھ جاؤ، میں کھانا لاتی ہوں، بغیر کھانا کھائے میں نہیں جانے دوں گی، چلو شاباش بیٹھ جاؤ۔'' اور یہ بول کر وہ اندر چلی گئیں۔ ''بچو! اب بولو۔'' عرفان نے کہا۔

''خالہ کی بات تو میں ٹال نہیں سکتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔'' یہ بول کر سلامت بیٹھ گیا۔ چند منٹ میں ہی کھانا آ گیا تو دونوں نے کھانا کھایا۔

کھانا کھانے کے بعد سلامت اپنے گھر آ گیا، تو اس کی امی نے آتے ہی کہا۔ ''بیٹا اب جلدی سے کھانا کھالو۔''

سلامت بولا۔ ''امی میں عرفان کے پاس چلا گیا تھا، وہاں خالہ نے زبردستی کھانا کھلا دیا۔''

''خیر کوئی بات نہیں، زبیدہ ہے بھی بہت دل والی، جب بھی جاؤ تو بغیر کھانا کھلائے آنے نہیں دیتی۔'' سلامت کی امی بولیں۔

شام کے پانچ بجے اس کے بابا آئے اور سلامت کے پاس ہی بیٹھ گئے اور بولے۔ ''بیٹا تمہیں کل حکیم وقار نے بلایا ہے، ان کے ساتھ جو حکیم کامل تھے انہوں نے کہا تھا کہ آپ بچے کو اکیلے بھیج دیجئے گا، آپ کا آنا ضروری نہیں۔ تم ایسا کرنا کل صبح ہی صبح کر مو

کو ساتھ لے کر گھوڑا گاڑی پر نکل جانا۔''

''جی بہت اچھا۔'' کہہ کر سلامت اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور مدھو کے خیالوں میں گم ہو گیا۔

شام ہوئی اور پھر شام کے بعد اندھیرے نے پوری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ رات کا کھانا سب نے مل کر کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد سلامت اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ لیکن لیٹنے سے پہلے اس نے دروازے کی کنڈی لگانا بھولا نہیں تھا۔

ادھر رولو کا نے اپنے علم اور خفیہ کارندوں کی مدد سے سلامت اور مدھو کی ساری حقیقت کو معلوم کر لیا تھا کہ آخر سلامت کی بیماری یا کمزوری کا اصل مسئلہ کیا ہے؟

پھر بھی رولو کا حقیقت کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرنا چاہتا تھا۔ اسے تو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ مدھو رات کے کس ٹائم سلامت کے پاس آتی ہے، لہٰذا وقت مقررہ پر رولو کا پوشیدہ حالت میں سلامت کے کمرے میں موجود تھا۔

مدھو کے انتظار میں سلامت کروٹیں بدلتا رہا کہ اپنے وقت پر مدھو اس کے پاس آ گئی۔ ''کیا بات ہے، آج تمہیں نیند نہیں آئی، کروٹ پر کروٹیں بدل رہے ہو۔'' مدھو بولی۔

''تم چیز ہی ایسی ہو کہ تمہارے بغیر بھلا نیند آ سکتی ہے؟ آج تو میں دن سے ہی تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ آج میری طبیعت بھی بہت نڈھال رہی ہے اور پتا نہیں کیا ہو گیا ہے کہ اب تو دو قدم چلتا ہوں تو مجھے چکر آنے لگتے ہیں اور میں ستانے کے لئے بیٹھ جاتا ہوں۔'' سلامت بولا۔

''تو اس میں گھبرانے والی کوئی بات نہیں، تم ٹھیک ہو جاؤ گے، میں نے اپنے بابا سے بات کی تھی تمہاری طبیعت کے متعلق تو انہوں نے یہ شربت دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ یہ پیتے ہی تم چاک و چوبند ہو جاؤ گے، اور چند دن کے استعمال سے تمہاری ساری کمزوری دور ہو جائے گی، میں نے تم سے پیار کیا ہے تو تمہارے لئے تو یہ سب کرنا ہی پڑے گا۔ چلو اسے جلدی سے پی لو۔'' مدھو بولی۔

''بھئی شربت تو بہت میٹھا اور مزیدار ہے۔'' غالباً سلامت نے شربت پی لیا تھا۔ چونکہ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا لہٰذا کچھ نظر آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔

شربت کے پیتے ہی سلامت کے جسم میں توانائی کا کرنٹ سا دوڑ گیا تو وہ بولا۔ ''ارے مدھو یہ شربت ہے یا بجلی کا جھٹکا، اس کے پیتے ہی میرے جسم میں گرمی دوڑ رہی ہے اور میری کمزوری تو بالکل ختم ہو گئی۔''

''ابھی تو آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا؟ تم فکر بالکل بھی نہ کیا کرو، میں جو ہوں نا فکر کرنے والی۔

لیکن آج مجھے تمہارے کمرے میں کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے، جیسے اس کمرے میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا بھی موجود ہے، میرا من کہہ رہا ہے۔'' مدھو بولی۔

''تمہارا من خراب ہو گیا ہے، ہم دونوں کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے، میں نے خود کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی تھی، اگر ایسی بات ہے تو چلو لالٹین جلا کر دیکھ لیتے ہیں، تب تو تمہیں اطمینان ہو جائے گا۔'' سلامت بولا۔

''ارے نہیں، نہیں لالٹین نہیں جلانا۔'' مدھو بولی۔ رات میں روشنی مجھے بہت زہر لگتی ہے۔ اور میں تمہیں ایک شعر سناتی ہوں۔ سنو۔

آج شب وصل ہے گل کر دو ان چراغوں کو
خوشی کے بزم میں جلنے والوں کا کیا کام

''واہ بھئی واہ!! تم تو شعر بھی کہہ لیتی ہو، اور یہ شعر تو تم نے بہت خوب کہا۔'' سلامت بولا۔ پھر وہ دونوں جذبات میں بہنے کی تیاری کے لئے پر تولنے لگے تو رولو کا موقع محل کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کمرے سے نکل کر پوشیدہ حالت میں مطب کے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت مقررہ پر مدھو نے سلامت سے اجازت چاہی اور اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

سلامت نے آج اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھا کیونکہ صبح سویرے ہی ولی حکیم وقار کے پاس پہنچنا تھا۔ اذان فجر کے وقت وہ اٹھا۔ نہایا دھویا۔ آج اس کے جسم میں عجیب طرح کی توانائی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ مدھو نے اسے توانائی کا شربت جو پلایا تھا۔

علی الصبح سلامت نے ناشتہ کیا اور گھر سے نکل گیا، باہر اس کے بابا بھی موجود تھے۔ گھوڑا گاڑی لئے کرمو پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس کے بابا نے کرمو سے کہا۔ ''کرمو دیکھ بھال کر گاڑی چلانا اور کوشش کرنا کہ جلدی واپس آجاؤ۔

بیٹا حکیم صاحب کی بات غور سے سننا اور دوا کے متعلق پوری تفصیل ذہن نشین کر لینا۔ اچھا اب جاؤ خدا حافظ۔'' سلامت گاڑی پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

اور کرمو نے گھوڑے کی لگام ڈھیلی کر کے اشارہ کیا تو گھوڑا آگے بڑھنے لگا۔ اور تھوڑی دیر میں ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ دن کے ساڑھے دس بجے سلامت حکیم وقار کے مطب پہنچ گیا۔ کرمو نے ایک طرف گاڑی روکی اور پھر سلامت گاڑی سے اتر کر انتظار گاہ میں بیٹھ گیا۔ مریضوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ گیارہ بجے وہ حکیم وقار کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو حکیم وقار بولے۔

''آپ برائے مہربانی حکیم کامل کے پاس جائیں، وہ برابر والے کمرے میں تشریف رکھتے ہیں۔''

یہ سن کر سلامت برابر والے کمرے میں چلا گیا۔ رولو کا آنکھیں بند کئے پتہ نہیں کن خیالوں میں گم تھا۔ خیر جھجکتے ہوئے سلامت نے السلام علیکم کہا تو رولو کا نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ رولو کا نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔ ''آپ تشریف لے آئے، بیٹھ جاؤ۔''

سلامت رولو کا کے سامنے بیٹھ گیا۔ تو رولو کا بولا۔ ''اور سناؤ طبیعت کیسی ہے؟''

''حکیم صاحب! مجھے طبیعت ٹھیک نہیں لگتی، نقاہت اور کمزوری بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اب تو چند قدم چلنے سے چکر آنے لگتے ہیں، بس دل چاہتا ہے کہ ہر وقت آنکھیں بند کئے اپنے کمرے میں پڑا رہوں۔'' سلامت بولا۔

''دن بھر آنکھیں بند کئے پڑا رہوں اور آدھی رات کے وقت کسی کی آمد پر آنکھیں کھول کر رات بھر جاگتا رہوں اور پھر اس کے ساتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر رہوں، یہی دل چاہتا ہے ناں۔'' رولو کا اپنی نظریں بند کئے سلامت سے بولا۔

''حکیم صاحب کیا مطلب؟'' سلامت جھٹ سے بولا۔

''مطلب تم واضح سمجھ رہے ہو۔'' رولو کا بولا۔

''میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ یہ باتیں تمہارے والد یا پھر حکیم وقار کے سامنے رکھوں۔ جو کچھ میں بتا رہا ہوں، تم سمجھ رہے ہو۔''

''حکیم صاحب اب میں کیا بتاؤں، آپ ساری حقیقت جان گئے ہیں، بس جی.....'' اور سلامت نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اس کا نام مدھو ہے۔'' رولو کا مسکراتے ہوئے بولا۔

''حکیم صاحب آپ کو تو اس کا نام تک معلوم ہے، کیا آپ اسے جانتے ہیں؟ وہ کون ہے، کیا ہے اور کہاں سے آتی ہے؟ میں تو یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' سلامت ندامت بھرے لہجے میں بولا۔

''میاں جوانی دیوانی ہوتی ہے سنا ہے اور اکثر نوجوان دیوانگی کے عالم میں اپنے اردگرد کے حالات سے بے خبر، بس جذبات کے سمندر میں کود پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ صنف نازک کے چکر میں کسی اور کی ذات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اگر انہیں کوئی سمجھائے تو اسے اپنا دشمن تصور کرتے ہیں۔ بس ہر وقت اس کے خیالوں میں گم رہنا اور اگر ان کا بس چلے تو اس کی خاطر ساری دنیا کو تہہ تیغ کر دیں۔ یہی بات ہے ناں۔'' رولو کا مسکراتے ہوئے بولا۔

''حکیم صاحب میں کیا بتاؤں، ہر وقت اس کا

خیال رہتا ہے، اس کے سوا مجھے کچھ اور نظر ہی نہیں آتا اور اس کی باتوں کے سوا کسی اور کی بات سننے کو دل نہیں چاہتا۔'' سلامت نظریں جھکائے ہوئے بولا۔

''میاں تمہارے اور موت کے درمیان کا فاصلہ دن بدن کم ہو رہا ہے، یہ ایک بہت اہم راز ہے، یہ سلسلہ تمہارے ساتھ کھلیان سے شروع ہوا اور اب تمہارے کمرے تک پہنچ گیا ہے۔''

''حکیم صاحب یہ آپ کیا بتلا رہے ہیں۔ میرا اور موت کا درمیانی فاصلہ.....'' سلامت اچنبھے کی حالت میں بولا۔

''ہاں! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ موت کی صورت میں مدھو، تمہیں اپنے شکنجے میں جکڑتی جا رہی ہے اب اس کے شکنجے سے نکلنا تمہارے بس کی بات نہیں۔ ہر روز تمہارا خون چوس رہی ہے، اور تمہیں کوئی خبر نہیں۔

یہ تو اچھا ہوا کہ تم میرے پاس آ گئے، اور میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ شاید تمہارے والدین کی کوئی نیکی کام آ رہی ہے، ورنہ تم اب تک بہت اذیت ناک موت سے ہمکنار ہو چکے ہوتے۔ اسے بھی تم سے کچھ لگاؤ ہو گیا ہے، نہیں تو وہ اب تک تمہیں اپنے ساتھ لے جا چکی ہوتی، لیکن اس کی کوشش ہے کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گی۔

بہت کم دن رہ گئے ہیں کہ تمہارا ناطہ اس دنیا سے ختم ہو جائے گا۔ تمہارے جسم میں خون اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔

خیر تم گھبراؤ نہیں، بالکل بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں، اور نہ ہی تم اس پر کسی قسم کا خدشہ ظاہر کرو گے۔

جب وہ تمہارے پاس آئے گی تو ہر روز کی طرح اس سے والہانہ انداز سے ملو گے۔ اس طرح اسے تمہارے رویہ سے کوئی بھی خطرہ ظاہر نہیں ہوگا۔

باقی کا مسئلہ میں سنبھال لوں گا۔ اگر تم نے اس پر اپنا خوف یا پھر اس کی اصلیت اس پر ظاہر کر دیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا، اور پھر وہ تمہیں فوراً جانی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی، تو کیا خبر تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔ میری باتیں اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے میرے بتائے ہوئے راستے پر عمل کرو گے تو اس سے تمہاری جان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے گی۔'' رولو کا نے کہا۔

''جی حکیم صاحب میں آپ کی باتوں پر من و عن عمل کروں گا، میں اس پر کسی قسم کا بھی خوف ظاہر نہیں کروں گا، اور نہ ہی اس سے کوئی ایسی ویسی بات کروں گا کہ اسے پتہ چل جائے کہ مجھے اس کی اصلیت کا پتہ چل گیا ہے۔'' سلامت نے کہا۔

''آج رات وہ ٹھیک اپنے مقررہ وقت پر آئے گی، اور تم ہر روز کی طرح اس کا انتظار کرو گے۔''

''جی! میں ایسا ہی کروں گا۔'' سلامت بولا۔

رولو کا نے ایک سوئی سلامت کو دی۔ سوئی میں لمبا سا سفید دھاگہ پڑا تھا۔ وہ سوئی دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ سوئی تم سنبھال کر اپنے پاس رکھنا سوئی میں دھاگہ رہنا چاہئے، ویسے میں نے دھاگہ کے دونوں سروں کو ایک جگہ کر کے گرہ لگا دیا ہے، دھاگہ سوئی سے نکلے گا نہیں۔

سوئی کو تم نے احتیاط سے سنبھال کر رکھنا ہے۔ تاکہ اسے پتہ نہ چلے۔

جب وہ تمہارے پاس آجائے اور ہر روز کی طرح راز و نیاز اور پیار کی باتیں کرنے لگے تو تم بھی بھرپور اس کا ساتھ دینا۔ اس سے پیار و محبت اور والہانہ طریقے سے اس کے ساتھ پیش آنا۔ اس کی نظر میں تم بے خود سے ہو جاؤ گے۔

مگر اندرونی طور پر تم خود پر قابو رکھنا، اپنے آپ کو بہکنے نہ دینا، بلکہ اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھنا۔

پھر جب وہ جانے کی بات کرنے لگے تو، بہت احتیاط کے ساتھ یہ سوئی اس کے کپڑے میں لگا کر چھوڑ دینا۔ سوئی اس طرح کپڑے میں لگانا کہ اسے پتہ نہ چلے اور سوئی کے نکلنے کا احتمال نہ ہو۔ یہ کام بہت احتیاط سے تم نے کرنا ہے۔ اور پھر وہ چلی جائے گی۔ اور تم حسب معمول سو کر رات گزارنا۔ دن کے کسی بھی وقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں تمہارے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔ پھر باقی کام میرا ہوگا۔

اس بات کا ذکر تم اپنے والد، گھر والوں یا کسی دوست یار سے بھی نہیں کرنا۔ میں تمہیں ایک شربت دے رہا ہوں، تمہارے گھر والے معلوم کریں تو انہیں بتا دینا کہ حکیم صاحب نے یہ دوا دی ہے، اور بولا ہے کہ تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔

جب میں آؤں گا تو باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ یہ شربت لو، اور اپنے گھر چلے جاؤ۔

میری باتیں ذہن میں رکھنا اور جیسا میں نے کہا ہے، اس پر ہوش و حواس سے عمل کرنا، بھول چوک میں تمہارا جانی نقصان ہو سکتا ہے۔ اب تم جاؤ۔" بول کر رولوکا نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

سلامت نے رولوکا سے مصافحہ کیا اور اپنے گھر آنے کے لئے مطب سے نکل گیا۔ جب وہ باہر آیا تو کرمو اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ گھوڑا گاڑی پر بیٹھا اور کرمو سے بولا۔" کرمو چلو۔" یہ سنتے ہی کرمو نے گھوڑے کی لگام ڈھیلی کر کے اشارہ دیا تو گھوڑا آگے کی جانب بڑھنے لگا۔

گاڑی تیزی سے آگے کو بڑھتی رہی لیکن گاڑی سے کہیں تیز رفتار سے اس کا ذہن دوڑ رہا تھا۔ سلامت سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔

رولوکا کی باتوں نے اسے اندر سے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ مدھو کا ایک بھیانک اور خوفناک چہرا اس کے سامنے آ گیا تھا۔ کھلیان میں اس کا ملنا، کھلیان میں جمالے کی اندوہ ناک موت۔

پھر کھلیان میں ہی غلہ لٹیروں کی اذیت ناک حالت، بیلوں کا مر دا ہونا۔

رات کے وقت گاؤں کے کتوں کا بھونکنا اور پھر تمام کتوں کی دہشت ناک موت۔

پھر سب سے زیادہ اچنبھے میں ڈالتی رات کے وقت کمرے کا دروازہ بند ہونے کے باوجود اس کا کمرے میں آنا۔ یہ تمام کی تمام حقیقت اس پر عیاں ہو چکی تھی۔ اور اب وہ اندرونی طور پر کپکپا رہا تھا۔ اس کی عقل یہ جاننے سے ابھی بھی قاصر تھی کہ "آخر مدھو ہے کیا؟"

مدھو کا ہمیشہ رات میں ہی آنا، اور صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے چلے جانا۔ بلکہ کمرے میں لالٹین بھی نہ جلانے دینا۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں کہ اس کا ذہن سوچ کے گرداب میں غوطے کھا رہا تھا۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی کمزوری حد سے بڑھ چکی تھی۔

گھوڑا گاڑی تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی لیکن وہ آنکھیں بند کئے بیتے ہوئے خیالوں میں محو تھا کہ اچانک اس کی زبان سے نکلا۔" یا اللہ میری مدد فرما، اللہ تو رحمٰن ہے رحیم ہے کریم ہے، میری غلطیوں کوتاہیوں اور گناہوں کو معاف فرما۔" پھر وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔" اچھا ہوا کہ میرے بابا حکیم وقار اور حکیم کامل کے پاس مجھے لے کر آئے تھے ورنہ میں تو....."

اس کی سوچ یہیں تک پہنچی تھی کہ کرمو گاڑی روک کر بولا۔" سلامت بابو، اتریں گھر آ گیا ہے۔"

کرمو کی بات سن کر وہ چونک پڑا اور اپنی آنکھیں کھول دیں۔ تو دیکھا کہ واقعی گھر آ گیا تھا۔ گھوڑا گاڑی دروازے پر کھڑی تھی اور ایک کنارے اس کے بابا کھڑے تھے۔

بابا کو دیکھتے ہی وہ گھوڑا گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

"بیٹا آ گئے۔" اس کے بابا نے پوچھا۔

"جی بابا!" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"حکیم صاحب نے کیا کہا ہے؟" اس کے بابا نے پوچھا تو وہ بولا۔" حکیم صاحب نے دوا دی ہے اور بولا ہے کہ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے، گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ منہ ہاتھ جلدی سے دھو لو اور کھانا کھاؤ۔" اس کے بابا نے کہا۔

کرمو گھوڑے کو کھول کر اس کے آگے چارا ڈال دو، اور تم بھی منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ، وقت زیادہ ہو گیا

ہے، بھوک بھی لگی ہوگی۔" انہوں نے کہا۔

"جی مالک!" یہ کہتے ہوئے کرمو گھوڑا گاڑی کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

سلامت گھر میں داخل ہوا تو اس کی امی اسے دیکھ کر بولیں۔" بیٹا کیسی طبیعت ہے، حکیم صاحب نے کیا کہا ہے، دوا دی ہے اور کھانے پینے کا کیا کہا ہے؟"

"ارے ذرا صبر کرو، تم تو ایک ہی سانس میں بولے جا رہی ہو۔" اس کے بابا نے کہا۔ سلامت کی دونوں بہنیں ایک طرف کھڑی بھائی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔

"میں نے معلوم کر لیا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں اور کھانے پینے میں بادی چیزیں نہ کھاؤ اور زیادہ سے زیادہ طاقتور خون بنانے والی چیزیں کھاؤ۔"

سلامت کے بابا نے کہا۔ تو سلامت نے مسکرا کر اپنے بابا کو دیکھا۔

"سلامت میں نے ٹھیک کہا ناں۔ یہی باتیں حکیم صاحب نے بتائی ہیں۔"

"جی بابا! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" سلامت بولا۔

"ارے بھئی تم سوالات ہی کرتی رہو گی یا اسے کھانے کے لئے بھی دو گی۔" سلامت کے بابا نے کہا۔ تو اس کی امی بچیوں کی طرف مڑیں اور بولیں۔" ارے تم دونوں منہ کیا دیکھ رہی ہو، جلدی سے بھائی کے لئے کھانا گرم کرو، اسے بھوک بھی لگی ہوگی۔" یہ سنتے ہی دونوں بہنیں باورچی خانہ کی طرف بڑھ گئیں۔

"امی میں ذرا غسل کر لوں، پھر کھانا کھاتا ہوں، راستے میں کافی گرمی تھی۔" سلامت بولا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! تم جلدی سے نہا لو۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں۔" امی نے کہا۔

بہن نے کپڑے لا کر دیئے تو وہ نہانے کے لئے چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر میں نہا کر آیا اور کھانے کے لئے بیٹھ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی پھر سے مدھو کے خیالات نے اس کے دل و دماغ پر یلغار کر دی۔ وہ یہ سوچ کر حیران ہونے لگا کہ کس طرح مدھو نے پیار محبت اور چاہت و خلوص کا جال پھیلایا۔ کیا مدھو اس قدر خوفناک اور بھیانک وجود کی مالک ہے اور وہ کس سفاکی سے اس کی جان کی دشمن بن بیٹھی ہے۔"

اتنا کچھ ہونے کے باوجود ابھی بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مدھو اس کی جان لینا چاہتی ہے۔ ہو سکتا ہے اسے کوئی بیماری لاحق ہو گئی ہو۔

وہ ہر طرح سے سوچتا کہ مدھو اس کا خون کس طرح چوس رہی ہے؟ وہ تو آتی ہے پیار محبت کی باتیں کرتی ہے اور اپنی چاہت و خلوص کا کھیل کھیل کر چلی جاتی ہے۔ بھلا ایک معصوم سی بھولی بھالی نرم و نازک صفت کی لڑکی بھلا میرا خون کس طرح چوس سکتی ہے؟"

جب ان تمام خیالات نے اسے ہر طرح سے جکڑ لیا اور پھر اس کے سر میں درد ہونے لگا تو اس نے اپنا سر جھٹکا اور بستر سے اٹھ گیا۔ اس نے سوچا ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کے لئے سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ "میں اپنے دوستوں میں جا کر بیٹھ جاؤں۔" اور پھر وہ اپنے کمرے سے نکل گیا۔

صحن میں آ کر وہ اپنی امی سے بولا۔" امی تھوڑی سی چائے بنا دیں۔ سر میں شدید درد ہو رہا ہے، چائے پینے سے ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کی امی نے اس کی بہن کو آواز دی اور بولیں۔" بیٹا چولہے پر چائے کے لئے پانی رکھ دو، میں ابھی آ کر چائے بناتی ہوں، بھائی کے سر میں درد ہو رہا ہے۔" چند منٹ بعد وہ اٹھیں اور باورچی خانے میں جا کر چائے بنانے لگیں۔

سلامت صحن میں بیٹھ گیا اور بہنوں سے باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس کی امی چائے بنا کر لائیں تو وہ چائے پینے لگا۔ چائے پیتے پیتے اس کی امی بولیں۔" سلامت اب تم اپنی صحت کی طرف سے بالکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی لاپرواہی چھوڑ دو، اپنی صحت کا خیال رکھو، وقت پر کھانا کھاؤ اور سونے کے لئے بھی وقت کا خیال رکھا کرو، دوستوں میں زیادہ اٹھو بیٹھو، اس طرح تمہارا ذہن بٹا رہے گا کیونکہ دوستوں میں اٹھنے بیٹھنے سے تمہیں تمہاری بیماری کا خیال زیادہ نہیں آئے گا۔ اللہ نے چاہا تو تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔

تمہارے ابا بول رہے تھے کہ دلی والے حکیم صاحب بہت تجربہ کار اور پہنچے ہوئے ہیں وہ جسمانی بیماری کے ساتھ ساتھ روحانی علاج بھی کرتے ہیں۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ پریشان حال مریض آتے ہیں اور صحت یاب ہو کر ہنستے ہوئے جاتے ہیں۔

یہ بھی بتا رہے تھے کہ بھوت چڑیل، آسیب اور جنات تک کا علاج کرتے ہیں، اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا دیا ہوا ہے اور سب سے بڑھ کر خوبی یہ کہ ہوائی چیزوں کے علاج کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں لیتے۔ اگر یہ دیکھا جائے تو یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ اور جو اللہ والے ہوتے ہیں وہ واقعی کوئی پیسہ پائی نہیں لیتے۔'' یہ بول کر اس کی امی خاموش ہو گئیں۔

''جی امی! میں نے بھی یہی سمجھا ہے کہ حکیم صاحب واقعی بہت رحم دل ہیں اور بہت پہنچے ہوئے ہیں۔'' سلامت بولا۔

''بیٹا میرے دل سے تو حکیم صاحب کے لئے اٹھتے بیٹھتے دعائیں نکل رہی ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی دے تاکہ وہ دکھی انسانیت کی خدمت کرتے رہیں، ایسے نیک اور رحم دل لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ اپنا خاص فضل و کرم کرتا ہے۔

اچھا اب تم جا کر عصر کی نماز پڑھو، اذان ہو چکی ہے، نماز کے بعد دوستوں میں چلے جانا، تمہارے ابا بتا رہے تھے کہ میں لوگوں کے پاس جا رہا ہوں کہ کل فصل کی کٹائی کرانی ہے اور ہاں مغرب کی نماز کے بعد فوراً گھر آ جانا۔'' سلامت کی امی نے کہا تو سلامت اٹھ کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر میں سلامت کے بابا آ گئے اور آتے ہی پوچھا۔ ''سلامت کہاں ہے؟''

اس کی امی بولیں۔ ''ابھی ابھی چائے پی کر باہر گیا ہے، عصر کی نماز پڑھے گا اور پھر اپنے دوستوں کی طرف بھی جائے گا۔ میں نے بول دیا ہے کہ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد گھر آ جانا۔''

''چلو اچھا ہے، دوستوں میں رہے گا تو اس کا دماغ بیماری کی طرف سے بٹا رہے گا۔'' اس کے بابا نے کہا۔ ''اچھا میں بھی نماز کے لئے جاتا ہوں۔'' اور یہ بول کر وہ بھی گھر سے باہر چلے گئے لیکن جاتے جاتے بول گئے۔ ''میں نے لوگوں سے فصل کی کٹائی کے لئے بات کر لی ہے، تم سلامت کو یاد سے بول دینا کہ کل صبح ہی صبح کھیت کی طرف نکل جائے اور وہاں اپنی نگرانی رکھے، ویسے تو میں بھی وہاں رہوں گا۔''

مغرب کی اذان ہوئی اور پھر تھوڑی دیر میں نماز پڑھ کر سلامت کے بابا گھر آ گئے۔ سلامت کی امی نے پوچھا۔ ''سلامت نہیں آیا، آپ نے مسجد میں اسے دیکھا تھا۔''

''ہاں میں نے دیکھا تھا۔ نماز کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ''بابا میں ذرا عبداللہ کے پاس جا رہا ہوں، کئی دن ہو گئے عبداللہ سے ملاقات نہیں ہوئی، تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔'' سلامت کے بابا نے کہا۔

''خیر سلامت عشا کی نماز پڑھ کر گھر آ گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کے بابا بھی عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر آ گئے تو، رات کا کھانا لگا دیا گیا، سب نے ایک ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا، کھانے سے فراغت کے بعد اس کے بابا بولے۔ ''بیٹا میں نے کل فصل کی کٹائی کے لئے لوگوں کو بول دیا ہے۔ تم صبح ہی صبح کھیت میں پہنچ جانا، ویسے تو میں بھی رہوں گا، تمہاری طبیعت بھی بہل جائے گی۔''

''ٹھیک ہے بابا، میں پہنچ جاؤں گا۔'' مگر ایک پھانس تھی جو اس کے دل میں چبھ رہی تھی۔ ''رات

میں مدھو آئے گی، اور نہ جانے کب تک رہے گی، پھر حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق میں نے اس کے کپڑے میں سوئی لگانی ہے، اور رات زیادہ ہو گئی تو پتہ نہیں میری آنکھ صبح کے وقت کھلے یا نہ کھلے خیر دیکھا جائے گا اگر آنکھ نہ کھلی تو بابا سے معذرت کر لوں گا، یا پھر تھوڑی دیر سے کھیت میں چلا جاؤں گا۔'' یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

''بیٹا! ابھی تم اپنے کمرے میں نہ جاؤ، تھوڑی دیر یہیں بیٹھے رہو، اور گپ شپ کرتے رہو، میں دودھ گرم کر کے لاتی ہوں، یہیں تم دودھ پی لینا اور تمہیں دوا بھی تو پینی ہے، پہلے تم دوا پی لو پھر بعد میں دودھ پی لینا۔ کل رات تم دودھ پینا بھول گئے تھے، میں تمہارے کمرے میں دودھ رکھ کر آئی تھی۔ مگر صبح دیکھا تو دودھ اپنی جگہ پڑا کا پڑا رہ گیا تھا، تمہاری آنکھ لگ گئی ہو گی، تم دودھ پینا بھول گئے ہو گے، ویسے بھی تم تو ہو بھی بھولکڑ، بہن سے بولو تمہاری دوا لے آئے۔'' یہ بول کر وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

سلامت اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس کی بہن دوا کی شیشی اٹھا لائی تو اس نے دوا پی۔ تھوڑی دیر میں اس کی امی گرم گرم دودھ لے آئیں تو اس نے اس جگہ بیٹھے بیٹھے دودھ پی لیا۔ دودھ پینے کے بعد وہ بولا۔ ''اچھا امی اب میں کمرے میں جا رہا ہوں، کافی تھکن محسوس کر رہا ہوں اب بستر پر لیٹوں گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا اب تم جا کر آرام کرو۔'' اس کے بابا نے کہا۔ تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور کمرے میں داخل ہو کر کمرے کی کنڈی اندر سے لگا لی۔

بستر پر لیٹ کر وہ مدھو کے خیالوں میں گم ہو گیا۔

''پتہ نہیں کب تک آئے گی۔ آج اسے جلدی آنا چاہئے۔'' وہ سوچنے لگا کیونکہ آج اسے حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق اس کے کپڑے میں سوئی لگانی تھی۔

اس سوئی سے کیا مسئلہ حل ہو جائے گا، کیا وہ بارہ بھی مدھو میرے پاس آتی رہے گی؟ یا پھر مدھو کا میرے پاس آنا یکسر ختم ہو جائے گا۔ سوئی لگانے کے

اطلاع عام

عوام الناس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ادارہ علی میاں پبلی کیشنز، عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور کے زیر اہتمام مصنف محی الدین نواب کی شائع ہونے والی کتب جن کے دائمی قانونی حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

اس کے حوالہ سے مصنف محی الدین نواب کے خلاف ایک مقدمہ

بعنوان عبدالغفار vs محی الدین نواب

بعدالت جناب انجم رضا سید ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج صاحب لاہور زیر سماعت ہے۔ جس میں عبدالغفار، علی میاں پبلی کیشنز کو حکم امتناعی مل چکا ہے۔ لہٰذا کتب مذکورہ کے بارے میں دیگر پبلشرز کی شائع کردہ کتب جعلی ہیں۔ لہٰذا اسٹاکسٹ اور بک سیلرز حضرات صرف علی میاں پبلی کیشنز کی شائع کردہ کتب ہی خریدیں کیونکہ وہ قانونی طور پر ان کو چھاپنے کے مجاز ہیں۔

کاشف حسین ایڈووکیٹ
ہائی کورٹ۔ لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بعد حکیم صاحب کیا اقدام کریں گے؟ اور اس کا اثر میری صحت پر کیا پڑے گا؟ حکیم صاحب تو اتنی دور بیٹھے ہیں، خیر مجھے تو وہی کرنا ہے جیسا حکیم صاحب نے کہا ہے۔'' وہ سوچتا رہا۔

اپنی جیب سے سوئی نکال کر اس نے تکیہ کے نیچے رکھ لی۔ کیونکہ اگر سوئی اس کی جیب میں رہتی تو ہوسکتا تھا کہ سوئی اسے خود چبھ جاتی۔ یا پھر وقت سے پہلے مدھو کو ہی چبھ جاتی۔

کروٹ پر کروٹ وہ بدلنے لگا۔ جب کروٹ بدلتے بدلتے وہ تھک جاتا تو اٹھ کر بستر پر ہی بیٹھ جاتا اور جب بستر پر بیٹھے بیٹھے اکتا جاتا تو بستر سے نیچے اتر کر ٹہلنے لگتا۔

کمرے میں جاتے ہی وہ سب سے پہلے لالٹین کو بجھا دیا کرتا تھا کیونکہ مدھو کا حکم تھا کہ کمرے میں روشنی نہیں ہونی چاہئے۔

آج وقت بہت کٹھن لگ رہا تھا۔ روزانہ تو وہ مدھو کا انتظار کرتے کرتے سو بھی جایا کرتا تھا۔ اس لئے کہ جب وہ سو جاتا تو آنے کے بعد مدھو اسے جگا دیتی تھی۔

لیکن آج تو اسے ہرگز سونا نہیں تھا کیونکہ حکیم صاحب نے اسے تاکید کی تھی کہ تمہیں آج جاگ کر اس کا انتظار کرنا ہے، اس کے ساتھ آج کچھ زیادہ ہی گرم جوشی سے ملنا ہے۔

انتظار کرتے کرتے نہ جانے کتنا وقت ہو چکا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے کروٹیں بدل رہا تھا کہ اچانک ایک سرگوشی سنائی دی۔

''سلامت میں حکیم کامل بول رہا ہوں، مجھے پتہ ہے کہ تم بڑی بے چینی سے مدھو کا انتظار کر رہے ہو اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انتظار کی گھڑیاں بہت کٹھن ہوتی ہیں۔

تو تمہارے اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آج تمہاری مدھو نہیں آئے گی، کیونکہ آج اس کی برادری میں کچھ مصروفیات ہیں، وہ اپنے جاننے والوں میں مصروف ہے، اس کی تو حتی الامکان کوشش رہی کہ وہ آجائے مگر لاکھ کوشش کے باوجود بھی آج وہ نہیں آسکے گی۔ اب اس کے آنے کا وقت بہت زیادہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا میرا مشورہ ہے تمہارے لئے کہ اب تم آرام سکون سے سو جاؤ، مگر سوئی احتیاط سے سنبھال کر رکھنا، ایسا نہ ہو کہ سوئی کسی کے ہاتھ لگ جائے اور وہ سوئی کو کوئی اہمیت نہ دے اور ادھر ادھر کر دے۔ سوئی کو تم نے بہت سنبھال کر کل تک کے لئے رکھنی ہے، وہ کل بہت بے چینی کی حالت میں آئے گی کیونکہ تمہاری ایک دن کی بھی جدائی اس کے لئے ناقابل برداشت ہے، چلو اب آرام سے سو جاؤ۔''

سلامت نے رولوکا کی سرگوشی سنی تو اچنبھے میں پڑ گیا۔ اور اذیت سے بھی وہ دوچار ہو گیا کیونکہ اسے بڑی بے چینی سے مدھو کا انتظار تھا۔ ''آج مدھو نہیں آئے گی۔'' یہ سوچ کر وہ ماہی بے آب ہو گیا۔

یہ بھی سوچنے لگا۔ ''حکیم کامل واقعی بہت پہنچے ہوئے ہیں کہ انہیں معلوم ہو گیا کہ آج مدھو نہیں آئے گی، وہ اپنی برادری میں بہت مصروف ہے اور ساتھ ہی یہ کس قدر اچنبھے کی بات ہے کہ حکیم کامل اپنی جگہ ہیں اور وہ اس طرح بات کر رہے ہیں کہ جیسے میرے قریب ہیں۔

میں نے آج تک اپنی عمر میں ایسا کسی کو نہیں دیکھا کہ سینکڑوں میل دور بیٹھا محض حالات کو جان لے اور اپنی باتیں کسی تک پہنچا دے، یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے ریڈیو ہوتا ہے۔''

خیر، اب کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن میں کیا کروں نیند تو مجھ سے کوسوں دور ہے، ایسا ہی سہی۔'' اس نے سوچا اور بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگا۔ پھر نہ جانے کس پہر اسے نیند کی دیوی نے آکر دبوچ لیا۔

اذان فجر کے وقت اس کی امی نے نماز فجر کے لئے اس کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ تھوڑی دیر تک دروازہ پیٹنے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ ''بیٹا فجر کی اذان ہو گئی ہے، منہ ہاتھ دھو لو اور

وضو بنا کر نماز ادا کرو، تمہارے بابا تو مسجد جا چکے ہیں، اگر مسجد جانا ہے تو چلے جاؤ، یا پھر اگر گھر میں نماز پڑھنا چاہو تو پڑھ لو۔'' اس کی امی نے کہا۔

''ٹھیک ہے امی میں مسجد چلا جاتا ہوں۔ نماز کے بعد تھوڑی دیر تک دوستوں کے ساتھ ٹہلنے کے لئے نکل جاؤں گا۔ واپسی پر ناشتہ کے بعد کھیت میں چلا جاؤں گا۔'' سلامت نے کہا اور منہ ہاتھ دھو کر گھر سے نکل کر مسجد چلا گیا۔

نماز کے بعد سلامت کے بابا گھر آئے چائے پی اور ناشتہ کے بعد کھیت میں چلے گئے۔ انہوں نے سلامت کا پوچھا تو پتہ چلا کہ نماز کے بعد وہ دوستوں کے ساتھ تھوڑی دیر تک چہل قدمی کرے گا اور واپس آکر ناشتہ کے بعد کھیت میں چلا جائے گا۔ یہ سن کر اس کے بابا گھر سے چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں سلامت بھی آ گیا، اس نے ناشتہ کیا اور ناشتہ کے بعد کھیت میں چلا گیا۔

فصل کی کٹائی دوپہر سے پہلے پہلے ہو گئی۔ دونوں باپ بیٹے فارغ ہو کر گھر آ گئے۔ گھر آ کر سلامت کے بابا نے کہا۔ ''سلامت کی ماں میں نے سوچا ہے کہ مولوی صاحب کو بول دوں کہ آج میلاد شریف پڑھ دیں اور لوگوں کو بھی بول دوں گا، عشاء کی نماز کے بعد میلاد شریف کا پروگرام ٹھیک رہے گا، دو مہینے سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے، ہم نے میلاد نہیں کرایا۔

''سلامت تمہارا کیا خیال ہے؟'' انہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے بابا جیسے آپ کی مرضی۔ آپ نے جو فیصلہ کیا ہے ٹھیک ہے۔ میں بھی اپنے دوستوں کو بول دوں گا۔'' سلامت نے کہا۔

''یہ تو اچھی بات ہے کہ آج میلاد ہو جائے، حلوائی کو بول دیجئے گا، ذرا اچھے شکر پارے بنا دے، چینی کا خاص خیال رکھے، چینی میں کنجوسی نہ کرے، شکر پارے اچھے ہوں تو لوگ تعریف کرتے ہیں۔''

سلامت کی امی نے کہا تو اس کے بابا بولے۔ ''ٹھیک ہے میں بول دوں گا۔'' اور یہ بول کر وہ نماز ظہر کے لئے چلے گئے۔

ظہر کی نماز کے بعد سلامت کے بابا گھر آئے اور آ کر بتایا کہ ''میں نے مولوی صاحب کو میلاد شریف کے لئے کہہ دیا ہے اور مسجد میں یہ بھی اعلان کرا دیا کہ آج میلاد ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد میلاد شروع ہو جائے گی۔''

رات میں میلاد کا سن کر سلامت کے دماغ میں ایک دھماکہ ہوا۔ ''رات میں میلاد کے چکر میں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے، میلاد ختم ہونے اور پھر سامان وغیرہ سمیٹتے سمیٹتے وقت کا تو پتہ نہیں چلے گا۔ خیر میں کوشش کروں گا کہ کام سے جلدی فراغت مل جائے۔'' یہ سوچ کر اس نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا۔

لیکن پھر بھی اسے چین نہیں مل رہا تھا کیونکہ کل رات بھی مدھو نہیں آئی تھی اور آج بھی مدھو کے نہ آنے کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ سلامت کا دل تو ایک پل کے لئے بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ مدھو سے دور رہے مگر ہائے مجبوری کے تحت وہ مدھو سے جدائی برداشت کر رہا تھا۔

وقت بڑی تیزی سے گزرنے لگا اور پھر شام ہو گئی۔ شام کے بعد رات ہو گئی اور عشاء کا ٹائم ہو گیا۔ گاؤں دیہات میں چونکہ پہلے وقتوں میں بجلی نہیں ہوتی تھی، کسی تقریب یا شادی بیاہ میں رات کے وقت گیس بتی جلاتے تھے۔ میلاد کے لئے بھی چار گیس بتیاں کرائے پر آ گئی تھیں۔ ساری تیاری مکمل تھی اور پھر مٹھائی بھی شکر پارے کی صورت میں آ گئی تھی۔

گاؤں دیہات میں گھر بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ سلامت کا گھر بھی بہت وسیع تھا۔ بڑے بڑے کمرے، بہت بڑا صحن اور سب سے بڑا دالان تھا۔ دالان اتنا بڑا تھا کہ بیک وقت دو ڈھائی سو لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ میلاد کا پروگرام دالان میں ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھا گیا تھا۔

عشاء کی نماز ختم ہوتے ہی دالان میں دری بچھادی گئی، گیس بتیاں جلادی گئیں۔ ایک کونے میں تخت پر دری اور سفید چادر بچھا کر سفید ہی دو تکیے رکھ دیئے گئے۔

عشائی نماز کے بعد میلاد شریف شروع ہوگئی۔ بہت سارے لوگ میلاد میں شریک ہوئے۔ گاؤں میں چونکہ لوگ رات میں جلدی سوجاتے ہیں اور اذان فجر کے وقت اٹھ جاتے ہیں، اور صبح کا سفیدہ پھیلتے پھیلتے لوگ اپنے کام کاج میں لگ جاتے ہیں، اس کے پیش نظر مولوی صاحب نے میلاد ساڑھے گیارہ بجے ختم کردی۔ میلاد کے بعد مٹھائی بانٹی گئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

میلاد کے بعد دری اور دیگر سامان سمیٹتے سمیٹتے رات کے ساڑھے بارہ بج گئے۔ اس کے بعد گھر میں کھانے پینے کا انتظام ہونے لگا۔

سلامت اپنے کمرے میں گیا تو اچانک رولو کا کی سرگوشی سنائی دی۔ ”سلامت میاں آج بھی مدھو نہیں آئے گی، کیونکہ تمہارے گھر میں میلاد کی محفل ہوئی ہے۔ اس لئے گھر میں گہما گہمی ہے۔ لوگ جاگ رہے ہیں، پورے گھر کے علاوہ تمہارے کمرے میں مکمل تنہائی نہیں ہے اور تم ابھی تک جاگ رہے ہو، اور رات گئے تک جاگنا پڑے گا اور خاص کر مقدس محفل کی وجہ سے مدھو نہیں آئے گی۔

تم گھبراؤ نہیں۔ میں حکیم کامل بول رہا ہوں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں باخبر کردوں۔

تم آرام سکون سے کھاؤ پیو، گھر والوں کے ساتھ جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔ کھانا کھانے اور دیگر بات چیت کے بعد سکون سے اپنے کمرے میں آکر سوجانا۔

میری بات کو ذہن میں رکھنا، سوئی کو تم نے احتیاط سے سنبھال کر رکھنا ہے، ادھر ادھر نہ ہوجائے، کیونکہ اگر سوئی دھاگہ سمیت ادھر ادھر ہوگئی تو منا را بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا، لہٰذا تم نے سوئی کو بہت سنبھال کر رکھنا ہے، اچھا اب میں بات ختم کرتا ہوں، تم اپنے کام کاج میں آرام سکون سے لگ جاؤ۔“

رولو کا کی سرگوشی سن کر سلامت اچنبھے میں پڑ گیا اور سوچنے لگا۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ حکیم صاحب ہر لحہ میرے ساتھ ساتھ ہیں۔ میری تمام حرکات وسکنات پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

مدھو نہیں آئے گی تو میں کر بھی کیا سکتا ہوں، نہ جانے آج کی رات کس طرح کٹے گی، کاش! مجھے مدھو کا اتہ پتہ ہوتا تو میں خود اس کے پاس پہنچ جاتا۔“

وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا اور گھر والوں کے پاس مرجھائے ہوئے دل کے ساتھ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ ”بابا نے بھی میلاد کا پروگرام آج ہی رکھنا تھا۔ بابا کو کیا پتہ کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے، کل مدھو اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہیں آئی اور آج اس میلاد کی.....“ اور اس کی سوچ ادھوری رہ گئی۔

کیونکہ اس کے بابا نے کہا۔ ”بیٹا سلامت! کیا سوچنے لگے، چلو دستر خوان پر بیٹھو، ویسے بھی کافی دیر ہوگئی ہے۔ سونا بھی ہے اور فجر میں اٹھنا بھی ہے۔“

سلامت دستر خوان پر بیٹھ گیا اور بے دلی سے کھانا کھانے لگا۔ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد بڑی بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ آج مدھو سے نہ ملے۔ دوسرا دن تھا۔ کل کی رات تو اس نے جیسے تیسے کر کے کاٹ لی تھی کہ چلو ایک رات کی بات ہے لیکن آج کی رات تو اس پر اذیت ناک بن گئی تھی۔ اسے کسی پل چین نہیں آرہا تھا۔ مدھو کی یادوں نے اسے ہر طرف سے جکڑ لیا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹا جارہا تھا۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

آج اسے پتہ لگ رہا تھا کہ وہ مدھو کے بغیر ادھورا ہے، اب مدھو کے بغیر وہ دو دن بھی نہیں کاٹ سکتا، مدھو اس کے دل و دماغ پر چھا گئی ہے، مدھو کی ایک پل کی بھی دوری اسے اذیت سے دوچار کردیتی

تھی۔ اچانک اس کے دماغ میں یہ بات آگئی۔

”کہیں حکیم کامل نے اپنے علم سے مدھو کی راہ میں رکاوٹ تو نہیں ڈال دی ہے اور مجھ سے اس کی مصروفیات اور میلاد وغیرہ کا بہانہ کررہے ہیں۔ اگر مدھو کل بھی نہیں آئی تو میں جا کر انہیں منع کردوں گا کہ میں آپ سے اپنا علاج نہیں کراتا، علاج آپ نے میرا کرنا ہے اور بات مدھو پر ڈال دی ہے، اور میرے علاج کا بہانہ بنا کر آپ نے مدھو کو مجھ سے ملنے سے روک دیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ مدھو مجھ سے ملتی رہے اور آپ صاف صاف بتادیں کہ مدھو کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟ تاکہ میں کوئی اٹل فیصلہ کرسکوں، میں مدھو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

وہ اور بھی اس قسم کی باتیں سوچتا رہا، اور پھر آخر کار وہ نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

صبح ہوئی اور آج سلامت نے رات کے وقت کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ فجر کے وقت اس کے بابا نے اسے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا تھا کیونکہ رات میں وہ بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ ویسے بھی آج کل چونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

صبح نو بجے کے قریب اس کی امی نے اٹھایا۔ بیٹا سلامت دن کے نو بجنے والے ہیں، چلو جلدی سے اٹھ جاؤ۔“ یہ سنتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔

”ارے نو بجنے والے ہیں، آپ مجھے جلدی اٹھا دیتیں۔“ وہ بولا۔

چلو کوئی بات نہیں، تم ویسے بھی رات میں کافی تھک گئے تھے، تمہارے چہرے سے تھکن صاف جھلک رہی تھی۔ تمہارے بابا نے کہا کہ ”سلامت کو سونے دو۔ میں خود کھیتوں کی طرف چلا جاتا ہوں۔

اور ہاں وہ بول رہے تھے۔ ”سلامت اٹھ جائے اور ناشتہ سے فارغ ہوجائے تو بول دینا کہ کھیت میں جا کر کٹی ہوئی فصل کو اپنی نگرانی میں اٹھوا کر کھلیان میں رکھوادے۔ اگر ذمہ دار آدمی نہیں ہوتا تو مزدور بہت زیادہ لاپرواہی کرتے ہیں۔

بیٹا تم جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کرو اور کھیت میں چلے جاؤ، اور اپنی نگرانی میں فصل اٹھوالینا اور اس کے بعد گھر آجانا۔“ اس کی امی نے کہا۔

سلامت نے منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور کھیتوں کی طرف نکل گیا۔

آج کام کچھ زیادہ ہی تھا، کام ہوتے ہوتے شام کے چار بج گئے۔ کام سے فارغ ہو کر وہ گھر آیا، کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر لیٹنے کے بعد وہ اٹھا اور اپنے دوستوں کی طرف چلا گیا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے آج وہ کچھ زیادہ ہی تھک گیا تھا۔

بہر حال عشاء کی نماز کے بعد وہ گھر میں آیا، رات کا کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی لگائی اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

بستر پر لیٹنے کے بعد اس کے ذہن میں آیا کہ میں مدھو کے کپڑے میں دھاگہ سمیت سوئی نہیں لگاؤں گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس عمل سے مدھو بالکل ہی مجھ سے دور ہوجائے، اور میں مدھو کے لئے تڑپتا ہی رہ جاؤں۔“

پھر اس کے دل میں آیا کہ ”نہیں میں اس کے کپڑے میں سوئی لگا کر دیکھوں کہ ہوتا کیا ہے؟ حکیم صاحب نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ سوئی لگنے کے بعد کیا رد عمل ہوگا۔ لہٰذا میں اس کے کپڑے میں سوئی ضرور لگاؤں گا۔ تاکہ مجھے اصل حقیقت کا پتہ تو چلے۔“

جوں جوں رات آگے کو کھسک رہی تھی اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس کی بے قراری کا یہ عالم تھا کہ جیسے ایک ایک پل ایک ایک برس بن کر گزر رہا تھا۔ وہ بستر پر لیٹتا، پھر اٹھ کر بستر پر بیٹھ جاتا اور پھر اس پل بھی چین نہیں آتا تو بستر سے نیچے اتر کر ٹہلنے لگتا۔ اور پھر دونوں ہاتھ ماتھے پر مارنے لگتا۔

پھر وہ آنکھیں موند کر بستر پر لیٹ گیا۔ تھکن تو زیادہ تھی اور اس بنا پر اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔

اچانک ایک نسوانی وجود سلامت سے لپٹ گیا۔ تو اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مدھو۔"

"ہاں!"

"تم دو دن سے کہاں تھیں؟" تمہارے انتظار میں میری آنکھیں پتھرا گئیں۔" سلامت بولا۔

"میں کیا بتاؤں..... میں ذرا مصروف تھی۔ مگر تمہارے بغیر انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔

"تم انگاروں پر لوٹ رہی تھیں اور میں تو جیسے مجسم آگ میں جھلس رہا تھا۔" سلامت بولا۔

"اور کل کیا ہو گیا تھا؟ کل تو تمہاری مصروفیات نہیں تھیں۔ کل تو میں نے تمہارا بہت انتظار کیا اور کل مجھے پتہ چلا کہ انتظار کی گھڑیاں کتنی کٹھن ہوتی ہیں؟"

"کل تمہارے گھر میں بہت سارے لوگ جمع تھے، کافی رات تک تم لوگ مصروف نظر آ رہے تھے، اور اتنے لوگوں میں میرا تو جیسے دم گھٹنے لگتا ہے، اس لئے میں نہیں آئی۔" مدھو بولی۔

"جب تم غائب ہونے والا منتر پڑھ کر آتی ہو تو، منتر پڑھ کر آ جاتیں، لوگ تھے تو کیا ہوا، تمہیں تو میرے پاس آنا تھا، اور پھر میں آدھی رات کے وقت کام وام سے فارغ ہو گیا تھا۔ سارے لوگ جا چکے تھے۔ میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ تم نے یہ سوچا ہوتا کہ کوئی میرے انتظار میں تڑپ رہا ہوگا۔ چلو زیادہ وقت کے لئے نہ سہی۔ چند منٹ کے لئے ہی آ جاتیں۔"

"اچھا آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" مدھو بولی۔

"تم اپنا اتہ پتہ ہی بتا دو، تاکہ کبھی ایسا ہو تو میں تمہاری جگہ آ کر کم از کم تمہاری ایک جھلک ہی دیکھ لوں اور میری بے قراری کو چین آ جائے۔" سلامت بولا۔

"تم گھبراؤ نہیں، بہت جلد تمہاری بے قراری ختم ہو جائے گی، تم تو مجھے نہیں لا سکتے، میں خود ہی لے جاؤں گی، پھر تمہیں آنے جانے کی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ کیوں ٹھیک ہے ناں۔" مدھو بولی۔ اور جھٹ سلامت کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اور سلامت کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا تو سلامت نے بھی برابری کا ساتھ دیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دونوں جذبات کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔

سلامت کو اپنا ہوش نہ رہا وہ جذبات کے طوفانی تھپیڑوں میں اوپر نیچے ہونے لگا۔

اچانک اس کے دماغ میں رولوکا کی آواز گونجی۔ "سلامت اپنے حواس پر قابو رکھو اور وقت ضائع نہ کرو، خود کو سنبھالتے ہوئے اس کے کپڑے میں سوئی گھسیڑ دو اچھی طرح۔"

سلامت کو اچانک ہوش آ گیا، اس وقت وہ رولوکا کی آواز کے زیر اثر آ چکا تھا، اگر رولوکا ایسا نہ کرتا تو سلامت کو اتنا ہوش نہ تھا کہ وہ سوئی دھاگہ سمیت مدھو کے کپڑے میں گھسیڑ دیتا اس نے جھٹ تکیہ کے نیچے سے سوئی نکالی اور احتیاط سے سوئی کو مدھو کی چندری میں اٹکا دی اور مطمئن ہو گیا۔

"مدھو آج تم نہ جاؤ، آج میرے پاس ہی رک جاؤ، تم تو ویسے بھی غائب ہونے کا منتر پڑھ کر سب کی نظروں سے غائب ہو جاتی ہو، کیا میری خاطر تم ایسا نہیں کر سکتی ہو۔" سلامت بولا۔

"میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ سورج کی روشنی یا کسی بھی روشنی میں میرا منتر کام نہیں کرتا، تھوڑے دن کی تو بات ہے تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے پاس ہی آ جاؤ گے۔ گھبراؤ نہیں بہت جلد ایسا ہوگا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں، اب تم آرام سے سو جاؤ، آج تو تمہیں....." اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

مدھو کے جانے کے بعد رولوکا کی سرگوشی سنائی دی۔ "سلامت اب تم آرام سے سو جاؤ اور کل دن کے گیارہ بجے گھر پر میرا انتظار کرنا، کہیں جانا نہیں، تم اپنے بابا سے کچھ نہیں کہنا بلکہ میں خود ان سے رابطہ کر کے انہیں بھی بتا دوں گا کہ وہ بھی کہیں نہ جائیں۔ تم نے اچھا کیا کہ سوئی اس کی چندری میں اٹکا دی۔ اور سرگوشی بند ہو گئی۔

ادھر رولوکا نے سلامت کے والد سے ذہنی رابطہ کیا اور ان کے دماغ میں یہ بات ڈال دی کہ وہ دن میں کہیں اور نہ جائیں بلکہ گھر پر ہی رہیں۔

سلامت سوچنے لگا۔ "اللہ خیر کرے پتہ نہیں حکیم صاحب آ کر کیا کریں گے، کہیں ایسا نہ ہو کہ مدھو کا راز بابا کے سامنے کھول دیں، اگر ایسا ہوا تو میری عزت خاک میں مل جائے گی، میں گھر والوں کی نظروں میں ذلیل ہو جاؤں گا، لیکن ایسا لگتا نہیں کہ حکیم صاحب مدھو اور میرے تعلقات کا کھل کر اظہار کر دیں۔ حکیم صاحب باشعور، سمجھدار اور بردبار لگتے ہیں، اگر ایسا ہوتا تو مجھے اکیلے میں کیوں بلاتے، بابا کے سامنے بھی ایسا کچھ بول سکتے تھے، نہیں ایسا نہیں کریں گے، لیکن یہاں آ کر کریں گے کیا؟" سلامت اس قسم کی شک وشبے والی باتیں سوچتا رہا کہ پھر آخر وہ نیند کی گہرائی میں چلا گیا۔

صبح ہوئی دن کا اجالا ہر سو پھیل گیا۔ لوگ اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے۔ آج سلامت کے بابا کی طبیعت کچھ ناسازی لگ رہی تھی۔ انہوں نے فجر کی نماز پڑھی اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئے، یہی حال سلامت کا بھی تھا، وہ بھی کسی کام یا پھر سیر سپاٹے کے لئے بھی گھر سے باہر نہیں گیا۔

دن کے نو بجے آج گھر والوں نے ناشتہ کیا۔ ویسے تمام گھر والے صبح ساڑھے سات بجے تک ناشتہ کر لیا کرتے تھے کیونکہ صبح ناشتہ کرنے کے بعد سلامت یا اس کے بابا کام کاج کے لئے گھر سے نکل جاتے تھے۔

سلامت کے دماغ میں یہ بات تھی کہ حکیم کامل دن کے گیارہ بجے تشریف لائیں گے؟ اور آنے کے بعد وہ کیا قدم اٹھائیں گے؟ کیا باتیں کریں گے۔

گیارہ بجنے میں دس منٹ رہ گئے تو سلامت گھر سے نکل کر دالان میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور بڑی بے چینی سے رولوکا کا انتظار کرنے لگا۔

رولوکا دن کے ٹھیک گیارہ بجے دالان کے سامنے آ کر رک گیا۔

"ارے شرافت صاحب آپ پریشان نہ ہوں، میں نے سلامت سے اپنی آمد کا ذکر نہیں کیا تھا، پہلے دن آپ نے مطب میں اپنے گھر اور گاؤں کا پتہ لکھ دیا تھا۔ اسے دیکھ کر میں آ گیا۔

آج میرا آنا ضروری تھا سو میں آ گیا۔ میں نے سوچا آج آپ کے بیٹے کی بیماری کا خاتمہ کروں، اسی غرض سے میں آ گیا۔

آج کا دن سلامت کی بیماری کا آخری دن ہے، آج اس بیماری کا خاتمہ آپ سب کے سامنے ہو جائے گا، دلی میں بیٹھ کر ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا میں یہاں آ گیا۔" رولوکا نے کہا۔

"حکیم صاحب اللہ آپ کو حوصلہ اور تندرستی دے، اور اپنا فضل وکرم آپ پر ہمیشہ رکھے۔" سلامت کے بابا نے کہا۔ "آپ تشریف رکھیں۔ سلامت بیٹا حکیم صاحب کے لئے فوراً چائے پانی کا انتظام کرو۔"

"شرافت صاحب اس کی ضرورت نہیں، آپ تکلف نہ کریں۔ میرا پیٹ بھرا ہوا ہے، کسی بھی چیز کی طلب نہیں۔ آپ گھر پر ہی تشریف رکھیں، کہیں جایئے گا پڑتے ہوئے بولا۔ "آپ کو ہمارے گھر کا پتہ کیسے چلا؟ آپ بول دیتے میں گھوڑا گاڑی بھیج دیتا۔"

گاڑی واڑی کی کوئی ضرورت نہیں، بس میں آ گیا، اس دن میں نے تمہارے والد سے گھر کا پتہ لے لیا تھا۔" رولوکا بولا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سلامت کے والد گھر سے نکل کر سامنے آ گئے اور رولوکا کو دیکھتے ہی حیرانی سے بولے۔ "حکیم صاحب آپ کیسے آئے؟ اگر آنا تھا تو مجھے بتلایا ہوتا، میں گھوڑا گاڑی بھیج دیتا۔ ایسا تو نہیں کہ آپ نے یہاں آنے کا وقت سلامت کو دیا تھا۔ لیکن سلامت نے آپ کے آنے کا ذکر مجھ سے نہیں کیا۔ سلامت کیا تمہیں حکیم صاحب نے بتایا تھا کہ آج یہ آئیں گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مت، میں سلامت کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں، اور تھوڑی دیر میں ہم واپس آتے ہیں۔

آپ ایسا کریں کہ ایک بڑا دیگچہ، تین سیر سرسوں کا تیل، چولہا بنانے کے لئے چھ عدد پکی اینٹیں اور پانچ چھ گز کے قریب ڈوری کا انتظام کر کے رکھیں، ہم دونوں تھوڑی دیر میں واپس آتے ہیں۔ سلامت چلو میرے ساتھ۔'' یہ بول کر رولوکا سلامت کے ساتھ آموں کے باغیچے کی طرف چل پڑا۔

''سلامت تم اندرونی طور پر کچھ گھبرا رہے ہو، تم بالکل بھی فکر نہ کرو، میں تمہارے اور مدھو کے تعلقات کے بارے میں اپنی زبان نہیں کھولوں گا، بے فکر رہو۔'' رولوکا بولا۔

تھوڑی دیر میں دونوں آموں کے باغ میں پہنچ گئے۔ باغ میں پہنچ کر رولوکا ہر ایک درخت کو اونچائی پر بغور دیکھنے لگا۔ وہ ہر درخت کے پاس جاتا اور درخت کی اونچائی پر بہت غور سے دیکھتا۔ جیسے اسے کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔

اسی طرح وہ ہر ایک درخت کو دیکھتا رہا۔ آخر ایک درخت کے سامنے رک گیا۔ اور اوپر کو دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔

''سلامت یہی درخت ہے، تم سامنے غور سے دیکھو، تمہیں سفید دھاگہ نیچے کو لٹکتا ہوا نظر آ رہا ہے؟'' رولوکا بولا۔

اور جب سلامت نے غور سے درخت کی تھوڑی اونچائی پر دیکھا تو واقعی سفید دھاگہ نیچے کو لٹکتا ہوا نظر آ گیا۔ ''جی حکیم صاحب مجھے دھاگہ نظر آ گیا۔'' سلامت بولا۔

پھر رولوکا نے کچھ پڑھ کر درخت پر پھونک ماری اور پھر درخت کے چاروں طرف ایک دائرہ کھینچ دیا۔ اس کے بعد چھلانگ لگا کر وہ درخت پر چڑھ گیا۔ اور جب وہ نیچے اترا تو اس کے ہاتھ میں ایک بالشت کی ایک مضبوط ہڈی تھی۔

سلامت نے دیکھا کہ اس ہڈی میں ایک سوئی دھاگہ سمیت پیوست تھی۔

سوئی اور دھاگہ کو دیکھ کر سلامت حیران رہ گیا مگر منہ سے کچھ بولا نہیں۔ اور نہ ہی اس نے رولوکا سے کوئی بات کی۔ بس وہ حیرانگی کی حالت میں ہڈی کو دیکھے جا رہا تھا۔

رولوکا بولا۔ ''چلو واپس چلتے ہیں، کام ہو گیا۔''

دونوں تھوڑی دیر میں واپس آ گئے۔ دالان میں سلامت کے والد بیٹھے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ گاؤں کے کئی لوگ اور بھی موجود تھے۔

''شرافت صاحب کیا تمام چیزیں حاضر ہیں؟'' رولوکا نے پوچھا۔

''جی حکیم صاحب یہ رہیں وہ چیزیں آپ دیکھ لیں کسی اور چیز کی تو ضرورت نہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ ایسا کریں ان اینٹوں کو تین سائیڈ رکھ کر چولہا بنا دیں۔ اور دیگچے میں یہ سارا تیل ڈال دیں۔'' رولوکا نے کہا۔

رولوکا کے کہنے کے مطابق وہی ہوا جو وہ چاہتا تھا۔

پھر رولوکا نے اس تیل میں وہ ہڈی ڈال دی اور فوراً ڈھکن سے دیگچے کا منہ بند کر دیا۔ اس کے بعد اس نے رسی کی مدد سے ڈھکن کو دیگچے پر خوب مضبوط کر کے باندھ دیا، اس کے بعد مٹی گیلی کر کے ڈھکن کے چاروں طرف خوب اچھی طرح لگا دی۔ تاکہ اندر سے بھاپ باہر نہ نکل سکے اس کام سے فارغ ہو کر اس نے دیگچے کو چولہے پر رکھ دیا۔

اور چولہے کے نیچے ڈھیر ساری لکڑیاں رکھ کر ان پر مٹی کا تیل ڈالا اور پھر دیا سلائی دکھا دی۔ لکڑیاں فوراً زوردار طریقے سے جلنے لگیں۔

اس کے بعد اس نے کچھ پڑھ کر دیگچے کے گرد ایک حصار کھینچ دیا۔

تھوڑی دیر بعد دیگچے کے اندر سے آوازیں آنے لگیں۔ آوازیں ایسی تھیں کہ جیسے دیگچے میں پتھر ڈال دیا گیا ہو، اور وہ پتھر زوردار طریقے سے دیگچے کے

اندر جیسے اچھل رہا ہو۔

آہستہ آہستہ ان آوازوں میں زور پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ پھر تو ایسا لگنے لگا کہ بہت بھاری پتھر پوری قوت سے دیگچے کے اندر اچھل رہا ہے۔

دیگچے کے چاروں طرف اور پھر ڈھکن پر بھی اس پتھر کے اچھل اچھل کر ضرب لگنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

اس جگہ موجود سارے لوگ اچنبھے کی حالت میں اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ہر آدمی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ کیا ہے، اور ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' لیکن کسی کے منہ سے ہلکی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی، سب سے زیادہ حیران و پریشان سلامت تھا، کیونکہ اسے معلوم تھا ہڈی میں پیوست سوئی اور دھاگہ وہی تھا جسے رات میں اس نے مدھو کی چندری میں پیوست کیا تھا۔

''مدھو تو جیتی جاگتی مجسم لڑکی تھی اور یہ ہڈی کیا ہے؟''

سلامت سکتے کے عالم میں تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس جگہ موجود سارے لوگ ہی سکتے کے عالم میں تھے کہ ''حکیم صاحب یہ کیا کر رہے ہیں؟''

دیگچے کے نیچے لکڑیاں جلتی رہیں اور دیگچے کے اندر سے مسلسل کسی پتھر کے اچھل کود کی زوردار آوازیں باہر سنائی دیتی رہیں۔

ایک گھنٹہ کے بعد دیگچے کے اندر سے آتی آوازیں مدھم ہونے لگیں اور پھر کافی دیر بعد دیگچے میں سے ہر قسم کی آوازیں آنی بند ہو گئیں۔

جب بالکل بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی تب بھی ایک گھنٹہ تک دیگچہ چولہے پر ہی رہا اور نیچے لکڑیاں جلتی رہیں۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد رولوکا نے چولہے کے نیچے سے جلتی لکڑیاں کھینچ دیں اور دیگچے کو چولہے پر ہی رہنے دیا۔ اس طرح مزید دیگچہ دو گھنٹے تک چولہے پر چڑھا رہا۔

دیگچہ جب بالکل ٹھنڈا ہو گیا تو رولوکا نے اسے اینٹ کے بنے ہوئے چولہے پر سے نیچے اتار لیا، اور کچھ پڑھ کر دیگچے پر پھونک ماری۔ اس کے بعد اس نے چاروں طرف سے مٹی ہٹائی، پھر اس نے ڈھکن پر سے رسی کھول دی۔

اور جب اس نے دیگچے پر سے ڈھکن کو ہٹایا تو ایک بہت ہی ناگوار بدبو اس جگہ پھیل گئی۔ لوگوں نے جھٹ اپنی ناک پر انگلی رکھ لی۔

بدبو ایسی تھی کہ جیسے گوشت کو کھولتے تیل میں ڈال کر جلایا گیا ہو، اور وہ گوشت جل جل کر کوئلہ اور پھر راکھ میں تبدیل ہو گیا ہو۔

کھولتے ہوئے تیل میں ہڈی جل کر بالکل ختم ہو چکی تھی۔ دیگچے میں ہڈی کا بالکل بھی نام و نشان نہیں تھا۔

لوگوں کی حیرانی میں اضافہ ہو گیا تھا کہ ان کے سامنے دیگچے میں موجود تیل میں ایک بالشت لمبی اور تقریباً تین انچ موٹائی کی ہڈی ڈالی گئی اور اب ہڈی کا دیگچے میں نام و نشان نہیں تھا۔ ساتھ ہی ساتھ سارا تیل بھی جل کر ختم ہو چکا تھا۔

پھر رولوکا نے دیگچے پر ڈھکن رکھا اور کچھ پڑھ کر دیگچے پر پھونکا۔ پھونک مارنے کے بعد اس نے اپنے دایاں پاؤں سے دیگچے کو دبایا تو دیگچہ ایسے چور چور ہو گیا کہ جیسے وہ المونیم کا مضبوط دیگچہ نہ ہو بلکہ بھربھری مٹی کا کچا دیگچہ ہو۔

اس منظر کو بھی دیکھ کر لوگ سکتے میں آ گئے کہ اتنا مضبوط المونیم کا دیگچہ کچی بھربھری مٹی میں کیسے تبدیل ہو گیا؟ اور یہ بات تھی بھی سارے لوگوں کو حیران کرنے والی۔

سلامت سے رولوکا بولا۔ ''سلامت ایک ڈبہ لے آؤ جس میں یہ ساری مٹی آ جائے۔''

''جی ابھی لایا۔'' بول کر سلامت گھر کے اندر چلا گیا۔ اور چند منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹین کا ڈبہ تھا۔ اس نے وہ ڈبہ لا کر رولوکا کے قریب رکھ دیا۔

رولوکا نے دیگچے والی ساری مٹی اٹھا کر ڈبہ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈال دی اور بولا۔ ”سلامت سامنے جوگندے پانی کا گڑھا ہے اس میں یہ ڈبہ پھینک کر آؤ۔“

سلامت نے ڈبہ اٹھایا اور اسے لے کر آگے کو بڑھ گیا۔ اس کے بعد رولو کا بولا۔ ”شرافت صاحب آپ یہاں پر موجود لوگوں سے کہیں کہ یہ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔“

سلامت کے والد شرافت علی نے کہا۔ ”بھائیو! آپ لوگ برائے مہربانی اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔“ ان کی بات سن کر کسی نے بھی کچھ نہ کہا اور اچنبھے میں رولو کا کو دیکھتے ہوئے اس جگہ سے چلے گئے۔

”حکیم صاحب! آپ برائے مہربانی تشریف رکھیں، کھانے کا وقت بھی ہوگیا ہے، میں کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔“

”نہیں شرافت صاحب مجھے بھوک نہیں اور ویسے بھی مجھے جلدی مطب میں پہنچنا ہے۔ خیر چلئے آپ کی بات، میں رد نہیں کرتا، آپ چائے پلا دیں۔“ رولو کا بولا۔

اتنے میں سلامت آ گیا تو اس کے بابا بولے۔ ”بیٹا ذرا جلدی سے اچھی سی چائے بنوا کر لے آؤ، حکیم صاحب جانے والے ہیں۔“ یہ سن کر سلامت فوراً گھر کے اندر چلا گیا۔

”حکیم صاحب! آپ نے یہ جو بھی کیا ہے، اگر آپ بتانا مناسب سمجھیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

”شرافت صاحب! دراصل آپ کے بیٹے کے ساتھ ایک بری آتما کا چکر ہوگیا تھا۔ وہ آتما آپ کے بیٹے کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ اب اسے کوئی جسمانی بیماری نہیں رہی۔ یہ آتما اس طرح اس کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ اگر بروقت اس کا علاج نہیں ہوتا تو آپ کا بیٹا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہو جاتا۔

اصل میں یہ آتما اس کے ساتھ کھلیان سے لگی تھی۔ آتمائیں یا روحیں رات میں اپنے مسکن سے باہر نکل آتی ہیں اور آزادانہ طور سے گھومتی پھرتی ہیں۔

آپ نے دیکھا تھا کہ میرے ہاتھ میں ایک ہڈی تھی۔ وہ آتما دن کے وقت ہڈی کی صورت اختیار کر کے آم کے درخت کے کھوہ میں پڑی جاتی تھی۔ میں نے اپنے تئیں معلوم کر لیا تھا کہ دن میں اس کا مسکن کہاں ہے؟ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ مجسم مل گئی۔ اگر مجسم نہیں ملتی تو بہت زیادہ دشواری ہوتی۔

میں نے اس کا خاتمہ کر دیا ہے، اب کسی قسم کا ڈر یا خوف نہیں۔ آپ نے گاؤں میں دو تین جو حادثات ہوئے تھے وہ بھی اسی کا چکر تھا، اگر اس کا خاتمہ نہیں ہوتا تو وقت کے ساتھ مزید جانی نقصانات ہوتے رہتے، اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا کہ آپ کا بیٹا بھی دنیا سدھار جاتا۔ اس قسم کی خاموش اور چپ بھٹکی ہوئی روحیں جو ہوتی ہیں بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ اس خاموشی سے اپنا کام کرتی ہیں کہ سامنے والے کو زیادہ تکلیف اور بیماری کا احساس نہیں ہوتا۔ کچھ روحیں یا بھوت چڑیل یا آسیب و جنات ہوتے ہیں جو کہ کسی پر سوار ہوتے ہیں اودھم مچاتے ہیں وہ فوراً نگاہوں میں آ جاتے ہیں، اور اس طرح لواحقین حرکت میں آ کر اس کا تدارک کرا دیتے ہیں۔ چپ چاپ اثر انداز ہونے والی روحوں میں یہ خرابی پیدا ہوتی ہے کہ یہ انسانی جسم میں داخل ہو کر کوئی نہ کوئی ایسی بیماری کی شکل اختیار کر لیتی ہیں کہ لوگ اس بیماری کا علاج کراتے رہ جاتے ہیں۔

میں آپ کو ایک چھوٹا سا مگر انتہائی خطرناک اور جان لیوا واقعہ سناتا ہوں۔

ایک شخص پر جادو کرا دیا گیا۔ جادو کرنے والے نے اپنا ایک گندا بیر اس شخص پر مستقل مامور کر دیا۔ جادوگر نے بیر کو پیٹ تک محدود کر دیا۔ شروع شروع میں اس شخص کے پیٹ میں درد اور مروڑ ہونے لگا۔ شروع میں چھوٹے چھوٹے ڈاکٹروں کے پاس وہ جاتا رہا۔ لیکن ہوا ایسا کہ

جوں جوں دوا کی مرض بڑھتا رہا

ہر روز تینوں وقت وہ دوا کھاتا رہا مگر پیٹ کا درد

کم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا، گاؤں کے ڈاکٹروں کو چھوڑ کر اس نے شہر کے ڈاکٹروں سے رجوع کرنا شروع کیا۔ جس ڈاکٹر کے پاس جاتا، ڈاکٹر اسے اپنے تجربے کے بنا پر نئی دوا لکھ کر دیتا اور اپنی فیس ہتھیا لیتا۔

درد کی شدت میں روز بہ روز افاقہ کے بجائے اضافہ ہونے لگا تھا۔ رات نو دس بجے کے بعد اس کے درد میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا جس سے اس کی چیخیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ چیخیں سن کر سارے گھر والے نیند سے بے کل ہو کر اٹھ جاتے، صبح تک یہی سلسلہ رہتا اور پھر سورج طلوع ہوتے ہی اس کے درد میں شدت کم ہو جاتی۔

مہنگی سے مہنگی دوا دے کر بھی ڈاکٹر پریشان تھے، کوئی دوا بھی زیادہ دیر پا اثر نہیں رکھ رہی تھی۔ مریض کی حالت دن بدن ناقابل برداشت ہونے لگی۔ جب وہ درد سے تڑپنے لگتا تو اس کی پریشانی اور تکلیف دیکھ کر لوگ دعائیں کرنے لگے تھے کہ ”اس تکلیف سے تو اچھا ہے کہ اسے موت آ جائے۔“

گھر والے اسے نئے سے نئے ڈاکٹر، وید حکیم اور پنڈتوں کے پاس لے کر جاتے جاتے بے حال ہو گئے تھے، جادو کرنے والے نے تین ماہ کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔ وہ لوگ تھے بھی کافی امیر، دراصل جگہ جائیداد کا مسئلہ تھا۔ اس کے مرنے سے اس کے بھائی کو فائدہ پہنچنے والا تھا۔

جس بھائی نے اس پر جادو کرایا تھا، وہ بھی لوگوں کو دکھانے کے لئے بھاگ دوڑ خوب کرتا تھا، رات رات بھر جاگ کر بھائی کے پاس بیٹھ کر اپنی چاہت و محبت کا اظہار کرتا تھا۔

پھر جب سارے لوگ اس کی بیماری سے تنگ آ گئے اور وہ مریض بھی بہت تھک گیا، جب اس کی تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ بھی دعا کرنے لگا کہ اسے موت آ جائے تو اچھا ہے۔ اور پھر ایک دن اس کی موت ہو گئی۔

اسے لے جا کر چتا پر رکھ دیا گیا۔ آگ زوردار طریقے سے اس کے بدن کو جھلسانے لگی۔ تو لوگوں نے ایک بہت ہی بھیانک منظر دیکھا۔ اس منظر کو دیکھ کر اس جگہ موجود لوگ سکتے میں آ گئے، ان کے دل دہل کر رہ گئے۔

وہ بھیانک منظر تھا۔ اس شخص کا پیٹ بہت تیز آواز سے پھٹا اور ایک گول سی چھوٹی تھیلی نکل کر چتا سے دور جا پڑی۔

اچنبھے کی حالت میں لوگ اس طرف بڑھے، جب لوگوں نے اس جگہ جا کر دیکھا تو دنگ رہ گئے وہ تھیلی گول مٹول تھی۔ اس میں کسی طرف بھی ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اس میں اندر یا باہر کسی چیز کے آنے جانے کے لئے کوئی راستہ ہو۔

تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگوں نے جب اس تھیلی کو پھاڑا تو بالکل ہی حیران ہو گئے۔ کیونکہ اس تھیلی میں وہ تمام دوائیں موجود تھیں جو وہ کھاتا رہا تھا۔

پورا گاؤں اس واقعے کا سن کر حیران تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ ایک مریض تین ماہ تک دوائیں کھاتا رہا، اور وہ دوائیں پیٹ میں الگ ایک تھیلی میں جمع ہوتی رہیں۔

تھوڑے عرصہ بعد ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے بہت ہی رازدارانہ انداز میں مرنے والے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بہت واسطے دیئے اور یہ وعدہ کیا کہ اب وہ اس کا ردعمل ظاہر نہیں کرے گا تو میں نے اسے اصل واقعہ بتا دیا۔ جسے سن کر وہ کانپ کر رہ گیا اور بولا۔

”حکیم صاحب کیسا زمانہ آ گیا ہے کہ ایک بھائی ایک بھائی کی جائیداد ہتھیانے کے لئے ایسا ظلم کر بیٹھا، کیا وہ بھگوان کو منہ نہیں دکھائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”خیر! یہ تو اپنے اپنے ضمیر کی بات ہے۔ ہر انسان نے مرجانا ہے، اور مرنے کے بعد مرنے والا اپنے ساتھ کیا لے جاتا ہے۔

تو ہاں! شرافت صاحب اب آپ کا بیٹا بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب میں چلتا ہوں اور کل اسے میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس بھیج دیجئے گا، میں کچھ دوائیں دوں گا جس کے استعمال سے یہ چند روز میں صحت یاب ہو جائے گا۔

آپ نے بہت اچھی چائے پلائی اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔"

اتنے میں سلامت بھی اس جگہ آ گیا۔ جو کہ چائے رکھ کر گھر میں چلا گیا تھا۔

رولو کا بولا۔ "سلامت کل تم میرے پاس ضرور آنا۔ میں تمہیں چند دوائیں دوں گا، جس سے تم چند روز میں اپنے جسم میں مکمل توانائی محسوس کرنے لگو گے، تمہاری ساری جسمانی کمزوری بھی دور ہو جائے گی۔"

رولو کا نے دونوں باپ بیٹے سے ہاتھ ملایا اور چل پڑا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے روپوشی اختیار کی اور پلک جھپکتے دلی اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

صبح ہوئی اور دن کے دس بجے حکیم وقار کے مطب میں سلامت پہنچ گیا۔ حکیم وقار بہت ہی اپنائیت سے اس سے ملے، رولو کا کی زبانی حکیم وقار کو سلامت کی بیماری کا سبب معلوم ہو گیا تھا۔ چند منٹ میں رولو کا اس جگہ آیا تو سلامت کو دیکھ کر خوش ہوا اور بولا۔ "تم میرے کمرے میں آؤ۔"

رولو کا کی بات سن کر سلامت اٹھ گیا اور رولو کا کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اپنے کمرے میں جا کر رولو کا بیٹھ گیا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"سلامت میاں اور سناؤ! رات میں مدھو تو نہیں آئی۔" رولو کا بولا۔

"حکیم صاحب مدھو تو نہیں آئی مگر اس کی یاد رات بھر مجھے پریشان کرتی رہی، میں نے رات اس طرح گزاری ہے جیسے انگاروں پر لیٹ کر۔" سلامت بولا۔

"سلامت شکر کرو کہ تم بچ گئے، ورنہ زیادہ دنوں کے مہمان تم نہیں تھے، بس یہ سمجھو لو کہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ تمہاری زندگی کا رہ گیا تھا۔

دراصل مدھو ایک چڑیل تھی۔ جو کہ تم پر فریفتہ ہو گئی تھی۔

وہ جوان بن کر آتی تھی اور تمہارے ساتھ وقت گزارتی تھی۔ اس کے ساتھ تم جذبات کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتے تھے۔ تمہاری جسمانی کمزوری آخری حدوں کو چھونے لگی تھی۔

اپنے پروگرام کے تحت تمہاری موت کے بعد، تمہاری روح کو وہ اپنے قبضے میں کر لیتی، جس کا اظہار وہ تم سے کر چکی تھی کہ "میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

وہ رات میں گوشت پوست کی زندہ جوان بن کر تمہارے پاس آتی اور دن میں آم کے درخت پر کھوہ میں ہڈی بن کر پڑی رہتی تھی۔

تم نے جو سوئی اس کی چندری میں لگائی تھی، جس کا اسے پتہ نہیں چلا۔ دن کے وقت تم نے دیکھا کہ جب وہ ہڈے بن کر پڑی رہی تو وہ سوئی اس ہڈی میں پیوست نظر آ رہی تھی۔ میں نے لمبا سا دھاگہ اس سوئی میں یوں لگایا تھا کہ وہ دھاگہ لٹکتا ہوا نظر آ جائے، اور ایسا ہی ہوا۔

دراصل ہڈی کی شکل میں موجود مدھو تھی، اور تم نے دیکھا کہ جب ہڈی تیل میں جھلسنے لگی تو کس طرح دیگچے میں اچھل کود کرنے لگی تھی اور پھر انسانی گوشت کے جلنے کی بو ہر طرف پھیل گئی تھی، اب تمہاری مدھو جو کہ تمہاری موت بن کر آئی تھی، اس کا خاتمہ ہو چکا ہے، تم کسی قسم کا اندیشہ نہیں کرو۔ چند دن میں تم صحت مند ہو جاؤ گے۔

یہ دوائیں لیتے جاؤ ایک ہفتہ تک استعمال کرنا، تمہارے جسم کی ساری توانائی بحال ہو جائے گی اور تم مکمل صحت مند نظر آؤ گے، جاؤ کھاؤ پیو اور خوش رہو۔

میں نے مدھو کا ذکر تمہارے بابا سے نہیں کیا تھا کہ تم مدھو سے کس حالت میں ملتے رہے ہو، اب تم جاؤ۔

رولو کا سے سلامت نے مصافحہ کیا، شکریہ ادا کیا اور گھوڑا گاڑی پر بیٹھ کر اپنے گاؤں واپس آ گیا۔

(جاری ہے)

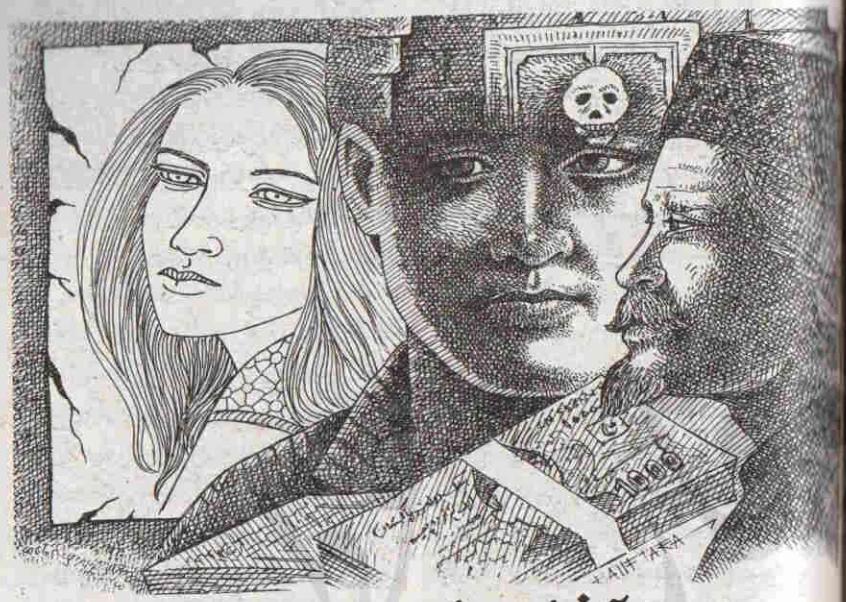

آخری چوری

ذیشان اقبال عظمی۔ کراچی

اچانک اس شخص کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب گر پڑا کیونکہ جنہیں وہ سویا ہوا سمجھ رہا تھا دراصل وہ مردہ لاشیں تھیں۔ ایک نہایت ہی بھیانک اور لرزہ خیز منظر تھا۔

روحوں کے نرغہ میں پھنسے ہوئے ایک شخص کا دردناک خوفناک اور لرزہ خیز شاخسانہ

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں ایک پیشہ ور چور ہوں۔ دوسرے مختلف پیشوں کی طرح چوری بھی ایک پیشہ ہے۔ معلوم نہیں لوگ کیوں اسے برا سمجھتے ہیں۔ دوسرے پیشوں میں تو صرف محنت اور لگن درکار ہوتی ہے۔ چوری کرنے میں محنت، لگن اور پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ رسک بھی شامل ہوتا ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ دوسروں کی اجازت کے بغیر ان کی دولت لوٹ لینا غیر اخلاقی کام ہے۔ تو جناب کسی امیر شخص کی دولت میں سے حسب ضرورت مال لے لینا کوئی غلط کام تو نہ ہوا۔ اگر یہی امیر لوگ اپنی دولت کا ایک حصہ خود ضرورت مند افراد کیلئے وقف کر دیں تو مجھ سمیت دوسرے کئی چوروں کو اپنی جان خطرے میں نہ ڈالنی پڑے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر دولت مند افراد اپنی کچھ دولت سے مستحق افراد کو سہارا دے دیں تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معاشرے سے چوری چکاری کا پیشہ ہی ختم ہو جائے۔ لیکن نہیں!!! امیر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئے گی۔ مہنگے ہوٹلوں میں جا کر پیسہ لٹا دیں گے، علاج کے نام پر مہنگے ڈاکٹروں اور اسپتالوں سے لٹنا پسند کریں گے لیکن کوئی اگر ان کا تھوڑا سا پیسہ بقدر ضرورت چرا لے تو شور مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔

پولیس کے بڑے بڑے افسران تک رسائی حاصل کریں گے، ٹی وی اور اخباری نمائندوں کو اپنی بپتا سنائیں گے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے انصاف کی اپیل کریں گے اور اگر چور بدقسمتی سے پکڑا جائے تو پوری کوشش کریں گے کہ غریب کو پھانسی میں چڑھا دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان امیر لوگوں کے محلوں میں چوری کرتے ہوئے کوئی شرمندگی یا عار محسوس نہیں کرتا۔ ہاں میری حتی المقدور کوشش ہوتی ہے کہ کسی متوسط طبقے یا نچلے طبقے کا کوئی شخص میری ضد میں نہ آئے۔

اپنے پیشے میں مہارت حاصل کرنے کیلئے میں نے برسوں دردر کی خاک چھانی تھی۔ مختلف استادوں سے مختلف ہنر سیکھے تھے اور کچھ کاریگری سیکھنے کیلئے تو جان بوجھ کر جیل گیا تھا کیونکہ مطلوب استاد ان دنوں جیل میں تھا۔ اس سے آپ میری لگن اور جستجو کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن ہر انسان کی زندگی میں کچھ ایسے لرزہ خیز اور ناقابل فراموش واقعات پیش آتے ہیں جو اس کی زندگی کا رخ تبدیل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ بحیثیت چور میں نے زندگی میں لاتعداد مشکل اور جان لیوا حالات کا سامنا کیا ہے لیکن جو واقعہ میں ذیشان اقبال عظمی صاحب کی معرفت آپ کے سامنے دہرانے جا رہا ہوں، اس کے بارے میں سوچتے سے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

وہ سردیوں کی ایک کہر آلود رات تھی۔ ٹھنڈ اپنے زوروں پر تھی اس لئے رات جلد ہی بازار اور سڑکوں پر سناٹا چھا گیا تھا۔ میرے کام کیلئے یہ ایک نہایت موزوں رات تھی۔ میں نے کافی دن پہلے ہی اک بنگلے کو تاکا ہوا تھا اور مختلف اوقات میں اس بنگلے کا جائزہ لے کر اور ادھر ادھر سے معلومات حاصل کر کے میں نے اس امر کو یقینی بنا لیا تھا کہ میرا مطلوب ہدف کم سے کم مشکل اور زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہو۔ میری معلومات کے مطابق بنگلے کے مکین صرف ایک میاں بیوی تھے اور دونوں ہی ملازمت سے وابستہ تھے۔ ان کے علاوہ بنگلے میں ایک جز وقتی تو نوکر اور ایک کل وقتی چوکیدار تھا۔ میں نے یہ بات بطور خاص نوٹ کی تھی کہ چوکیدار بالکل مستعد نہیں تھا اور ہمہ وقت دروازے کے پاس ہی بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی زیادہ تر توجہ بنگلے کے بجائے ریڈیو سننے یا مونچھیں سنوارنے پر ہوتی تھی اور میرے نقطہ نظر سے یہ بات بہت اچھی تھی۔

رات گہری ہونے کے بعد میں نے اپنا مخصوص سیاہ چست لباس پہنا، ضروری آلات سے لیس ہو کر اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور ٹہلتا ہوا اپنے مطلوبہ بنگلہ کی طرف چلنے لگا۔ حسب توقع سڑکوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آج ہوا بھی معمول سے کچھ زیادہ سرد اور تیز تھی۔ بجلی کے محکمے کی قابل ستائش کارکردگی کی وجہ سے اسٹریٹ لیمپ تاریک پڑے تھے اور سڑکوں پر تاریکی کا راج تھا۔ کہیں کہیں کوئی اکلوتا ٹمٹماتا ہوا زرد بلب اندھیرے سے جدوجہد کرتا نظر آ جاتا۔ بجلی کے محکمے کے اس تعاون کیلئے چور برادری ہمیشہ سے ان کی ممنون رہی ہے۔ مجھے اپنی منزل تک پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ بلکہ رات کا زیادہ گذرنا میرے حق میں زیادہ بہتر تھا۔ اس لئے میں اطمینان سے ٹہلتا ہوا ماحول پر طائرانہ نظر ڈالتا چلا جا رہا تھا۔ دکانیں بند پڑی تھیں اور گھروں کے کھڑکی دروازے بھی بند نظر آ رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ راہ گیر بغلوں میں ہاتھ دبائے تیزی سے چلتا ہوا گزر جاتا تھا۔ مطلوبہ بنگلے کے پاس پہنچ کر پہلے میں اس کے مرکزی گیٹ کے سامنے سے گذرا تاکہ صورت حال کا جائزہ لے سکوں، گیٹ پر ایک دو سو واٹ کا بلب جل رہا تھا۔ چوکیدار شاید گیٹ کے اندر چارپائی ڈال کر لیٹا ہوا تھا کیونکہ ریڈیو سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ میں گھوم کر عقبی سمت میں پہنچا۔ بنگلے کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک سفیدے کا درخت موجود تھا جسے میں کئی دن

پہلے ہی تاک چکا تھا۔

درخت کے پاس پہنچ کر میں نے کمر سے بندھی بیلٹ کھولی اور درخت کے گرد گھما کر دونوں ہاتھوں سے پلٹ کے سرے تھام لئے۔ یہ اس قسم کے درختوں پر چڑھنے کی ایک موثر اور محفوظ تکنیک تھی۔ بیلٹ کی مدد سے میں درخت کے تنے پر پیر جماتا ہوا کچھ ہی لمحوں میں دیوار کے سرے تک پہنچ گیا۔ دیوار پر کانچ کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے لیکن میں پوری طرح تیار تھا۔ درخت سے لٹکے لٹکے میں نے ایک ہاتھ سے اپنے بیگ کی زپ کھول کر چادر نکالی اور دیوار پر پھینک دی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے درخت سے ہاتھ چھوڑ کر دیوار پر پیر رکھے اور گھر کے اندر کود گیا۔ میرے پیروں میں موجود ربڑ سول کے جوتوں کی وجہ سے کوئی خاص دھمک پیدا نہیں ہوئی۔ میں چند لمحوں تک یونہی دبکا بیٹھا کسی متوقع ردعمل کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرے کودنے کی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی تو میں اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ حسب توقع مقفل تھا لیکن ایسے تالے کھولنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میں نے جیب سے ایک "L" کی شکل کی چھوٹی راڈ جو ایک مڑی ہوئی تار نکالی۔ راڈ کو تالے کے اوپری حصے میں پھنسانے کے بعد میں نے مڑی ہوئی تار تالے کے سوراخ میں ڈال کر ایک مخصوص طریقے سے ہلائی اور پھر راڈ کو گھمایا تو ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ کمرہ روشن ہو گیا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

اب اسے میں اپنی بدقسمتی ہی کہہ سکتا تھا کہ وہ کمرہ دراصل کچن تھا جس کے عقبی دروازے سے میں اندر داخل ہوا تھا۔ کچن میں اس وقت ایک موٹی عورت شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں کھڑی تھی۔ ابھی اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، اس نے مجھے دیکھ لیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے حلق سے ایسی چیخ برآمد ہوئی جیسے اس کے سامنے کوئی آدمی نہیں بلکہ تین سر اور چار ہاتھ والی کوئی بلا نمودار ہو گئی ہو۔ میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی اور پھرتی سے واپس مڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ اب اس عورت کی چیخیں پورے بنگلے میں گونج رہی تھیں۔ میں نے واپس دیوار کے پاس پہنچ کر کمر سے بندھی ہوئی رسی کھولی جس کے ایک سرے پر آنکڑہ بندھا ہوا تھا۔ رسی کو دو تین بار جھلا دینے کے بعد میں نے مخصوص مہارت سے اسے دیوار کی طرف اچھالا تو پہلی ہی بار میں آنکڑہ دیوار میں جا کر پھنس گیا۔ میں رسی کی مدد سے دیوار پر پاؤں جماتا ہوا دیوار پر چڑھنے لگا۔

ابھی میں دیوار کے سرے تک پہنچنے ہی نہ پایا تھا کہ مجھے بنگلے کی طرف سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ یقیناً بنگلے کے مکین اور چوکیدار وغیرہ کو میری آمد کی تفصیلات مل چکی تھیں اور اب وہ اسی طرف آ رہے تھے۔ جیسے ہی میرے ہاتھ دیوار کی منڈیر تک پہنچے، میں نے ایک موٹی تو ندوالے گنجے آدمی کو چوکیدار کے ساتھ بھاگ کر آتے ہوئے دیکھا۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر پیر منڈیر پر جمائے اور باہر کود گیا۔ بنگلے کی دیوار خاصی اونچی تھی لیکن اس وقت کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ ہاتھ پیر سنبھال کر کودنے کے باوجود میرا بایاں ٹخنہ کسی پتھر سے ٹکرا کر بری طرح مڑا اور میرے منہ سے بے ساختہ ایک کراہ نکل گئی۔ خود پر قابو پا کر میں جیسے تیسے اٹھا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ ابھی میں گلی کے سرے تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ چوکیدار کی تیز سیٹی کی آواز سے پورا علاقہ گونجنے لگا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گلی میں ٹارچ کی لہراتی ہوئی روشنی نظر آ رہی تھی۔ شاید چوکیدار میرے پیچھے آ رہا تھا۔

"کتے کا بچہ۔" میں نے زیر لب اسے گالی دی اور اپنی رفتار ممکنہ حد تک بڑھا دی۔ حالانکہ میرے بائیں ٹخنے میں شدید تکلیف ہو رہی تھی اور بایاں قدم زمین پر رکھتے ہی درد کی ایک لہر ٹخنے سے ہوتی ہوئی میری پوری ٹانگ میں سرائیت کر جاتی لیکن میں دانت بھینچے مسلسل بھاگ رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ چوکیدار جلد میرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہے۔ اسے اپنی غفلت کا احساس تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے میں بنگلے میں داخل ہونے میں کامیاب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگیا تھا۔ اب اپنی نوکری بچانے اور مالک کی نظر میں ہیرو بننے کی یہی صورت تھی کہ وہ مجھے پکڑ کر اپنے مالک کے سامنے پیش کردیتا۔ مجھے جیل جانے میں کوئی ایسا خاص مسئلہ نہیں تھا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ کسی چور کے پکڑے جانے پر پہلے سب مل کر چور کی اچھی خاصی دھلائی کرتے ہیں۔ محلے کا ہر فرد، ہر نوکر، ہر ایرا غیرا چور کو یوں پیٹتا ہے جیسے چوری اس کے گھر ہوئی ہو۔ یہ چور کو سزا کم دیتے ہیں اور اپنی ذاتی زندگی کی محرومیوں کا غصہ زیادہ نکالتے ہیں۔ تیز مزاج میری، بدتمیز اولاد، مہنگائی، چڑچڑا باس، کم آمدنی، ترقی کرتے دوست، دسترس سے باہر خوبصورت لڑکی، بوڑھے بیمار والدین اور ایسے کئی معاملات کی بھڑاس وہ چور پر ہی نکالتے ہیں۔

فی الحال ان کو ایسا موقع دینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ چوکیدار نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا اور اب وہ مسلسل میرے پیچھے ہی دوڑ رہا تھا۔ میں ادھر ادھر گلیوں میں گھوم کر اسے غچہ دینے کی کوشش کررہا تھا لیکن اس نے بھی شاید آج ٹھان لی تھی کہ اپنی نوکری نہیں جانے دے گا۔ سالوں میں ایک آدھ بار تو اسے ہاتھ پیر ہلانے کا موقع ملتا ہوگا۔ ادھر میری یہ حالت تھی کہ پیر کی تکلیف کی وجہ سے میری رفتار لحہ بہ لحہ کم ہوتی جارہی تھی۔ اگر میں جلد ہی چوکیدار کو اپنے تعاقب سے نہ جھٹکتا تو وہ مجھے پکڑنے میں کامیاب ہوسکتا تھا۔ بھاگتے بھاگتے میری نظر ایک پرانے مکان پر پڑی جو پوری طرح سے تاریک پڑا تھا۔ آس پاس کے مکانوں میں برآمدے کے بلب جلتے نظر آرہے تھے اس کا مطلب تھا کہ مکان خالی پڑا تھا۔ کچھ دیر چھپنے کیلئے یہ ایک اچھی جگہ ہوسکتی تھی۔ گو یہ صرف میرا اندازہ تھا کہ مکان خالی ہے لیکن اس وقت رسک لئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے مکان کے دروازے پر ہنر آزمائی کی اور اگلے ہی لمحے میں مکان کے اندر تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی میں سانس روک کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر بعد باہر سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ آواز قریب آنے کے بعد لحہ بہ لحہ دور جانے لگی اور پھر معدوم ہوگئی۔

چوکیدار یقیناً میری تلاش میں آگے جاچکا تھا۔ فی الحال میرا یہاں چھپے رہنا ہی بہتر تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ جیب سے ٹارچ نکال کر مکان کا جائزہ لوں کہ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کون ہے؟" یہ ایک نسوانی آواز تھی جو مکان کے اندر کہیں سے آئی تھی۔ میں ہوشیار ہوکر اپنی جگہ دبک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ مکان بہرحال خالی نہیں تھا۔ واپس باہر جانے کا مطلب اپنی شامت کو آواز دینا تھا۔ اور اگر اس مکان کے لوگ شور مچادیتے تو بھی برا حشر ہونا تھا۔ ابھی میں کوئی لائحہ عمل سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کچھ قدم کے فاصلے پر ایک عورت کھڑی نظر آئی جس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی موم بتی تھی۔ وہ اس قدر اچانک سامنے آئی تھی کہ مجھے ہلنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ اب عملاً میں پھنس چکا تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے جیسے الجھن کے عالم میں پوچھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اس عورت کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسے یہاں کسی چور کی آمد کی توقع نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر خوف یا پریشانی نہیں تھی، صرف حیرت تھی۔

"وہ..... دراصل..... میرے پیچھے دشمن لگے ہوئے ہیں۔ تو..... میں جان بچانے کیلئے یہاں آپہنچا۔ اگر آپ مجھے کچھ دیر یہاں چھپا رہنے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔" میں نے جلد از جلد ایک کہانی گھڑ کر سناتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی میں نے چہرے پر معصومیت اور شرافت کے تاثرات قائم کرلئے۔ پریشانی کی ایکٹنگ کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں اس وقت واقعی پریشان نظر آرہا تھا۔ عورت کچھ دیر تک کھڑی سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی اور بے جان سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"آجاؤ۔ اندر آجاؤ۔" یہ کہہ کر وہ مڑی اور واپس اندر جانے لگی۔ میں لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ یہ ایک چھوٹی سی راہداری تھی جس کے

اختتام پر ایک ہال نما کمرہ موجود تھا جس کے اطراف میں کمرے موجود تھے۔ وسطی دیوار کے ایک طرف سیڑھیاں بھی موجود تھیں جو یقیناً اوپری منزل کو جاتی تھیں۔ باہر سے یہ مکان جتنا پرانا اور کھنڈر نما لگ رہا تھا، اندر سے اس کے بالکل برعکس تھا، کمرے کے درمیان ایک بڑی میز اور اس کے گرد کرسیاں موجود تھیں۔ عورت نے موم بتی لے جاکر میز پر رکھ دی۔ میں بھی ایک کرسی پر جا کر ٹک گیا۔

"یہاں روشنی کیوں نہیں ہے؟ آس پاس کے گھروں میں تو بجلی آرہی ہے۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ پتہ نہیں کیا ہوگا۔ پہلے بھی روشنی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیوں اندھیرا ہوگیا۔" عورت نے عجب گول مول لہجے میں کہا۔

اچانک کسی نے زور سے باہر کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔ میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" عورت نے سپاٹ لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"ام کو معلوم ہے تم ادھر ای چھپا ہے چور کا بچہ۔ تمہارا کیچڑ والا پیر کا نشان ادھر تک ای آیا ہے۔،، باہر سے چوکیدار کی غصے سے بھری آواز آئی۔ میں نے بے ساختہ اپنے پیروں کی جانب دیکھا۔ میرے پیر واقعی مٹی اور کیچڑ میں اٹے ہوئے تھے۔ اب نہ جانے یہ کیچڑ کہاں سے پیروں میں لگی تھی لیکن اب یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اگر چوکیدار اس عورت کو بتادیتا کہ میں ایک چور ہوں۔ تو یہ مکان جو میرے لئے جائے پناہ تھا۔ ایک چوہے دان بن جاتا۔ اب مجھے اس مکان سے نکلنا تھا لیکن سامنے کے رخ پر چوکیدار موجود تھا۔

"چلو کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔" یہ سوچ کر میں نے موم بتی اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور موم بتی بجھ گئی۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی کیونکہ کمرے میں ہوا کا کوئی گزر نہ تھا۔ جتنی دیر میں یہاں بیٹھا رہا تھا، معمولی سی ہوا بھی محسوس نہیں ہوئی تھی نہ ہی موم بتی کا شعلہ لہرایا تھا۔ یہ تو ایسا لگا تھا جیسے کسی نے پھونک مار کر موم بتی بجھادی ہو۔ مگر اس وقت میرے پاس ان باتوں پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر روشن کی اور ان سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا جو پہلی منزل کی طرف جارہی تھیں۔ اگر مجھے کسی کمرے کی کھڑکی کے باہر کوئی سیوریج پائپ وغیرہ مل جاتا تو میں یہاں سے باہر نکل سکتا تھا۔ پہلی منزل پر پہنچ کر مجھے جو پہلا دروازہ نظر آیا، میں اس میں داخل ہوگیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب ناگوار سی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ شاید کمرے میں چوہوں کا آنا جانا تھا۔ میں نے ٹارچ کی محدود روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں ایک قد آدم الماری اور سنگار میز کے علاوہ ایک جہازی سائز کا بستر بھی موجود تھا جس پر کوئی کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ میں نے فوراً ٹارچ کا رخ زمین کی جانب کردیا تاکہ جو کوئی بھی بستر پر سو رہا ہے وہ جاگ نہ جائے۔ ٹارچ بجھانے کا خطرہ میں اس لئے مول نہیں لے سکتا تھا کہ اس طرح کمرے میں گھپ اندھیرا ہوجاتا اور میں اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا بھی سکتا تھا۔

میں دبے پاؤں اس کھڑکی کی طرف بڑھا جو کمرے کی عقبی دیوار میں نصب تھی۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر میں نے پھر بستر پر ایک نظر ڈالی۔ یہ کوئی عورت تھی جو چار بچوں کو اپنے برابر لٹا کے سو رہی تھی۔ ٹارچ کا رخ زمین کی طرف ہونے کی وجہ سے مجھے صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن ان کے بے حس و حرکت ہونے سے معلوم ہورہا تھا کہ یہ سب گہری نیند میں ہیں۔ میں نے آہستہ سے کھڑکی کی چٹخنی گرائی اور پوری احتیاط سے کھڑکی کا پٹ اس طرح کھولا کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ لیکن یہ دیکھ کر میری امیدوں پر اوس پڑ گئی کہ کھڑکی میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے کھڑکی کا پٹ واپس بند کیا تو اچانک چڑچڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز سن کر میری تو جان ہی نکل گئی کیونکہ آواز خاصی اونچی تھی اور کسی نہ کسی آنکھ کا کھلنا لامحال تھا۔ لیکن اس قدر تیز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آواز کے باوجود وہ سب سوئے پڑے رہے۔ میں نے تعجب سے بستر کی جانب دیکھا۔ نیم تاریکی میں ان کے ہیولے بے حس و حرکت نظر آرہے تھے۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ ایک عورت اور چار بچوں میں سے کوئی کسمسایا تک نہیں۔ میں نے ہمت کرکے ٹارچ کا رخ بستر کی جانب کیا۔

دوسرے ہی لمحے میرے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی اور میں لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب گر پڑا۔ کیونکہ جنہیں میں سویا سمجھ رہا تھا وہ دراصل مردہ لاشیں تھیں۔

چہرے اور جسم کا گوشت جگہ جگہ سے ادھڑ چکا تھا اور ان میں سے جسم کی ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ یہ ایک نہایت ہی بھیانک اور لرزہ خیز منظر تھا۔ یہ لاشیں نہ جانے کب سے یہاں اس حالت میں پڑی تھیں۔ کمرے میں بو بھی انہی لاشوں کی وجہ سے پھیلی ہوئی تھی۔ میں کسی طرح حواس مجتمع کرکے گرتا پڑتا کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر نکل کر میں ہانپتا کانپتا سیڑھیوں سے نیچے پہنچا۔ جیسے ہی میں بیرونی دروازے والی راہداری کے قریب پہنچا، باہر سے کسی کے دروازہ کھولنے کی آواز آئی۔ میں فوراً دوسری طرف پلٹا اور لنگڑاتا ہوا نچلی منزل کے کمروں کی طرف بھاگا۔ پہلے دو کمروں کے دروازے مقفل تھے۔ تیسرے کمرے کے دروازے کے ہینڈل پر میں نے جیسے ہی ہاتھ رکھا وہ گھوم گیا۔ میں دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ کمرہ اندر سے بالکل خالی تھا۔ کوئی فرنیچر کوئی سامان نہیں تھا۔

لیکن کمرے میں کافی سارے لوگ خاموشی سے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا انداز اتنا غیر فطری تھا کہ پہلے تو میری سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا کہ ایک خالی کمرے میں اتنے لوگ خاموش کیوں کھڑے ہیں۔ پھر میں نے ٹارچ کی روشنی کا رخ ان کے چہروں کی جانب کیا تو یہ دیکھ کر میری جان نکل گئی کہ سب کے چہرے لاشوں کی طرح سفید ہیں اور سب کی آنکھیں اوپر کی جانب چڑھی ہوئی ہیں۔ خیر میں نے ٹارچ کا رخ واپس زمین کی طرف کیا تو مجھے پھر جھٹکا لگا کہ سب کے پیر زمین سے چھ انچ اوپر ہوا میں معلق تھے۔ مجھ پر بے اختیار کپکپی طاری ہوگئی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ یہ سارے لوگ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھ رہے ہیں۔ میں گھبرا کر پلٹا اور کمرے سے باہر نکل کر بھاگتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف لپکا۔ ابھی میں راہداری میں ہی پہنچا تھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے جکڑ لیا۔ میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔

''کہاں جاتا ہے چور کا بچہ۔ آج تم کو پکڑ لیا۔'' یہ وہی چوکیدار تھا جو میرا پیچھا کررہا تھا۔

''بھاگو۔ بھاگو۔ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ یہاں بدروحیں موجود ہیں۔ بھاگو۔'' میں نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کیا بکواس کرتا ہے خبیث کا بچہ؟ آج ہم آسیب کو بھی دیکھ لے گا۔ مگر تم کو نہیں چھوڑے گا۔'' چوکیدار نے درشت لہجے میں کہا۔ اچانک مکان عجیب پر ہول آوازوں سے گونجنے لگا۔ چوکیدار نے گھبرا کر مجھے چھوڑ دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ آوازیں مکان کے در و دیوار سے ابھر رہی ہوں۔ یہ ایسی دل دہلا دینے والی آوازیں تھیں جن کو سن کر ہاتھ پیروں سے جان نکلی جارہی تھی۔

اچانک چوکیدار کا جسم ہوا میں یوں اٹھنے لگا جیسے کسی نے اسے گردن سے پکڑ کر اٹھا لیا ہو۔ خوف کے مارے چوکیدار کی آنکھیں باہر کو ابل آئی تھیں اور وہ ہوا میں بری طرح ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اچانک اس کا جسم پچھلی جانب سے دوہرا ہوا اور ساتھ ہی فضا میں ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز ابھری۔ چوکیدار کا ہاتھ پیر مارتا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

میرے تو ویسے ہی اوسان خطا ہو چکے تھے لیکن اس وقت نہ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی قوت آگئی کہ میں ایک لمحہ بھی رکے بغیر دروازے کی طرف بھاگا۔ میرے پیچھے کئی غیر انسانی آوازیں ابھریں لیکن میں پلٹ کر دیکھے بنا بھاگتا رہا اور مکان سے باہر آگیا۔ مکان سے باہر آکر بھی میں نے ادھر ادھر نہیں دیکھا اور

بھاگتا چلا گیا۔ نہ جانے کتنی دیر میں اور کیسے میں اپنے ٹھکانے پر پہنچا اور گھر میں داخل ہوتے ہی فرش پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

اگلے روز نہ جانے کب مجھے ہوش آیا۔ مجھے تیز بخار تھا اور میرا ذہن پوری طرح کام نہیں کررہا تھا۔ نیم غشی کی کیفیت میں، میں نے اپنے ایک ساتھی کو فون کرکے اطلاع دی کہ مجھے فوری مدد کی ضرورت ہے۔ نہ جانے وہ کب آیا اور مجھے اٹھا کر اسپتال لے گیا۔ یہ مجھے اس نے بعد میں بتایا کہ مجھے تین روز تک شدید بخار رہا اور میں نیم بے ہوشی کی حالت میں ہذیان بکتا رہا۔ میرے پیر کی موچ بری طرح بگڑ گئی تھی جسے ٹھیک ہونے میں کافی وقت لگا۔ پوری طرح صحت یاب ہونے کے بعد میں پھر تجسس کے باعث اسی مکان کی طرف گیا لیکن اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں پڑی۔

آس پاس کے گھروں اور دکانوں سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کا لب لباب یہ تھا کہ کافی عرصہ پہلے وہ مکان ایک عمر رسیدہ جوڑے کا تھا جن کی کوئی اولاد نہ تھی۔ کافی عرصہ بعد اولاد سے مایوس ہوکر انہوں نے ایک یتیم بچے کو گود لے لیا اور ناز و نعم سے اس کی پرورش کی۔ لیکن وہ لڑکا بڑا ہوکر ناخلف نکلا اور بری عادتوں میں پڑ گیا۔ ماں باپ نے اس کی شادی ایک سیدھی سادی لڑکی سے کردی کہ شاید شادی کے بعد وہ سدھر جائے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ الٹا اس نے جائیداد کے چکر میں مبینہ طور پر اپنے ماں باپ کو زہر دے کر مار دیا۔ مشہور یہی کیا گیا کہ باپ کو دل کا دورہ پڑا اور ماں اس کی موت کا صدمہ برداشت نہ کرسکی اور خالق حقیقی سے جا ملی۔ اس کی بیوی اصل حالات سے بے خبر تھی۔

شادی کے چھ سالوں میں اس کے بطن سے چار بچے پیدا ہوئے اور چاروں کی چاروں لڑکیاں تھیں۔ شوہر نے لڑکیوں کی پیدائش کیلئے اسی کو مورد الزام ٹھہرایا اور آئے دن اس پر ظلم کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی بیوی پر بدکاری کا الزام تک لگا دیا اور کہا کہ یہ چاروں کسی اور کی ناجائز اولاد ہیں۔ بیوی نے دلبرداشتہ ہوکر اپنے اور بچوں کے کھانے میں زہر ملا کر بچوں سمیت خودکشی کرلی۔ شوہر کو کوئی ایسا خاص صدمہ نہیں ہوا بلکہ الٹا وہ خوش ہوا کہ آزادی مل گئی۔ لیکن ماں باپ اور بیوی بچوں کی بے چین روحیں انصاف کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔

ایک روز وہ مکان میں ایسا سویا کہ پھر نہ اٹھا۔ کچھ روز بعد جب مکان سے تعفن اٹھا تو محلے داروں نے دروازہ توڑ کر اس کی لاش دریافت کی۔ اس کی لاش اس حالت میں ملی کہ گردن سمیت جسم کی ہر ہڈی چور چور ہو چکی تھی اور آنکھیں زبان موجود نہیں تھیں۔ اس کے بعد وہ مکان آسیب زدہ مشہور ہوگیا اور پورے محلے میں یہ بات پھیل گئی کہ جو بھی رات کے وقت اس مکان میں داخل ہوتا ہے۔ اگلے روز اس کی لاش ہی ملتی ہے۔

کچھ لوگوں نے خالی مکان دیکھ کر اس پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ہر بار کسی نہ کسی کی پراسرار حالت میں موت واقع ہوجاتی۔ تب سے لوگوں نے مکان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہ سارے واقعات جاننے کے بعد مجھ پر جھرجھری طاری ہوگئی۔ نہ جانے اللہ نے کیوں مجھ جیسے سیاہ کار انسان کی جان بچالی تھی۔ میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ میں نے رضا کارانہ طور پر پولیس کے سامنے گرفتاری پیش کردی اور اپنے تمام گناہ قبول کرلئے۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد میں نے کچھ عرصہ محنت مزدوری کرنے کے بعد گاڑیوں کی مرمت کا کام شروع کردیا۔ ایک روز ذیشان عظمی صاحب اپنی گاڑی کا کچھ کام کروانے آئے تو میری ان سے سلام دعا ہوئی۔ جب انہوں نے بتایا کہ وہ مصنف ہیں اور ڈرڈ انجسٹ میں لکھتے ہیں تو میں نے بھی اپنی داستان ان کے گوش گزار کردی تاکہ میری یہ سبق آموز کہانی قارئین تک پہنچ سکے۔ قارئین سے التماس ہے کہ میرے حق میں دعا کریں کہ خدا تعالیٰ میرے سابقہ گناہوں کو معاف فرمائے اور مجھے زندگی کی آخری سانس تک حلال روزی اور سیدھے راستے پر چلنا نصیب کرے۔ آمین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیتلی

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

اچانک آمدنی کا ذریعہ جب میاں بیوی کے سامنے آیا تو دونوں حیران رہ گئے، وہ اپنے آپ کو اذیت دے کر دولت لوٹنے لگے کہ پھر ایک خونی واقعہ سامنے آیا جس نے دونوں میاں بیوی کو فرش سے اٹھا کر عرش پر پھنچادیا۔

اچنبھے میں ڈالتا ایک خونی حقیقی واقعہ..... جسے پڑھ کر اہل دل دنگ رہ جائیں گے

وہ بوڑھی عورت سڑک کے کنارے پرانے متروک برتنوں اور نوادرات کا ایک اسٹینڈ چلاتی تھی۔ اس عورت کا لہجہ اور خدوخال مشرقی تھے۔ اس نے لیدر کی گھسی ہوئی پینٹ پہنی ہوئی تھی مگر پاؤں میں جوتا نہیں تھا اور وہ سردی سے ٹھٹھری نظر آرہی تھی۔ اس عورت کا اسٹینڈ ایک سبز میز پر مشتمل تھا اس پر کئی بے کار اشیاء پڑی تھیں۔

ایلس اور جان اپنی بیٹی سے کالج ہوسٹل میں مل کر اپنے گھر واپس جارہے تھے۔ یہاں اس بڑھیا کے اسٹینڈ کے پاس وہ کچھ دیر آرام کے لئے رکے تھے کیونکہ ایک لمبی ڈرائیونگ سے جان کی کمر میں درد شروع ہوگیا تھا اور وہ کچھ دیر کمر سیدھی کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران سارے سفر میں ایلس سوئی رہی تھی یا اونگھتی رہی تھی۔ وہ قدرے ناراض نظر آرہی تھی کیونکہ اسے بار بار وہ رقم یاد آرہی تھی جو وہ اپنی بیٹی کی کالج کی فیس کے طور پر ادا کر کے آئی تھی۔ ایلس نے یہ رقم اپنی کئی خواہشات کا گلا گھونٹ کر جمع کی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کسی پہاڑی مقام پر کچھ دن جان کے ساتھ گزارے مگر اب یہ رقم اسے قربان کرنا پڑی تھی۔

بوڑھی عورت ایلس کے قریب جھک آئی اور اس کی لمبی مخروطی انگلیوں میں پیتل کی ایک کیتلی تھی جو اس نے بغیر کچھ بولے ایلس کی طرف بڑھادی۔ ایلس گڑبڑا گئی، عورت کے پراسرار انداز نے اس کو پریشان کردیا۔

"اسے رکھ لو....." عورت نے سرگوشی نما ہلکی آواز میں کہا۔

"اس کی قیمت.....؟" ایلس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں..... میں کچھ نہیں لوں گی..... یہ اپنی قیمت خود وصول کرلے گی اگر چاہے گی تو....."

ایلس چپ چاپ اس کی طرف حیرانی سے دیکھتی رہی۔

"رکھ لو اسے....." عورت کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"شکریہ....." ایلس نرمی سے بولی اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ مزید کیا بولے۔

ایلس نے وہ کیتلی کار کی عقبی سیٹ پر رکھ دی۔ عقبی سیٹ پر پہلے ہی ایک پرانا سا سوٹ کیس پڑا ہوا تھا۔ کار کی حالت بھی نہایت خستہ تھی۔ اس دوران جان کچھ نہیں بولا اسے اس کیتلی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

واپسی پر وہ اس رقم کے بارے میں بحث کرتے رہے جو ان کے خیال میں ضائع ہی ہوگئی تھی کیونکہ ان کی بیٹی کو اس کالج سے اسکالرشپ نہیں ملا تھا اور اب تو جان اور ایلس دونوں مل کر کام کرنے کے باوجود گھر کے اخراجات

پورے نہیں کر پارہے تھے اور قرضوں کے بوجھ تلے بری طرح دبے ہوئے تھے۔

کار گھر کے اندر روک کر جب وہ دونوں باہر نکلے تو جان نے ایلس کی مدد کی خاطر بڑھ کر سوٹ کیس اٹھانے کی کوشش کی اسی وقت ایلس نے بھی اس کو پکڑنے کی کوشش کی اس دوران میں ایلس کی انگلی غیر ارادی طور پر سوٹ کیس کے ہینڈل میں پھنس گئی۔ اس نے بے ساختہ ایک چیخ بلند کی۔

"معاف کرنا....." جان اس کا ہاتھ تھام کر اسے سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

عین اسی وقت کار کے اندر سے کھنکھناہٹ کی آواز سنائی دی یوں جیسے کسی نے پیتل کی کیتلی کو انگلی سے بجایا ہو۔

ایلس نے آگے بڑھ کر کیتلی کو اٹھا لیا، اس کا ڈھکن ہٹا کر اندر جھانکا تو وہاں پانچ سکے موجود تھے۔

"یہ کہاں سے آگئے.....؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

جان بھی کوئی جواب نہ دے سکا۔

جب دوسرے دن صبح ایلس نے اس کیتلی کو چولہے پر رکھنے کی تجویز دی تو جان بھنا گیا۔ وہ اس بات پر پریشان تھا کہ پرانے زمانے کے یہ کیتلی ان کے جدید کچن میں بدنما نظر آرہی تھی۔ انہوں نے کوشش کر کے اور اپنی بساط سے بڑھ کر کچن میں ہر چیز جدید زمانے کے مطابق تیار کی تھی۔ ان کا فریج دو دروازے والا تھا، اوون خود بخود صاف ہوجانے والا تھا۔ اگر انہیں اندازہ ہوتا کہ ان کی بیٹی کو اسکالرشپ نہیں ملے گا اور اس کے سارے تعلیمی اخراجات انہیں ہی برداشت کرنا پڑیں گے تو وہ کبھی بھی کچن پر یہ خرچہ نہ کرتے۔ اس سارے خرچے کی قسطیں اگلے تین سال تک ادا ہونا تھیں۔ جان اس وقت بھڑک اٹھا جب ایلس نے فیصلہ کیا کہ آج سے وہ صبح کی کافی اسی کیتلی میں بنایا کرے گی۔

"مگر کیوں.....؟" جان چیخا۔

"اس لیے کہ..... بجلی کی کیتلی خراب ہوچکی ہے....." ایلس نے اطلاع دی۔

جان نے اس کی طرف گھور کر دیکھا، وہ اس وقت اپنے دفتر جانے کے لئے تیار ہوچکا تھا۔ ایلس ابلتے ہوئے پانی میں کافی کے بیج ڈال رہی تھی اس کے سنہری بالوں کی نہایت نفاست کے ساتھ چٹیا بنی ہوئی تھی۔

"میں نے پہلے کبھی ایسا تجربہ کیا نہیں....." وہ ابلتے ہوئے پانی میں چمچ ہلاتے ہوئے بولی۔ پلاسٹک کا چمچہ پانی کی گرمی سے پگھل کر دوہرا ہورہا تھا۔ جان نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشش کی کہ اسے درست طریقہ بتائے۔

"تمہیں چمچ اس طرح ہلانا چاہئے تھا۔" جان نے اسے بتانے کی کوشش کی اور ایک دھاتی چمچ کیتلی کے اندر ڈالا اور اسے ہلا کر دکھایا۔ ایلس نے اسے تیکھی نظروں سے گھورا اور ایسا وہ عموماً اس وقت کیا کرتی تھی جب جان اسے کچھ سکھانے کی کوشش کرتا۔

"میں جانتی ہوں..... تم مجھے کچھ سکھانے کی کوشش نہ کرو۔" وہ اس کے ہاتھ سے چمچ چھینتے ہوئے بولی اور اس کا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا اس کی وجہ سے کیتلی ڈگمگائی اور گرم پانی کے کچھ چھینٹے جان کی کلائی پر گر گئے۔ درد کی شدت سے وہ چیختا ہوا پیچھے ہٹا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایلس نے فوراً اس کی متاثرہ کلائی پر برف کا ٹکڑا رکھ دیا۔

"کہیں چھالا نہ پڑ جائے۔" وہ گھبرا کر بولی اور فوراً اس کی کلائی پر برف رگڑنا شروع کر دی۔ جان کچھ نہ بولا۔ ایلس نے کیتلی سے کافی انڈیلی اور ٹوسٹ نکال کر میز پر رکھ دیے۔ دونوں ناشتہ کرنے کے لئے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"تم رات کو کب واپس آؤ گے....." ایلس نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے جان سے پوچھا۔

"لگتا ہے دیر ہو جائے گی....." جان نے جواب دیا۔ "کافی سامان آ رہا ہے اور مجھے اکیلے ہی سارا کام نمٹانا پڑے گا۔"

"کیوں..... کیا کوئی مددگار ساتھ نہیں دیا دفتر والوں نے.....؟" ایلس نے پوچھا۔

"دیا ہے..... ایک لڑکی ہے..... جو سیدھی کالج سے اس دفتر میں آ گئی ہے، اسے کام کی الف بے بھی نہیں معلوم مگر باس اس کی خوبصورتی پر لٹو ہو گیا ہے۔"

دراصل جان اپنا سارا کام خود کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر اس لڑکی نے اپنی قابلیت دکھا دی تو جان کی ملازمت کو خطرہ ہو سکتا ہے اور جان اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ یہ اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھا۔

کافی کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے وہ جونہی جانے کے لئے کھڑا ہوا اسے اپنے منہ میں کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔

"کیا تم نے یہ کیتلی اچھی طرح نہیں دھوئی تھی.....؟" جان نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"بہت اچھی طرح سے دھوئی تھی۔" ایلس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جان نے اپنے منہ میں چپکے کچھ کاغذ باہر نکالے یہ دو ڈالر کا ایک نوٹ تھا۔

"اگر دھوئی تھی..... تو پھر یہ کیا ہے؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

ایلس آگے جھک آئی۔ دونوں جھک کر غور سے اس نوٹ کو دیکھنے لگے جو، جان نے ٹیبل پر پھیلا دیا تھا۔ دونوں کے پاس اس نوٹ کی موجودگی کا کوئی جواز نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ یہ سمجھا جاتا کہ ایلس نے غلطی سے اسے کیتلی میں رکھ دیا تھا۔ حالانکہ وہ قسم کھا رہی تھی کہ اس نے کیتلی کو نہایت اچھی طرح دھویا تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں میں سے کسی کے پاس کل سے دو ڈالر کا کوئی ایک بھی نوٹ نہیں تھا..... تو پھر یہ کہاں سے آ گیا؟۔

دفتر جانے کا وقت نکل رہا تھا اس لئے جان نے اس مسئلے پر سوچنے کو ملتوی کیا اور باہر کی طرف بڑھا پھر اسے کچھ یاد آیا اور اس نے مڑ کر ایلس کو گلے لگا لیا اس کے ماتھے پر الوداعی بوسہ دیا۔ پلٹتے ہوئے اس کی زخمی کلائی ایلس کی قمیض سے ٹکرائی تو ایک بار پھر اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ اسی وقت کیتلی کے اندر کسی چیز کے کھنکھنے کی آواز سنائی دی۔ دونوں بیک وقت حیرت سے اچھلے اور کیتلی میں اکٹھے جھانکنے لگے، کیتلی کے اندر کئی سکے موجود تھے حالانکہ اس سے پہلے کیتلی میں کچھ نہ تھا۔ جان اسے اٹھا کر روشنی میں دیکھنے لگا۔

ایلس نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور پھر ایک دم اس نے جان کے بازو پر پورے زور سے چٹکی کاٹی اس سے پہلے کہ وہ چیختا یا اس کا ہاتھ پیچھے ہٹاتا ایک دفعہ پھر کیتلی میں سے کچھ کھنکنے کی آواز گونجی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے.....؟" جان حیرت زدہ ہو

کر بولا۔

ایلس مسکراتے ہوئے جان کے قریب آ کر بولی۔ "مجھے مارو....." ایلس کے لہجے سے یوں لگا جیسے وہ کچھ کچھ سمجھ گئی ہو۔

"کیا....." جان حیرت بھری نگاہوں سے ایلس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اس طرح مت دیکھو..... میرے بازو پر مکے مارو..... اتنی زور سے کہ درد محسوس ہو۔"

مگر جان نے اسے مارا نہیں، اس کی بجائے اس نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور صدر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"اگر مجھے دیر ہو گئی تو وہ میرا کام اس لڑکی کے سپرد کر دیں گے، اس طرح میں اپنے اوور ٹائم کی تنخواہ کے حق سے بھی محروم ہو جاؤں گا اور ہمیں ابھی بہت سارے خرچے ادا کرنے ہیں۔"

ان کا معمول یہ تھا کہ رات کا کھانا ایلس بنائے گی کیونکہ وہ جان سے پہلے گھر آ جاتی تھی۔ شام کو جہاں وہ اکاؤنٹنٹ کا کام کرتی تھی وہاں سے اسے جواب مل چکا تھا۔ جان صبح کا ناشتہ بنانے میں اور ویک اینڈ پر سارا دن اس کی مدد کرتا تھا۔ لیکن اس رات جان جب گھر لوٹا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ آج گھر میں کچھ نہیں بنا کیونکہ اسے کچن سے کوئی خوشبو آتی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایلس صوفے پر نیم دراز تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور کیتلی اس کے پیٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ جان نے اوور ٹائم کے لالچ میں اپنے باس سے کہا کہ وہ اکیلے ہی سارا کام نمٹا لے گا۔ لہٰذا باس نے لڑکی کو جلدی چھٹی دے دی اور گھر چلی گئی جب کہ جان کو سارا کام نمٹاتے ہوئے معمول سے زیادہ وقت لگ گیا۔ گھنٹوں کھڑے رہ کر کام کرنے کے سبب اس کے گھٹنے بھی درد کر رہے تھے۔

جان کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے اس نے دن میں بھی اپنی مصروفیت کے باعث کچھ نہیں کھایا تھا اور اب ایلس کو یوں فارغ لیٹا دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا صرف ٹی وی کی اسکرین روشن تھی اور اسی کی وجہ سے اس کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو.....؟" اس نے لائٹ آن کرتے ہوئے ایلس سے پوچھا۔

تیز روشنی سے بچنے کے لئے ایلس نے اپنے چہرے پر تکیہ رکھ لیا مگر اس دوران میں جان نے اس کے چہرے پر زخم کے نشانات اور سوجن دیکھ لی تھی۔

"یہ کیا ہو.....؟" وہ گھبرا گیا۔

ایلس کی داہنی آنکھ کے گرد سیاہ حلقہ تھا اور وہ اس بری طرح سے سوجی ہوئی تھی کہ بمشکل کھل رہی تھی۔ جان بھاگ کر کچن میں گیا اور فریزر میں سے تھوڑی سی برف نکالی اور لا کر ایلس کی آنکھ پر رکھ دی۔ برف آنکھ پر لگتے ہی وہ بری طرح سے اچھلی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اس طرح نہیں..... پہلے برف کے گرد کپڑا لپیٹو....." وہ جان کو سمجھانے لگی۔

"یہ چوٹ کیسے لگی.....؟ کیا تم پر کسی نے حملہ کیا ہے.....؟ کیا تم نے اس کی اطلاع پولیس کو دی ہے.....؟" جان نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

جان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اس کو فکر لاحق ہو گئی کہ زیادہ خون بہنے سے اس کی بیوی کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا ہے اور اس طرح اس کو اسپتال کا بل بھی ادا کرنا پڑے گا جو اضافی بوجھ ہو گا اور اس کے پاس اس بوجھ کو سہارنے کے لئے رقم نہیں تھی۔

"نہیں..... کچھ نہیں ہوا..... کسی نے کچھ نہیں کیا....." ایلس نے اسے جان کر تسلی دی اور اسے کیتلی تھما دی۔ جان نے اس کا ڈھکن ہٹا کر دیکھا تو اس کے اندر دس دس ڈالر کے نوٹ تھے۔

"یہ کیا ہے.....؟" جان نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"میں نے اپنے آپ کو لوہے کے راڈ سے مارا....." وہ نگاہیں چراتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔ "اس کی وجہ سے مجھے اس کیتلی کے اندر دس ڈالر کا ایک نوٹ ملا۔ میں نے مزید دو دفعہ پھر ایسا ہی کیا اور مجھے مزید دو نوٹ مل گئے۔ یعنی جب ہم اپنے آپ کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نقصان پہنچاتے ہیں تو اس کیتلی کے اندر رقم آجاتی ہے۔"

"چلو میرے ساتھ اسپتال چلو تم بہت زخمی ہو....." جان نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ جان پریشان تھا۔ مگر ایلس نے منع کردیا۔

"تم پریشان مت ہو..... یہ سوجن جلد ہی ختم ہو جائے گی۔" پھر ایک طویل گہری سانس لیتے ہوئے اس نے اپنا سر جان خاوند کے شانے پر رکھ دیا۔ "میرا خیال ہے اس رقم سے ہمیں آج رات کا کھانا کہیں باہر کسی اچھے ریستوران میں کھانا چاہیے۔ کافی عرصہ ہوگیا ہم اکٹھے کہیں باہر کھانا کھانے نہیں گئے۔"

کھانا..... اور وہ بھی کسی اچھے ریستوران میں..... وہ اس عیاشی کے کبھی بھی متحمل نہیں ہوسکتے تھے مگر اب بھوک اور اچھے کھانے کی خواہش نے جان کو بیوی کے چہرے پر لگنے والی چوٹوں کو بھی بھولنے پر مجبور کردیا۔

"اگر پیٹ بھرا ہو تو میں ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکوں گا۔" جان نے ہنستے ہوئے کہا۔

جب وہ دونوں باہر جانے کے لئے نکلے تو ایلس نے کیتلی بھی اٹھالی، جان نے کہا بھی کہ وہ اسے گھر میں چھوڑ جائے مگر وہ نہ مانی۔ وہ اب کسی بھی صورت اس کیتلی کو اپنے آپ سے جدا کرنے پر تیار نہیں تھی، وہ اسے کھونے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھی۔ ریستوران میں بھی ایلس نے اسے اپنے سامنے میز پر رکھا۔ ویٹر ان دونوں کو اور اس کیتلی کو شک بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ ہال میں بیٹھے باقی لوگ بھی پہلے کیتلی کو دیکھتے پھر ایلس کے چہرے پر لگے زخموں کو اور پھر بڑے نفرت بھرے انداز میں جان کو گھورنے لگتے۔ یوں لگتا جیسے وہ ایلس کی ان چوٹوں اور زخموں کا ذمہ دار جان کو ہی سمجھ رہے تھے۔

"تمہارا کیا خیال ہے ہمیں اس چیز کو اپنے ساتھ لانا چاہتے تھے؟" جان نے سلاد پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کیتلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس اٹالین ریستوران میں گئے تھے جہاں پہلے وہ صرف برتھ ڈے یا کسی خاص موقع پر جایا کرتے تھے۔ یہ ان کا پسندیدہ تھا۔

"میں نہیں جانتی....." ایلس نے زچ ہوکر جواب دیا اس کی سوجی ہوئی آنکھ سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ جان نے نیپکن کو پانی میں بھگو کر اس کی آنکھ صاف کی۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ موقع ملا ہے کہ....."

ایلس نے بات مکمل کرنے کی کوشش کی مگر جان نے اسے موقع نہ دیا اور فوراً بولا۔

"کیسا موقع.....؟"

ایلس اپنی بات مکمل نہ کرسکی کیونکہ اسی دوران میں ویٹر کھانا لے کر آ گیا تھا۔ جان نے پاستہ منگوایا تھا مگر ایلس نے سادہ چیزوں پر گزارہ کیا۔ دونوں خاموشی سے کھانا کھانے لگے، کیونکہ وہ کھانے کے دوران باتیں کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس دن ایلس نے بھی دن میں کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ سارا دن دفتر میں اپنی جاب میں مصروف رہی تھی۔ سارا دن ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں اور ایک منزل سے دوسری منزل کی سیڑھیاں اترتے چڑھتے اس کے پاؤں دکھنے لگے تھے، کیونکہ اس کا دفتر ایک بہت بڑی بلڈنگ میں تھا۔ تنخواہ بھی اس رقم سے بہت کم تھی جو وہ بطور اکاؤنٹنٹ اپنے پہلے دفتر سے حاصل کرتی تھی جہاں سے اس کو اس لئے نکال دیا گیا تھا کہ وہ حساب کتاب کی غلطیاں بہت کرتی تھی، رقم گننے میں غلطی کر جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے کمپنی والوں کو لاکھوں کا نقصان ہوا تھا۔

جب ویٹر نے بیس ڈالر کا بل ان کے سامنے رکھا تو دونوں کے ہوش اڑ گئے وہ گھبرا گئے کیونکہ یہ رقم ان کی توقع سے کہیں زیادہ تھی انہوں نے آرڈر دینے سے پہلے مینیو اور قیمتوں کی لسٹ دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ کافی عرصے سے اس ریستوران میں نہیں آئے تھے اس لیے انہیں قیمتیں بڑھنے کا بھی علم نہیں تھا۔

وہ خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے پاس بل کی رقم سے گیارہ ڈالر کم تھے۔ ویٹر کو ٹپ دینے کے لئے تو بالکل بھی کچھ نہ تھا۔ پچھلے ہی دنوں تو وہ اپنی بیٹی سے ملنے گئے تھے، کچھ رقم کار کے پٹرول پر خرچ ہوگئی اور جو بچا وہ بیٹی کو اس کی کالج فیس بھرنے کے لئے تھما آئے تنخواہ ملنے میں ابھی تین دن باقی تھے۔ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ وہی تھا

جو ان کو کیتلی میں سے ملا تھا۔

"میں ان کو تین دن بعد کا ایک چیک لکھ کر دے دیتا ہوں....." جان نے تجویز پیش کی۔

"یہاں چیک نہیں چلتے....." ایلس نے اس کی توجہ ایک ہدایت کی طرف دلائی جو سامنے دیوار پر باقاعدہ جلی حروف میں تحریر تھی۔

جان کے معدے میں پریشانی سے اینٹھن شروع ہوگئی۔ دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ خاموشی کی زبان میں ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کے بعد ایک فیصلہ کیا اور تھوڑی دیر بعد سب کی نظر بچا کر جان مردانہ واش روم کی طرف بڑھ گیا، کیتلی بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

دروازہ بند کرتے ہی اس نے ایک زوردار مکا پتھریلی دیوار پر دے مارا۔ فوراً ہی اسے چند سکے کیتلی میں گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے یکے بعد دیگرے چار پانچ گھونسے دیوار پر دے مارے۔ انگلیاں سرخ ہوگئی تھیں اور ان میں جلن ہونے لگی تھی۔ مگر کیتلی میں صرف تین ہی ڈالر جمع ہو پائے تھے۔ اب اس نے اپنا گھٹنا پوری قوت سے دیوار پر دے مارا، درد کی شدید لہر پورے جسم میں محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے کیتلی کی طرف دیکھا اس میں پانچ ڈالر کا ایک نوٹ موجود تھا۔ اب اس نے گرم پانی کا نل پوری طرح کھول دیا اور اپنا ہاتھ اس کے نیچے پانی کے اندر رکھ دیا، گرم پانی کی وجہ سے اس کو جلد ہی اپنی کھال جلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ درد کی شدت سے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس دوران میں اس کو کچھ سکے کیتلی کے اندر گرتے سنائی دیے مگر اس نے اپنا ہاتھ پانی کے نیچے سے نہیں ہٹایا جب تک اسے تسلی نہیں ہوگئی کہ کیتلی کے اندر کافی اور ضرورت کے مطابق سکے جمع ہوگئے ہیں۔

ایلس کو بل کے بدلے اتنی زیادہ تعداد میں سکے ادا کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی مگر مجبوری تھی اور اپنے پراسرار انداز میں زخمی ہوجانے والے شوہر کو سہارا دے کر باہر نکلتے ہوئے وہ باقی سب لوگوں سے بھی نظریں چرا رہی تھی۔ اسے خود بھی اپنی ایک آنکھ کی مدد سے بیرونی دروازہ تلاش کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔

گھر پہنچتے ہی جان بے دم ہو کر بستر پر گر گیا۔ ایلس کچن میں چلی گئی پھر کچھ دیر بعد جان کو کچن سے ایلس کی دبی دبی کراہیں سنائی دینے لگیں مگر اس کی زیادہ توجہ کیتلی میں گرنے والے سکوں کی کھنک کی طرف تھی۔

صبح اس کی آنکھ کافی دیر سے کھلی۔ عموماً اس کی آنکھ الارم کی آواز سے کھلتی تھی مگر آج تو الارم بھی اسے جگا نہیں سکا تھا۔ صبح کے دس بج چکے تھے اور ایلس کہیں نظر نہیں آرہی تھی کیتلی بھی غائب تھی جان نے ایلس کو اک دو آوازیں دیں مگر جواب نہ پا کر سمجھا کہ شاید وہ دفتر چلی گئی ہے۔ جان جلت میں تیار ہوا اس دوران میں اس کو پورے گھر میں ایلس کہیں بھی نظر نہ آئی۔ تیار ہو کر جان سیدھا دفتر کی طرف بھاگا۔ دفتر میں جس کسی نے بھی اسے دیکھا اس نے یہ کہا لگتا ہے کسی نے اسے خوب پیٹا ہے۔ جان کسی کو بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اس کی نئی خوبصورت کم عمر اسسٹنٹ اپنا کام شروع کر چکی تھی اور اس نے ثابت کردیا تھا کہ وہ اکیلے بھی سارے کام کو خود ہینڈل کرسکتی تھی اور یہ بھی کہ اس سارے کام کے لئے اوور ٹائم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ کام دو گھنٹے پہلے بھی یہ کام ختم ہوسکتا ہے۔ باس نے اس کی اسسٹنٹ کی کارکردگی اور جان کی حالت دیکھتے ہوئے اسے گھر واپس جانے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

مایوس اور افسردہ جان جب واپس گھر پہنچا تو دیکھا ایلس گھر پر ہی موجود تھی۔ وہ بھی کام پر نہیں گئی تھی۔

"تم گھر واپس کیوں آگئے ہو.....؟" ایلس نے حیرت سے پوچھا۔ جان چپ چاپ اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا، جو دن کی روشنی میں زیادہ خوف ناک اور قابل رحم نظر آرہا تھا بہ نسبت رات کو ریستوران کی روشنی میں۔

"تم نے صبح گھر سے نکلنے سے پہلے مجھے کیوں نہیں اٹھایا.....؟" جان نے تھکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں تو آج صبح سے کہیں باہر گئی ہی نہیں...... دفتر بھی نہیں گئی......" ایلس نے بتایا۔ "صبح جب میں اسٹور میں تھی تو دیوار پر لٹکنے والا ایک ہتھوڑا اتفاقیہ میرے سر پر آ گرا جس سے میں بے ہوش ہو گئی۔" ایلس نے اپنے سر کو دباتے ہوئے بتایا۔

جان نے آگے بڑھ کر اس کے سر کو ٹٹولا تو وہاں ایک بہت بڑا گومڑا ابھرا ہوا تھا۔ جان اس کو پرخیال انداز میں گھورنے لگا۔

"اب میں بالکل ٹھیک ہوں......" ایلس نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"ہمیں اس سارے کام کو روکنا ہوگا ایلس!......" جان چلا اٹھا اور اس نے زبردستی اس کے ہاتھ سے کیتلی چھینی اور کچن کی الماری کے اوپر رکھ دی جہاں ایلس کا ہاتھ آسانی سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بھنا کر ایلس نے ایک کرسی الماری کے پاس گھسیٹی اور اس کے اوپر چڑھ کر کیتلی واپس نیچے اتار لی۔

"ہمیں کچھ حاصل کرنے کا موقع ملا ہے تو کیوں نہ اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے......" ایلس نے چیختے ہوئے کہا۔ اس نے کیتلی کو پوری طرح مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

"تم ایسا مت کرو......" جان اسے سمجھانے لگا کہ دولت اور پیسہ حاصل کرنے کا یہ طریقہ مناسب اور بہتر نہیں۔ اس کے لئے بس ایک ہی راستہ ہے کہ ہم دونوں محنت کریں، کام کریں، اوور ٹائم کریں۔ اپنی آمدنی بڑھانے اور اخراجات کو کم کر کے بچت کرنے کی کوشش کریں۔

"آج تو ہم اور زیادہ پیچھے چلے گئے ہیں......" اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ "اس طرح ہم کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتے۔ نہ کبھی کچھ ملا ہے۔ نہ کبھی کچھ ملے گا۔"

دونوں ایک گھنٹے تک اسی موضوع پر بحث کرتے رہے۔ اس سارے عرصے میں ایلس کیتلی کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی۔ اس دوران میں ایلس نے اسے تین دفعہ نکما کہا اور جان نے اسے ایک دفعہ یہ لقب دیا۔ غصے میں جان نے اسے ایک بری ماں بھی کہا۔ اس سے پہلے دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے اتنے برے طریقے سے بات نہیں کی تھی۔ جب لڑائی ختم ہوئی تو دونوں بری طرح تھک چکے تھے۔

ایلس نے کیتلی کا ڈھکن ہٹایا تو اس کے اندر بیس ڈالر کے کئی نوٹ تھے، گنتی کی تو پورے چار سو کے تھے۔

"یہ سب کیسے......؟ ہم میں سے تو کسی کو بھی کوئی چوٹ نہیں پہنچی...... پھر یہ کیسے......؟" جان نے حیرت سے پوچھا۔

"مگر تکلیف تو پہنچی ہے نا باتوں سے......" ایلس نے کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بتانے لگی کہ کیسے ایک دن وہ لنچ کے لئے گھر واپس آئی، اسے امید تھی کہ پوسٹ مین اپنے معمول کے مطابق وہاں سے گزرے گا اور اسے ہیلو کہے گا۔

اسی وقت بیس ڈالر کا ایک نوٹ کیتلی میں آ گیا۔

جان اسے دیکھنے کے لئے پوری طرح آگے جھک آیا۔

"اب تم مجھے کچھ برا کہو...... میری کوئی برائی کرو، کچھ نقص نکالو میری ذات میں......" ایلس نے کہا۔

"تم اول درجے کی حرافہ ہو......" جان بولا، اسی وقت کیتلی میں کچھ سکے کھنکے۔

"کچھ اصل اور حقیقی بولو۔ بتاؤ کہ تم مجھ سے کتنی نفرت کرتے ہو، تم نے جو کچھ غلط کیا ہے یا کچھ ایسا جو مجھے بہت زیادہ تکلیف دے۔" ایلس اسے سمجھانے لگی۔ جان بیٹھ گیا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میں نے ایک رات ایلن واٹرسن کے ساتھ بھی گزاری تھی اور......"

"میں یہ جانتی ہوں......" ایلس مطمئن انداز میں بولی۔

"......لیکن تم یہ نہیں جانتی کہ ایسا کئی بار تم سے شادی کے بعد بھی ہوا تھا......" وہ دانت کچکچا کر بولا۔

یہ وہ راز تھا جو بیس سال تک جان کے سینے میں دفن رہا تھا۔ ہر رات جب وہ ایلس کے پہلو میں بستر پر لیٹتا، اس راز کی بدبو محسوس کرتا تھا۔ اس کا چہرہ یہ بات بیان کرتے ہوئے پیلا پڑ گیا مگر ہونٹوں کے گوشوں پر مسکراہٹ تیرنے لگی تھی کیونکہ اس نے کیتلی میں پچاس ڈالر کا نوٹ اترتے دیکھ لیا تھا۔

"بولتے رہو......" ایلس سرگوشی کے انداز میں بولی مگر اس کی نگاہیں بدستور کیتلی پر جمی ہوئی تھیں۔

دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے کو بہت کچھ بتاتے رہے، وہ کچھ بھی جو ایک شادی شدہ جوڑا کبھی بھی ایک دوسرے کو بتانے کی ہمت نہ کر سکے۔ جان نے اسے ساتھ کام کرنے والی خواتین کے متعلق بتایا، اس نئی اسسٹنٹ لڑکی کے متعلق بھی جو اس کی جگہ دفتر میں آئی تھی اور جس کا جسم نہایت دلفریب اور صحت مند تھا۔ ایلس نے بھی ان مردوں کا ذکر کیا جن کے ساتھ اس کی دوستی شادی سے پہلے تھی۔ اس نے ان حدود کا ذکر کیا جن کی اس نے ان مردوں کو اجازت دی تھی۔ ایک دوسرے سے اپنے پیار کا اظہار بھی کیا۔ اس سب کارروائی کے نتیجے میں شام تک کیتلی ایک ہزار ڈالر سے بھر گئی اور یہ ان دونوں کی ایک ہفتے کی مجموعی تنخواہ سے بھی بہت زیادہ تھی۔

دوسرے دن بھی انہوں نے اپنے اس نئے کام کو جاری رکھا۔ سارا دن نہایت بری طرح ایک دوسرے پر چیختے ہوئے ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے رہے اور پھر روتے پیٹتے سونے چلے گئے۔ کیتلی ہر بار ڈالروں سے بھر جاتی تھی۔ چوتھے دن جان کو اپنے دفتر سے باس کی کال موصول ہوئی کہ اب اسے دوبارہ کام پر آنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی اسسٹنٹ لڑکی سارے کام کو ہینڈل کر لے گی۔

"بہت خوب......" جان نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "میں کسی اور جگہ جاب تلاش کر لوں گا......" اس کا باس اس کے اس غیر متوقع رویے پر حیران رہ گیا۔ دوسری طرف ایلس نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ملازمت چھوڑ دے گی۔ اگرچہ کچھ دن کے بعد ان دونوں کے پاس ایک دوسرے کی بے عزتی کا مواد کم ہو رہا تھا، جھوٹی بے عزتی سے کچھ نہیں ملتا تھا مگر وہ اب بھی رقم حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ وہ ہر صبح دیر سے اٹھتے، بعض اوقات تو سہ پہر کے وقت ان کی آنکھ کھلتی، وہ کچن کے میز پر جا بیٹھتے اور کیتلی کو اپنے بیچ میز پر رکھ لیتے اور شروع ہو جاتے......

"تم ہمیشہ سے نکمی اور بے کار عورت ہو۔" جان نے کہا۔

کلنک...... کلنک...... کلنک...... کیتلی میں سکے کھنکے۔

"تم کبھی بھی مجھے شادی شدہ زندگی کی حقیقی خوشی نہیں دے سکے......" ایلس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

فوراً ہی بیس بیس ڈالر کے تین نوٹ کیتلی میں آن گرے۔

ایلس اندازہ لگا رہی تھی کہ کیسے اپنے خاوند کو بے عزت کر کے وہ کتنی رقم حاصل کر سکتی ہے۔ بے عزتی، مار کٹائی، ہتک، ان کا معمول بن چکا تھا ان چہروں پر بے رونقی تھی۔

تیسرا مہینہ ختم ہونے تک اس کیتلی سے ہر روز حاصل ہونے والی رقم کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ ایلس نے دوبارہ اپنے جسم پر چوٹ لگانا شروع کر دی تا کہ اس کیتلی سے کم از کم روزانہ کے اخراجات کی رقم تو حاصل کر سکے اور ان کو روزانہ کم از کم سو ڈالر درکار تھے۔

جب ان کی بیٹی نے انہیں فون کیا اور انہیں اطلاع دی کہ وہ چھٹیوں پر گھر آ رہی ہے تو ایلس نے مناسب انداز میں اسے روکنے کی کوشش کی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کی بیٹی گھر واپس آئے اور ان کی اور گھر کی یہ حالت دیکھے مگر بیٹی نے اپنی ماں کی ایک نہ سنی اور اگلی رات ہی اس نے کر آن دروازہ کھٹکھٹایا۔

جب وہ گھر داخل ہوئی تو اسے ہر چیز مختلف محسوس ہوئی۔ دیوار پر ٹنگی تصویریں بری طرح تباہ ہو چکی تھیں، پھٹ چکی تھیں۔ اس کے ماں کے سر کے بال بھی پہلے سے کافی چھوٹے ہو چکے تھے۔ ایلس نے بہانہ کیا کہ وہ نیا ہیر اسٹائل اپنا رہی ہے۔ جب کہ درحقیقت رقم حاصل کرنے کی خواہش میں اس نے اپنے بالوں کو خود اپنی مٹھیوں میں جکڑ جکڑ کر اور کھینچ کھینچ کر اکھاڑ ڈالا تھا اس حد تک کہ اب صرف مکمل گنجا ہونا باقی تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باپ بیٹی کے لئے سب سے بڑا سرپرائز تھا۔ اس کا جسم بھاری اور سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ دونوں میاں بیوی خوب کھاتے اور سوتے تھے، ایکسرسائز نہیں کرتے تھے اور کیتلی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور ہر اس موقع کے منتظر رہتے جب وہ معمولی سی بھی رقم اس کیتلی سے حاصل کر سکتے۔

ان کی بیٹی نے اس سارے بدلے ہوئے ماحول کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ ٹوٹے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے وہ انہیں اپنے کالج، دوستوں اور پروفیسرز کی کہانیاں سناتی رہی۔ یہ اس کا معمول تھا وہ جب بھی چھٹیوں پر گھر آتی تو ان کو اسی قسم کی باتیں اور کہانیاں سناتی اور وہ بھی عموماً اس کی ایسی باتیں بہت غور سے سنتے تھے اور مختلف باتوں پر استفسار کرتے، سوالات پوچھتے مگر اب کی بار وہ چپ تھے۔ وہ سن تو اس کی باتیں رہے تھے مگر سوچ اس کی کیتلی کے بارے میں رہے تھے جو ان کے سامنے خاموش پڑی تھی۔ باتوں باتوں میں بے خیالی میں لڑکی کا ہاتھ کیتلی سے ٹکرایا تو دونوں ماں باپ نے ایک دم چیختے ہوئے کیتلی اس کے پہنچ سے دور کھینچ لی۔ لڑکی ان کے اس رویے پر بھونچکا رہ گئی۔

"یہ بہت قدیم ہے....." ایلس نے اسے نہایت احتیاط سے اسے دوبارہ میز پر رکھتے ہوئے بیٹی کو بتایا۔

"ممی!..... آپ کی آنکھوں کو کیا ہوا.....؟" لڑکی نے پوچھا۔ کوئی قریب سے دیکھے تو ایلس کی آنکھوں کے گرد زخم کے نشانات تھے اور یہ اس وقت کے تھے جب اس نے لوہے کے راڈ سے اپنے آپ کو زخمی کیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں....." وہ دھیرے سے بولی تو اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ ایلس نے اپنی بیٹی کی سفید چمک دار بے داغ شفاف جلد کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں رشک امڈ آیا تھا۔ بستر پر جانے سے پہلے اوپر اپنے کمرے میں اس نے اپنی ماں کو شب بخیر کہتے ہوئے گلے لگایا تو ایلس نے چپکے سے اس کی کمر پر چٹکی کاٹ لی۔ لڑکی بلبلا اٹھی مگر ایلس کے کان تو صرف کیتلی میں کھنکھنے والے سکوں کی آواز سن رہے تھے مگر وہ مایوس ہو گئی کہیں سے کوئی آواز سنائی نہ دی تھی۔

"معاف کرنا....." ایلس نے کہا۔

جب لڑکی اپنا سوٹ کیس اٹھا کر مڑنے لگی تو ایلس نے مزید کوشش کے طور پر اس کی ملائم پنڈلی میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ کراہی اور لڑکھڑا گئی، مگر بڑی مشکل سے سنبھل پائی۔ اس کی ماں معذرت کرنے لگی مگر اب بھی اس کو کیتلی میں گرنے والے سکوں کی کھنکھناہٹ سنائی نہ دی۔

اس رات دونوں کافی دیر تک اپنی بیٹی کے سونے کا انتظار کرتے رہے تاکہ اس کے بعد وہ اپنی معمول کی مار پیٹ اور ایک دوسرے کی بے عزتی کی کارروائی شروع کر سکیں تاکہ کل کے اخراجات کی رقم حاصل کر سکیں۔ دوسری صبح جب لڑکی نے ماں سے پوچھا کہ اس کا ہونٹ کیوں سوجا ہوا ہے تو وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

اگلے روز لڑکی اپنی چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی واپس جانے کو تیار ہو گئی کیونکہ اس کی ماں نے اتفاقیہ طور پر اس کو سیڑھیوں سے اس وقت نیچے دھکیل دیا تھا جب وہ اس کے پیچھے سیڑھیاں اتر رہی تھی اس کی کہنی میں گہرا زخم آیا تھا۔ وہ اپنے کالج کے اسپتال سے اس کا علاج کرانا چاہتی تھی مگر اس کو اس بات پر حیرت تھی کہ اس کے ماں اور باپ دونوں میں سے کسی نے بھی اس کو روکنے کی کوشش کی، نہ اس کی پرواہ کی۔

"ایلس!..... تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔" جان نے دھیرے سے کہا جب وہ اپنی بیٹی کو الوداع کہہ رہے تھے۔

"اگر وہ نہ جاتی تو ہم اس کی فیس کہاں سے ادا کرتے؟" ایلس نے جواب دیا۔

گھر کے ٹوٹے شیشے، ٹوٹا فرنیچر دونوں کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ پھر سے مار پیٹ کا سلسلہ شروع کریں کیونکہ اب زبانی کلامی الزام تراشی اور ایک دوسرے کی بے عزتی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ مگر جان اب اس کام سے اکتا گیا تھا اس لئے اس نے اپنے پرانے باس سے رابطہ کیا اور اس سے دوبارہ ملازمت کی درخواست کی مگر اس کی درخواست کا کوئی جواب نہ آیا۔

بیٹی کے کالج کی فیس، اس کے ساتھ بجلی کا بل،

قرضے کی قسط، پانی اور گیس کا بل، کریڈٹ کارڈ کی قسط، ہر مہینے ان کے سامنے ایک تلخ حقیقت کے طور پر آن کھڑے ہوتے مگر اس حقیقت کو بیان کرنا ضروری نہیں کہ جان کو ایلس کو ایمرجنسی میں اسپتال لے جانا پڑا کیونکہ اسٹور میں لٹکا ہتھوڑا اس کے سر پر گرنے کی وجہ سے ایلس کا سر پھٹ گیا تھا۔

ایک پولیس والے نے ویٹنگ روم میں جان سے ملاقات کی اور مختلف سوالات پوچھے۔

"کیا آپ کی بیوی پھسل کر گر گئی تھی۔؟" پولیس والے نے پوچھا۔

جان نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر وہ پولیس والے سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

جان ہر ہفتے کے اختتام پر سکوں کی ایک بہت بڑی ٹوکری بھر کر بینک لے جاتا اور انہیں نوٹوں میں تبدیل کروا لیتا۔ مگر اب ان سکوں کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ انہیں ہر ہفتے چار سو ڈالر کی توقع تھی مگر جلد ہی یہ تعداد ڈھائی سو رہ گئی۔

"فریج کام نہیں کر رہا....." گھر میں داخل ہوتے ہی جان کو ایلس نے اطلاع دی۔

"کیوں..... کیا ہوا.....؟" جان نے پریشان ہو کر پوچھا۔ وہ پہلے ہی بینک سے پریشان ہو کر لوٹا تھا۔

"مجھے کیا معلوم.....؟" وہ بولی۔ "شاید تمہاری ٹھوکروں سے..... تم نے اسے لاتوں اور گھونسوں سے مارا بھی تو بہت ہے....." ایلس طنزیہ لہجے میں بولی۔ اس کا رویہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بدلتا جا رہا تھا۔ جان کو شبہ تھا کہ اس نے رقم کے لالچ میں اپنے آپ کو دوبارہ ایک بار پھر اس وقت چوٹ پہنچائی ہے جب ایک ہفتہ پہلے وہ باتھ روم میں پھسل گئی تھی اور جان نے اس کے بے ہوش جسم کو وہاں سے بیڈ روم میں پہنچایا تھا۔ ایلس نے بتایا کہ یہ ایک حادثہ تھا، مگر اس وقت کیتلی بھی تو اس کے ساتھ باتھ روم میں موجود تھی۔ انہوں نے تجربہ کر کے دیکھا تھا کہ یہ کیتلی صرف اس وقت کام کرتی تھی جب وہ ایک خاص حد کے اندر ہوتی جہاں وہ شخص زخمی ہوا ہو۔

"کیا تم فریج ٹوٹنے کا ذمہ دار مجھے سمجھ رہی ہو....." جان نے پوچھا۔ "مگر کار کے متعلق کیا خیال ہے؟ میں بھی تمہیں اس کی ونڈ اسکرین ٹوٹنے کا ذمہ دار قرار دے سکتا ہوں۔"

ایلس کے جسم کی کھال نیلگوں اور زرد ہو رہی تھی اس کی آنکھوں میں چمک نہیں صرف سرخی تھی۔ بے خوابی اور راتوں کو جاگنے کی وجہ سے کچھ تھوڑی سی رقم ملتی تھی۔

جب مکینک ان کا فریج ٹھیک کرنے آیا تو اس نے انہیں اطلاع دی کہ ان کے فریج کی وارنٹی ختم ہو چکی ہے۔ یہ سنتے ہی ایلس غصے سے پھٹ پڑی۔ وہ مکینک چھوٹے قد کا بھاری بھرکم شخص تھا جس کے سر کے سارے بال جھڑ چکے تھے اس گنجے مکینک کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں چاندی کی انگوٹھیاں تھیں اس نے نیلے رنگ کا یونیفارم پہن رکھا تھا۔

"مس!..... وارنٹی کے قوانین میں نے نہیں بنائے۔" وہ منمنایا۔

اس وقت جان اپنی ٹھوڑی پر لگے زخم پر پانی کے چھینٹے ڈال رہا تھا مگر خون رک نہیں رہا تھا۔ وہ شور سن کر ان کی طرف آیا اس وقت تک ایلس غصے کی حالت میں لکڑی کے کھانا پکانے والے چمچ سے اس مکینک کے گنجے سر پر وار کر چکی تھی۔ وزنی جسم کے باعث اس کے لئے پھرتی سے ہلنا ممکن نہیں تھا اس پر یہ کہ اس کی دائیں ٹانگ میں ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی۔

"ایلس!!....." جان چلایا اور اس ادھیڑ عمر مکینک کو گھسیٹ کر پیچھے کھینچا جو اپنے دونوں بازو اور ہاتھ چہرے پر رکھے ایلس کے وار سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایلس کا دوسرا وار اس کے ہاتھوں پر ہوا۔ لکڑی کا چمچ مکینک کے ہاتھ کی انگوٹھیوں پر لگنے سے عجیب سا جلترنگ پیدا ہوا۔ اس شور میں کیتلی کے اندر کھنکتے سکوں کی آواز نے مزید دلکشی پیدا کر دی۔

سکوں کی آواز سنتے ہی گویا ایلس میں نئی جان پڑ گئی ہو اس نے فوراً جان کا سہارا لے کے پاؤں سے موٹے مکینک کی ناک پر فلائنگ کک جما دی۔ فوراً ہی خون کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موٹی دھار موٹے کی ناک سے بہہ نکلی جو اس کے ہونٹوں سے ہوتی ہوئی فرش پر گرنے لگی موٹا درد سے ڈکرا رہا تھا۔

"تم لوگ پاگل ہو گیا.....؟" اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا وہ اپنی ناک پکڑے بلبلا رہا تھا۔

"یہ پاگل نہیں ہے....." جان پرسکون انداز میں بولا اور کیتلی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا ڈھکن ہٹایا تو اس کے اندر کچھ سکوں کے ساتھ سوڈالر کا ایک نوٹ موجود تھا۔ اس نے وہ نوٹ مکینک کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا اب تم اس فریج کو درست کرو گے.....؟"

"میں تمہیں عدالت لے کر جاؤں گا..... پولیس کو اطلاع دوں گا۔ تم لوگوں نے مجھے زخمی کر دیا ہے۔" مکینک غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

جان نے کن انکھیوں سے ایلس کی طرف دیکھا جس کی نیلگوں کھال کچن کی ہلکی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک مزید گہری ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا ایلس نے شلف پر رکھا گوشت کاٹنے والا چاقو چھرا، یا اور کوئی وقت ضائع کیے بغیر پوری قوت سے مکینک کے پیٹ میں گھسیڑ دیا۔ چھرے کا دستہ اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ ایک جھٹکے سے اس نے چھرا واپس کھینچا اور دوبارہ وار کیا جیسے اس نے فلموں میں دیکھ رکھا تھا۔

"یہ تم نے کیا کر دیا.....؟" جان پریشان ہو کر چیخا۔

موٹے مکینک کا جسم دہرا ہو کر فرش پر گر گیا۔ اس نے ایک دفعہ اٹھنے کی کوشش کی مگر دوبارہ گر گیا۔ ایک دفعہ تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔ ایلس نے اس کے جسم کو ایک زوردار ٹھوکر ماری مگر وہ بے حس و حرکت تھا۔

"یہ تم نے کیا کر دیا.....؟" جان بوکھلایا ہوا تھا۔

ایلس نیچے جھکی اور اس مکینک کے مردہ جسم میں چھرے کے مزید تین چار وار اس امید پر کیے کہ شاید ابھی وہ زندہ ہو اور اسے مزید درد محسوس ہو۔

خوف زدہ جان بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ ایلس اٹھی اور کیتلی کی طرف بڑھی، اس کا ڈھکن ہٹایا اندر دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خون آشام مسکراہٹ تیرنے لگی تھی۔

"یہ دیکھو....." اس کی خوف ناک سرسراتی آواز سنائی دی۔ اس نے کیتلی اٹھا کر جان کو دکھانے کی کوشش کی جو اس کی طرف نہیں بلکہ موٹے کی لاش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر کیتلی سو سو ڈالر کے نوٹوں سے لبالب بھری ہوئی تھی۔

"تم نے اس آدمی کو قتل کر دیا ہے۔" جان بڑبڑایا۔ خوف کے عالم میں اس نے کچن کی کھڑکی کی طرف دیکھا وہ بند تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔

"ہمیں اس لاش کو باہر کھڑے اس کے کمپنی کے ٹرک میں رکھ دینا چاہئے۔ دیکھو کیا اس موٹے کی جیب میں اس ٹرک کی چابیاں ہیں۔" ایلس نے مطمئن لہجے میں جان سے کہا۔

"کیا تم میری مدد کر سکتی ہو۔ اس سے پہلے کہ لوگوں کو اس واقعہ کی اطلاع ہو ہمیں اس سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہئے۔" وہ لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ایلس اس کی بات نہیں سن رہی تھی وہ تو بس کیتلی کو گھورے جا رہی تھی۔

"اب ہم امیر ہو جائیں گے ہمارے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔" اس کے لبوں سے سرگوشی بلند ہوئی، وہ کیتلی کو دیکھے جا رہی تھی جس میں دس ہزار ڈالر تھے۔ جان اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا وہ دوبارہ خود کلامی کے انداز میں بولنے لگی۔

"ہمارے آس پاس پڑوسیوں کے تقریباً پندرہ گھر ہیں اور ان سب کو ہم پر بہت اعتماد ہے۔ ہر بار دس ہزار ڈالر..... ذرا سوچو جان!..... ہر بار دس ہزار ڈالر..... یا پھر شاید اس سے بھی زیادہ..... اب ہمیں کیتلی سے سکے مانگنے کی اور اپنے آپ کو تکلیف دینے کی کوئی ضرورت نہیں..... ہر بار دس ہزار ڈالر..... اب ہم بہت امیر ہو جائیں گے۔" اس کے چہرے پر سپاٹ مسکراہٹ تھی۔

"پندرہ پڑوسی..... ہر دفعہ دس ہزار ڈالر..... ہم بہت امیر ہو جائیں گے۔"

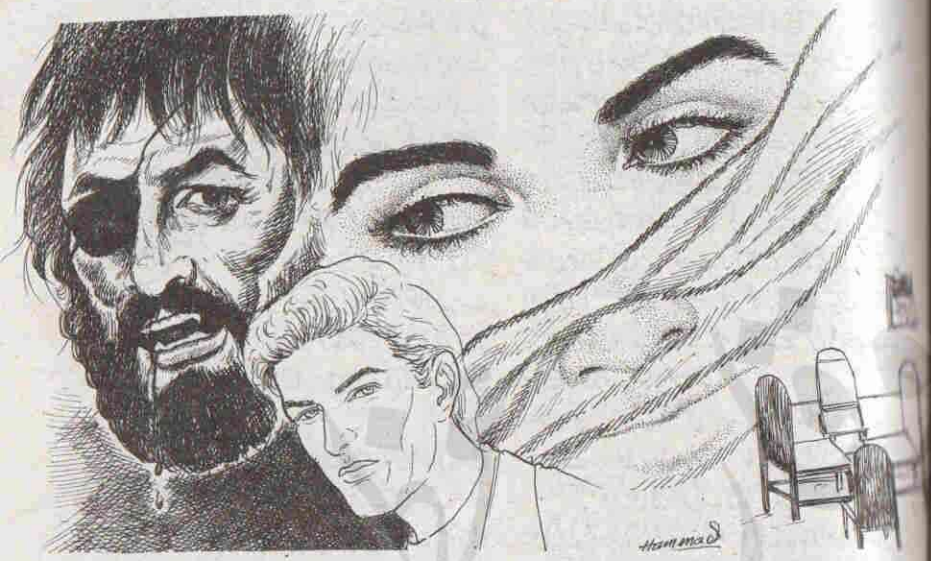

آنکھیں

شعیب شیرازی-اسلام آباد

خوبرو دوشیزہ کی پلک جھپکتے ہی اس نے اپنے آپ کو ایک انجان جگہ پر محسوس کیا، اس جگہ موجود نوجوان نے کہا تمہاری آنکھیں خوبصورت ہیں، میں تمہاری آنکھیں چرالوں گا، اور جب دوشیزہ کی آنکھ کھلی تو اس کی بینائی جاچکی تھی۔

کیا خلوص وچاہت اور عشق ومحبت کے متلاشی بھی خودغرض ہوتے ہیں؟ ایک دلگداز کہانی

"**انیلہ** کی آنکھیں چلی گئیں۔"

"کیا؟"

"ہاں بیٹا"

"مگر کیسے امی؟"

"پتہ نہیں بیٹا! بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ صبح سو کر اٹھی تو اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، اس کی آنکھیں بے نور تھیں۔"

"یقین نہیں آتا امی کہ ایسا کیسے ہو گیا؟"

"بیٹا یقین تو ہمیں بھی نہیں آ رہا مگر یہ سب سچ ہے، اب وہ کبھی نہیں دیکھ پائے گی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ کوئی تیز تپش کی وجہ سے اس کی بینائی گئی ہے اس کے علاوہ انیلہ نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔"

امی کا یہ انکشاف مجھ پر بجلی بن کر گرا، کہ انیلہ اب کبھی نہیں دیکھ پائے گی۔ مگر میں یہ سوچ سوچ کر پاگل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ جو شخص بچپن سے بینا ہے وہ اچانک کیسے نابینا ہوگیا ۔ اور ویسے بھی انیلہ میری منگیتر تھی، بہت جلد ہماری شادی ہونے والی تھی۔ میں اس سے انتہا درجے کی محبت کرتا تھا بلکہ دل و جان سے چاہتا تھا، کیسے کیسے خواب سجائے تھے ہم نے، ہمارے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔

کیا حسین خواب دکھایا تھا محبت نے ہمیں
کھل گئی آنکھ تو تعبیر پہ رونا آیا

ان حالات میں اب کوئی کیا کرسکتا تھا۔ یہ سب سوچ سوچ کر میرا سر چکرا رہا تھا۔ عجیب وغریب خیالات نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ میری زندگی کا سب سے پریشان کن مرحلہ۔

"جب میری زندگی ایسے موڑ پر آن کھڑی ہوئی ہے تو مجھے ایک ہی راستہ نظر آتا ہے کہ میں سب سے الگ تھلگ ہوکر تنہائی پسند بن جاتا ہوں اور اپنے غم کو ہلکا کرنے کے لئے انسانوں سے دور جنگل کا رخ کرتا ہوں۔ انیلہ جو حسن کی پیکر تھی میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ بیٹھا تھا کہ میری زندگی کی ساتھی ہے۔ میری چاہت میری الفت میرا پیار ہے کیا ہمارا ملن ممکن ہوگا؟ کیا ہم ایک دوسرے سے کیے ہوئے وعدے نبھا پائیں گے؟ میرے سب خواب بکھر رہے تھے، میری خواہشیں دم توڑ رہی تھیں۔ ہم نے تو ایک ساتھ جیسے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ پھر یہ کیسے ہوگیا؟ کیا یہ عشق کا امتحان ہے؟ اگر یہ عشق کا امتحان ہے تو میں اسے اپنالوں گا۔ اس کے غموں کا مداوا کروں گا۔ اس کے دکھ درد سہہ لوں گا، اسے وہ سب چاہتیں دوں گا۔ جن کے کبھی خواب دیکھے تھے۔

میں ان حالات میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ تو محبت کی توہین ہوگی۔ محبت کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔ محبت انسان سے نہیں کردار سے کیجاتی ہے۔ اور ویسے بھی محبت قربانی مانگتی ہے۔ ابھی تو اسے میری ضرورت ہے۔ میرے سہارے کی ضرورت ہے۔ ابھی تو وہ وقت آیا ہے، اخلاص وفا کا پیکر مجھے بننا ہے۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ انسان کو آزمایا جاتا ہے۔" عجیب و غریب خیالات میں جکڑا ہوا، میں آبادی سے بہت دور کھیتوں کی طرف چل دیا۔ جہاں ہر طرف حسین نظارے بکھرے پڑے تھے۔ پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں جنگل پر چھائے ہوئے سکوت کو توڑ رہی تھیں۔ میں کھیتوں کے درمیان ایک پتلی سی پگڈنڈی پر چل رہا تھا۔ سوچوں کا تانا بانا ابھی بھی میرے دل و دماغ پر طاری تھا۔ "اتنی خوبصورت آنکھیں کیسے نابینا ہوگئیں اس کی آنکھیں تو خوبصورتی کا شاہکار تھیں۔ ان آنکھوں میں تو گہرے رنگ بھرے تھے جس کی وجہ سے دیکھنے والا ڈوب جایا کرتا تھا۔"

ان کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
سونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

"کیا کسی کی نظر لگ گئی؟" میں نے سوچا۔ مگر میں نے خود ہی نفی کردی۔ نظر کا لگ جانا اتنا بڑا معمانی مسئلہ تو نہیں کہ اس سے اس کی بینائی ختم ہوجائے، اس حد تک تو ہوسکتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں جلن ہو درد ہو۔"

واقعی اس کی آنکھوں میں پراسراریت تھی عجیب تپش تھی۔ ہم تو صرف اتنا جانتے تھے کہ اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں۔ ہلکا نیلا اور سبز رنگ اس کی آنکھوں میں نمایاں رہتا تھا۔ اتنا تو ہم جانتے تھے کہ اس کے ساتھ ہی کئی عجیب وغریب واقعات کا مشاہدہ بھی ہوا۔

اس دن میں اس کے گھر کھانے کی ٹیبل پر کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ قریب ہی ٹیبل پر پانی سے بھرا شیشے کا گلاس رکھا ہوا تھا اور پاس ہی انیلہ بیٹھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کھانے کے دوران کن انکھیوں سے اسے دیکھ لیتا، جب بھی میں اسے دیکھتا تو اس کی نظر میری طرف ہونے کی بجائے پانی سے بھرے گلاس کی طرف ٹکی ہوتی تھیں۔ میں نے کئی بار اسے دیکھا مگر اسے اسی طرح پانی کے گلاس پر نظریں جمائے پایا۔ جیسے وہ پانی میں کچھ تلاش کررہی ہے۔ میں نے بھی یہی سمجھا اور کھانے میں مصروف رہا۔ مگر اس وقت میں اچھل ہی پڑا جب گلاس کئی حصوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔ اور سارا پانی ٹیبل پر بہہ گیا۔

اچانک پانی کا قطرہ میرے بدن سے ٹکرایا تو مجھے ایسا لگا کہ وہ قدرے گرم ہے، میری نظر انیلہ پر پڑی تو وہ ابھی بھی ٹوٹے ہوئے گلاس کو گھور رہی تھی، میں نے انیلہ کو جھنجھوڑا "انیلہ، انیلہ" میرے اس طرح اچانک ہلانے سے وہ چونک سی گئی۔ اپنے اردگرد کا جائزہ لینے لگی مگر اردگرد سب شانت تھا جب اس کی نظر ٹیبل پر بکھرے پانی پر پڑی تو مجھے بغور دیکھنے لگی۔ "کیا گلاس ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا؟"

مجھے بڑا عجیب لگا کہ "اسے تو علم نہیں کہ گلاس کے ساتھ کیا بیتی ہے؟" اس نے اپنے کاندھے اچکائے۔

"ابھی صاف کردیتی ہوں۔" اور وہ کپڑے سے سارا پانی صاف کرنے لگی۔

اس واقعے کے بارے میں کسی کو کچھ خبر نا ہوئی۔ اس واقعے سے مجھے ایک چیز کا تو اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں پراسراریت ہے۔ کیونکہ جب بھی شیشے کی کوئی بھی چیز سامنے آجاتی گویا کہ دو دشمن آمنے سامنے ہوں۔ وہ شیشے کو آنکھ بھر کر دیکھتی تو شیشے کے ٹکڑے بکھر جاتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ جس آئینہ میں وہ اپنے آپ کو سنوارتی، بال بناتی اپنے سراپائے حسن کو دیکھتی تو وہ آئینہ بھی اس کے حسن کی تاب نہ لاکر ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جاتا۔ جتنے بھی آئینے لائے جاتے وہ سب اس کی آنکھوں کا شکار بن جاتے۔ اس گھر میں آئینہ تو اب رہا بھی نہیں تھا۔ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا کہ آئینوں کے ساتھ یہ کیا ہورہا ہے؟ پھر سب نے اپنے لئے چھوٹے آئینے رکھے ہوئے تھے، کانچ کے سارے برتن اور آئینے اسی طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار بنتے رہے۔

یہ راز اس وقت فاش ہوا جب انیلہ نے اپنی چھوٹی بہن نائیلہ سے آئینہ مانگا۔ نائیلہ نے بلا جھجک دے دیا۔ انیلہ اپنے سراپائے حسن کو آئینے میں دیکھنے لگی نائیلہ اس انتظار میں تھی کہ کب آئینہ فارغ ہو اور وہ بھی اپنے خدوخال کی جانچ پڑتال کرے مگر انیلہ تو آئینے میں کھو گئی۔ جیسے کسی کو بہت عرصے بعد کچھ دیکھنے کو ملا ہو۔

نائیلہ نے جب اسے اس طرح کھوئے ہوئے پایا تو وہ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی اسے عجیب سا لگنے لگا۔ ابھی وہ اتنا ہی سوچ پائی تھی کہ کرچ کی آواز کے ساتھ کسی چیز کے ٹوٹنے کا احساس ہوا، جب نائیلہ نے فرش پر نظر ڈالی تو آئینہ انیلہ کے ہاتھ سے ریزہ ریزہ ہوکر بکھر چکا تھا۔ جب اس نے انیلہ کی طرف دیکھا تو وہ ابھی بھی نہ جانے کس جہان میں کھوئی ہوئی تھی۔ نائیلہ نے شیشے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انیلہ کو جھنجھوڑا۔ "انیلہ۔ انیلہ"

انیلہ چونک سی گئی اس کا انداز ایسا ہوگیا کہ جیسے نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ وہ آئینے سے بے خبر تھی جس کا ایک ٹکڑا ابھی بھی اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ ابھی کچھ دیر قبل کیا کچھ ہوا اور نائیلہ کو دیکھنے لگی جو بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اکٹھا کررہی تھی۔

اچانک نائیلہ کی نظر ایک ٹکڑے پر پڑی جس کی پشت پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ مگر آدھا تھا۔ پھر اسے ایسے کئی ٹکڑے نظر آئے جن کی پشت پر کچھ نہ کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر آئینے کے ٹکڑوں کو جوڑنا شروع کیا۔ تب ایک لفظ سامنے ظاہر ہوا "آنکھیں"۔

نائیلہ کے سامنے ایک بات تو کھل کر آگئی تھی کہ آنکھوں کا کچھ نہ کچھ چکر ضرور ہے۔ اس نے یہ بات سب سے چھپائی اور کسی دوسرے آئینے کا ٹوٹنے کا انتظار کرنے لگی اور پھر ایسا ہی ہوا جب دوسرے آئینے کے ٹکڑوں کو جوڑا گیا تو ان کے پیچھے بھی "آنکھیں" لکھا ہوا تھا۔

اس دن میں بھی ادھر ہی موجود تھا اور گلاس والا واقعہ بھی ایک دو دن پہلے کا تھا۔ نائیلہ نے وہ ساری باتیں مجھے بتلادیں۔ میں نے بھی اس کی ہر بات سچ مان لی کیونکہ واقعی ایسا تھا۔ یہ بات سمجھنے میں کسی بھی دلیل یا ثبوت کی ضرورت پیش نہیں آئی پھر ہم دونوں نے یہ بات ہر ایک سے چھپائی۔ کیونکہ یہ سب کچھ ثابت کرنے کے لئے ابھی بھی ایسے ثبوت کی ضرورت تھی جس سے ہماری باتوں کو تسلیم کرلیا جاتا۔ اس طرح آئینے کا ٹوٹنا اور اس کی پشت پر "آنکھیں" لکھا ہونا۔ اس سے تو یہ پتہ چلتا تھا کہ کوئی پراسراریت ضرور ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن ”وہ ہے کیا؟“ یہ تو ہم نہیں جانتے تھے۔ اور پھر ہم دونوں اس تگ و دو میں لگ گئے کہ اس پر اسراریت سے پردہ فاش کیا جائے۔ اپنے اپنے طور پر ہم دونوں ہی سرگرداں تھے۔ میں نے اکثر انیلہ سے اس کی آنکھوں کے متعلق یہی سب کچھ پوچھا جو گذرا تھا مگر وہ تو ایسے انجان تھی جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ ہو۔ میں جب بھی انیلہ سے بولتا کہ ”تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔“ وہ صرف اتنا کہتی تھی۔ ”وہ تو ہیں۔“ اور مسکرا کر بات ٹال دیتی۔

سیدھا سا اک سوال ہے سیدھا جواب دو
یوں مسکرا کے بات کو نہ ٹالا کرو وصی

کافی جدوجہد کے بعد بھی ہم کوئی بھی سراغ لگانے میں ناکام رہے اور اسی طرح وقت گزرنے لگا مگر اس کی آنکھوں کی پر اسراریت کا بھوت ابھی بھی میرے سر پر سوار تھا کسی بھی طور میں اسرار جان لینے کے بغیر مجھے سکون میسر نہیں تھا۔ میری زندگی ایک عجیب چوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک ایسا موڑ جو پل پل میری بے چینی میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ جب میری زندگی ایسے موڑ پر آن کھڑی ہوتی ہے تو میں تنہائی پسند بن جاتا ہوں جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا یا پھر کتابوں سے دوستی کر لیتا ہوں، ابھی بھی میں کتابوں کی ورق گردانی میں لگا ہوا تھا اور پھر مجھے میرا مقصد حاصل ہو گیا، جب ورق گردانی کے دوران ایک صفحہ میرے سامنے آ گیا۔ جس پر لکھا ہوا تھا جادو کی کمالات! آگے کمالات کا ذکر تھا۔ میرے لئے سب سے اہم کمال یہ تھا کہ ”نظروں کے ذریعے گلاس توڑنا“ اور یہ سب ممکن ہے میجک کے ذریعے۔

بات کافی حد تک میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ کیا انیلہ بھی میجک میں دلچسپی رکھتی ہے؟ اور کیا وہ یہ سب میجک کے ذریعے کر رہی ہے؟ کچھ حد تک میں مطمئن ہو چکا تھا۔ اور پر اسراریت کا بھوت بھی میرے سر سے اتر چکا تھا۔

دن تیزی سے گذرنے لگے۔ اس واقعے کو کم و بیش ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ ”آج مجھے یہ خبر سننے کو ملی کہ انیلہ کی آنکھیں چلی گئی ہیں۔“

اور پھر میں دل برداشتہ ہو کر کھیتوں کی طرف نکل پڑا یہی سب کچھ سوچتے ہوئے مجھے کھیتوں میں شام ہو گئی۔ سورج بھی الوداع کرتا ہوا رخصت ہونا چاہتا تھا۔ اور پھر شام کے دھندلکے بھی چھانے لگے تھے۔ میرے ذہن پر چھایا ہوا غبار بھی کافی حد تک صاف ہو چکا تھا۔ اور پھر کل انیلہ کے گھر جانے کا سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر پہنچا تو ہر طرف خاموشی کا راج پایا۔ گھر کا ہر فرد اداس تھا۔ میں کسی سے کچھ بولے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات کو کھانا بھی نہیں کھایا۔ رات گئے تک یہی کچھ سوچتا رہا اور پھر نہ جانے کب نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہو گئی اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

دوسرے دن میں اپنے ماموں کے گھر موجود تھا۔ انیلہ میری ماموں زاد تھی ہر شخص پریشان پریشان سا لگ رہا تھا۔ میری خاص آؤ بھگت نہ کی گئی۔ بس رسماً سب نے مجھے خوش آمدید کہا۔ ہر شخص غم میں ڈوبا ہوا تھا پھر ان حالات میں کون مجھے ویلکم کرتا۔ میں بھی رسمی علیک سلیک کے بعد انیلہ کو تلاش کرنے لگا، گھر سے باہر نکلا تو وہ مجھے تھوڑی دور جامن کے درخت کے نیچے نظر آئی جو دنیا سے بیگانی خیالوں میں مستغرق تھی، میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اسے میری آمد کا پتہ نہ چل سکا، میں نے خود ہی اپنی موجودگی کا احساس دلایا یعنی میں کھنکھارنے لگا تو وہ آواز سن کر چونک سی گئی۔ اور اپنے آس پاس ہاتھ مارنے لگی شاید کسی ان دیکھے وجود کو چھونا چاہتی تھی۔

پھر اچانک بول پڑی۔

”دیپک..... دیپک۔“

دیپک کا نام سن کر مجھے شدید جھٹکا لگا۔ ”یہ دیپک کہاں سے آ گیا؟“۔

مزید میں دیپک کا نام نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس لئے فوراً بول پڑا۔ ”انیلہ! میں ساحل ہوں۔“ مجھے ایسا لگا کہ ساحل کا سن کر انیلہ کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ انیلہ

جو ساحل کا سن کر شرما جاتی تھی۔ آج ساحل کا سن کر وہ خاموش بیٹھی تھی۔ وہ انیلہ جو ساحل کا سن کر اس کے چہرے پر خوشی رقص کرنے لگتی۔ آج وہ ساحل کا سن کر اداس سی ہو گئی تھی۔ یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔ میں انیلہ کو دلاسہ دینے آیا تھا نا کہ اس کے زخموں کو کریدنے۔

”ساحل تم آ گئے۔ میں کب سے تمہاری راہیں دیکھ رہی تھی۔“

مجھ سے رہا نہ گیا اور میں بول پڑا۔ ”مگر انیلہ یہ دیپک؟“

چھوڑو دیپک کو! تم اپنی سناؤ کیسے ہو؟“۔

”انیلہ میں تو ٹھیک ہوں، مگر تمہارے ساتھ یہ سب کیسے ہو گیا؟“۔

”ساحل یہ سب قدرت کے کھیل ہیں، میری دنیا کے سب رنگ بے نور ہو گئے ہیں۔ دیکھ آنکھوں سے اندھی ہو گئی ہوں۔“

شاید وہ ایموشنل ہوتی جا رہی تھی۔ ”انیلہ! تم صبر سے کام لو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں آ گیا ہوں ناں، میں سب ٹھیک کر لوں گا۔“ میں نے قدرے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”نہیں ساحل اب کچھ بھی نہیں ہونے والا، میں تمہیں پہلے بھی کچھ بتا دینا چاہتی تھی مگر کن وجہات کی بنا پر بتا نہیں پائی۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ سب کچھ تمہیں بتا دیا جائے۔ اس سے پہلے میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا شاید اس لئے کہ کوئی میری باتوں کو تسلیم نہیں کرے گا۔ ایک تم ہی تو ہو جو میرے جھوٹ کو بھی سچ مان لیتے ہو، کب سے تمہاری راہیں تک رہی ہوں کہ تم آؤ گے اور تمہیں اصل بات بتاؤں گی۔“

”اصل بات۔“ میں نے گہرے تجسس سے کہا۔

”ہاں ساحل اصل کہانی کچھ اور ہے وہ گلاس کا ٹوٹنا، آئینوں کا ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنا، سب میری آنکھوں کی وجہ سے تھا۔ اور میں یہ سب جانتی تھی مگر کسی کو بتا کر اپنا مذاق نہیں اڑوانا چاہتی تھی۔“

انیلہ کافی حد تک سریس ہوتی جا رہی تھی اور میں اس کی باتوں کو سنجیدگی سے سن رہا تھا۔

”ساحل جب میں پہلی بار کھیتوں میں گئی تو وہ مجھے سرسوں کے کھیت میں نظر آیا، میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ وہ کم و بیش میری ہی عمر کا لگتا تھا۔ اسے رنگوں سے محبت تھی بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ اسے رنگوں سے عشق تھا، کبھی وہ نیلے آسمان کو دیکھتا تو کبھی خوبصورت مناظر میں کھو جاتا تھا۔ اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتی تھی، اس دن اس سے میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ سرسوں کے پھولوں کے درمیان ایک تتلی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس وہ بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ اس کے بال ہوا کے دوش پر لہرا رہے تھے۔ شاید وہ تتلی کو پکڑنا چاہتا تھا۔ اپنے اردگرد سے بیگانہ وہ تتلی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ اس نے تتلی کو پکڑ لیا۔ تتلی نازک ہوتی ہے کسی کے ہاتھوں میں آنے سے مسلی جاتی ہے۔ مگر اس نے تتلی کو اس طرح پکڑا کہ وہ ابھی بھی اس کے ہاتھوں میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔

اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی وہ مجھے اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر شرمندہ سا ہونے لگا۔ شاید اس لئے کہ تتلیوں کا پکڑنا بچوں کا کام ہے اور پھر شرمندہ سی مسکراہٹ لئے وہ میرے قریب آنے لگا۔ ایک اجنبی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں سہم سی گئی۔ مگر مجھے اس سے خوف نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ وہ مجھے معصوم اور بھولا سا لگا! وہ میرے بہت قریب آ گیا۔ اتنا قریب کہ وہ میری آنکھوں میں جھانک سکتا تھا۔ پھر ایسا بھی ہوا، وہ میری آنکھوں میں ایسا کھویا کہ خود سے بھی بیگانہ ہو گیا۔ پتہ نہیں وہ میری آنکھوں میں کیا تلاش کر رہا تھا۔ تتلی ابھی بھی اس کے ہاتھوں میں موجود تھی پھر اچانک تتلی پھڑ پھڑائی، تتلی کے پھڑ پھڑانے سے اسے اپنے وجود کا احساس ہوا، وہ میری آنکھوں سے نکل کر باہر آ گیا۔ میری آنکھوں میں جھانک کر وہ شرمندہ تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے اس نے وہ رنگ برنگی تتلی اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں ہاتھوں کے درمیان قید کرلی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان جھری تھی۔ تتلی اس کے ہاتھوں کے حصار سے باہر نکلنے کے لئے مچل رہی تھی۔ پھر وہ تتلی کو دیکھنے لگا۔ اس نے باری باری دونوں آنکھوں سے جھانک کر تتلی کو دیکھا۔ پھر اس نے اپنے سر کو اوپر اٹھایا تو اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ کچھ دیر اس نے اپنی آنکھیں بند کرنے کے بعد آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں ٹمٹما رہی تھیں۔ کچھ دیر ٹمٹمانے کے بعد آنکھیں اپنی جگہ پر آ کر ٹھہر گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کھلا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے تتلی اس کے ہاتھوں سے نکل کر آزاد ہوگئی۔

مگر ایسے لگتا تھا کہ وہ پہلے والی تتلی نہیں تھی بلکہ بے رنگ ہوگئی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اب اس تتلی کے سارے رنگ اس کی آنکھوں میں جھلک رہے تھے اور وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں ایسی کھوئی کہ تھوڑی دیر کے لئے میں بھی خود سے بیگانی ہوگئی۔

جوں جوں میں اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی میری آنکھوں میں نشہ بڑھتا جارہا تھا۔ پھر جونہی اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں تو میں ہوش کی دنیا میں واپس چلی آئی۔ گویا کہ جس نشے میں ڈوبی جارہی تھی اس کا آنکھوں کا جھپکنا درمیان میں حائل آ گیا۔ اور میں شرمندہ سی اسے کن انکھیوں سے دیکھنے لگی۔

"تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔" اس نے اچانک سے یہ جملہ بول دیا۔ اس کے اس جملے سے میں سمٹ سی گئی۔

"میں دیپک ہوں۔" گویا کہ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ "دوستی کروگی مجھ سے!" یہ اس کی آفر تھی جسے میں کسی بھی صورت ٹھکرانا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ جہاں اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں، وہیں وہ خود بھی خوبصورتی کا شاہکار تھا۔ بلاجھجک میں نے دوستی کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس بھی مجھے حیران کر دیا، لطیف سا نرم و نازک ہاتھ، جی چاہ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ تھام کر رکھوں، مگر وہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ اور پہلی ہی ملاقات میں کسی کی اتنی قربت میسر آنا ناممکن سا لگتا ہے۔

"مجھے رنگوں سے پیار ہے۔" اس نے اپنا شوق ظاہر کیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھے ہوا تھا۔ "مجھے رنگوں سے پیار ہے۔ جہاں بھی خوشنما نظارے دیکھتا ہوں ان میں کھو سا جاتا ہوں۔ ان میں سمانے کو دل کرتا ہے۔ اپنانے کو دل کرتا ہے۔ سارے رنگ چرانے کو دل کرتا ہے۔ مگر جو نظارا تمہاری آنکھوں میں کیا۔ ایسا نظارا پہلے کبھی نہیں کیا۔ تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ تمہاری آنکھوں کے سارے رنگ میں چرالوں گا۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

میں اس کی یہ بات سمجھ نہ پائی کہ "تمہاری آنکھوں کا رنگ چرالوں گا۔" شاید مذاق کر رہا تھا۔ اس کے عجیب شوق پر میں تذبذب کا شکار ہوتی جارہی تھی۔

"میرے جانے کا سمے آ گیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ کل پھر ملیں گے۔ اسی جگہ پر۔" اتنا کہہ کر وہ ایک طرف کو چل دیا۔

عجیب تھا وہ، کسی کو ملنا دوستی کی آفر کرنا اور پھر سب کچھ نظر انداز کر کے ایک طرف کو چل دینا یہ سب کچھ عجیب سا تھا۔ دل نے چاہا کہ اسے نہ جانے دوں مگر روکنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ ایک طرف کو جارہا تھا اور میں اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ کافی دور چلا گیا مگر اس کا دھندلکا ابھی بھی نظر آ رہا تھا۔ پھر جونہی میں نے آنکھیں جھپکائیں تو وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ اور میں بوجھل قدموں کے ساتھ گھر کی طرف چل پڑی۔

میرے دل و دماغ پر وہی طاری تھا۔ میں اسے بھلائے نہیں بھولتی تھی۔ بس اسی کے بارے میں سوچنا، خیالوں میں اسی کے چہرے کا طواف کرنا۔ اسی کے لئے تڑپنا میری عادت سی بن گئی۔

"کل پھر اسی جگہ دوبارا ملیں گے۔" یہ سوچ کر دل خوشی سے جھوم اٹھتا مگر کل میں بہت وقت پڑا تھا۔

ایک ایک لمحہ مجھ پر پہاڑ بن کر گذرنے لگا گھر کے کام کاج سے دل اکتا گیا، آنے والے کل کا بے صبری سے انتظار میری جان لینا جارہا تھا۔ میں ماہئی بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ سب نے مجھے اکتایا ہوا دیکھا۔ میری بے چین طبیعت کو سب نے بھانپا، مگر طبیعت کا اکتا جانا کسی بھی طور ہوسکتا ہے۔ "آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔" ایک بار پھر اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی میں اپنے اردگرد کا احاطہ کرنے لگی مگر آس پاس تو کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ شاید میرا وہم تھا۔ اور پھر میں آئینے کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور اپنی آنکھوں کا بغور جائزہ لینے لگی۔ آنکھوں کو پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ "واقعی میری آنکھیں خوبصورت ہیں۔" آنکھوں میں کئی رنگ سما گئے تھے۔ اور پھر میں خود سے بھی شرما گئی۔

کہ اچانک کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میری نظر آئینے پر پڑی تو وہ ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گیا تھا۔ میں حیران پریشان آئینے کو دیکھ رہی تھی۔ یہ سب کیسے ہوا؟ میں نہیں جانتی تھی، شاید میری آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ آئینہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور پھر ایسا بھی ہونے لگا جس چیز میں بھی میرا عکس ابھرتا وہ چیز ٹوٹ کر بکھر جاتی۔ وہ گلاس کا ٹوٹنا کسی بھی آئینے کا سلامت نہ رہنا سب میری آنکھوں کی وجہ سے تھا۔ یہ سب کمال میری آنکھوں کا تھا۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا۔

جب دوسرے دن میں اس سے ملنے گئی تو وہ پہلے ہی سے جامن کے درخت کے پاس موجود تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بے صبری سے میرا منتظر ہو۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر خوشی رقص کرنے لگی۔ میں بھی اس کی معصومیت پر مسکرا دی۔ "آ گئی تم، میں کب سے تمہاری راہیں تک رہا تھا۔" اس نے تھوڑی بے زاری سے کہا اور دور خلاؤں میں گھورنے لگا جیسے وہ مجھ سے ناراض ہے۔ مگر وہ ناراض کیوں تھا یہ حق تو ابھی میں نے اسے دیا ہی نہیں تھا۔ پھر کیوں ناراض تھا؟ شاید مجھے اپنا سمجھ بیٹھا تھا۔ یا پھر اس نے میرے دل کی کیفیت کا اندازہ کرلیا تھا کہ میں رات بھر اس کے لئے تڑپتی رہی ہوں۔ میں نے بھی اسے خوش کرنے کے لئے کہہ دیا "سوری بابا! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

وہ ابھی بھی خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ اور پھر اس نے ناچاہتے ہوئے بھی مجھے دیکھا اور وہیں پر بیٹھ گیا۔ وہ روٹھا روٹھا سا لگ رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ پھر سے اپنے شوق بیان کرنے لگا۔ "انیلہ!" اسے میرا نام بھی معلوم تھا۔ "مجھے رنگوں سے پیار ہے جہاں بھی خوشنما رنگ دیکھتا ہوں ان میں کھو سا جاتا ہوں۔"

"مگر تم تو یہ سب بتا چکے ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"ہاں مگر میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

"کیا بتانا چاہتے ہو تم؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آتا ہوں؟"

"تو پھر بتاؤ ناں۔" میں نے بے صبری سے کہا۔

"انیلہ! میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ میں انسان نہیں ہوں۔"

"انسان نہیں ہو!! اچھا جوک کر لیتے ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"انیلہ میں مذاق نہیں کر رہا۔" اس بار وہ کافی سنجیدہ تھا۔

"تو پھر کیا ہو؟ کوئی جن ہو؟"

"نہیں میں جن بھی نہیں ہوں۔" اس نے پھر عجیب بات کہہ ڈالی تھی۔

"عجیب انسان ہے کہتا ہے، میں انسان نہیں ہوں پھر کہتا ہے، میں جن بھی نہیں ہوں۔" میں خود سے بول رہی تھی۔

"انیلہ میری بات کا یقین کرو، میرا تعلق جنات سے ہے اور نا ہی انسانوں سے۔" اس بار وہ کافی سنجیدہ تھا اور سچائی اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ مجھے بھی اس کی بات سیریس لینی پڑی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ کہہ رہا تھا۔ ''انیلا نہ ہمارا تعلق جنات سے ہے اور نہ ہی انسانوں سے، بس اتنا سمجھ لو کہ ہم جنات اور انسانوں کے درمیان کی مخلوق ہیں، ہماری کچھ ضروریات جنات جیسی ہیں اور کچھ انسانوں جیسی لیکن ہم ان دونوں کے بیچ ہیں، ہمیں الگ تھلگ ہی رہنا پڑتا ہے۔ ہمارا بھی ایک قبیلہ ہے۔ ہماری بھی ایک بستی ہے۔ ہم اپنی دنیا میں رہتے ہیں۔'' اس کی باتیں حیران کردینے والی تھیں۔

اور میں حیرانگی کا مجسمہ بنے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''انیلہ! ہماری سردار ایک پری زاد تھی۔ اسے ایک ایسے انسان سے پیار ہوگیا جسے رنگوں سے پیار تھا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ مصور تھا اور تصویروں میں رنگ بھرا کرتا تھا۔ اس انسان کو رنگوں سے حد درجے کا عشق تھا۔ پری یہ بات جانتی تھی اس نے انسان کی خوشی کیلئے اپنی ساری نگری کو رنگوں میں رنگ دیا اور انہی رنگوں کے درمیان ان کی شادی ہوگئی۔ سب یہ بات جانتے تھے کہ ایک پری اور انسان کا ملاپ ممکن نہیں۔ مگر اس میں ہماری سردار کی خوشی تھی، کوئی کیا کرسکتا تھا۔ ان کی شادی کے بعد جو بچہ پیدا ہوا وہ عجیب تھا، نا اسے انسان کہا جاسکتا تھا اور نا ہی پری زاد مگر وہ دکھتا انسان تھا اور صلاحیتیں جنات جیسی تھیں۔ پری کے بعد وہ اس کا جانشین ٹھہرا۔ اس کی نسل جب آگے بڑھی تو سب اس کی طرح تھے۔'' ''انہی میں سے میں ایک ہوں۔'' پھر اس نے اپنی ایک الگ دنیا بسالی۔ کیوں کہ جنات کے ساتھ ہمارا گزارا نہیں ہوتا تھا۔ اور اپنی ماں کا مجسمہ بنا کر اپنی نگری میں نصب کردیا۔ پھر وہ سب کے لئے دیوی کا مقام رکھنے لگی۔

اس نے اپنے قبیلے کے باشندوں کو حکم دیا کہ وہ پیارے پیارے رنگ چرا کر لائیں، دیوی کے حکم پر سب کے سب کمربستہ ہوگئے، یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ اچھے سے اچھا رنگ لے کر آئے تاکہ اسے انعام ملے۔ رنگ چرانے میں وہ اتنے حریص ہوتے چلے گئے کہ آنکھوں کے رنگ بھی چرانے لگے۔ اور پھر بات اتنی آگے بڑھ گئی کہ آنکھوں کا رنگ چرانے کی بجائے آنکھوں کی بلی دی جانے لگی۔

ان میں سے کسی ایک کی نظر تم پر بھی پڑ گئی۔ اور پھر مجھے حکم ہوا کہ میں تمہاری آنکھوں کے سارے رنگ چرالوں۔ ہماری دیوی کو خوش کرنے کے لئے تمہاری آنکھوں کی بلی چاہیے۔ بس میں تمہاری آنکھیں چرانے آیا تھا لیکن میں ایسا کر نہیں پا رہا ہوں۔ شاید مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ تمہاری آنکھوں سے پیار ہوگیا ہے پھر میں کیسے تمہاری آنکھیں چرالوں'' وہ اپنی کہانی سنا کر پھر خلاؤں میں گھورنے لگا۔

میں عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ میری سوچیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ ''کیا یہ انسان نہیں ہے؟ میری آنکھوں کے سب رنگ چرانا چاہتا ہے۔ چرا نہیں پا رہا، کیا اسے مجھ سے محبت ہے۔''

''مگر انیلہ اس سے پہلے میں تمہیں اپنی نگری دکھانا چاہتا ہوں۔'' وہ پھر بول پڑا۔ مجھے اتنا بھی موقع نا ملا کہ میں اس کی سنائی ہوئی کہانی پر غور کرسکوں۔ ''چلو گی میرے ساتھ؟'' اس نے یہ بات ایسے کہہ ڈالی تھی کہ میں اس کی کہانی پر ایمان لا چکی ہوں۔ ''تمہاری دنیا! کہاں ہے تمہاری دنیا؟'' میں نے اسے جھٹلاتے ہوئے کہا۔

''انیلہ تمہیں یہ سب جھوٹ لگ رہا ہے۔ یہ جھوٹ نہیں ہے، میں تمہیں رات کو لینے آؤں گا۔ تم بس تیار رہنا، ایک بار تمہیں اپنی دنیا دکھانی ہے۔ میں چلتا ہوں رات کو ملیں گے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک طرف کو چل دیا۔

اس بار وہ مجھے گہری سوچوں میں ڈال گیا تھا۔ اور میرے لئے ان سوچوں سے باہر نکلنا کسی بھی طور ممکن نہیں تھا۔ جو کہانی وہ سنا گیا تھا، مجھے تو وہ کوئی افسانہ نگار لگتا تھا۔ مگر جس سنجیدگی کے ساتھ اس نے کہانی سنائی تھی کبھی کبھی تو اس کہانی پر سچ کا گمان ہونے لگتا۔ بہر حال جو بھی تھا، میں اٹھ کھڑی ہوئی اور گھر کی طرف چل دی۔ گھر آ کر بھی انہی خیالوں میں جکڑی رہی کہ ''کیا یہ سب

سچ پر مبنی ہے؟ کیا وہ رات کو آئے گا؟ لگتا تو نہیں۔'' اور پھر کچھ سوچ کر رات ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ کیونکہ وہ جو بھی تھا مجھے بس اچھا لگتا تھا۔ میں سمجھتی کہ میرا ہر پل ہر لمحہ اسی کے ساتھ گذرے۔ اس کی رومانوی کہانی کو تو میں بھلا ہی چکی تھی۔ بس انتظار تھا تو صرف اس کا، اس کے بارے میں سوچتے ہوئے رات ہوگئی۔

رات کو میں چھت پر جا کر ٹہلنے لگی۔ اور بے صبری سے اس کا انتظار کرنے لگی۔ کافی رات بیت گئی، وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ کھیتوں میں جا کر دیکھتی ہوں شاید وہاں آیا ہو۔ مگر اس وقت باہر نکلنے سے مجھے خوف آتا تھا۔ سو میں چھت پر ہی ٹہلنے لگی۔ اور پھر میں کتنی ہی دیر اس کا انتظار کرتی رہی، اسے نہ آنا تھا اور وہ نہ آیا، میں مایوس ہو کر نیچے چلی آئی، مجھے اس پر غصہ بھی آرہا تھا کہ آنے کا وعدہ کر کے بھی وہ نہ آیا۔

آجا کہ انتظار نظر ہیں کہیں سے ہم
مایوس ہو نہ جائیں کہیں زندگی سے ہم

نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رہ رہ کر اس پر غصہ آرہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اپنی آنکھیں موندلیں پھر نہ جانے کب نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہوئی اور میں نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ مگر مجھے ایسا لگا کہ ذرا سی آہٹ سے میری آنکھیں کھل گئی ہوں سامنے نظر پڑی تو دیپک کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مجھے اس پر غصہ آرہا تھا۔ مگر اس کی معصوم سی مسکراہٹ کے سامنے اپنا سب کچھ ہارنے کو دل کر رہا تھا، مجھے ایسا لگا کہ میں کسی اور دنیا میں موجود ہوں۔ یہاں تو ہر طرف دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے پڑے تھے۔ دیپک چلتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ ''دیپک تم کل کیوں نہیں آئے؟ کتنا انتظار کیا تھا میں نے تمہارا؟'' میں نے اس پر اپنا غصہ جھاڑا۔

''میری جان ابھی کل ہونے تو دو، تب غصہ کرنا۔''

''کیا مطلب تمہارا؟''

''یہی کہ اب تم میرے ساتھ میری نگری میں موجود ہو، میں تو اپنے وعدے پر قائم ہوں۔''

میں اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے لے کر ایک طرف کو چل دیا۔ واقعی اس کی دنیا خوش رنگ لگتی تھی، کہیں پر جھیل اور کہیں پر اونچی نیچی پہاڑیاں تھی۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ خوبصورت نظارے میرے من کو لبھا رہے تھے۔ ہر طرف پھولوں کی بھرمار تھی۔ اور خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ مسحور کن خوشبو انسان کو پاگل کیے دیتی تھی۔ رنگوں کا تو حسین امتزاج بکھرا پڑا تھا۔ ایسے رنگ میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہم خوبصورت نظاروں سے گذرتے ہوئے ایسی جگہ پر آن پہنچے۔ جہاں پر ایک خوبصورت سی دیوی کا بت ایستادہ تھا۔

دیپک اس دیوی کے سامنے ہاتھ باندھ کر پرنام کرنے لگا۔ ''انیلہ! یہ ہے ہماری دیوی۔ جس نے اس انسان سے محبت کی تھی۔ اسی کی خاطر ہم رنگوں کو چراتے ہیں۔ انیلہ ہماری دیوی تمہاری آنکھوں کی بھی بلی چاہتی ہے۔ اسی لئے میں تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔ انیلہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری بینائی چھین لی جائے۔ مگر کیا کروں مجبوری ہے۔ دیوی کی خوشی اسی میں ہے کہ تمہاری آنکھوں کی بلی دی جائے۔ تمہاری آنکھیں میرے پاس امانت رہیں گی۔ جس دن ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ ہم تمہاری بینائی تمہیں لوٹا دیں گے۔

آج کے بعد ہماری ملاقات نہیں ہوگی۔ بس ایک دن تمہیں تمہاری بینائی لوٹانے ضرور آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا، میں ضرور آؤں گا۔''

اور پھر اچانک سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ دیر قبل جو حسین نظارے میری آنکھوں کا مرکز بن رہے تھے۔ وہ سب میری آنکھوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میں دیپک کو پکارنے لگی۔ ''دیپک دیپک'' مگر دیپک تو جیسے غائب ہوگیا تھا۔ میں کچھ تلاش کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔

اچانک مجھے ٹھوکر لگی میں گرنے ہی والی تھی کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری آنکھیں کھل گئی۔ میں نے خود کو اپنے بستر پر پایا، میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر میں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھی۔ کیا یہ سب خواب تھا؟ مگر یہ تو حقیقت کا روپ دھار چکا ہے۔ میری بینائی چلی گئی تھی۔ مجھے اس کی باتیں یاد آنے لگیں۔ ''تمہاری آنکھوں کی بلی دینی ہے۔ میں تمہاری آنکھوں کے سارے رنگ چرالوں گا۔'' واقعی اس نے میری بینائی چھین لی تھی۔ مجھے اندھا بنا دیا تھا۔ وہ میری آنکھوں کے سارے رنگ چرا کر لے گیا تھا۔

بہت عزیز تھی اسے میری آنکھیں لیکن
وہ مجھے چھوڑ کر میری آنکھیں لے گیا

آج مجھے اس کی پھر بات سچ لگ رہی تھی۔ میں اپنی آنکھوں کے غم میں ڈوبی جارہی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا۔

اچانک میری چیخ نکل گئی۔ ''نہیں..... نہیں.....'' چیخ سنتے ہی گھر کا ہر فرد میری طرف بھاگا جب مجھے ہوش آیا تو سب میرے گرد جمع تھے۔ مجھ سے وجہ پوچھی جارہی تھی۔ ''کیا ہوا تھا؟'' چیخ کیوں ماری تھی؟'' میں انہیں کیا بتاتی کہ میرے ساتھ کیا گذری ہے۔ بس اتنا بتا پائی کہ ''مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔ میری بینائی چلی گئی ہے۔'' یہ بات سن کر سب اچنبھے میں پڑ گئے۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ ٹھیک ٹھاک تو سوئی تھی۔''

اس واقعے کو ایک سال بیت گیا ہے۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ اصل کہانی آج تمہیں سنائی ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ تم میری باتوں کا یقین کرو گے۔ اس نے کہا تھا کہ۔ ''میں آؤں گا، تمہاری بینائی تمہیں لوٹانے۔'' میں آج تک اس کا انتظار کررہی ہوں۔''

جب میں نے انیلہ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے اور وہ یہ غزل سنا کر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''وہ ضرور آئے گا۔ وہ سچ بولتا تھا۔ وہ اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتا، وہ ضرور آئے گا وہ ضرور آئے گا۔''

بھر کائیں گی میری پیاس کو اکثر تیری آنکھیں
صحرا میرا چہرہ ہے سمندر تیری آنکھیں
پھر کون بھلا داد تبسم انہیں دے گا
روئیں گی بہت مجھ سے بچھڑ کر تیری آنکھیں
خالی جو ہوئی شام غریباں کی ہتھیلی
کیا کیا نہ لٹاتی رہیں گوہر تیری آنکھیں
بوجھل سی نظر آتی ہیں بظاہر مجھے لیکن
کھلتی ہیں بہت دل میں اتر کر تیری آنکھیں
اب تک میری یادوں سے مٹائے نہیں مٹتا
اک بھیگی ہوئی شام کا منظر تیری آنکھیں
میں سنگ میل ایک ہی راستے پہ کھڑا ہوں
شاید مجھے دیکھیں گی پلٹ کر تیری آنکھیں
یوں دیکھتے رہنا اسے اچھا نہیں محسن
وہ کانچ کا پیکر ہے تو پتھر تیری آنکھیں

وہ اپنا سارا درد غزل میں بیان کرکے جا چکی تھی۔ میرے ذہن میں ایک خیال گذرا ''انیلہ غزل۔'' غزل تو انیلہ نے سنائی ہے کیوں نہ اسے ''انیلہ غزل'' کہہ دوں۔

وہ ایسا غم سنا کر مجھے بھی رلا گئی تھی۔ میں گہری سوچوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ''کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی خود کسی سے محبت کرے اور وہ اس کی آنکھیں چھین لے۔ کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ آنکھوں میں رنگ بھرنے والا حسین نظاروں کی سیر کرانے والا خود اسے اندھے کنوئیں میں دھکیل دے۔ عجیب لوسٹوری ہے۔ ''میں واپس آؤں گا، تمہیں تمہاری آنکھیں لوٹانے۔''

اس سے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ محبت کرنے والے دھوکا نہیں دیتے۔ وہ وفا کرتے ہیں۔ وہ تو غم بھی بانٹ لیا کرتے ہیں۔ پھر غم کی وجہ کیوں بنیں گے۔ ''بس یہی کچھ سوچ کر میں خوش تھا اور مطمئن بھی۔ مگر یہ شعر پھر بھی میرے دماغ میں ہلچل مچا رہا تھا۔

بہت عزیز تھی اسے میری آنکھیں محسن
وہ مجھے چھوڑ کر میری آنکھیں ساتھ لے گیا

لنگڑا بھوت

ایم ریاض-حضرو

خستہ حال مکان رات کی تاریکی میں بہت پراسرار لگ رہا تھا، چارپائی پر سوئے ہوئے شخص کو ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اسے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ جسے سن کر وہ شخص ماہئی بے آب ہوگیا۔

کم عقلی اور ناسمجھی اکثر انسان کو پریشانی سے دوچار کرتی ہے، یہ تو کہانی پڑھ کر ہی پتہ چلے گا

وعدے کے مطابق فائزہ آج پھر اسلم سے ملنے آئی تھی۔ اور سونے پر سہاگہ کہ آج اسلم کا بڑا بھائی اکرم بھی گھر پر نہیں تھا وہ پچھلے تین دنوں سے پولیس کی حراست میں تھا۔ جمعے کو دن دہاڑے بنک لوٹنے کے بعد اکرم پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا جبکہ باقی ساتھی مال سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے جن میں اسلم اور اس کا جگری دوست فیاض بھی شامل تھا فائزہ اس کی بہن تھی وہ فیاض اور سب گھر والوں سے چھپ کر اسلم سے ملنے آتی تھی یہ چکر پچھلے دو ماہ سے چل رہا تھا مگر ان دو ماہ میں آج پہلی دفعہ انہیں کھل کر ملاقات کرنے کا موقع ملا تھا۔ ابھی ٹھیک طرح سے ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

کون ہوسکتا ہے؟ اسلم نے ذہن پر زور دیا۔ پھر سوچ کر کمرے کا دروازہ بند کرکے بیرونی دروازے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف بڑھا۔

دروازہ کھولتے ہی اسلم پر کپکپی کی سی کیفیت طاری ہوگئی فیاض کو یوں اپنے سامنے پا کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے وہ فیاض کی شکل میں اپنی موت دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ فیاض کو ان کے کرتوتوں کا پتہ چل گیا ہے اور اب وہ ان دونوں کا قصہ تمام کرنے آیا ہے۔

فیاض کے غصے کو اسلم جانتا تھا۔ شدت خوف سے اسکی زبان بھی بند ہوگئی تھی۔

کیوں بے۔ کیا ہوا تمہیں؟ یہ اتنا کانپ کیوں رہے ہو؟ فیاض نے اسلم کی حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

کک کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔ اسلم نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ کیا ہوگیا ہے کوئی بھوت ووت تو نہیں دیکھ لیا تم نے؟

نہیں..... ہاں ہاں بھوت۔

یہ کیا ہوگیا تمہیں تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ اسلم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

اندر آنے کے لئے نہیں کہو گے۔ کیا میں یونہی دروازے پر کھڑا رہوں گا۔

وہ..... وہ..... اندر..... بھوت ہے اسلم کے حواس ایک بار پھر جواب دینے لگے تھے۔

کیسا بھوت ہے میں بھی تو دیکھوں۔ فیاض نے اسلم کو ایک طرف ہٹایا اور اندر داخل ہوگیا۔

اسلم کو اب یقین ہوگیا کہ ان کی موت کا وقت اب قریب آ گیا ہے فیاض کمرے میں اپنی بہن کو دیکھ لے گا۔ اور پھر؟

پھر وہ ان دونوں کو قتل کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرے گا۔

"لگتا ہے تمہارا بھوت مجھ سے ڈر کر بھاگ گیا ہے۔ فیاض نے کمرے کو خالی پایا تو اس کا مذاق اڑانا چاہا۔

فیاض کی بات سن کر اسلم بھی آگے بڑھا کمرہ واقعی خالی تھا۔ جلد ہی صورتحال اس کی سمجھ میں آ گئی فائزہ کمرے کی پچھلی جانب کھڑکی کی آہنی سلاخ توڑ کر بھاگ گئی تھی۔ مگر اس نے اتنی موٹی سلاخ توڑی کیسے؟ یہ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔

بہر حال جو بھی ہوا اچھا ہوا ان کی جان تو بچ گئی ورنہ فیاض اس کی حالت بھی ویسے ہی بنا دیتا جیسے محلے کے ایک لڑکے کی۔ جس نے فائزہ کو چھیڑنے کی غلطی کی تھی اور پھر وہ بیچارہ دو مہینے تک اسپتال میں ہی پڑا رہا تھا۔

"تیاری مکمل ہے؟"

"کیسی تیاری؟" اسلم نے متعجب نظروں سے اسے دیکھا۔

"ارے آج اکرم کو لاک اپ سے باہر نہیں نکلوانا؟ اتنی جلدی بھول گیا تو۔"

"ہاں ہاں مکمل ہے تیاری۔ مجھے تو کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا۔"

"لگتا ہے بہت بھیانک بھوت دیکھا تھا تم نے جس نے تمہیں سب کچھ بھلا دیا۔"

"ہاں۔" اسلم نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیسا بھوت تھا؟"

"لنگڑا تھا۔" اسلم نے ویسے ہی منہ سے نکال دیا۔

"کیا؟" "لنگڑا بھوت؟"

"ہاں وہ لنگڑا کر چل رہا تھا پہلے بھی ایک دو دفعہ میں نے اسے دیکھا تھا۔" اسلم جھوٹ بولنے میں بڑا ماہر تھا۔

"کیا وہ بھی اس مکان میں رہتا ہے؟"

"ہاں۔"

"اس مکان میں بھوت نہیں رہیں گے تو اور کیا رہے گا انسانوں کے رہنے کے قابل تو ہے نہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے مگر یہ مکان ہمارے لئے ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔"

"کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ یہاں تو بھوت بھی رہتے ہیں۔"

"اچھا چھوڑو یہ فضول بکواس یہ بتاؤ اتنی جلدی

کیسے آ گئے ہو، ہمیں تو رات بارہ بجے کے بعد اپنے کام کے لئے جانا تھا جبکہ ابھی تو پانچ بج رہے ہیں۔"

"میں اس لیے جلدی آیا کہ شہباز اور گلو کو بھی بتا دیں وہ دونوں ساتھ رہیں گے تو کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ میں ابھی شہباز کو فون کرتا ہوں۔" اسلم نے جیب سے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ان سے کہنا بارہ بجنے سے پہلے یہاں پہنچ جائیں۔"

☆.....☆.....☆

شہر کی آخری حدود میں واقع یہ خستہ حال مکان رات کی تاریکی میں بڑا پراسرار لگ رہا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ مکان کے برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی پر ایک نوجوان سو رہا تھا۔ اسے سوئے ہوئے ابھی چند ہی دیر گزری تھی۔ کہ ایک بھاری بھرکم آواز نے اسے جاگنے پر مجبور کر دیا یکدم ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے ایک سایہ نظر آیا وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ مگر وہ صحیح طرح نہیں چل پا رہا تھا۔ وہ ایک پاؤں کو زمین پر گھسیٹ کر چل رہا تھا۔

اچانک اسے اسلم کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"لنگڑا بھوت۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ اس کا بندوبست تو میں ابھی کیے دیتا ہوں۔ اس نے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکالا اور آناً فاناً اس پر دو فائر کر دیئے جواب میں اس نے کسی کے کراہنے کی آواز سنی تھی۔

فائر کی آواز سن کر اسلم بھی دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"کس پر فائر کیے ہیں تم نے؟"

"تمہارے اس لنگڑے بھوت کا قصہ تمام کر دیا میں نے۔"

"کیسا بھوت؟..... کہاں تھا وہ؟"

"اس طرف" فیاض نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اسلم دوڑتا ہوا اس طرف گیا۔

"ارے یہ کیا کیا تم نے یہ تو اکرم ہے۔"

"اکرم؟ مگر یہ لنگڑا کر کیوں چل رہا تھا۔"

فیاض نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں بغور دیکھے اس کا ایک پاؤں خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ جس پر تازہ خون جما ہوا تھا۔ اس نے اس کی ٹانگ کا وہ حصہ بھی دیکھ لیا جہاں شاید گولی لگی تھی۔ خون وہیں سے نکل رہا تھا مگر اس نے تو شاید سینے کا نشانہ لیا تھا۔ اور یہ تو پہلے ہی لنگڑا کر چل رہا تھا۔

"اوہ میرے خدا یہ کیا ہوگیا۔"

اکرم شاید پولیس کی حراست سے بھاگ نکلا تھا پولیس نے اس پر فائر کیا گولی اس کی ٹانگ میں لگی۔ اس لیے یہ اپنی زخمی ٹانگ کو گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ جیسے فیاض نے لنگڑا بھوت سمجھا تھا۔

اعلان

ایک صاحب نے سینما ہال پہنچ کر منیجر سے کہا میری بیوی کسی دوسرے شخص کے ساتھ فلم دیکھ رہی ہے براہ کرم اندر جا کر اس سے کہیں کہ وہ باہر آ جائے۔

مینیجر نے فوراً فلم رکوا دی اور اسٹیج پر جا کر اعلان کیا کہ جو صاحب اپنے شوہر کو چھوڑ کر کسی دوسرے مرد کے ساتھ فلم دیکھ رہی ہیں۔ وہ باہر آ جائیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آدھا سینما ہال خالی ہوگیا۔

(محمد عثمان علی۔ میاں چنوں)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

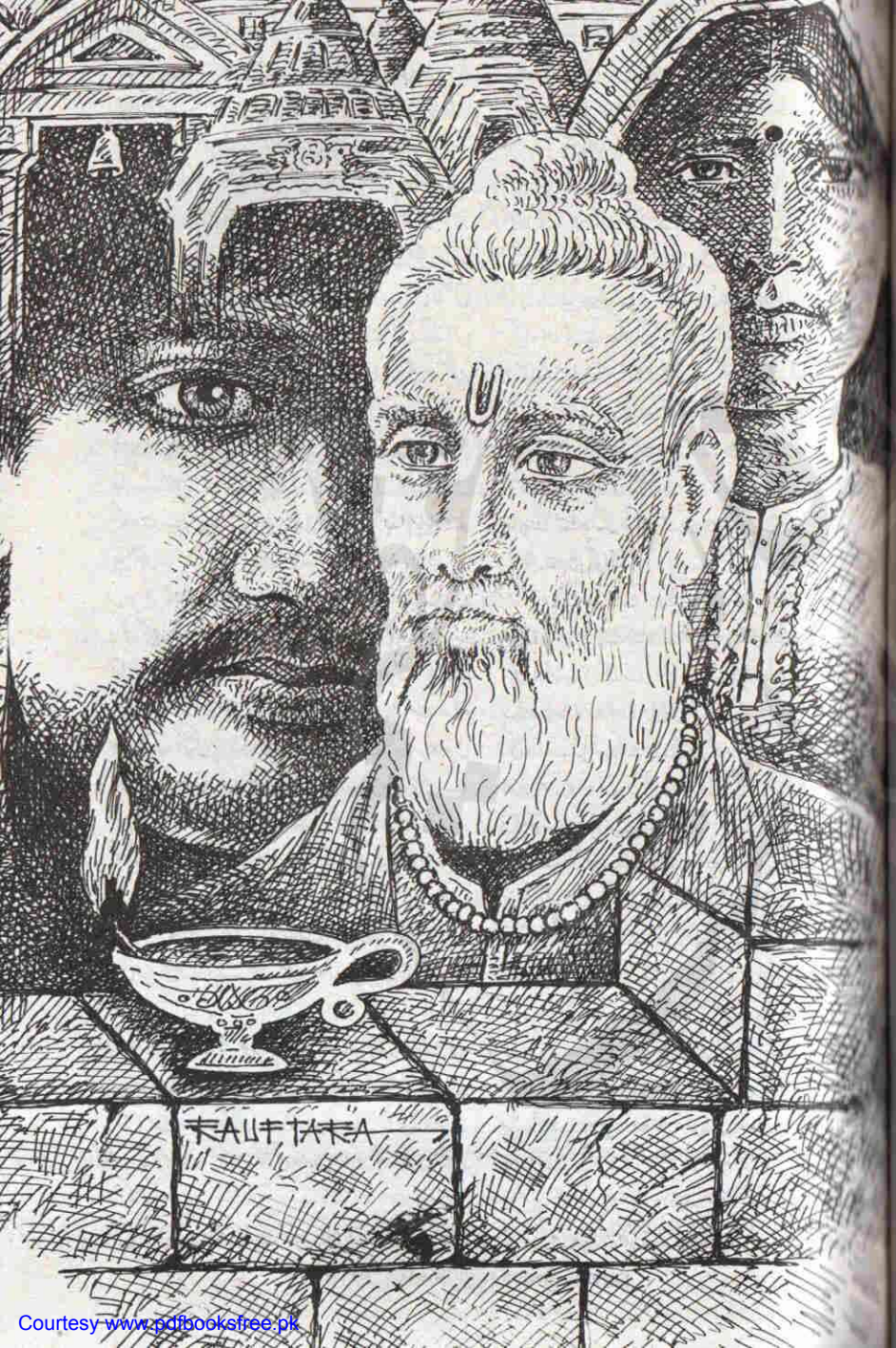

شہر وحشت

ایم اے راحت

قسط نمبر:17

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرھول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دھشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکرائو، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذھن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کو بہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

اسے پھر پانی کی یاد ستانے لگی۔ اگر پانی نہ ملا تو ہر صورت میں موت ہے۔ اور موت سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ نادیدہ دیوار کو عبور کر کے دشمن کو ہلاک کردیا جائے۔ اسے اب پھرتی سے کام لینا پڑے گا۔ لیکن وہ ایک لمحہ آرام کیلئے ریت پر بیٹھ گیا۔ تاکہ پھر سوچے وہ کر ہی کیا سکتا تھا؟ کچھ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اسے کچھ نہ کچھ تو ضرور کرنا چاہئے تھا۔ بلاشبہ کئی قسم کی نیلی جھاڑیاں تھیں لیکن وہ ان سے کیا کام لے گا؟ لیکن بغور معائنہ کرنے سے ممکن ہے۔ وہ ان سے کوئی فائدہ اٹھانے کی تدبیر اخذ کرے۔ اور پھر اس کی زخمی ٹانگ، اس بارے میں بھی لازماً کچھ کرنا پڑے گا۔ اور کم از کم پانی کے بغیر زخم تو صاف ہونا چاہئے۔

اس کی ٹانگ میں تکلیف اب پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔ پس اس نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے ٹانگ کا علاج ضروری ہے۔ نیلی جھاڑیوں میں سے ایک قسم کی جھاڑیوں میں پتے بھی اگے ہوئے تھے۔ یا پتوں سے ملتی جلتی کوئی شے تھی۔ اس نے مٹھی بھر پتے اکھاڑ لئے اور ان کا معائنہ کرنے کے لئے اس نے پتوں سے زخم کو صاف کیا۔ اور پھر تازہ پتے زخم پر رکھ کر اوپر سے اسی جھاڑی کی بیلیں اتار کر ٹانگ پر باندھ لیں۔ یہ بیلیں نہایت مضبوط تھیں۔ اس نے اپنے پتھر کے ہتھیار کی مدد سے بہت سی بیلیں کاٹ ڈالیں۔

اور ان میں بعض بیلیں ایک فٹ سے زیادہ لمبی تھیں۔ اور ان بیلوں کو بٹ کر اچھا خاصا موٹا رسہ بنایا جاسکتا تھا۔ سو اس نے سوچا۔ ممکن ہے ایسا رسہ کام ہی آجائے۔ پھر اس نے اپنے پتھری چاقو کی نوک کو دوسرے پتھروں سے رگڑ کر اسکی دھار تیز کی اور پھر بیلوں کو بٹ کر ایک پٹی سی بنائی اور اس میں اپنا ہتھیار باندھ لیا۔ اور پھر نیلی جھاڑیوں کا معائنہ کرنے لگا۔ تین علیحدہ علیحدہ قسموں کی جھاڑیاں تھیں۔ ان میں سے ایک قسم کی جھاڑیاں تو پتوں سے آزاد تھیں۔ دوسری قسم کے پتے اور شاخیں آگ میں جلنے کیلئے بہترین ثابت ہوسکتے تھے۔ اور تیسری قسم کی جھاڑی میں موٹی موٹی اعلیٰ لکڑی کی شاخیں تھیں۔ شلوگ پھر لنگڑاتا ہوا نادیدہ دیوار کی جانب گیا، بلاشبہ دیوار موجود تھی۔

دشمن اپنے حصے میں ایک ایسی جگہ محفوظ تھا۔ جہاں شلوگ کا پھینکا ہوا پتھر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اور کچھ نہ کچھ کارروائی کرنے میں ضرور مصروف تھا۔ لیکن کیسی کارروائی؟ شلوگ کو اندازہ نہیں ہوسکا۔ ایک بار وہ حرکت کرتے کرتے رکا اور دیوار کے نزدیک آیا۔ اور شلوگ کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ اپنی توجہ سامنے مرتکز کئے ہوئے ہے۔ اس مرتبہ بھی شلوگ کو ابکائی سی آنے لگی اس نے جھلا کر ایک پتھر دشمن پر پھینکا۔ اور دشمن واپس مڑ گیا۔ اور اسی کام میں مصروف ہو گیا جو اس سے پیشتر وہ کر رہا تھا۔

شلوگ کو کم از کم اطمینان ضرور تھا کہ وہ اپنے دشمن کو قریب نہیں آنے دے گا۔ اور یہ سوچ کر وہ متواتر دو گھنٹے تک پتھر لالا کر جمع کرتا رہا۔ اس نے اپنی سرحد میں پتھروں کی کئی ڈھیریاں جمع کر دیں۔ اب اس کا حلق پیاس کے مارے جل رہا تھا۔ اور سوائے پانی کے اس کے ذہن کو اب کوئی نئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ لیکن اسے اپنے بچاؤ کیلئے کچھ نہ کچھ تو ضرور سوچنا ہوگا۔ نادیدہ دیوار کو کیسے عبور کرے؟ دشمن کو کس طرح ہلاک کیا جائے؟ اور اس سے پہلے کہ شلوگ پیاس اور گرمی کی شدت سے مر جائے، یہ دونوں کام سرانجام پا جانے چاہئیں۔

نادیدہ دیوار خدا جانے کس قدر اونچائی تک چلی گئی تھی۔ اور ریت کے اندر کی گہرائی۔ کہاں تک تھی؟ یہ تمام سوالات اسے حل کرنے تھے۔ ابھی وہ انہی خیالات میں گم تھا کہ دفعتاً اس کی نظر اپنے حصے میں حرکت کرتی ہوئی ایک چھپکلی پر پڑی جو ایک جھاڑی سے نکل کر دوسری جھاڑی کی جانب رینگ گئی تھی۔ دوسری جھاڑی کے قریب پہنچ کر چھپکلی نے شلوگ کی طرف مڑ کر دیکھا اور شلوگ اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ اور اس سے کہنے لگا۔

"ہیلو۔"

چھپکلی۔ شلوگ کی جانب چند قدم آگے آئی اور بولی۔ "ہیلو۔" ایک لمحے کیلئے شلوگ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔

اور تب پھر وہ ایک زبردست قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور ایسا کرنے سے اس کے حلق کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ وہ چھپکلی سے مخاطب ہوا۔ "آؤ، میرے قریب آ جاؤ۔" لیکن چھپکلی واپس مڑ کر جھاڑیوں میں بھاگ گئی۔

اب وہ پھر شدت سے پیاس محسوس کر رہا تھا۔

اس نے سوچا اگر اس طرح یہاں بیٹھا رہا تو اپنے دشمن سے جنگ کبھی نہیں جیت سکے گا۔ اسے کچھ نہ کچھ تدبیر اختیار کرنی ہی چاہئے۔ لیکن کیا تدبیر؟

یہی ایک بات سمجھ میں آتی تھی کہ نادیدہ دیوار کو عبور کیا جائے۔ وہ اسے عبور کر سکتا ہے۔ یا اس پر سے پھلانگ سکے گا۔؟ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ ریت کے نیچے سے کوئی راستہ مل جائے۔

یہ سوچ کر وہ لنگڑاتا ہوا نادیدہ دیوار کی جانب گیا، اور اپنے چاقو کی مدد سے اس کے ساتھ ملی ہوئی زمین کو کھودنے لگا۔ کھودتا رہا۔ کھودتا رہا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس سخت دشوار کام میں اس کا کتنا وقت صرف ہوا۔ لیکن اس نے چار فٹ گہرا گڑھا کھود لیا لیکن خشک ریت ہی نکلتی چلی آتی تھی۔ پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ اور گڑھے کے ساتھ نادیدہ دیوار کی رکاوٹ صاف محسوس ہوتی تھی۔

شلوگ تھک کر وہیں لیٹ گیا۔ اور پھر اس نے اپنے دشمن کو دیکھنے کیلئے سر اٹھایا۔ وہ بھی اپنے حصے میں کوئی عجیب سی کارروائی کرنے میں مشغول تھا۔ شلوگ نے دیکھا کہ وہ جھاڑیوں کی لکڑی کے دو ٹکڑوں کو بیلوں کی مدد سے باندھ کر کوئی شے تیار کر رہا تھا۔ ایک چار فٹ اونچی مربع سی شے کو تکنے لگا جو دشمن بڑی سرگرمی سے بنا رہا تھا۔ پھر دشمن نے ایک بڑا پتھر اس مشین میں رکھا اور اسے گھما کر شلوگ کی جانب کر لیا۔ اور پھر وہ پتھر سنسناتا ہوا شلوگ کے سر پر سے گزر گیا۔ جس فاصلے سے یہ پتھر آ رہا تھا۔ اس فاصلے تک شلوگ ایک چھوٹا سا پتھر بھی نہیں پھینک سکتا تھا۔ اب تو شلوگ بہت پریشان ہوا۔ خواہ، وہ اپنی سرحد کے آخری نقطے تک چلا جاتا تب بھی اس مشین کے پتھر سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی اثناء میں ایک اور پتھر اس کی جانب آیا۔ اور شلوگ اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ معاملہ خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

پھر وہ تیزی سے ادھر ادھر حرکت کرنے لگا۔ تاکہ دشمن کا نشانہ ٹھیک نہ بیٹھے۔ اب ایک ہی صورت

باقی تھی کہ کسی طرح پتھر پھینکنے والی مشین کو تباہ کر دیا جائے۔ لیکن کیسے؟ زمین کھودنے کی وجہ سے اس کے بازو اب سخت درد کر رہے تھے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چل کر اپنے میدان کے آخری کنارے تک چلا گیا۔ لیکن دشمن کے پتھر وہاں با آسانی پہنچ رہے تھے۔ وہاں سے وہ پھر نادیدہ دیوار کی جانب آنے لگا۔ راستے میں وہ کئی بار گرا۔ وہ بمشکل اٹھ کر قدم اٹھاتا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ کہ اس کا خاتمہ اب قریب ہے۔ تاہم اپنی جان بچانے کی خاطر وہ باقاعدہ دوڑ دھوپ میں مشغول تھا۔

دفعتاً دشمن کی غلیل نما مشین سے نکلا ہوا پتھر شلوگ کے جمع کیے ہوئے پتھروں کے ڈھیر پر آن گرا۔ اور پتھروں کے ٹکرانے سے آگ کی چنگاریاں نمودار ہوئیں۔ چنگاریاں آگ، شلوگ کو یاد آیا کہ قدیم نسل کا آدمی چقماں پتھروں کو رگڑ رگڑ کر آگ جلاتا تھا۔ اور اگر جھاڑیوں کے خشک پتے آگ پکڑ لیں تو خوش قسمتی سے ایسے پتوں کی ایک جھاڑی اس کے قریب ہی موجود تھی۔ اس نے جھاڑیوں کو اکھاڑ ڈالا۔ پھر اسے پتھروں کے ڈھیر پر لے گیا۔

اور پھر ایک بڑا پتھر اٹھا کر دوسرے پتھر پر زور سے مارا تو آگ کی چنگاریاں نکلیں شلوگ نے کئی بار یہ عمل انجام دیا۔ حتیٰ کہ جھاڑیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ لیکن اب اسے ایک ترکیب سوجھ گئی تھی۔ شلوگ نے آٹھ فٹ گہرے گڑھے میں آگ جلائی۔ اور اس جھاڑی کی شاخوں کو اس میں ڈال دیا۔ جو آہستہ آہستہ جلتی رہتی تھیں۔ لوہے کے تاروں کی مانند مضبوط بیلیں آسانی سے آگ نہیں پکڑتی تھیں۔ لیکن جل اٹھنے پر بہت دیر تک جلتی ہی رہتی تھیں۔ اور پھر شلوگ نے ان بیلوں کو لپیٹ کر ایک درجن بم کے گولے تیار کر لئے۔

بڑے بڑے پتھروں کے گرد اس نے بیلیں لپیٹیں۔ اور ان میں آگ لگا کر دشمن کی جگہ پر گولے پھینکنے شروع کر دیئے۔ دشمن خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنی غلیل پیچھے ہٹانے لگا۔ لیکن شلوگ نے تاخیر کئے بغیر تیزی سے بقیہ بم کے گولے مارنے شروع کر دیئے۔

چوتھا بم دشمن کی بنائی ہوئی لکڑی کی مشین پر جا پڑا اور اس میں فوراً آگ لگ گئی۔ دشمن نے اس پر ریت پھینک کر آگ بجھانی چاہی لیکن مشین کو بچانے کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور چند لمحے کے اندر اندر مشین جل کر راکھ ہو گئی، زخم کی تکلیف، پیاس، اور گرمی کی شدت اور تھکاوٹ کے ہاتھوں کمزور ہو کر شلوگ کے لئے کھڑا رہنا دشوار ہو گیا وہ ریت پر بیٹھ گیا۔

اب کیا کیا جائے۔؟ کیا دشمن کی طرح وہ بھی پتھر پھینکنے والی ایک مشین تیار کرے؟ تیر کمان؟ لیکن اسے شک تھا۔ کہ بیلوں یا لکڑی کے تیر صحیح نشانے پر نہیں جا سکیں گے۔ نیزہ؟ ہاں یہ ہتھیار کامیاب ثابت ہو سکتا ہے۔ دور پھینکنے کیلئے تو نیزہ بھی بیکار ثابت ہوتا لیکن قریب سے حملہ کرنے کیلئے نیزہ بہترین ہتھیار ہے لیکن نیزہ ہارپون کی مانند بننا چاہئے جس کے سرے پر ایک لمبا نوکیلا چاقو ہو۔ اور اس نیزے کے سرے پر ایک لمبا رسہ باندھ دیا جائے۔ تاکہ نیزہ پھینکنے کے بعد اسے واپس گھسیٹا جا سکے۔ یہ تدبیر ذہن میں آتے ہی وہ اٹھا اور نیلی جھاڑیوں سے بیلیں اکھاڑ اکھاڑ کر بٹنے لگا۔

بیس منٹ رسہ بٹنے کے بعد اس نے موٹی موٹی شاخوں کو باندھ کر ایک چار منٹ لمبا نیزہ تیار کر لیا۔ پھر ایک لمبے سے پتھر کو گھس گھس کر اس کی نوک بنائی اور یہ پتھر اس نے نیزے کے سرے پر مضبوطی سے باندھ دیا تاکہ ہارپون ضائع نہ ہو سکے قریب ہی ریت کی کوئی شے زوردار آواز کے ساتھ گری۔ اور شلوگ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ خدا جانے وہ کتنے عرصے تک سویا رہا تھا۔

پھر ایک اور پتھر اس کے قریب ہی آ گرا۔ شلوگ نے ہاتھوں کے بل ذرا سا اٹھ کر دشمن کو دیکھ لیا۔ وہ نادیدہ دیوار سے کچھ گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ شلوگ کو حرکت میں دیکھ کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ شلوگ کی حالت اب انتہائی ابتر ہو چکی تھی۔ پیاس کے مارے اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اختتام قریب ہے۔

اس کے ساتھ ہی انسانی نسل کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

دفعتاً شلوگ کے مردہ ذہن میں زندگی کی ایک کرن نمودار ہوئی۔ وہ کھسکتا کھسکتا انتہائی جاں کنی کے عالم میں نادیہ دیوار تک پہنچا یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اسے وہاں تک پہنچنے میں صدیاں صرف کرنا پڑیں گی۔ نادیہ دیوار حسبِ معمول وہاں موجود تھی۔ تب شلوگ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ وہیں ایک مشین بنانے کی تیاری میں مشغول تھا۔ مشین نصف سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی۔ شلوگ کے ذہن میں جو تدبیر آئی تھی۔ وہ یہ تھی کہ نادیہ دیوار کے قریب ہی لیٹ جائے۔ دشمن اسے غافل سمجھ کر حملہ کرنے کیلئے قریب آئے گا۔ اور پھر وہ اپنا ہارپون اس کے جسم پر پھینکنے کی کوشش کرے گا۔ دوسری طرف شلوگ کو اپنی ابتر حالت پر یقین ہو چکا تھا۔ کہ دشمن کو مشین استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ کیونکہ اس کی موت قریب ہے۔ اور جب مشین تیار ہوگی تو وہ مر چکا ہوگا۔ اور پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

"اچانک ہی شلوگ نے اپنے قریب ایک آواز سنی۔ "ہیلو۔" یہ ایک ننھی سی باریک آواز تھی۔ شلوگ نے آنکھیں کھول دیں سر کو گھما کر دیکھا یہ ایک چھپکلی تھی۔

"جاؤ۔ یہاں سے جاؤ۔" شلوگ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے حلق سے آواز ہی نہ نکلی اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

"زخمی" آواز نے کہا۔ "ہلاک کردو زخمی، ہلاک کردو۔" شلوگ نے دوبارہ آنکھیں کھولیں نیلی چھپکلی وہیں موجود تھی۔ پھر وہ نادیہ دیوار کی طرف گئی۔ اور واپس آ گئی۔

"زخمی!،، وہ بولی۔ "ہلاک کردو، آؤ۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ پھر دیوار کی جانب غائب ہوگئی۔ شلوگ سمجھ گیا کہ وہ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کررہی ہے۔ بار بار وہ بے معنی الفاظ کہتی تھی اور شلوگ اپنی آنکھیں کھولتا۔

چھپکلی بھاگتی ہوئی۔ نادیہ دیوار کی جانب جاتی اور پھر شلوگ کے پاس واپس آجاتی۔ "زخمی ہلاک کردو۔ آؤ۔"

مجبور ہو کر شلوگ اس کے پیچھے رینگتا ہوا چلا اور پھر اس کے کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی۔ ریت پر کوئی نیلی سی شے پڑی تھی۔ اور بے چینی سے تڑپ رہی تھی۔ تب شلوگ نے اسے پہچان لیا یہ تو وہی چھپکلی تھی جسے دشمن نے اس کی ٹانگیں اکھاڑ کر شلوگ کی طرف پھینکا تھا۔ اور وہ اسے مردہ سمجھ رہا تھا۔ لیکن، لیکن وہ تو زندہ تھی۔

"زخمی!" دوسری چھپکلی نے کہا۔ "زخمی ہلاک کردو۔ ہلاک کردو۔"

شلوگ سمجھ گیا۔ اس نے اپنا چاقو پیٹی سے نکالا اور زخمی چھپکلی کو ہلاک کردیا زندہ چھپکلی جلدی سے ایک جھاڑی کی طرف بھاگ گئی۔ شلوگ دوبارہ رینگتا ہوا نادیہ دیوار کی جانب چلا گیا۔ دشمن سرگرمی سے مشین کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ اچانک شلوگ کے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ زخمی چھپکلی تو نادیہ دیوار عبور کر کے آئی تھی۔ وہ دشمن کی طرف سے آئی تھی اس نے چھپکلی کی ٹانگیں اکھاڑ کر اسے شلوگ کی جانب پھینک دیا تھا۔ اور اس نے سوچا کہ چھپکلی مردہ ہے۔ لیکن وہ مردہ نہیں تھی۔ وہ صرف بیہوش تھی۔

آہ۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ ایک زندہ اور باہوش چھپکلی نادیہ دیوار عبور نہیں کرسکتی۔ مگر ایک بیہوش چھپکلی اسے عبور کرسکتی ہے اور اس خیال کے آتے ہی شلوگ اپنی زندگی داؤ پر لگانے کیلئے تیار ہوگیا۔ اس نے ایک پتھر ہاتھ میں پکڑا اور نادیہ دیوار کے قریب کھدی ہوئی ریت کے ڈھیر پر لیٹ گیا۔ یہ ڈھیر آدھا دشمن کی سرحد میں تھا۔ اور آدھا شلوگ کی سرحد میں وہ اس ڈھیر پر اس انداز سے لیٹ گیا کہ اگر بیہوش ہو جائے تو اس طرح گرے کہ دشمن کی سرحد میں داخل ہو جائے۔

اس نے اپنے ہتھیاروں کو اچھی طرح اپنے

ساتھ رکھ لیا تھا۔ پھر اس نے دائیں ہاتھ سے پتھر بلند کیا۔ جسے وہ اپنے سر پر مار کر بے ہوش ہونا چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس ضرب سے وہ ہلاک ہو جاتا۔ اسے شبہ ہوا کہ دشمن یہ تمام حرکتیں دیکھ رہا ہے۔ اور پھر وہ شلوگ کو بیہوش ہو کر اپنی سرحد میں گرتے دیکھ کر ضرور تفتیش کیلئے آئے گا۔ اور وہ سمجھے گا کہ شلوگ مر گیا ہے۔ اور پھر اس نے پتھر اپنے سر پر مارا۔ دفعتاً اس کی کمر میں زور سے درد اٹھا۔ اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

لیکن اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔ دشمن آہستہ آہستہ اس کی جانب آرہا تھا۔ اور وہ اس سے بیس فٹ کے فاصلے پر آ گیا اور اس نے ایک پتھر شلوگ پر پھینکا تھا یہ معلوم کرنے کیلئے کہ آیا۔ وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے۔"

دشمن قریب آ گیا۔ شلوگ دم سادھے پڑا رہا پھر دشمن نے نیچے کھول کر شلوگ کی جانب بڑھا۔ پوری طاقت جمع کر کے شلوگ نے اپنا ہارپون دشمن کے دے مارا۔ اور ہارپون دشمن کے جسم میں کھب گیا۔ اور دشمن واپس اسی حالت میں بھاگا کہ ہارپون اس کے جسم میں گڑا ہوا تھا۔ شلوگ نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی لیکن گر پڑا۔

خواب کچھ بھی دیکھ لو ادھورے رہ جاتے ہیں۔ نعمت علی کی زندگی سے پراسرار واقعات چمٹ گئے تھے۔ جب بھی کبھی اپنے آپ پر غور کرتا۔ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو جاتا۔ مدد علی نے بڑی سادگی سے زندگی گزاری تھی وہ خود بھی کھاپی رہا تھا۔ اور عیش کررہا تھا۔ کہ مدد علی کو اسے عالم اور درویش بنانے کی سوجھی۔ قبرستان بھیج دیا اور قبرستان میں جو کچھ ہوا وہی اب مدد علی کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ جب بھی کبھی غور کرتا۔ کچھ اچھائیاں اور کچھ برائیاں محسوس ہونے لگتیں۔

مثلاً یہ کہ کم از کم مدد علی کو زندگی کا یہ دور گزارنے میں ان دشواریوں کا سامنا کرنا نہیں پڑ رہا۔ جو انہوں نے زندگی بھر اٹھائی تھیں۔ اور صرف پیٹ بھر روٹی کھائی تھی۔ اور کچھ بھی نہیں لیکن اب وہ عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بیٹوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اگر خیر الدین خیری اس طرح نہ مل جاتا۔ تو بھلا نکما سا نعمت علی ماں باپ کیلئے کیا کرسکتا تھا۔ لیکن اور کچھ نہیں تو کم از کم اب اس کے دل کو یہ سکون ضرور تھا۔ کہ مدد علی اور آسیہ بیگم آرام و سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں کوئی پریشانی یا تکلیف نہیں ہے۔ ایک بیٹے کا فرض پورا ہو چکا تھا۔

لیکن اب جو الجھنیں پیش آ گئیں تھیں ان کا کیا کرتا۔ ہاں۔ اپنی جگہ ایک بات پر وہ اٹل تھا کہ ہندوستان سے اگر پاکستان واپس جائے گا تو خیر الدین خیری کو ساتھ لیکر جاہے وہ ایک ہوا ہی سہی۔ ایک روح ہی صحیح۔ لیکن کچھ اس طرح کا رشتہ ہو گیا تھا۔ خیر الدین خیری سے کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ چاہے اس کوشش میں زندگی ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑ جائے۔

راجہ پرمیت سنگھ کے ہاں جو واقعات اسے پے در پے پیش آرہے تھے۔ ان سے بعض اوقات اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ لیکن رانی پورن وتی نے اسے بتایا تھا۔ کہ راجہ پرمیت سنگھ کے پس پشت پردھان سنگھ ہے۔ اور پردھان سنگھ ہی وہ تھا۔ جس کے لئے نعمت علی یہاں رکا ہوا تھا۔ پردھان سنگھ کے قبضے سے خیر الدین خیری کی روح کو آزاد کرانا اب نعمت علی کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اور وہ اٹل تھا اس بات پر کہ اگر اس کوشش میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے تو دیکھا جائے گا۔

کم از کم موت کے بعد روحیں تو مل جائیں گی۔ اور کچھ ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ وہ یہاں معروف تھا۔ اور اس کے سامنے ہر طرح کی کہانیاں آرہی تھیں۔ شلوگ کی کہانی اس وقت زیرِ عمل تھی۔ مگر راجہ پرمیت سنگھ کے پیغام نے اس کہانی سے رابطہ توڑ دیا۔

راجہ پرمیت سنگھ نے اسے بلایا تھا۔ تیاریاں کرنے کے بعد وہ راجہ پرمیت سنگھ کے پاس پہنچ گیا راجہ پرمیت سنگھ نے بہت ہی اچھے انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔

"ہم جو کچھ بھی ہیں تمہارے علم میں آچکا ہوگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگ ہماری پوجا کرتے ہیں۔ دیوتا، اور اوتار کا درجہ دیتے ہیں ہمیں۔ لیکن ہم تمہیں سچ بتائیں ہم ابھی کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہمارے من میں ایک بہت بڑی بات ہے۔ اگر ہماری وہ بات پوری ہوجائے۔ تو پھر ہم کیا ہوں گے۔ یہ ابھی سنسار والے نہیں جانتے۔ ہم پراس شخص کی قدر کرتے ہیں۔ جس کے اندر کوئی خاص بات ہو اور تم قلیل وقت میں ہمارے پسندیدہ انسان بن گئے ہو۔ شیر دل بچپن ہی سے کرناوتی کے ساتھ رہا ہے۔

وہ صرف کرناوتی کے بس کی بات تھی۔ شاید تمہیں اس بات کا علم نہ ہو کہ کئی ایسے کئی سائس موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ جنہوں نے شیر دل کی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن تم نے شیر دل کو گیدڑ بنا دیا۔ اور اس پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ ہم اس بات کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اور اب ہم یہ سمجھتے ہیں وکرم راج، یہ ہی نام ہے ناں تمہارا؟"

"جی مہاراج۔"

"وکرم راج ہم تمہیں اپنے ایک اہم مقصد میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ بس یوں سمجھو! کہ تم ہمارے من کو بھا گئے ہو۔"

"محبت ہے۔ مہاراج کی۔"

"تم ہمیں بتاؤ۔ تم کہیں جانا تو نہیں چاہتے۔ کیا تم ایک طویل عرصے کیلئے ہمارا ساتھ دے سکو گے۔"

"جی مہاراج۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ میں یہاں آ کر بہت خوش ہوں۔ آپ نے جو عزت مجھے دی ہے۔ میں اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔"

"شکریہ ہم ایک سفر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور اس کے لئے طویل عرصے سے منصوبہ بندی کررہے ہیں۔ اس سفر میں تم ہمارے ساتھ ہوگے۔ اب من کی بات بتانی ہے تمہیں۔ تو بتائے دیتے ہیں۔ ہمیں پاتال سنگھاسن کی تلاش ہے۔ سمجھے؟" پاتال سنگھاسن کی" نعمت علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور سوالیہ نگاہوں سے راجہ پرمیت سنگھ کو دیکھتا رہا۔

"پوچھو ہم سے کہ پاتال سنگھاسن کیا ہے۔"

"ہمت نہیں کر پا رہا مہاراج۔ آپ کا حکم ہے تو بتا دیجئے۔"

"پاتال سنگھاسن، پاتال نگری میں ہے۔ کیا سمجھے؟ ہمارے گرو ہمیں۔ بہت مہان بہت ہی مہان۔ نام ہے۔ ان کا پردھان سنگھ تم سمجھ لو، اس سنسار کے بہت بڑے اوتار ہیں۔ ہمارے گرو ہیں وہ، انہی کے اشارے پر ہم پاتال سنگھاسن کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ پاتال سنگھاسن ہمیں مل جائے۔ تو یوں سمجھ لو، کہ سارا سنسار ہمارے چرنوں میں ہوگا۔ سمجھ رہے ہو ناں تم۔ پورا سنسار ہماری پوجا کرے گا۔ اور یہ سمان ہمیں ویر پردھان سنگھ دینا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے۔ کہ اب وہ اس سنسار سے جانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ جو کچھ ان کے قبضے میں ہے۔ وہ اسے ہمارے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔

ہم نے طے کیا ہے کہ ہماری بہن کرناوتی تم اور ویر پردھان سنگھ ہمارے ساتھ پاتال نگری چلیں گے۔

جہاں پاتال سنگھاسن پوشیدہ ہے۔ نعمت علی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ جو کہانی اس کے سامنے آئی تھی۔ وہ تو خیر جو کچھ تھی سو تھی ہی۔ لیکن یہ جان کر کہ کسی سفر میں پردھان سنگھ اس کے ساتھ ہوگا۔ یہ بھی بڑے غور کرنے کی بات تھی اس نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"مہاراج مجھے جو حکم دیں گے میں اس کیلئے حاضر ہوں۔"

"تمہاری جگہ بدل دی گئی ہے۔ اب تم محل میں اندر کے حصے میں رہو گے۔ وہاں جہاں، ہماری اپنی ہر چیز رہتی ہے۔"

"جو حکم مہاراج، غرض یہ کہ راجہ پرمیت سنگھ اسے پاتال سنگھاسن کے بارے میں بتاتا رہا۔ جو ایک تخت تھا اور جس پر بیٹھ کر دنیا بھر کے سارے راز نمایاں ہو ہی جاتے تھے۔ اور پرمیت سنگھ ہر چیز پر قادر ہو سکتا تھا۔ خیر، نعمت علی کو اس بات پر یقین تو نہیں تھا۔ وہ مسلمان تھا۔ اور اس کا ایمان تھا کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو

ہوتا ہے۔ انسان چاہے کتنی بھی کوششیں کرلے۔ کتے کی موت مارا جاتا ہے۔

تاریخ گواہ تھی فرعون، شداد، نمرود، حسن بن صباح، اور نجانے کون کون، نجانے کیا کیا حسرتیں لے کر دنیا میں آئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے طور پر ہر کوشش کر لی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک لمحہ ان کی تباہی کا باعث بن گیا۔ اور اب دنیا میں بس ان کا نام رہ گیا تھا۔ اور وہ بھی بڑی حیثیت سے، تو بیچارہ پرمیت سنگھ کیا تھا۔ کھیل کھیل رہا تھا۔ اور پھر ہندو دھرم میں تو اس قسم کے قصے کہانیاں عام ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا مسئلہ صرف یہ تھا کہ خیر الدین خیری کی روح کو آزادی دلائے۔ اور یہ ہی سب کچھ اس کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ نئی جگہ راج محل کا ایک بہت ہی خوبصورت حصہ تھا۔ اس کے برابر ایک زنان خانہ بھی موجود تھا۔

سامنے ہی پائیں باغ بھی تھا۔ جس میں حسین و جمیل پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور اس رات وہ ان پھولوں کے درمیان بیٹھا اپنے ماضی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ماں باپ کی طرف سے بالکل بے فکر تھا۔ کہ اچانک ہی اس نے آہٹیں سنیں۔ اور اس کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو کرناوتی اپنی دو تین سہیلیوں کے ساتھ ادھر آ رہی تھی۔ نعمت علی ایک لمحے کیلئے گڑبڑا سا گیا۔ یہ زنانہ باغ تو نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے یہ احساس ہوا کہ کرناوتی راجہ پرمیت سنگھ کی بہن ہے۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ کرناوتی اسی کی طرف آ رہی تھی۔

"ارے تو یہاں کیا کر رہا ہے سائس! کیا کر رہا ہے تو یہاں۔

"مجھے نہیں معلوم تھا۔ راجکماری جی! کہ آپ یہاں آئیں گی۔؟"

"مگر.....اوہو.....اوہو۔ ہمیں پتہ چل گیا۔ تو۔ تو یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ بڑی بات ہے۔ کبھی کبھی بھائی جی مہاراج بھی بیوقوفیوں کی حرکتیں کرتے ہیں۔ راجہ ہو کر انہوں نے ایک سائس کو اتنی عزت دے دی ہے۔" کرناوتی طنزیہ لہجے میں بول رہی تھی۔

نعمت علی کو غصہ تو آ رہا تھا۔ لیکن صورتحال کے تحت اس نے سب کچھ برداشت کرلیا تھا۔ کرناوتی نے کہا۔

"اب کھڑا کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ سنا ہے تو ہمارے ساتھ سفر پر جا رہا ہے۔؟"

"جی ہاں۔ راجہ صاحب نے یہ ہی کہا ہے۔ مجھ سے۔"

"چل ٹھیک ہے۔ بھائی جی! مہاراج کے جو فیصلے ہوں گے۔ ان پر عمل کرلیا جائے گا۔ آؤ.....لڑکیو! یہاں سے چلتے ہیں۔ اس جگہ بھی ایسے ایسے لوگوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔"

"سنیں کرناوتی جی! میری بات سنیں۔" نعمت علی کا صبر آخر کار انتہا کو پہنچ گیا۔ اور کرناوتی رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کو صرف اس بات کا دکھ ہے ناں۔ کہ میں نے آپ کا چیلنج قبول کرلیا۔ اور آپ کے اس ٹٹو کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ کرناوتی جی! میرے لئے وہ ٹٹو ہی تھا۔ اگر آپ کا سچ مچ کوئی گھوڑا ہو۔ تو اسے لائیے میں اسے بتاتا ہوں کہ گھڑ سواری کیا ہوتی ہے۔ آپ کو صرف اسی بات کا دکھ ہے ناں اور اس کی وجہ سے آپ میری توہین کر رہی ہیں۔ چلیں ٹھیک ہے۔ آپ عورت ذات ہیں آپکو چیلنج کرنا بھی میرے لئے حقارت کی بات ہے۔ لیکن اگر واقعی کبھی گھوڑے سواری کا موقع آیا تو پھر آپکو بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔" کرناوتی نے خونی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر بولی۔

"مجھے تمہارا چیلنج قبول ہے۔ تمہاری موت اگر میرے ہاتھوں لکھی ہے تو مجبوری ہے۔ میں کیا کرسکتی ہوں۔ "آؤ" اس نے ساتھی لڑکیوں سے کہا۔ اور اسے گھورتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ نعمت علی کو واقعی غصہ آ رہا تھا۔ ایک لمحے کیلئے اس کا دل چاہا کہ ساری چیزوں پر لعنت بھیج کر وہاں سے چلا جائے۔

لیکن ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ہی ایک درخت سے ایک خوبصورت طوطا اڑا اور اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کندھے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس طوطے کا یہاں آنا جو بڑے سائز کا تھا۔ اور بڑا عجیب تھا۔ نعمت علی کو بہت حیران کن محسوس ہوا۔ لیکن اچانک ہی طوطے نے انسانی آواز میں کہا۔

''نہیں۔ میری جان نہیں۔ نہیں وکرم راج! نہیں، تمہیں غصہ نہیں آنا چاہئے۔ نعمت علی ایک دم دنگ رہ گیا۔ اور پھر اچانک ہی اسے پورن وتی کا خیال آیا۔ جو طرح طرح کے روپ دھار سکتی تھی اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ تو اچانک ہی طوطا اپنی جگہ سے اڑا۔ زمین پر بیٹھا اور اس کے بعد اسے پورن وتی نظر آئی۔ جو انسانی شکل میں آ چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی۔ وہ آگے بڑھی اور بڑے پیار سے نعمت علی کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

''میرے دوست! میرے ساتھی! تم ایک بہت بڑا مقصد پورا کر رہے ہو میرا۔ تم میری زندگی کا بہت بڑا حصہ بن چکے ہو۔ اگر تم سویکار کرو تو میں تمہارے چرنوں کی داسی بننے کیلئے تیار ہوں۔'' وکرم راج میں تم سے پریم کرنے لگی ہوں۔ میری بات سنو۔'' جس پاتال سنگھاسن کے بارے میں راجہ پرمیت سنگھ نے تم سے کہا ہے۔ وہی تو میری سب سے بڑی طلب ہے۔ میرا استھان ہے۔ اور تم اس کا ذریعہ بن رہے ہو۔ تم نے اپنی محنت اور اپنی کوشش سے وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ راجہ پرمیت سنگھ اب تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کیلئے تیار ہو گیا ہے۔ ورنہ یہ بہت بڑا کام تھا۔ تمہیں جانا ہے۔ اس لڑکی کی پرواہ مت کرو۔ یہ ایسی ہی طبیعت کی مالک ہے۔ تم اسے جوتے کی نوک پر رکھو۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ میں اس بات کا دعویٰ کر رہی ہوں۔ تم دیکھ لینا۔ یہ تمہارے پاؤں چومے گی یہ پورن وتی کا قول ہے۔ تم اس کی بالکل چنتا نہ کرو۔ اپنے آپ کو ثابت کر دو کہ تم راجہ پرمیت سنگھ کے ساتھ جانے کے قابل ہو۔ بس سمجھ لینا۔ کہ تمہیں میرا یہ کام کرنا ہے۔'' نعمت علی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور اسے آہستہ سے پیچھے کر دیا۔

اسے ایک دم وشالی یاد آ گئی تھی۔ اس کی محبوبہ وہ جس نے نعمت علی کو ایک انوکھے احساس سے روشناس کرایا تھا۔ حالانکہ وہ ایک روح تھی۔ کبھی کبھی تو نعمت علی کو اس بات پر ہنسی آنے لگتی تھی۔ کہ روحوں نے اس کے گرد کیسا گھیرا ڈال رکھا ہے۔ اس نے پورن وتی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ پورن وتی جی۔ آپ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے۔ میں اسے سرانجام دینے کیلئے تیار ہوں۔''

''بہت..... بہت۔ دھنے واد، بہت بہت دھن واد، بد دل مت ہونا۔'' پورن وتی نے کہا۔ اور پھر اچانک اس نے ہاتھ فضاء میں پھیلائے۔ اور نعمت علی نے ایک انوکھا منظر دیکھا۔ ایسا منظر جو فلموں اور کہانیوں میں ہی نظر آ سکتا ہے۔ انسانی زندگی کا اس سے بھلا کیا تعلق۔ پورن وتی فضاء میں پرواز کر گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اتنی اونچی ہوئی کہ کسی چھوٹے سے پرندے کی شکل میں نظر آنے لگی۔

نعمت علی ایک گہری سانس لے کر محل میں واپس چل پڑا تھا۔

راجہ پرمیت سنگھ نے اس کے بعد تین چار دن تک کوئی ملاقات نہیں کی محل میں اسے ایک بڑی حیثیت حاصل تھی۔ کرناوتی اس دوران ایک بار بھی نظر نہیں آئی تھی۔ ان لوگوں سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جن کا ساتھ باہر کی دنیا میں رہا تھا۔ البتہ اور کچھ افراد تھے جن سے نعمت علی کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ انہی میں ایک دیپ چند بھی تھا۔ لمبا چوڑا اچھی شخصیت کا مالک، نعمت علی سے بڑی محبت سے پیش آتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ بھی پاتال سنگھاسن کی تلاش میں جانے والوں میں شامل ہے۔''

''ہمیں جانا کہاں ہوگا۔؟'' نعمت علی نے دیپ چند سے سوال کیا۔

''میرے سپرد اس سارے سفر کی ذمہ داریاں ہیں اور مجھے بتا دیا گیا ہے وکرم راج مہاراج کہ آپ ہمارے ساتھی ہیں غالباً آپکو خاص طور سے اس ٹیم میں

شامل کیا گیا ہے۔ ہم لوگ تبت کی ترائیوں میں ایسے علاقوں میں جائیں گے جن میں سے بعض علاقوں میں ابھی انسان کی پہنچ نہیں ہوئی ہے۔ ہمالیہ پہاڑ کے عقبی حصے میں۔ اس طرح کے قبیلے آباد ہیں۔ جن تک انسانی پہنچ نہیں ہوئی ہے۔ وہ علاقے ہمارے چرنوں کے نیچے ہوں گے۔''

پاتال سنگھاسن انہی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ نجانے کیوں نعمت علی کو اس بات سے دلچسپی کا احساس ہوا تھا۔ اب تک وہ ایسے علاقوں کی سیر کر چکا تھا۔ جہاں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہندوستان ویسے تو بڑی وسیع جگہ تھی۔ اور یہاں کی کچھ روایات کے بارے میں نعمت علی سن چکا تھا لیکن تبت وغیرہ کا علاقہ اس کے علم سے باہر تھا۔ اس انوکھی دنیا کے بارے میں بھی اسے تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

وہاں بدھ بھکشوؤں اور دلائی لاماؤں، کی حکمرانی تھی۔ اور وہاں کی پراسرار روایات بڑی دلچسپ و دلکش تھیں۔ نعمت علی کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اگر ان علاقوں کا سفر کیا جائے۔ تو لطف آئے گا۔ ویسے بھی اس کی زندگی کا کوئی خاص مقصد تو تھا نہیں۔ ماں باپ اچھے خاصے آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔ پھر بھی اس نے خیرالدین خیری سے سوال کیا۔

''استادِ محترم! آپ نے کہا تھا کہ جب بھی میں آپ کو آواز دوں گا۔ آپ میری آواز کا جواب دیں گے۔ کم از کم اور کچھ نہیں تو آپ مجھے اتنا تو ضرور بتا دیں کہ کیا میرے لئے یہ سفر مناسب رہے گا۔'' اور نجانے کیوں نعمت علی کو یہ احساس ہوا۔ کہ ایک مدھم سا راگ اس کے کانوں میں گونج رہا ہے۔ لفظ تو نہیں تھے۔ لیکن احساس بول رہا تھا۔ اور اسے یہ بتایا جا رہا تھا کہ یہ سفر کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔

دل کو ایک ڈھارس سی ہو گئی تھی۔ پھر غالباً چھٹا دن تھا۔ اس گفتگو کے ہونے میں کہ اسے دیپ چند بتلانے کیلئے آ گیا۔''

''آج سب لوگ مکمل ہو گئے ہیں۔ اور شاید ایک آدھ دن کے اندر اندر ہمیں سفر کرنا پڑ جائے۔''

''بہت خوب، ہمیں یہ سفر کیسے کرنا ہوگا۔؟''

''وہ بعد میں معلوم ہوگا لیکن آج رات کو پرمیت سنگھ مہاراج نے سب کو طلب کیا ہے۔ اور انہیں ان کے بارے میں بتا دیا جائے گا۔''

''ٹھیک۔''

پھر اسی رات دیپ چند کے ساتھ ہی وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں تمام لوگ موجود تھے۔ ایک لمبے لمبے بالوں والا سادھو بھی وہاں موجود تھا۔ جسے دیکھتے ہی نعمت علی نے پہچان لیا۔ یہ پردھان سنگھ تھا۔ نعمت علی کے دل کو ایک خوف کا سا احساس ہوا۔ راجہ پرمیت سنگھ نے سب کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ یہاں تک کہ کرناوتی بھی موجود تھی۔ اس نے کہا۔

''ہمارا یہ مشن ایک آدھ دن میں روانگی کیلئے تیار ہو جائے گا۔ اور ہمیں اپنے طور پر سفر کرنا پڑے گا۔ وہ بہت کچھ بتاتا رہا۔ لیکن، نعمت علی نے محسوس کیا کہ پردھان سنگھ اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ نعمت علی کے دل کو ایک خوف کا احساس ہوا۔ تو اس کے کان میں پورن وتی کی سرگوشی ابھری۔

''نہیں۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے تم پر شک ضرور ہوا ہے۔ لیکن وہ تمہیں پہچان نہیں سکے گا۔ ایکدم سے نعمت علی کا دل بڑا ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے۔ کہ پورن وتی تمام حالات سے واقف ہے اور اس کی پیٹھ پر ہے۔ نعمت علی کو ایک ڈھارس سی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ جب ساری باتیں ختم ہو گئیں۔ تو پردھان سنگھ اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

''پتہ نہیں کیوں۔ تو من کو اپنا اپنا سا لگتا ہے۔ کیا نام ہے تیرا وکرم راج! کون ہے تو؟''

''داس ہوں مہاراج آپ کا۔ وکرم راج ہے۔ میرا نام۔''

''ہاں..... سوتو ہے۔''

''چل ٹھیک ہے، اچھا لگا تو ہمیں جان چھوٹ گئی تھی۔ ورنہ نعمت علی کا دل تو دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا۔ کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھو! اب بھانڈا پھوٹتا ہے۔ بہر حال اس کے بعد تمام ترتیاریاں مکمل ہوتی چلی گئی تھیں۔

نعمت علی کو ان علاقوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ لیکن راجہ پرمیت سنگھ اور اس کے ساتھی تمام کاموں میں مصروف رہے تھے۔ ساری تیاریاں مکمل ہوئیں اور اس کے بعد ان لوگوں کے سفر کا آغاز ہوگیا۔ وہ سری لنکا چل پڑے تھے۔

سری لنکا، تک کا سفر خاصی دلچسپیوں کا باعث تھا۔ اور سفر میں بہت لطف آیا تھا۔ کرناوتی کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ جو اس کی مصاحب تھیں۔ کرناوتی کی نفرت کا وہی عالم تھا۔ بہر حال سری لنکا کے ایک قصبے میں ان لوگوں نے قیام کیا ہر ایک کو اپنے اپنے طور پر سیر و سیاحت کی آزادی تھی یہاں گیانڈی نامی اس قصبے میں نعمت علی کی ملاقات ایک بدھ لڑکے سے ہوئی۔ اس کا نام جے ورتنا تھا۔ وہ نعمت علی کا دوست بن گیا۔ اور دونوں بہت جلد بے تکلف ہوگئے۔

ورتنا کا باپ گیانڈی کے یاقوت کی ایک کان میں انجینئر تھا۔ ورتنا، نعمت علی کو اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ اسے ایک لڑکی سے عشق تھا۔ اور وہ خوب سیر و سیاحت کیا کرتے تھے۔ ورتنا نے نعمت علی کو وہاں کے قابل دید مناظر دکھائے۔ یہ علاقہ کتنا حسین تھا۔ اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ پہاڑی سلسلے میں آخری چوٹی بھی دیکھی گئی۔ جس کے بارے میں یہ ہی روایت تھی کہ حضرت آدم کو اسی چوٹی پر پھینکا گیا تھا۔ وہاں باقاعدہ ایک احاطہ بنا ہوا تھا۔ سری لنکا کے مسلمان عقیدت مند زندگی کی بازی لگا کر اس چوٹی تک آتے تھے۔ اور یہاں بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ ورتنا نعمت علی کو بہت سی چیزیں دکھاتا رہا۔ انہوں نے یہاں بدھوں کی نہایت مشہور عبادت گاہ مہاسمان دیول بھی دیکھی۔ اور کچھ عجیب سی پر اسرار قوتیں، نعمت علی کو اپنے اردگرد رقصاں محسوس ہوئیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے عالم خواب میں ہو۔ اور اس کے ذہن پر ایک دھندسی چھائی ہوئی ہو۔

اس دن جب مہاسمان دیول سے واپسی ہو رہی تھی تو انہوں نے ایک ایسی جگہ قیام کیا جہاں پتھر کی چٹان شیر کے منہ کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔ پورا شیر کا دہانہ تھا۔ لمبے لمبے دانت کھلے ہوئے تھے۔ جے ورتنا نے اسے بتایا کہ لوگ یہاں آتے ہیں تو اس میں بیٹھ کر تصویریں کھنچواتے ہیں۔ اور یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ شیر کے حلق میں بیٹھے ہوں۔

نعمت علی جے ورتنا کے ساتھ وہاں جا بیٹھا۔ اور اس کے ذہن پر ایک دھندسی چھانے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے ایک اندھیری سی فضاء ہو اور اس کا تسلسل نہ ٹوٹ پا رہا ہو۔ غرض یہ کہ اس طرح سے وقت گزرتا رہا۔ ورتنا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ دیر وہ نعمت علی کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا۔ اور اس کے بعد اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟" وکرم راج مہاراج۔؟" نعمت علی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔ "ہمارا تعلق سری لنکا کے ایک ایسے قبیلے سے ہے۔ جس کا اپنا ایک وقار ایک مقام ہے۔ ہم جسے دوست کہہ دیتے ہیں اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی تمہارے علم میں ہے کہ میں مذہبا بدھ ہوں اور میں نے اپنے قبیلے کی روایات کے مطابق بہت سی مذہبی تعلیمات کا جائزہ لیا ہے۔

"بہر حال میں تمہیں بہت سی ایسی باتیں بتاؤں گا۔ جنہیں سن کر تمہیں حیرت ہوگی۔" نعمت علی حیران نگاہوں سے ورتنا کا جائزہ لے رہا تھا۔ بڑی سادہ سی زندگی گزاری تھی اس نے، اب تک بہت پر اسرار واقعات پیش آئے تھے اس کی زندگی میں، لیکن اس طرح کی معلومات اسے کبھی حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ پر اسرار واقعات سے گزرنا ایک الگ بات ہے۔ اور ان کے بارے میں معلومات ایک مشکل کام اب تک جن لوگوں سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بیشک بعض معاملات میں ناقابل یقین تھے۔ لیکن اب صورت حال بہت ہی مختلف محسوس ہو رہی تھی۔ ورتنا کہنے لگا۔

"تم نہیں جانتے کہ وردھان سادھانی کسی ایک انسان کا نام نہیں۔ بلکہ یہ زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ایک چمکدار دھند ہے۔ جو اس کے گرد لپٹ جاتی ہے۔ جو وردھان سادھانی کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اور میں تمہیں دل سے بتا رہا ہوں کہ وہم کا کوئی وجود نہیں ہے۔ میں تمہیں ایک ایسی جگہ لے چلوں گا۔ اگر تمہیں اس کی اجازت ملی۔ جسے دیکھ کر تم دنگ رہ جاؤ گے۔" نعمت علی کے دل میں ایک بالکل ہی نئی امنگ پیدا ہو چکی تھی۔

راجہ پرمیت سنگھ کی طرف سے اسے اجازت تھی کہ جب تک راجہ پرمیت سنگھ یہاں سے آگے بڑھنے کا انتظام نہیں کر لیتا۔ وہ آزادی سے جہاں چاہے گھوم سکتا ہے۔ اور ورتنا در حقیقت ایک بہترین دوست اور بہترین ساتھی ثابت ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"وردھان سادھانی کے نام سے ایک جگہ منسوب ہے۔ ہم اسے رانگا پلی کہتے ہیں جو یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ یہاں سے تھوڑی سی دوری پر ایک بستی ہے۔ جہاں دشوار گزار پہاڑوں کا ایک راستہ جاتا ہے۔ اس بستی کا نام مودمبے ہے۔ کسی زمانے میں اس راستے پر آمد و رفت رہتی تھی۔ اور محکمۂ جنگلات کے لوگ جنگلی ہاتھی پکڑنے والے ادھر جا نکلتے تھے۔ مگر اس کے بعد وہاں پے در پے واقعات ہونے لگے۔ اور لوگوں نے ادھر جانا چھوڑ دیا۔ اسی راستے پر کافی دور جا کر وردھان سادھانی اور اس کے بدعقیدہ بھکشوؤں کا دھارہ ہے۔ بہت کم لوگوں نے وہ جگہ دیکھی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سال کے آٹھ مہینے ان پہاڑوں پر برف جمی رہتی ہے۔ میرے پتا نے بھی دور سے ہی اس دھار کی عمارت دیکھی ہے۔ پر قریب جانے کی ہمت نہیں کی اس کی وجہ وہاں کی روایات ہیں۔"

"کیسی روایات؟" نعمت علی کے منہ سے بے ساختہ نکلا اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اب اس کے ذہن میں کچھ نئی امنگوں نے جنم لیا ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"ابھی تم نے کہا تھا۔ ورتنا کہ وردھان سادھانی بدعقیدہ اور بدمست ہے۔"

"ہاں۔ ان لوگوں کے عقیدے ہمارے عقائد سے میل نہیں کھاتے۔ بلکہ ہم اپنے الفاظ میں انہیں کافر کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بدھ مذہب سے بہت دور کی باتیں کرتے ہیں۔"

"اور وہ جگہ کیسی ہے؟"

"وہاں برف جمی رہتی ہے۔ اور وہاں لوگوں کے نجانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں جو ایک دفعہ چلا گیا۔ وہ یا تو دنیا کو ترک کر کے انہی گمراہ بھکشوؤں میں شامل ہو جاتا ہے۔ یا پھر پاگل ہو جاتا ہے۔"

"اوہ....." نعمت علی نے مدہم لہجے میں کہا۔ بہر حال اس کے بعد وہ واپس آ گیا۔ ورتنا نے اسے ایک عجیب ہی دنیا کی سیر کرادی تھی۔ لیکن جس جگہ قیام کیا گیا تھا۔ وہ بھی خاص قسم کی طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔ نعمت علی کو بھی ایک ایسی جگہ دے دی گئی تھی۔ جو مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کا راستہ باہر ہی تھا۔

رات کے کھانے پر سب لوگ ساتھ تھے۔ نعمت علی کو باقاعدہ نوکروں کی جگہ نہیں دی گئی تھی۔ اور پھر خاص طور سے کیونکہ اسے ہندو سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے رات کا کھانا ان لوگوں نے ساتھ ہی کھایا تھا۔ سبزیاں دودھ اور کچھ خاص قسم کی چیزیں جو بہر طور بڑی لذیز تھیں۔ اور تبدیلی بھی۔ نجانے کب تک نعمت علی جاگتا رہا۔ پھر اس نے لائٹ بجھائی اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اور بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔

نجانے کب اسے نیند آ گئی۔ اور نجانے کتنی دیر سویا تھا کہ نیند ہی کے عالم میں اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی اسے پکار رہا ہو۔ جو اسے پکار رہا تھا۔ اس کی آواز جانی پہچانی سی لگتی تھی۔ اور نعمت علی ایک دم جاگ گیا۔ گھڑی اس وقت رات کا ایک بجا رہی تھی۔ ایک بار پھر آواز سنائی دی تو وہ تڑپ کر اٹھ گیا۔

وشالی کی آواز اس نے صاف پہچان لی تھی۔

پتہ نہیں کون جاگ رہا تھا۔ کون سو رہا تھا۔ یہاں اس جگہ نعمت علی تنہا نہیں تھا۔ بلکہ بہت سے لوگ اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آس پاس موجود تھے۔ لیکن وہ ان سب سے بے نیاز باہر نکل آیا۔

باہر اس نے ایک سفید سایہ دیکھا۔ جو سلکی لباس میں ملبوس تھا۔ سایہ سر سے پاؤں تک ایک لبادہ نما لباس میں موجود تھا۔ لیکن سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اور پھر دھند میں چھائی ہوئی مدھم روشنی میں اس نے گردن گھما کر دیکھا تو نعمت علی ایکدم بے اختیار ہو گیا۔ وہ وشالی ہی تھی۔

"و.....و.....و.....شالی.....وشالی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر آواز دی لیکن وشالی آگے بڑھ گئی۔ اس کا لباس اڑ رہا تھا۔ نعمت علی دیوانہ وار اس کے پیچھے چل پڑا۔

اس سے پہلے کبھی اس پر یہ لمحہ طاری نہیں ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھتا رہا اونچی نیچی ٹیکریوں، وادیوں اور میدانوں سے گزرتے ہوئے۔ وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وشالی اس سے اتنے ہی فاصلے پر تھی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ فضاء میں تیر رہی ہے۔

نعمت علی کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دور نکل آیا۔ لیکن یہ انوکھا سفر اس کے لئے ہوش و حواس سے عاری تھا۔ بستی پیچھے رہ گئی تھی۔ اور وہ پہاڑی راستوں پر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ رات کا پچھلا پہر گھنے جنگلوں کا گزر اور پھر بلندیاں اور پستیاں جن پر چڑھتے اترتے یوں لگ رہا تھا۔ کہ جیسے یہ فضائی سناٹا اس کے لئے کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو۔

سردی کافی تھی۔ دھند بھی تھی۔ لیکن نعمت علی کے اندر ایک عجیب سی توانائی اور سرشاری تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی بلندی پر پہنچ گیا ہے۔ رات کتنی گزر گئی۔ آخر کار کچھ دیر کے بعد اس نے دیو قامت درختوں پر اکا دکا پرندوں کی چہچہاہٹ سنی۔ اس کے ساتھ ہی مدھم مدھم روشنی بھی نمودار ہوتی جا رہی تھی۔

گویا صبح ہونے والی تھی۔ پھر ذرا سا اجالا ہوا تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس وقت وہ جس پہاڑ کی دشوار گزاری پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ اس کے خاتمے پر اسے ایک عمارت دھبے کی صورت میں نظر آئی۔ اس نے دیکھا کے اس عمارت کے عقب میں پہاڑ ایک دیوار کی طرح سیدھا اٹھتا چلا گیا ہے۔ اور اتنا بلند ہے کہ اس کی چوٹی بادلوں میں چھپ گئی ہے وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسے خیر الدین خیرو کا ساتھ حاصل تھا۔ ایک نا قابل یقین کی سی کیفیت تھی۔

لیکن اب تک اس نے ایسا کوئی منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور وشالی بھی اسے کہیں آس پاس نظر نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال وہ آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر ایک عجیب عمارت نظر آئی۔ بلکہ اسے عمارت کہنا مناسب نہیں تھا۔ پہاڑ کی ایک ٹھوس چٹان کو تراش کر قدرتی غار کی کیفیت دے دی گئی تھی۔

جس کی ایک محراب سی بنی ہوئی تھی۔ محراب سے گزر کر ایک طویل غلام گردش نظر آ رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا گنبد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس آدھے گنبد کا حصہ پہاڑ نے نگل لیا ہو۔ اندرونی حصہ سرنگوں اور گپھاؤں پر مشتمل تھا۔ چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر چھوٹے بڑے حجرے بنائے گئے تھے۔ یقیناً، ان حجروں میں بھکشو، یا پجاری رہتے ہوں گے غرض یہ کہ وہ آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر اچانک ہی، اس نے پانی گرنے کا شور سنا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر دو راستے پھوٹتے تھے۔ اور ان دونوں راستوں میں سے ایک طرف وشالی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ تو اس نے چٹان میں چار پانچ سیڑھیاں تراش کر اوپر جانے کا راستہ دیکھا۔ اور پھر جب وہ اوپر پہنچا تو اسے ایک چوڑا سا پلیٹ فارم نظر آیا۔ یہاں وشالی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔ نعمت علی اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اس نے کہا۔

"وشالی۔" لیکن ابھی اس کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے کہ اچانک وشالی کا پورا بدن دھوئیں میں ڈوب گیا۔ سفید لطیف دھواں جس سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ چند لمحات تک یہ دھواں فضاء میں بلند ہوتا رہا۔ اور اس کے بعد جب دھواں ہٹا تو نعمت علی نے دیکھا کہ وہاں کسی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ نعمت علی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا تھا۔ اسے ایک عجیب سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دکھ کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے حلق سے ایک مدھم سی آواز نکلی۔

"وشالی!..... وشالی! کہاں چلی گئیں تم۔ وشالی تم کہاں چلی گئیں۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اسے کسی نے اپنے دونوں بازوؤں میں سنبھال لیا ہو۔ اور ایک عجیب و غریب خوشبو اس کے سارے وجود میں تیرنے لگی ہو۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی کے گھنیرے بال اس کے چہرے کو چھو رہے ہوں۔

ایک لمحے کیلئے اس کی آنکھیں بند ہوئیں۔ پھر فوراً ہی کھل گئیں۔ بڑی عجیب سی کیفیت کا احساس تھا۔ جب ذہنی کیفیت واپس آئی۔ تو اس نے پورن وتی کو دیکھا۔ جس کا چہرہ دھند جیسی کیفیت میں چمک رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔

"مہا..... مہا..... مہا..... متی۔ آپ؟"

"ہاں۔ وکرم راج۔ یہ میں ہوں۔ تم زندہ طلسمات میں گھر گئے ہو۔ تم بہت سی نگاہوں کا مرکز بن گئے ہو۔ اور میں جانتی ہوں۔ ایسا کیوں ہے تمہارے تصور میں بھی یہ بات نہیں ہوگی وکرم راج کہ دیوی اور دیوتاؤں نے تمہیں اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ نجانے وہ تم سے کیا کام لینا چاہتے ہیں جو ہوگا۔ اس پر پریشان مت ہونا۔ کیا سمجھے؟ جو گزر رہی ہے اسے گزرنے دو۔ وقت آنے پر بہت سی حقیقتیں خود تمہارے سامنے آجائیں گی۔"

لیکن..... میں..... میں..... وہ نہیں ہوں۔ جو تم لوگ سمجھ رہے ہو مجھے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"وشالی کہاں گئی؟" نعمت علی کے منہ سے بے اختیار نکلا اور پورن وتی کا چہرہ خشک ہوگیا۔

"ایک وشالی پر انحصار مت کرو۔ وکرم راج! بہت سی وشالی تمہارے راستے میں آئیں گی۔ بہت کچھ تمہارے راستے میں آئے گا۔ سمجھ رہے ہو نا؟" بس صبح ہوگئی باقی باتوں پر غور مت کرو۔ بعد میں سوچنا۔" پورن وتی نے نعمت علی کی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ نرم سا احساس اور اس کے بعد ایک آواز۔

"اٹھ جایئے مہاراج! اٹھ جایئے پربھو ناشتے کا سمے ہوگیا ہے۔ آپ بہت دیر سے سو رہے ہیں۔ سب جاگ گئے ہیں۔" ایکدم سے نعمت علی کے بدن میں تھرتھراہٹ سی ہوئی۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ کیا ہوگیا۔ یہ طلسم تو بہت ہی ہولناک تھا۔ بہرحال اپنی جگہ سے اٹھا۔ پورا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ جو سفر اس نے رات کو طے کیا تھا۔ وہ اس کے جسم پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ باقی لوگ نارمل تھے۔ آگے بڑھنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ آگے کے سفر کا آغاز کردیا گیا۔ ان لوگوں نے ذریعہ سفر شاندار قسم کی جیپیں اور گھوڑے کا اختیار کیا تھا۔ تین جیپیں تھیں۔ پانچ گھوڑے تھے اور ان گھوڑوں کو وہیں سے حاصل کیا گیا تھا۔

راجہ پرمیت سنگھ کے لئے یہ سارے کام کرنا مشکل نہیں تھا۔ ہر جگہ اس کی پذیرائی ہو رہی تھی۔ اور اسکا نعمت علی کو بھرپور طریقے سے اندازہ تھا۔ پردھان سنگھ البتہ جب بھی سامنے آتا تو اسے غور سے دیکھنے لگتا تھا۔ یہ ہی خوش نصیبی تھی کہ اس کے ذہن میں نعمت علی کی بات نہیں آئی تھی۔ اس دوران نعمت علی نے کئی بار یہ کوشش کی تھی۔ کہ پردھان سنگھ کہ معمولات تلاش کرے اور یہ پتہ چلائے کہ اگر خیرالدین خیری کی روح اس کے قبضے میں ہے تو وہ کس طرح ان روحوں کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔

یا پھر خیرالدین خیری کے علاوہ کوئی اور روح بھی اس کے قبضے میں ہے یا نہیں لیکن ظاہر ہے۔ نعمت علی کو یہ سب کچھ نہیں آتا تھا۔ چنانچہ وہ کچھ معلوم نہیں کرسکا تھا۔

سفر کا آغاز ہوگیا۔ ماحول انتہائی خوبصورت تھا۔ نجانے کیسے کیسے معاملات نظر آرہے تھے۔ وہ لوگ خوبصورتی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جارہے تھے۔ اور دیکھ رہے تھے کہ یہاں نجانے کیا کیا ہے۔ تبت کے علاقے میں ہر منظر بے پناہ خوبصورت تھا۔ اور جو کچھ

نگاہوں کے سامنے آرہا تھا۔ وہ اتنا حسین تھا کہ لطف آجاتا تھا۔ بہرطور تقریباً دو دن کا سفر کیا گیا اور اب اس کے بعد وہ روایتی پہاڑی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جس کے بارے میں پہلے بھی کئی بار سنا جا چکا تھا۔

اس دوران قیام بھی ہوتا تھا۔ کھانا وغیرہ بھی پکایا جاتا تھا۔ اور ساری چیزیں نگاہوں کے سامنے آجاتی تھیں۔

نعمت علی بہت ہی عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ اس دوران نہ تو وشالی اسے نظر آئی تھی۔ اور نہ ہی پورن وتی بس وقت گزر رہا تھا۔ اور احساسات میں تبدیلیاں ہوتی جارہی تھیں۔

پھر ایک بہت ہی خوبصورت جگہ قیام کیا گیا۔ یہ ہمالیہ کی ترائی کا علاقہ تھا۔ اور یہاں کے مناظر کافی حد تک خوبصورت تھے۔ اور دل یہ چاہتا تھا۔ کہ یہیں زندگی کی شام ہو جائے۔ کرناوتی کی نفرت کا وہی عالم تھا۔ یہاں غالباً کچھ وقت زیادہ قیام کرنا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ تو معلوم نہیں ہوسکی تھی۔ لیکن یوں لگتا تھا۔ جیسے راجہ پرمیت سنگھ یہاں زیادہ وقت گزارنا چاہتا ہو۔

دوپہر کے بعد موسم میں خاصی تبدیلیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ آسمان پر بادل جھکے ہوئے تھے۔ کرناوتی ایک خوبصورت سفید رنگ کے گھوڑے پر سوار ہو کر سیر و سیاحت کیلئے نکلی۔ نعمت علی کو بھی کوئی کام نہیں تھا۔

اچانک ہی کرناوتی نے کہا۔

"جی! شہ سوار، آؤ چل رہے ہو میرے ساتھ۔"

نعمت علی نے گردن اٹھا کر کرناوتی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بدستور تضحیک کے آثار تھے۔

"کہاں جانا ہے۔ راجکماری جی!"

"ان علاقوں میں گھوڑے کی سیر کا مزہ ہی الگ ہے۔ بشرطیکہ کسی کے اندر ہمت ہو۔" نعمت علی نے گردن خم کرکے کہا۔

"اگر آپ مجھے حکم دیں گی تو بھلا میری مجال ہے کرنے سے انکار کروں۔"

"گھوڑا لاؤ۔" کرناوتی نے ایک سائس سے کہا۔ اور وہ ایک مشکی گھوڑا لے کر آگیا۔ گھوڑا نہایت تندرست و توانا تھا۔

"کیا خیال ہے؟"

"جی۔"

"تو پھر آؤ۔" کرناوتی بولی اور نعمت علی گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

کرناوتی آہستہ آہستہ سفر کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ تین گھوڑے اور تھے چوتھے گھوڑے پر نعمت علی سوار تھا۔ کرناوتی کی آنکھوں میں کوئی عجیب سی کیفیت نظر آرہی تھی۔ جس کو نعمت علی نے محسوس نہیں کیا۔

بہرحال گھوڑے سست روی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں دوڑانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ یہ علاقہ گھوڑے دوڑانے کے قابل تھا ہی نہیں۔

کرناوتی ایک خوفناک ڈھلان تک پہنچی، یہ ڈھلان بس ناقابل یقین تھا۔ اتنی خوفناک چٹانیں اس میں بکھری ہوئی تھیں کہ اگر ذرا سی لغزش ہو جائے۔ اور انسان اس کے درمیان چلا جائے۔ تو قیمہ ہی بن جائے۔ یہاں آکر کرناوتی نے اپنا گھوڑا روکا۔ لیکن اس انداز میں کہ گھوڑا ڈھلان کے بالکل کنارے پر کھڑا تھا۔ اچانک ہی کرناوتی نے ایک عمل کر ڈالا جس کی کوئی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس نے ایک سرنج نکالی جس میں ایک سیال بھرا ہوا تھا۔

اور اچانک ہی اس نے سرنج گھوڑے کی ران کے اوپر لگادی۔ گھوڑا بری طرح اچھلا تھا۔ اور نعمت علی کو اس طرح اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوگیا تھا۔ کوئی ایسی چیز گھوڑے کے اندر انجیکٹ کی گئی تھی۔ کہ گھوڑا دیوانہ ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے ڈھلان میں چھلانگ لگادی۔ یہ سب کچھ نعمت علی کیلئے ناقابل یقین تھا۔

باقاعدہ شہ سوار تو وہ تھا ہی نہیں۔ وہ تو بس پورن وتی کی مہربانی تھی کہ اس نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ لیکن اس وقت اسے گھوڑے کو سنبھالنا انتہائی مشکل ہوگیا۔ گھوڑا چٹانوں کے درمیان چھلانگیں لگا دیا تھا۔ ہر چھلانگ پر نعمت علی گھوڑے کی پشت پر سے اچھل جاتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن بس تقدیر تھی۔ جو اسے جمائے ہوئے تھی۔ گھوڑا ڈھلان پر دوڑتا چلا جارہا تھا۔

نعمت علی کو یہ اندازہ ہوگیا تھا۔ کہ اس کے خلاف کوئی گہری سی سازش ہوئی ہے۔ گھوڑے نے کئی جگہ ٹھوکر کھائی تھی۔ اور نعمت علی کے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ پھر جو کچھ ہونا تھا۔ وہ ہوگیا۔ نعمت علی گھوڑے کی پشت سے بہت اونچا اچھلا تھا۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا۔ کم از کم اسے اس کا علم نہیں تھا۔ لیکن جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک عجیب و غریب ماحول میں دیکھا کچھ دیر کیلئے اس کے احساسات اس سے بہت دور چلے گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ ہوش و حواس واپس آتے چلے گئے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک پہاڑی غار میں ہے۔ کافی بلندی پر غار کی چھت نظر آرہی تھی۔ جو خاصی ہموار اور تراشیدہ تھی۔

یہ غار سو فیصدی قدرتی تھا۔ بدن کے نیچے کوئی نرم سی چیز تھی۔ اس نے اس چیز کو چھو کر دیکھا۔ لیکن اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ البتہ اسے اپنی طبیعت میں ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہورہا تھا۔ رفتہ رفتہ واقعات اس کے ذہن میں نمایاں ہوتے چلے گئے۔ اسے وہ ڈھلان کا ہولناک سفر یاد آیا۔ کرناوتی یاد آئی جس نے گھوڑے کو انجکشن دیا تھا۔ اور گھوڑا پاگل ہوگیا تھا۔ یقیناً وہ تیزاب یا ایسی کسی چیز کا انجکشن تھا۔ جس نے گھوڑے کے وجود میں آگ لگادی تھی۔ نعمت علی کو یقین تھا۔ کہ گھوڑا تو مر چکا ہوگا۔

لیکن جو کچھ کرناوتی نے کیا تھا۔ وہ ناقابل معافی تھا۔ اور اب یہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کہ وہ راجہ پرمیت سنگھ سے کتنی دور نکل آیا تھا۔ کچھ لمحوں تک وہ ماضی کے بارے میں غور کرتا رہا۔ اور پھر اس کے بعد اس نے گردن گھمائی اس نے دیکھا۔ کہ پتھر کی چٹانوں کو چھو کر تراشا گیا ہے۔ اور ان تراشیدہ چٹانوں پر عجیب و غریب چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں خوبصورت رنگ کے پتھر بھی موجود تھے۔

ایک جگہ ہلکا سا دھواں بلند ہورہا تھا۔ بہرحال وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر بہت دور فاصلے پر اسے ایک گول دروازے سے کوئی داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ یہ ایک انسان تھا۔ لیکن لاماؤں کے لباس میں اسکا سر گنجا تھا۔ اور گلے میں مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ نعمت علی کو یاد آ گیا کہ وہ لاماؤں کے دیش میں ہے۔

لیکن کس کیفیت میں۔ جس طرح گھوڑا دوڑا تھا۔ اس وقت تو یہ اندازہ ہورہا تھا کہ اس کی ہڈیاں چور چور ہوجائیں گی۔ زندگی بچنے کے کوئی امید نہیں تھی تو کیا میں زندہ ہوں۔؟

اور لاماؤں کی کس آبادی میں ہوں۔ اس کے علاوہ اور کیا سوچا جاسکتا تھا۔ بہرحال وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اور قریب آ گیا۔ اس کے بعد اس نے نعمت علی کے جسم کو دیکھا۔ اور گردن ہلائی۔ جیسے وہ اطمینان کا اظہار کررہا ہو۔ اس کے بعد اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔

جملہ تو سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن نعمت علی کو یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ بھوک کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ تب نعمت علی کو بھوک کا احساس ہوا اور اس نے گردن ہلادی۔ اس شخص کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے تھے۔ پھر وہ وہاں سے آگے بڑھا۔ اور لکڑی کے ایک پیالے میں کچھ چیزیں لے کر آیا۔ یہ ایک سیال ساتھا ساتھ ہی ایک لوکی نما پھل۔ جو اس نے سیال کے ساتھ نعمت علی کی طرف بڑھادیا۔

نعمت علی نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس کو وقت نہیں ہوئی۔ ایک لمحے کے لئے اسے حیرانی ہوئی تھی۔ اور اس نے سوچا تھا کہ کمال کی بات ہے زندگی ان حالت میں بھی بچ سکتی ہے۔ لیکن بہرحال اللہ کا وجود کہیں بھی اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔ وہ پیالہ لئے ہوئے نعمت علی کے پاس پہنچا اور اس نے لوکی نما چیز اس کے ہاتھ میں تھمادی۔

نعمت علی کو یہ تو نہیں معلوم تھا۔ کہ یہ ترکاری ہے۔ یا پھل لیکن اس نے اسے ذرا سا چکھ کر دیکھا۔ اور وہ اسے بہت ہی لذیز محسوس ہوا۔ میٹھا تھا۔ اور ہلکی ہلکی سی

ترشی بھی تھی۔ اس میں لیکن یہ پھل نعمت علی نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بہرحال نعمت علی نے وہ پھل چبایا۔ اور سیال کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لئے اب اس میں کوئی تکلف تو نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ لوگ نعمت علی کا علاج بھی کررہے تھے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ نعمت علی پھر آرام کرنے کے لئے اسی بستر پر لیٹ گیا۔ اور وہ شخص واپس چلا گیا۔ دن اور رات کا کوئی تعین نہیں تھا۔ غار میں ایک عجیب سی مدھم مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

پھر اس وقت کوئی یقین ہی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کیا وقت ہوا ہے کہ ایک ضعیف شخص غار کے اس دہانے سے اندر داخل ہوا۔ یہ بھی لاماؤں کے لباس میں تھا۔ اور اس کے پیچھے دو افراد بڑے ادب سے نظریں جھکائے چلے آرہے تھے۔ آنے والوں میں سے ان دو آدمیوں نے لکڑی کا بنا ہوا ایک اسٹول جو بہرصورت بھدا تھا۔ لیکن اسے اسٹول نما ہی بنایا گیا تھا۔ یعنی درخت کے اوپری حصے کو کاٹ کر اس میں چار سوراخ کئے گئے تھے۔ اور ان سوراخوں میں لکڑیاں گھسا کر اسے اسٹول بنادیا گیا تھا۔

انہوں نے وہ اسٹول بستر کے سامنے رکھ دیا۔ اور بوڑھا شخص اس پر بیٹھ گیا۔ اچانک ہی نعمت علی نے محسوس کیا کہ اس کے کندھے پر ایک عجیب سی چیز بیٹھی ہوئی ہے۔ نعمت علی نے غور کیا تو اسے محسوس ہوا۔ کہ یہ ایک پرندہ ہے۔ لیکن یہ کیسا پرندہ تھا۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو پارہا تھا۔

شکل وصورت میں وہ چمگادڑ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اسکا رنگ گہرا نیلا تھا۔ نیلی چمگادڑ، نعمت علی کے ذہن میں ایک نام ابھرا۔ اور نجانے کیوں اسے یوں لگا جیسے چمگادڑ ہنس پڑی ہو۔ ادھر بوڑھا گہری نگاہوں سے نعمت علی کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو۔؟''

''میں بہت دور سے آرہا ہوں۔ اور میں نہیں جانتا کہ میں یہاں کیسے پہنچا؟ یہ کون سی جگہ ہے۔''

''پاتال نگری۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔ اور نعمت علی کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ یہ ہی نام تو راجہ پرمیت سنگھ نے لیا تھا۔ پاتال نگری۔ وہ کوئی پاتال سنگھاسن تھا۔'' جس کے لئے پرمیت سنگھ نے یہ سفر کیا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

''ہم پاتال نگری کے اوپری حصے میں ہیں۔ زمین کی گہرائیاں یہاں سے تھوڑے فاصلے سے شروع ہوتی ہیں۔ اور کیا تم اس بات پر یقین کرو گے کہ تمہیں یہاں ایک مقصد کیلئے بلایا گیا ہے۔'' نعمت علی کو یاد آیا۔ کہ وہ یہاں خود تو نہیں آیا۔ اس کے ساتھ تو کرناوتی نے سازش کی تھی۔ زندگی بچ گئی۔ یہ بھی بہت بڑا کام ہے۔

''ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن دیوتاؤں کے فیصلہ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ تم خود یہاں نہیں آئے۔ بلکہ جو کچھ تمہارے ساتھ کیا گیا۔ وہ تمہیں یہاں پہنچانے کے لئے تھا۔'' نعمت علی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ بوڑھے نے اس کے دماغ میں اٹھنے والے خیالات کو پڑھ لیا تھا۔ بوڑھا پھر بولا۔

''ہاں..... میں نے تمہارے خیالات کو پڑھ لیا ہے۔ تمہیں جو اک شکل بخشی گئی ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ ایک نوجوان نے تمہیں تمہارے بارے میں بتایا تھا جس کا نام ورتنا تھا۔

''ورتنا کا تعلق بھی ہم سے ہی تھا۔'' نعمت علی نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی حیرتوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

''حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بعض معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں تم تھوڑا سا آرام کرو۔ ٹھیک ہوجاؤ گے اور تمہیں بہت آسانیاں مل جائیں گی۔ میں تمہاری رہائش کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔'' اس کے بعد نعمت علی کو ایک بہت ہی اچھی جگہ جو ایک جھونپڑے کی شکل میں تھی۔ رہنے کے لئے دی گئی۔ یہاں اسے بڑی آسائشیں فراہم کی گئی تھیں لیکن وہ دنگ تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہورہا ہے۔ قدرت اس سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔ اس کی زندگی کا تو ایک ہی مقصد تھا۔ خیر الدین خیری کی رہائی۔ کرناوتی نے کمبخت نے ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگوں سے فاصلہ پیدا کر دیا تھا۔

بہر حال وقت کے فیصلوں کا تو انتظار کرنا ہی پڑتا ہے۔ جب انسان کے بس میں کچھ نہ رہے تو پھر وقت اسے آگے کی کہانی سناتا ہے۔ اور وقت نے آگے کی کہانی بڑھائی۔ کہ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ جب اچانک ہی خیر الدین خیری کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔

جس جھونپڑی میں وہ فروکش تھا۔ وہاں ایک روشندان نما جگہ بھی بنی ہوئی تھی۔ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز اسی روشندان سے آئی تھی۔ اور نعمت علی چونک کر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ پھر اس نے اسی نیلی چمگادڑ کو دیکھا۔ جو اس روشن دان سے اندر اتر آئی تھی۔ نعمت علی حیران رہ گیا۔

چمگادڑ زمین پر بیٹھی اور اس کے بعد اچانک ہی اس کا قد بڑھتا چلا گیا۔ اور دوسرے لمحے وہ پورن وتی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ نعمت علی اچھے بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جو زمین پر لگا ہوا تھا پورن وتی کے ہونٹوں پر بڑی سبک مسکراہٹ تھی۔

"ہاں۔ میں بھلا تم سے دور کیوں رہ سکتی ہوں۔ مختصر الفاظ میں تمہیں بتا دوں نیلی چمگادڑ بوڑھے آہورہ کا شاخسی نشان ہے۔ لیکن میں نے اسے دھوکا دیا نیلی چمگادڑ سے میری جنگ ہوئی اور میں نے اسے ہلاک کر کے اس کا روپ دھار لیا۔ کیونکہ مجھے تمہارے پاس آنا تھا۔"

"اوہ۔" نعمت علی کے منہ سے عجیب سے انداز میں نکلا۔

"اب میں تمہیں بتا دوں راجہ پرمیت سنگھ۔ کرناوتی، اور ان کا گرو پردھان سنگھ، یہاں آ چکے ہیں۔ اور بہت جلد وہ تم سے آ کر ملیں گے۔ سنو..... جو کچھ میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ اسے غور سے سنو۔ پہلے مجھے تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اور واقعی میرا جادو تمہاری شخصیت کے سامنے بالکل بے اثر ہو گیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مجھے تمہارے دھرم سے اختلاف تھا۔

لیکن بالکل اچانک کچھ باتیں معلوم کرتے ہوئے مجھے یہ پتا چل گیا۔ کہ تم مسلمان ہو۔ مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں تھا بعد میں مجھے اور بھی بہت سی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ تمہارا ایک مقصد ہے۔ جس کے لئے تم سرگرداں ہو۔ میں تمہاری مدد کرنے کے لئے تمہارے پاس اس وقت یہاں آئی ہوں۔ سنو! اتفاق کی بات ہے کہ تمہاری شکل وصورت ان لوگوں کے ایک مقدس دیوتا۔ سادھو وستو سے ملتی جلتی ہے۔ بوڑھا آہودہ بھی جانتا ہے۔ کہ تم سادھو وستو نہیں ہو لیکن وہ ایک کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بدھوں کے دو عقائد یہاں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ تمہیں ورتنا نے بتایا تھا کہ یہاں پاتال نگری میں ایک ایسا قبیلہ آباد ہے۔ جو بدھ دھرم میں تحریف سمجھتا ہے۔ اور اس پر یہ سرگرداں ہے۔ تمہیں اسی لئے یہاں لایا گیا ہے۔ تمہیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ راجہ پرمیت سنگھ پاتال نگری کے پاتال سنگھاسن پر براجمان ہونا چاہتا ہے۔ اور پردھان سنگھ اس کی مدد کر رہا ہے۔ لیکن اصل بات تمہیں نہیں معلوم۔ پردھان سنگھ اصل میں پرمیت سنگھ کو یہاں لا کر اس کے ذریعے پاتال سنگھاسن پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اور جب وہ پاتال سنگھاسن تک پہنچ جائے گا تو سب سے پہلے وہ راجہ پرمیت سنگھ کو ہی قتل کرے گا۔ طاقتوں کے کھیل ایسے ہی چلتے ہیں۔ وہ لوگ یہاں پہنچ چکے ہیں اور بہت جلد تم سے مل لیں گے۔ کیونکہ بوڑھا آہورہ تمہیں ان سے ملنے کی اجازت دے گا۔ سمجھ گئے ہو ناں تم۔؟"

تم پھر ان سب کے راہنما بنو گے۔ یہاں تمہارا ایک مجسمہ دیوتا کی حیثیت سے نصب ہے۔ جس کے بناء پر بوڑھا آہورہ اپنی قوم کو تمہاری جانب راغب کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ تم سے اس کے لئے مدد لے گا۔ اس کی مدد ضرور کرنا باقی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کسی نہ کسی شکل میں تم تک پہنچتی رہوں گی۔ اور تمہیں آگاہ کرتی رہوں گی۔"

نعمت علی دنگ رہ گیا تھا۔ رانی پورن وتی کو اس

کی ساری تفصیل معلوم ہو گئی تھی۔ لازمی بات ہے کہ اس کا نام بھی اسے پتہ چل گیا ہوگا۔ ادھر بوڑھے آہورہ کے بارے میں بھی اس نے ساری تفصیل بتا دی تھی۔ رانی پورن وتی نے کہا۔

"کہیں کسی جگہ بھی بددل نہ ہونا۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی بے فکر رہو۔" نعمت علی کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔ "اب میں جا رہی ہوں۔ حوصلے سے کام لینا۔" چنانچہ وہ اسی روشندان سے پرواز کر گئی۔ اور نعمت علی گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

ادھر نعمت علی یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ اور ادھر راجہ پرمیت سنگھ اس وقت کے بعد سے سخت بددل ہو گیا تھا۔ اس کا گرو پردھان سنگھ بھی نعمت علی کیلئے بہت پریشان تھا کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کرناوتی نے کیا کام دکھایا ہے لیکن وقت کے یہ ہی کھیل چلتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس مندر تک پہنچ گئے۔ جہاں انہیں حیرت انگیز چیزیں نظر آنے لگیں۔ یعنی پاتال نگری کے سفر کا آغاز ہو گیا۔

جتنی مشکلات سے وہ ان ڈھلانوں پر اترے تھے۔ ان کی حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔ سب ہی ایک دوسرے کا بوجھ سنبھالے ہوئے تھے۔ لیکن راجہ پرمیت سنگھ اپنے مقصد کو زندگی زیادہ قیمتی سمجھتا تھا۔ اور سر جھکائے وہ ان گہرائیوں میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں پر اترتے ہوئے ان کے کئی ساتھی کام آ گئے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ یہ سلسلہ کب تک ختم ہوگا۔ اور پاتال کی گہرائیوں کا یہ سفر نجانے کہاں تک پہنچے گا۔ وہ اترتے رہے۔ اور وقت آگے بڑھتا رہا۔ ان خوفناک گہرائیوں میں اترتے ہی دل پر اکتاہٹ طاری ہو رہی تھی۔ لیکن بہر حال وہ سفر کر رہے تھے۔ اور پھر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ ان ڈھلانوں کا اختتام، ایک وسیع اور شاندار پہاڑ کے دامن میں جا کر ختم ہوا تھا۔ جس کی چوٹی پر برف جمی ہوئی تھی۔

پہاڑوں کا یہ سلسلہ نیم دائرے کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ اور انتہائی طویل وعریض تھا۔ تاحدِ نظر پہاڑ ہی پہاڑ جن میں کہیں کوئی درہ یا شگاف نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے آگے کا میدان بنجر تھا۔ جس میں بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ اور ان پتھروں اور چٹانوں کے درمیان مویشیوں کے ریوڑ گھاس کی تلاش میں گھومتے نظر آ رہے تھے۔ پہاڑوں کے نسبتاً نیچے ڈھلانوں پر گھنے جنگلات تھے۔ اور ان جنگلات میں چھوٹے چھوٹے میدان بکھرے ہوئے تھے۔ جو دور سے دیکھنے میں واضح نہیں تھے۔ لیکن غور کرنے پر اندازہ ہوتا تھا۔ کہ وہ کھیت ہیں۔

وہ سب وہاں رکے اور سب سے پہلے وہاں انہوں نے اپنی تیز نگاہوں سے اس ماحول کا گہرے طریقے سے جائزہ لیا۔

"آہ..... یہ بھورے رنگ کی چٹانیں۔"

"نہیں یہ چٹانیں نہیں ہیں۔" پردھان سنگھ نے کہا۔

"تو پھر؟"

"یہ جھونپڑے ہیں۔ جو ایک خاص قسم کی گھاس پھوس سے بنے ہوئے ہیں۔"

"اوہ..... یہ تو بڑی عجیب صورت حال ہے۔ کیا واقعی ہم پاتال نگری پہنچ گئے۔"

"ہاں۔ میں جو کچھ تمہیں بتا رہا ہوں۔ اس پر شک نہ کرو۔"

"نہیں..... نہیں شک کی بات نہیں ہے۔ گرو مہاراج آپ جو کہہ رہے ہیں وہ سچ ہوگا۔" غرض یہ کہ وہ آگے بڑھنے لگے۔ پھر انہیں ایک دریا نظر آیا۔ اس کے آس پاس قدرتی خندقیں بھی تھیں۔ یہ مکانات نما جھونپڑے بہت خوبصورت بنے ہوئے تھے ایک باقاعدہ آبادی تھی۔ جو نسبتاً بلند مقام پر بنی ہوئی تھی۔ بہر حال وہ آگے بڑھتے رہے۔ اور پھر وہ ایک ایسی چٹان کے پاس پہنچ گئے جو عمارت نما بنی ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں راجہ پرمیت سنگھ نے پردھان سنگھ سے پوچھا۔

"وہ کون سی جگہ ہے۔؟"

"یقیناً کسی معزز شخصیت کی رہائش گاہ۔ بہر طور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ یہاں سے بھی آگے بڑھتے رہے۔ اور پھر ایک ایسی جگہ پہنچ گئے۔ جہاں انہیں بہت سے لوگ نظر آئے تھے۔ یہ گھٹے ہوئے سر اور لمبی چوٹیوں والے لوگ تھے۔ جن کے اوپر جسموں پر گیروے رنگ کا لباس تھا۔ سر صاف شفاف اور عجیب غریب تھے۔ پھر انہوں نے ایک اور شخص کو دیکھا۔ جس کی گردن میں بے شمار چھوٹی چھوٹی جانوروں کی کھوپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

وہ لوگ ان کے چاروں طرف بکھر گئے۔ اور پھر اس طرح انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کرنے لگے۔ جیسے وہ انہیں آگے لے جانا چاہتے ہوں۔ یہاں تک کہ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے اس آبادی کے پاس پہنچ گئے۔ جو جھونپڑیوں کی آبادی تھی۔ یہاں انہیں ایک احاطے میں لایا گیا۔ جو کافی وسیع و عریض تھا۔ یہاں بھی چھت والے جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ انسانوں کی رہائش گاہیں ہوں۔ لیکن عارضی رہائش گاہیں۔ تب انہیں لانے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"یہ جگہ تمہارے قیام کیلئے ہے۔ اور سنو! کوئی ایسا عمل نہ کرنا جو تمہارے لئے مصیبت کا باعث بن جائے۔ تمہیں یہاں امن دیا جاتا ہے۔" راجہ پرمیت سنگھ نے گردن خم کردی تھی۔ اور اس کے بعد وہ اس علاقے میں فروکش ہوگئے۔

بڑی سنسنی خیز کیفیت تھی۔ ان لوگوں نے نجانے کس کس طرح مشکلات اٹھا کر یہاں تک کا سفر کیا تھا۔ لیکن اب منزل پر پہنچنے کے بعد ان کے راستے مسدود ہوگئے تھے۔ راجہ پرمیت سنگھ کو سب سے بڑا سہارا گرو پردھان سنگھ کا تھا۔ وہ ضرور اس سلسلے میں ایسا عمل ضرور کریں گے۔ جس سے ان کی مشکلوں کا حل مل جائے گا۔ اور اس نے اس کے بعد گرو پردھان سنگھ سے کہہ ڈالی۔

"گرو جی! مہاراج اب ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ ہم عجیب سی کیفیت کا شکار ہیں۔ پاتال نگری پہنچ چکے ہیں۔ اور پاتال سنگھاسن ہم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لیکن یوں لگ رہا ہے۔ گرو مہاراج یہاں آکر ہمارے راستے بند ہوگئے ہوں۔ کیا آپ ہماری راہنمائی نہیں کریں گے۔" پردھان سنگھ جیسے خود بھی چکرایا ہوا تھا۔ اس نے پر خیال انداز میں گردن ہلائی۔ اور آہستہ سے بولا۔

"کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے..... کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ اور اب میں ایک عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہوگیا ہوں۔ بلکہ میں بتا نہیں سکتا پرمیت سنگھ۔ کہ یہ گڑبڑ کیا ہوئی ہے۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے۔ جیسے ہم ایک بہت بڑی سازش کا شکار ہوگئے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی بہت ہی سنگین واقعہ ہونے والا ہے۔ مجھ سے بہت غلطی ہوگئی ہے۔ بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ ہم ایک انوکھی مشکل کا شکار ہوگئے ہیں۔ مجھے بتا راجہ پرمیت سنگھ وہ لڑکا کس طرح تیرے پاس آیا تھا۔" پردھان سنگھ نے کہا۔ اور پرمیت سنگھ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"کون سے لڑکے کی بات کررہے ہو۔؟"

"وکرم راج! جسے تو اپنے ساتھ لایا تھا اور وہ پراسرار طریقے سے گم ہوگیا۔" وکرم راج کا نام سن کر کرنا وتی۔ ایکدم چونک گئی تھی۔ اس نے کوئی اظہار نہیں کیا۔ لیکن اس کے کان پردھان سنگھ کی باتوں پر لگ گئے۔ پردھان سنگھ کہہ رہا تھا۔

"کہا تھا ناں میں نے تجھ سے کہ اس لڑکے کی شکل نجانے کیوں مجھے جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب گرو جی!" راجہ پرمیت سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔

"کوئی بہت ہی بڑی بات ہوئی ہے۔ وہ لڑکا مسلمان تھا۔"

"کیا؟" راجہ پرمیت سنگھ نے سمجھ نہ آنے والے انداز میں پردھان سنگھ کو دیکھا۔

"ہاں..... مجھے بہت کچھ یاد آرہا ہے۔ بہت کچھ یاد آرہا ہے کہ اسے میں پہلے مل چکا ہوں۔ وہ کسی کے ساتھ تھا۔"

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

"بتاؤں گا۔ تجھے بتاؤں گا۔ ابھی تھوڑا سا دم

لے لے۔ ذرا سا اندازہ ہوجائے کہ ہم کہاں ہیں۔ اور ہمیں کہاں جانا ہے؟ ان باتوں کا پتہ چل جائے تو میں تجھے آگے کی بات بتاؤں۔"

"جو آگیا گرو مہاراج لیکن پتہ نہیں میرا من کیوں ڈر رہا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ میں خوف اور ڈر سے بہت دور ہوں۔ لیکن اب لگ رہا ہے کہ کوئی ایسی انوکھی بات ضرور ہے۔ جو کسی مشکل کا پتہ دے رہی ہے۔"

"ہاں..... ہے۔ لیکن میرے راستے بند نہیں ہیں۔" پردھان سنگھ اپنے کام میں مصروف ہوگیا لیکن کرنا وتی کی کیفیت بہت عجیب ہوگئی تھی۔ یہ ساری باتیں اس نے سن لی تھیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ جب اس نے نعمت علی کو موت کی طرف دوڑایا تھا۔ تو اس وقت تو اسے صرف یہ احساس تھا کہ اس کا پسندیدہ گھوڑا شیرول اس کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ لیکن اس کے بعد نجانے کیوں اس کے ضمیر نے اسے کچوکے دینا شروع کردیئے۔

کتنا نوجوان اور حسین تھا وہ لمبا چوڑا اونچا، خوبصورت، اور کس طرح اس کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا گھوڑے کی موت تو اس نے دیکھ ہی لی تھی۔ ڈھلانوں سے اترے ہی تھے۔ وہ لوگ۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اس کی نگاہیں نعمت علی کو تلاش کرتی رہی تھیں۔ اور اس وقت سے اس کے دل پر ملال سا تھا۔

اور ضمیر کا بوجھ جب بے تحاشہ بڑھ گیا تو وہ راجہ پرمیت کے پاس پہنچ گئی۔

"بھائی جی مہاراج! آپ کے سامنے اپنی ایک غلطی کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔" راجہ پرمیت سنگھ نے حیران نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔ اور بولا۔

"کیسی غلطی کرنا وتی۔؟"

"آپ، اور گرو مہاراج ابھی وکرم راج کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔"

"ہاں..... تو پھر؟ تو جانتی ہے اس کے بارے میں کہ کر چلا گیا۔ وہ گھوڑا لے کر کیوں فرار ہوگیا؟ کون تھا وہ؟ اور کیا چاہتا تھا۔ کیا وہ بھی ان ہی علاقوں میں آنا چاہتا تھا؟"

"نہیں بھائی جی مہاراج۔، وہ اب اس سنسار میں نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" پرمیت سنگھ نے حیران لہجے میں کہا۔

"میں نے اسے ہلاک کردیا۔ بھائی جی مہاراج۔" کرنا وتی شرمساری سے بولی۔ اور پرمیت سنگھ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"کوئی خواب دیکھا ہے تو نے۔ کوئی سپنا دیکھا ہے۔"

"نہیں بھائی جی مہاراج۔ مجھے اس سے نفرت تھی۔ اس وقت سے جب اس نے میرے شیر دل کو مجھ سے جدا کیا تھا۔" کرنا وتی نے پوری تفصیل راجہ پرمیت سنگھ کو بتادی۔ اور راجہ پرمیت کے چہرے پر افسردگی کے آثار پھیل گئے۔ "ارے..... یہ تو..... تو نے بہت برا کیا کرنا وتی۔ یہ تو تو نے بہت برا کیا۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں بھائی جی! بہت بڑی غلطی ہوگئی مجھ سے۔"

"ہوں۔ افسوس، مگر گرو جی کہتے ہیں کہ مسلمان لڑکا تھا۔ وہ اگر وہ مسلمان تھا۔ تو یہاں کیوں آیا تھا۔ مگر اسکا کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا۔" یہاں پاتال نگری میں آنے کے بعد ان پر کوئی عجیب سی کیفیت بیت رہی تھی۔ وہ بہت حیران تھے۔ پھر انہیں وہاں سے بھی کہیں اور چلنے کیلئے کہا گیا۔ اور جس جگہ یہ لے جائے گئے۔ وہ ایک بڑا سا غار تھا۔ جسے انسانی ہاتھوں کی تلاش سپاٹ اور سیدھی دیواروں کی شکل میں چکنا کیا تھا۔ اور یہ کافی خوبصورت تھا۔

اس میں بہت سی قیمتی چیزیں سجاوٹ کے طور پر لگی ہوئی تھیں۔ اور کہیں سے بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ کہ وہ کوئی اجنبی جگہ ہے۔ یہ لوگ یہاں آنے کے بعد بیٹھے تھے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک ایک طرف سے کچھ سرسراہٹیں سنائی دیں۔ یہ سرسراہٹیں جس طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے آئی تھی اور وہ اجنبی جگہ تھی۔ ان سرسراہٹوں کے نمودار ہونے کے ساتھ ہی وہاں ایک دیوار اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ اور اس میں ایک گول دروازہ نمودار ہو گیا۔

حیرانی کی بات تھی۔ کہ اس ویرانے میں جہاں صرف پتھریلی چٹانوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس طرح کا کوئی عمل بھی ہوگا۔ بہرحال انہیں کچھ نہیں پتہ چل سکا تھا۔ جو سوراخ پیدا ہوا تھا۔ وہ تاریک تھا۔ اور اس سے کوئی روشنی نہیں آ رہی تھی۔ لیکن چند لمحوں کے بعد ہی اس میں آہستہ آہستہ روشنی ہونے لگی۔ اور پھر انہیں کچھ مشعلیں نظر آئیں۔ جو انسانی ہاتھوں میں تھیں۔ جو لوگ جو مشعلیں اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ ادھر ہی کے باشندے تھے۔ غار میں داخل ہو کر وہ ساکت نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگے۔ پتہ نہیں کس مقصد کے تحت وہ یہاں آئے تھے۔

اور پھر چند ہی لمحات کے بعد وہاں جو بوڑھا شخص اندر آیا۔ انہیں اسے دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کافی بوڑھا تھا وہ اور انسانوں کے شانوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ ایک لمحے میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ بوڑھا انتہائی مکار آدمی ہے۔ غرض یہ کہ بوڑھا ان کے درمیان پہنچ گیا۔ اور وہ دونوں مشکل بردار واپس اس سوراخ سے اندر داخل ہو گئے۔ بوڑھا خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"میرا نام آہورہ ہے۔ کیا سمجھے؟ آہورہ ہے میرا نام اور تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں میں۔"

پرمیت سنگھ نے پردھان سنگھ کی طرف دیکھا۔ اور پردھان سنگھ نے آگے بڑھ کر گردن جھکا دی۔

"میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ مقدس بزرگ! ہم یہاں سیر و سیاحت کیلئے آئے ہوئے تھے۔ ہم مہم جو ہیں۔ اور دنیا کے ایسے پراسرار گوشوں کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں جو انسانی آنکھوں سے دور ہیں۔

محترم بزرگ! ہم اس طرف بھٹکتے ہوئے آ نکلے ہیں۔ اور یہ تو بہت ہی بڑی بات ہے کہ ہم ایک ایسی اجنبی جگہ آ گئے ہیں۔ جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں۔ مہمانوں کا درجہ دیں اور اس جگہ کا جائزہ لینے کے بعد ہم یہاں سے واپس چلے جائیں۔"

"ہوں۔ اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ وہی سچ ہے۔"

"ہاں۔ مقدس بزرگ! ہم بھلا آپ سے جھوٹ کیوں بولیں گے۔" بوڑھے کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے ان کی بات پر یقین نہیں کیا ہے۔ اور پھر اس نے جو کچھ کیا۔ وہ بہت مختلف تھا۔ اس نے کہا۔

"اگر تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ ہی سچ ہے۔ تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں پوری عزت اور احترام کے ساتھ اس دنیا سے واپسی کی اجازت دے دیں گے۔ لیکن اگر تم نے جھوٹ بولا۔ تو تم یوں سمجھ لو۔ کہ پھر تمہارے لئے زندہ رہنے کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔"

کرناوتی کانپ کر رہ گئی۔ راجہ پرمیت سنگھ بھی پریشان تھا۔ پردھان سنگھ کے دل میں جو کچھ بھی تھا۔ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ تاہم اس نے کہا۔

"ہمارے جھوٹ، سچ کی پرکھ کیسے ہوگی۔؟"

"ہمارے ہاں..... ایک پتھر نصب ہے۔ یہ سچ، اور جھوٹ کی پرکھ کا پتھر ہے۔ تمہیں اس کے سامنے کھڑے ہو کر یہ بتانا ہوگا کہ تم یہاں کیوں داخل ہوئے ہو۔ اگر تم نے سچ بولا تو یہ پتھر سبز ہو جائے گا۔ اور اگر جھوٹ بولا تو وہ سرخ ہو جائے گا۔ اور سرخ کا مطلب تو تم جانتے ہی ہو۔ یعنی ہم پر جھوٹے انسان کو اپنے سچ کے اس دیوتا پر قربان کر دیتے ہیں۔ کیا سمجھے؟ تمہارا سرخ۔ سرخ خون دیوتاؤں کو بہت پسند ہوگا۔ کل روشنی میں تمہیں وہاں لایا جائے گا۔ اور سچ اور جھوٹ کی پرکھ ہو جائے گی۔" بوڑھے نے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں کو اشارہ کیا اور اس کے بعد وہ غار سے باہر نکل گیا۔ لیکن اپنے پیچھے وہ شدید سنسنی چھوڑ گیا تھا۔

(جاری ہے)

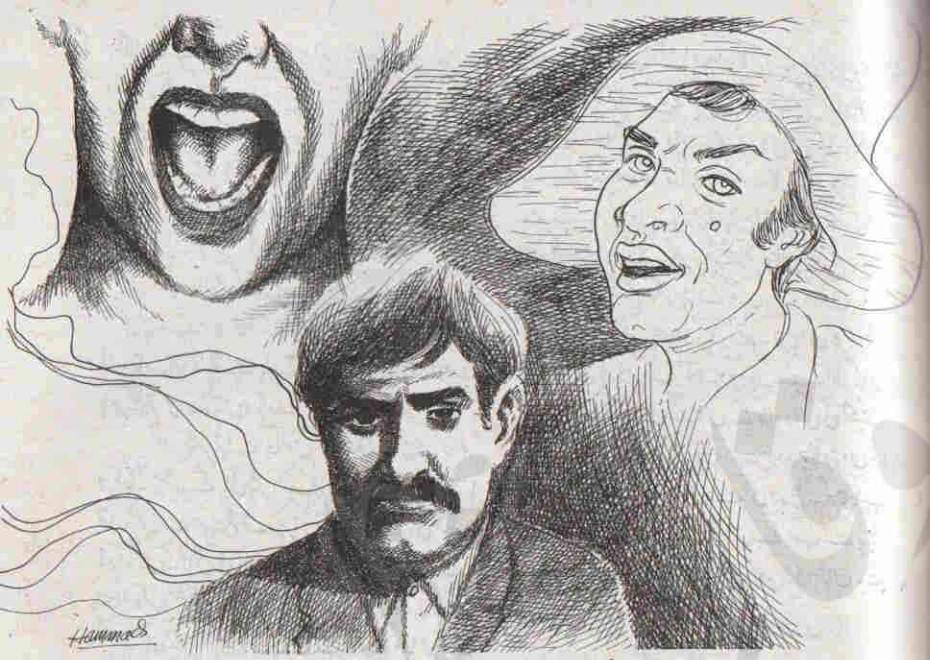

خونی مکڑی

عامر ملک۔ راولپنڈی

چشمہ میں نہانے والوں نے ایک عجیب منظر دیکھا پانی میں ایک مردہ جسم بہہ کر آ رہا تھا جس کی وجہ سے خوف و ہراس پھیل گیا لاش کی ابتر حالت دیکھ کر لوگ تھر تھر کانپنے لگے ہر کوئی اپنی اپنی جگہ ششدر اور خوفزدہ تھا کیونکہ.....

چشم زدن میں ایک دہشت ناک منظر سامنے آیا جس سے لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا

سپن براؤن کا چشمہ کسی زمانے میں لوگوں کا مرکز نگاہ تھا۔ اس کے گرم پانی سے لوگ مختلف امراض میں شفا پاتے تھے۔ زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی جنہیں جوڑوں کا درد لاحق ہوتا یا جو گردوں کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے۔ وہ یہاں آ کر اس پانی کو پیتے۔ اس میں نہاتے اور کئی ہفتے یہاں قیام کرتے۔ یہاں رہنے والوں کے لئے خوبصورت کاٹج بنے ہوئے تھے۔ ایک ہمہ وقتی ڈاکٹر بھی موجود تھا جو ان لوگوں کی دیکھ بھال کرتا اور انہیں طبی مشوروں سے نوازتا۔ اس طرح یہاں سال بھر خوب گہما گہمی رہتی۔ مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ جگہ ویران پڑ گئی۔ اس کی وجہ وہ پراسرار واقعات تھے۔ جو پے در پے یہاں نمودار ہوئے تھے۔ یہ چشمہ ایک غار میں سے نکلتا ہے اس کی لمبائی کوئی پندرہ فٹ اور چوڑائی تین فٹ ہے باہر سے یہ غار گھنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے اور اس غار کے دہانے پر ہر وقت دھند چھائی رہتی ہے جس کی وجہ سے یہ عموماً نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ ان واقعات کے رونما ہونے سے پہلے بارش کے موسم میں اس مقام پر معمول سے کچھ زیادہ ہی بارش ہوئی۔ ان طوفانی بارشوں کے باعث چشمہ میں پانی کی بہت زیادتی ہوگئی۔

علاوہ ازیں لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے جنگلی پرندے مثلاً کبوتر، چڑیاں اور دیگر پرندے وغیرہ اس غار کے اندر تو چلے جاتے ہیں مگر انہیں زندہ سلامت باہر نکلتے کسی نے نہیں دیکھا۔

اور پھر نہانے والوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ چشمہ کے پانی میں ایک مردہ جسم بہہ کر نیچے آرہا تھا۔ اس سے بہت خوف و ہراس پھیلا۔ لوگوں کی مختلف آراء تھیں۔ لاش کی ابتر حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اس کو مرے یا قتل ہوئے مدتیں گزر گئیں۔ ڈاکٹر فدکور ڈارون نے لاش کا معائنہ کیا۔ اور اس نے بھی یہی نتیجہ نکالا۔ لوگ اس واقعہ سے خوفزدہ ہوگئے اور اس دن شام سے پہلے پہلے بہت سے افراد یہاں سے روانہ ہوگئے۔ بہر حال آنے والے دنوں میں پانی کی بہتات کے باعث غار میں سے بہت سی چیزیں بہہ نکلیں۔ مثلاً گھاس پھونس کے ڈھیر اور جانوروں اور پرندوں کے بیسیوں پنجر۔

ڈاکٹر ڈارون ان تمام واقعات کا مشاہدہ کر کے بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ ہڈیاں اور ڈھانچے زمانہ قدیم کے جانوروں کے تھے۔ امتداز زمانہ نے ان ہڈیوں کو تقریباً پتھر میں تبدیل کر دیا تھا۔ لہٰذا پانی میں ان کی موجودگی سے کسی قسم کی آلودگی کا امکان نہ تھا اور لوگ بے شک اس پانی سے استفادہ کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر نے بیان جاری کر دیا۔ اور چند لوگ دوبارہ اس پانی کو استعمال میں لانے لگے۔ مگر پھر ایک اور واقعہ ہوا۔ ایک دن ایک لومڑی اور عقاب کے لاشے دیکھ کر لوگ پھر سے خوفزدہ ہوگئے۔ لاشوں کے بال و پر سلامت تھے اور انہیں مرے ہوئے زیادہ مدت نہ گزری تھی۔ یہاں آکر ڈاکٹر ڈارون کا پرانے جانوروں والا نظریہ دم توڑ گیا۔ یہ جانور زمانہ حال سے متعلق تھے اور ان کی ہلاکت بھی تازہ اور چند دنوں پر محیط تھی۔ لہٰذا یہ ایک طے شدہ امر تھا کہ ان واقعات کا تعلق زمانہ حال سے ہے۔ مریضوں نے اپنا اپنا سامان سمیٹا اور یہاں سے رخصت ہوگئے۔ پھر یہ چشمے تقریباً ویران ہوگئے۔

سوائے ایک جیسم انگریز کے جس کے دونوں ہاتھ گنٹھیا کی وجہ سے بیکار ہو چکے تھے۔ نام اس کا کمانڈر "سرتھامس ہاروبروک" تھا۔ وہ وہاں سے نہ نکلا کیوں کہ وہ دلیر اور نڈر آدمی تھا۔ اس کے علاوہ اس کی تکلیف اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اگر کوئی اسے مردہ چمگادڑوں کی یخنی پینے کو کہتا تو شاید وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتا جب سب لوگ وہاں سے چلے گئے تو اس نے سب سے پہلے ایک خوبصورت کاٹیج پر قبضہ کر لیا۔ اور بڑی شان سے وہاں رہنے لگا۔

☆.....☆.....☆

1883ء کا ذکر ہے کہ ایک مقامی ڈاکٹر کرسچین ویمبر ترک وطن کر کے امریکہ چلا گیا۔ وہاں اس نے بے تحاشا دولت کمائی۔ پھر وہاں سے ترک سکونت کر کے جنوبی امریکا چلا گیا۔ اور چند سال "فرنچ گنی" میں گزارے۔

انہی دنوں وہ واپس آگیا اور قصبہ سپن براؤن میں بود و باش اختیار کر لی۔ ڈاکٹر ڈارون نے اپنا کلینک اس کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اور خود وہاں سے چل دیا۔ ڈاکٹر ویمبر اپنے ہمراہ ایک بوڑھی حبشن ملازمہ بھی لایا۔ اس کا نام رگا تھا۔ اور وہ اس کے گھر کی دیکھ بھال پر مامور تھی۔ اس کی شکل و شباہت مقامی لوگوں کے لئے ایک عجوبہ سے کم نہ تھی۔ علاوہ ازیں اس کی پوشاک بھی عجیب و غریب ہوتی۔ ہمیشہ بھڑکیلے سرخ رنگ کا لباس پہنتی، شروع میں مجھے رگا تھا سے ڈر محسوس ہوتا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر ویمبر سے رشتہ داری کے باعث میں اس کے ساتھ مقیم تھا اور ہر وقت رگا تھا سے سامنا ہوتا رہتا تھا۔ ادھر ڈاکٹر ویمبر ایک سیم شیم دوہرے بدنی کا انسان

تھا۔ زیادہ تر نیلا سوٹ پہنتا۔ سر پر تنکوں کا ہیٹ اور پاؤں میں سیاہ جوتے ہوتے تھے وہ زیادہ تر خاموش رہتا۔ اور کسی سوچ میں غرق اس کی بھوری آنکھیں خلا میں تکتی رہتیں۔

اپنی جہاں گردی کی نشانی کے طور پر وہ اپنے ساتھ کئی چوبی صندوق بھی لایا۔ جن میں اس نے مختلف اقسام کے حشرات الارض جمع کر رکھے تھے۔ اسے مریضوں سے زیادہ ان کیڑوں مکوڑوں سے رغبت تھی۔ جن کی دیکھ بھال میں وہ کافی وقت صرف کرتا۔

اس کے علاوہ اس کے گھر میں بہت سے بدیسی پرندے اور جانور بھی موجود تھے۔ خاص طور پر ایک سفید مور مرجع خلائق تھا۔

☆.....☆.....☆

جلد ہی ڈاکٹر ویمبر اور سرتھامس کی گاڑھی چھننے لگی۔ دونوں گھنٹوں بیٹھے باتوں میں غرق رہتے دونوں ہی جہاندیدہ تھے۔ اور تجربات و مشاہدات کا ان کے پاس زخیرہ تھا اور پھر ڈاکٹر ویمبر ہپناٹزم میں بھی شدھ بدھ رکھتا تھا۔ وہ جب کبھی چاہتا۔ رگا تھا کو ہپناٹزم کے زیر اثر لے آتا اور معلومات حاصل کر لیتا۔

بہر حال قصہ تھا سپن براؤن کے چشموں کا۔ پرندے غار میں جاتے رہے اور غائب ہوتے رہے۔ پھر بڑے جانوروں کی باری آئی اور آخر کار نوبت انسانوں تک پہنچ گئی۔ نزدیک گاؤں کی ایک لڑکی لویزا جو اپنی دادی کے ساتھ تنہا رہا کرتی تھی۔ جنگل سے لکڑیاں چننے نکلی۔ لوگوں نے اسے چشمے کے قرب و جوار میں دیکھا اور پھر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اسے بھی غار نگل گیا۔

لوگوں میں غار کے متعلق عجیب و غریب داستانیں مشہور ہوگئیں۔ سب کا خیال تھا کہ غار میں کسی شیطانی روح کا بسیرا ہے۔ جو لوگوں کی ہلاکت کے درپے ہے۔

ایک دن میں ڈاکٹر ویمبر اور سرتھامس کی معیت میں بیٹھا تھا۔ سرتھامس تو خاموشی سے ایک موٹا سا بدبودار سگار پینے میں مشغول تھا۔ جبکہ ڈاکٹر ویمبر کیڑوں کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا۔ اس نے ایک ڈبہ کھولا۔ اس میں بڑی بڑی مکڑیاں بند تھیں کہنے لگا۔ "کل چشمہ کے قریب و جوار میں میں نے ایک نئی قسم کی مکڑی پکڑی ہے۔ یہاں کے جنگلوں میں اس کی موجودگی حیرت انگیز ہے۔ کیونکہ یہ قسم صرف امریکہ کے جنگلوں میں پائی جاتی ہے۔ اسے وہاں آدم خور مکڑی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔" سرتھامس اپنی جگہ سے اٹھا اور نزدیک آکر مکڑی کو بغور دیکھنے لگا۔

"میرے خیال میں قدرت کی یہ سب سے کریہہ الصورت مخلوق ہے۔ مجھے تو اس کی شکل دیکھ کر ہی ڈر لگتا ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے ایک جھرجھری لی اور خوف کی وجہ سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ سرتھامس ایک دلیر انسان تھا۔ اور مجھے اسے اس حال میں دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔

"آپ کا نظریہ درست نہیں۔" ڈاکٹر ویمبر کہنے لگا۔ میرے خیال میں قدرت کی ہر تخلیق اپنی جگہ مکمل اور خوبصورت ہے۔ اگر آپ اس مکڑی کو ہی غور سے دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ بھی قدرت کی صناعی کا ایک شاہکار ہے۔"

"بے کار اور بالکل" سرتھامس پر زور لہجے میں بولا۔ "مجھے مکڑیوں سے سخت نفرت ہے۔ اور مجھے ان میں کوئی خوبصورتی نظر نہیں آتی۔"

ڈاکٹر ویمبر نے اپنے شانے جھٹکے گویا وہ بات کو مزید طول نہیں دینا چاہتا تھا۔

سرتھامس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا۔ اور کہنے لگا۔ "چلو چل کر باہر کھلی فضا میں چہل قدمی کریں۔"

"ہاں..... ہاں۔" ڈاکٹر ویمبر خوش دلی سے کہنے لگا۔ "آپ دونوں حضرات بے شک سیر کو نکل جائیں مگر عشائیہ مل کر کھائیں گے۔"

سرتھامس نے گھوڑا گاڑے کی لگامیں تھام لیں۔ میں بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا اور چڑھائی کا رخ کر لیا۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ گھوڑا آہستہ آہستہ سفر کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سرتھامس بولے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہمینز ......! تمہیں بھی شاید مکڑیاں پسند ہیں۔ اس لئے اتنے خاموش ہو۔ مجھے تو اس جانور سے سخت نفرت ہے۔ خدا کا شکر ہے جہاں ہم رہتے ہیں، وہاں یہ ناپید ہے۔"

"یہ جو قسم ڈاکٹر ویمبر ہمیں دکھا رہے تھے۔ اس مکڑی کی سب سے خوفناک قسم ہے۔ یہ فرنچ گنی میں پائی جاتی ہے۔ خدا جانے یہاں سے کیسے اس کے ہاتھ لگ گئی۔ گرم آب و ہوا میں یہ زندہ رہتی ہے۔ اور خوب بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پرندے اس کا من بھاتا کھانا ہیں جوں جوں اس کا جسم بڑھتا ہے یہ بڑے جانوروں کو اپنا شکار بناتی ہے۔ یہ بہت مضبوط جال بنتی ہے۔ اور کوئی بدقسمت جانور اگر شومئی تقدیر سے ایک بار اس میں الجھ جائے تو پھر اس کی رہائی ناممکن ہے۔ سرد ملکوں میں یہ مخلوق نہیں پائی جاتی۔"

میں خاموشی سے سنتا رہا اور سرتھامس اپنی دھن میں بولتا رہا۔ اردگرد کے مناظر بہت ہی دل خوش کن تھے۔ ہمارے دائیں طرف گھنے جنگلات تھے اور بائیں طرف سین برون کا چشمہ یہاں چڑھائی کافی خطرناک تھی۔ جوں جوں ہم اونچائی میں پہنچے۔ چشمہ کا مجمع نزدیک آتا گیا وہاں ہر طرف دھند پھیلی ہوئی تھی اور پانی تقریباً ایک آبشار کی صورت میں نیچے گر رہا تھا۔ بارشوں کی وجہ سے پانی کی خاصی مقدار تیزی سے غار کے منہ سے خارج ہو رہی تھی۔ میں اور سرتھامس گاڑی میں بیٹھے اس منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ چڑھائی کی وجہ سے گھوڑے ہانپ رہے تھے آخر کار ہم ایک ہموار جگہ پہنچ گئے۔ جہاں سے غار صاف دکھائی دیتا تھا۔ گھوڑے یہاں آ کر خود بخود رک گئے۔ کچھ توقف کے بعد سرتھامس بولے۔

"ہمینز! یہاں کتنا سکون ہے۔ میرا دل پانی میں ڈبکی لگانے کو چاہتا ہے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو یقیناً ایسا ہی کرتا۔"

"مگر یہ کام آپ اب بھی کر سکتے ہیں۔ میں اتنی دیر ادھر ادھر جنگلوں میں گھومتا ہوں۔ ایک گھنٹہ بعد میں یہاں واپس آ جاؤں گا۔"

"شکریہ ہمینز! میں چشمہ کے پانی میں نہاتا ہوں، اتنی دیر میں تم ادھر ادھر گھومو۔"

اتنا کہہ کر اس نے گھوڑوں کو ایک درخت سے باندھا۔ میری طرف دیکھ کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور خوش دلی سے بولا۔ "ایک گھنٹہ بعد میں تمہیں پھر ملوں گا۔"

یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔

گھنٹہ بعد میں واپس آیا۔ گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ لیکن سرتھامس کہیں موجود نہ تھا۔ میں کھڑا انتظار کرتا رہا۔ شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی سوائے پانی کی گھن گرج کے۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ سامنے ایک ٹیلے پر چڑھ کر میں نے دائیں بائیں دیکھا اور سرتھامس کو پکارا، مگر کوئی جواب نہ آیا، تو میں گھبرا گیا، رات سر پر تھی۔ اچانک مجھے لویزا کا قصہ یاد آ گیا کہ کس طرح وہ بھی اسی قرب و جوار میں گم ہو گئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے غار کے اندر نگاہ کی۔ اندر اندھیرے میں مجھے دو بڑے بڑے سرخ دھبے دکھائی دیئے، جن کے چاروں طرف بڑی بڑی سیاہ پٹیاں بے تحاشا لہرا رہی تھیں۔ خدا جانے غار میں کیا بلا موجود تھی۔ خوف سے میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ میں مسلسل ان سرخ نقطوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ کوئی نادیدہ قوت مجھے ان کی طرف کھینچ رہی تھی۔ پھر اچانک ایک ٹڈا زور سے ٹرایا۔ اور اسی لمحے میں اس طلسم سے آزاد ہو گیا۔ لمبی لمبی چھلانگیں مارتا گھر کی جانب روانہ ہوا۔ مجھے گردوپیش کا کچھ ہوش نہ تھا۔ ہانپتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور چلایا۔ "دوڑو۔ دوڑو۔ سرتھامس غار میں ہیں۔" اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔

☆......☆......☆

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ویمبر گاؤں بھر کے مردوزن کی معیت میں سرتھامس کی تلاش میں نکلا اس نے جنگل کا کونہ کونہ چھان مارا۔ چشمہ کے پانی کو کھنگالا۔ غار کے اندر داخل ہونا کسی کے بس میں نہ تھا۔ مگر سرتھامس کا کچھ پتہ نہ چلا۔

ہوش آنے پر میں اور رگاتھا گھر میں اکیلے تھے میں ابھی تک دہشت کے مارے کانپ رہا تھا اور میرے منہ سے بے ہنگم الفاظ نکل رہے تھے۔ رگاتھا کبھی کبھار کھڑکی سے باہر جھانکتی کہ کچھ پتہ چلے۔ مگر تلاش بسیار کے بعد تمام ناکام واپس لوٹ آئے۔ سب کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ویمبر بہت پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اچانک ڈاکٹر ویمبر رگاتھا کی طرف مڑا۔ رگاتھا ڈر کے مارے لرزنے لگی۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لئے مجھے اس امتحان میں نہ ڈالو۔"

"مگر تمہیں میرا حکم ماننا ہی پڑے گا۔" ڈاکٹر ویمبر درشتی سے بولا۔

اور پھر ایسے لگا جیسے حبشن پر کسی خوفناک قوت نے غلبہ پا لیا ہو۔ وہ سر سے پاؤں تک تھر تھر کانپی۔ ڈاکٹر ویمبر نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور وہ ایک بے جان لاش کی طرح چلتی ہوئی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ وہاں پر موجود لوگ دیہاتی اور گنوار تھے، انہیں مسمریزم کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ اسے جادو سمجھ کر اپنے سینوں پر صلیب کا نشان بنائے گئے سب بہت خوفزدہ تھے اور یہی حال میرا بھی تھا۔

ڈاکٹر ......رگاتھا کے قریب گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے ہاتھ سے اس کے ماتھے کو چوما۔

"کیا تم اس جگہ ہو۔؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ آقا۔" آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"کیا تم سرتھامس کو دیکھ سکتی ہو۔؟"

یہ سن کر رگاتھا کے جسم میں تھرتھراہٹ چھوٹ گئی۔

"بولو کیا تم اسے دیکھ سکتی ہو۔؟" ڈاکٹر نے اپنا سوال دہرایا۔

"ہاں۔ ہاں۔" وہ بولی۔

"وہ کہاں ہے؟"

"وہ وہاں غار کے فرش پر پڑا ہے اور مر چکا ہے۔"

"کیا کہا۔ مر چکا ہے۔ اس کے ساتھ کون ہے؟"

"اف! میرے خدایا۔ رحم کر۔ یہاں ایک دیوزاد مکڑی بھی ہے۔ اس نے اسے گلے سے پکڑا ہوا ہے۔ اور اس کے چاروں طرف جالا بننے میں مصروف ہے۔"

یہ سن کر ڈاکٹر اپنے اردگرد نگاہ کی اور ہولے ہولے بڑبڑایا۔

"خدایا کس قدر بھیانک ہے۔" پھر رگاتھا کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"کیا مکڑی بہت بڑی ہے؟"

"ہاں آقا! اتنی بڑی مکڑی میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔ یہاں تک کہ میرے اپنے ملک میں اتنی بڑی مکڑیاں موجود نہیں۔ یہ حجم میں میرے سر کے برابر ہے۔"

اس کے بعد کافی دیر خاموش رہی۔ سب پریشان اور غمزدہ تھے۔

پھر ڈاکٹر کہنے لگا۔ "رگاتھا! کیا تم مجھے بتلا سکتی ہو کہ سرتھامس کس طرح موت سے دوچار ہوا۔؟"

"ہاں ......" رگاتھا بولی۔ "وہ پانی میں نہا رہا تھا۔ مکڑی نے اس کے ننگے جسم کو دیکھا تو بجلی کی سی تیزی سے سرتھامس پر جھپٹی اور اس کی گردن کو اپنے جبڑوں میں جکڑ لیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر چلایا "میرے خدا" اور اس کے بعد مکڑی اسے لے کر اپنے غار میں گھس گئی۔ حملہ کے بعد جب سرتھامس پانی میں گرا۔ تو اس وقت اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ اس کے بعد مکڑی نے اس کے گرد جال بننا شروع کر دیا۔ اس وقت سرتھامس کی رنگت سیاہ پڑ چکی ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہنیز! اب تم بتلاؤ کیا ہوا تھا۔؟" اور میں نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ سن کر ڈاکٹر پرجوش آواز میں بولا۔ ”میں سمجھ گیا۔ یہ سب کچھ اس جناتی مخلوق کا کیا دھرا ہے۔ یہی ہم سب کی بربادی کی موجب ہے۔ یہ ڈھانچے۔ لاشیں اور پراسرار گمشدگیاں۔ سب مکڑیاں اسی سے ملتی ہیں۔ نہ جانے آج تک کتنے بدنصیب اس کا شکار بن چکے ہیں۔“

پھر وہ درشتی سے چلایا۔ ”دوستو اور ساتھیوں لکڑیاں جمع کرو۔“

اتنا کہہ کر گھر سے نکل گیا۔ لوگ بھی پریشانی کے عالم میں اس کے پیچھے نکل کھڑے ہوئے کچھ دیر بعد لکڑیوں سے بھرے ہوئے دو گڈے چڑھائی پر چڑھتے نظر آئے۔ ان کے پیچھے لوگوں کا ہجوم تھا۔ رات کی تاریکی میں یہ سب کارروائی بہت لرزہ خیز تھی۔ اس پر چاند کی ہلکی ہلکی سوگوار روشن اس جلوس کو کچھ اور ہی پراسرار بنا رہی تھی۔ غار کے نزدیک پہنچ کر لوگ رک گئے۔ چند ایک کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی شمعیں تھیں۔

ڈاکٹر کہنے لگا۔ ”لکڑیاں آپ لوگ یہاں رکھ دیں۔ اور اس کے بعد ہمیں اس غار کے دھانے کو مکمل طور پر ایندھن سے ڈھکنا ہوگا۔“

سب خوفزدہ دکھائی دیتے تھے۔ ڈاکٹر کے احکام کے موجب چند منچلے آگے بڑھے اور درختوں کے بڑے بڑے تنے غار کے منہ میں ٹکا دیئے۔ تاکہ پانی بہا نہ سکے۔ اس کے اوپر چھوٹی چھوٹی شاخیں جما دیں۔ دھانہ آہستہ آہستہ مکمل طور پر لکڑیوں سے بند ہوگیا۔ رات کے اس وقت بارہ بج گئے تھے۔

ہر آدمی تھکا تھکا اور مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ پانی اب بھی لکڑیوں میں درازوں سے راستہ بناتا ہوا نیچے گر رہا تھا۔ نیچے کی لکڑیوں کی تہہ گیلی ہو چکی تھی۔ مگر اوپر والی لکڑیاں ابھی تک خشک تھیں پھر ڈاکٹر ویمبر نے اپنے ہاتھوں اس ڈھیر کو آگ لگا دی۔ پہلے چھوٹی چھوٹی شاخوں نے آگ پکڑی پھر آگ پھیلتی گئی اور آخر سارے کا سارا ڈھیر دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ رات کو آگ کے یہ لپکتے شعلے عجیب دلدوز منظر پیش کر رہے تھے۔ غار سے اب گہرے سیاہ دھوئیں کا بادل اٹھ رہا تھا چاروں طرف لوگ خاموشی سے کھڑے تھے۔ ان کی نظریں غار کے منہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس طرح ایک گھنٹہ گذر گیا۔ ڈاکٹر بے چین ہو رہا تھا۔ پھر اچانک غار کے اندر ہلچل مچی اور ایک بڑا سا سیاہ سایہ غار کے فرش پر نمودار ہوا۔ جو غار کے منہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مگر آگ کی تپش سے گھبرا کر وہیں غار میں گھس گیا۔ اس نے کئی دفعہ باہر نکلنے کوشش کی۔ مگر آگ کی اس دیوار کے آگے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔

اس کی بل دار لمبی لمبی ٹانگوں کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس بلا کا جسم انسانی سر جتنا تھا اور رنگ سرخ و سیاہ تھا۔ ایک لکڑہارے نے اس ڈر سے کہ کہیں یہ آگ کو پھلانگ کر باہر نہ آجائے، تاک کر کلہاڑی اس کی طرف پھینکی، نشانہ خوب لگا۔ کلہاڑی کی ضرب سے کٹ کر اس کا جسم دو ٹکڑے ہوگیا اور اس میں سے گہرے سرخ رنگ کا سیال فوارے کی طرح نکل پڑا غالباً یہ سرتھامس کا خون تھا۔

آگ جلتی رہی اور بالآخر یہ آدم خور بلا آگ میں جل کر بھسم ہوگئی۔ سپن برون کے چشمے کی ویرانی کا سبب یہی بلا تھی۔ لوگوں نے اپنی نظروں کے سامنے اس کی ہلاکت کا منظر دیکھا۔ مگر کچھ اس طرح کی دہشت ان پر طاری تھی کہ وہ چشمے کے نزدیک بھی نہ بھٹکے۔ یہ مکڑی کسی وجہ سے یہاں منتقل ہوگئی تھی اور غار کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ گرم مرطوب آب و ہوا نے اس کی نشو ونما پر خوب اثر ڈالا۔ اور اس کا حجم بڑھتا چلا گیا۔ ساتھ ہی اس کی درندگی اور بھوک میں اضافہ ہوتا گیا۔

وہ مکڑی جو ڈاکٹر ویمبر نے جنگل سے پکڑی۔ شاید اس مکڑی کی اولاد تھی۔ بہرحال ڈاکٹر ویمبر پھر بھی سرتھامس کی موت کا گہرا اثر ہوا۔ اس نے اپنا مال و اسباب سمیٹا رگاتھا کو ساتھ لیا اور کسی نامعلوم سمت روانہ ہوگیا۔

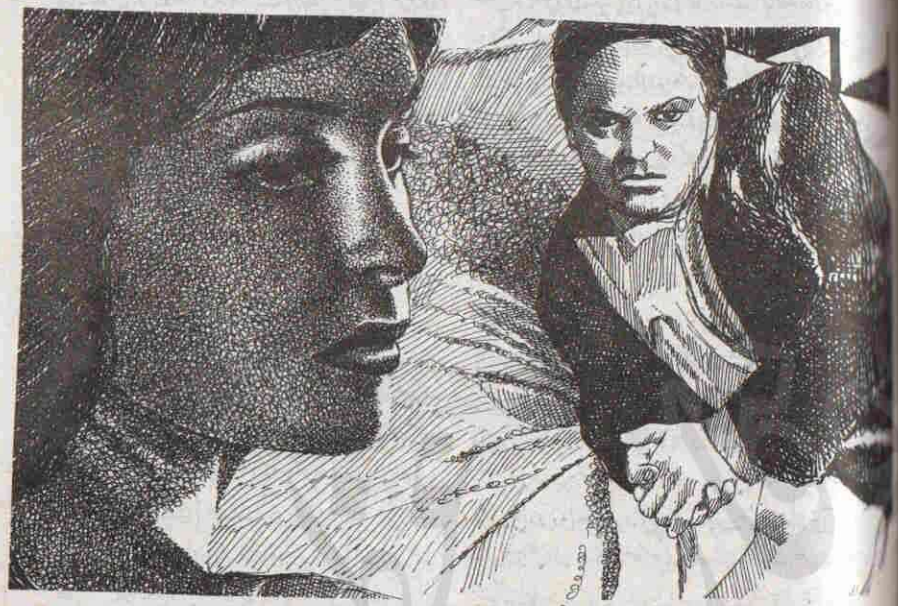

روحانی لگاؤ

راوی: عزیز الرحمٰن

تحریر: ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اور پھر اچانک ایسا خوفناک حادثہ وقوع پذیر ہوا کہ اس کہانی کے تمام ہنستے کھیلتے کردار یکدم غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئے..... ایک سچا، حیرتناک اور ذہن کو خوف کے شکنجے میں جکڑتا ہوا حقیقی روداد۔

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ایک دلگداز دلفریب اور حیرت انگیز سبق آموز کہانی

کتابی چہرہ کھلتی ہوئی گندمی رنگت اور ذہانت سے بھرپور، سیاہ آنکھوں والا تجمل میرا ہم جماعت تھا۔ ہم مسلسل چھ سال سے ہم جماعت چلے آرہے تھے۔ قائداعظم ہائی اسکول کی چہار دیواری میں یہ ہمارا آخری سال تھا۔ نویں درجہ تک ہماری ملاقات صرف سلام دعا کر لینے اور حال احوال پوچھنے تک محدود تھی۔ اور ان سرسری تعلقات کے پس پردہ موہوم سا جذبۂ رقابت بہت زیادہ تھا۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ تجمل نہ صرف ذہین بلکہ میری نسبت محنتی بھی بہت زیادہ تھا۔ لیکن نہ معلوم کس طرح ہر امتحان میں، میں اس سے دو چار نمبر زیادہ ہی لے جاتا، اور اس طرح کلاس مانیٹر ہونے کا شرف مجھے ہی حاصل ہوتا رہا۔ اب دسویں جماعت کے سہ ماہی امتحانات ہونے کو تھے۔ تجمل ان تھک محنت کر رہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ کلاس روم اور کلاس روم سے باہر کاریڈور، لائبریری لان حتیٰ کہ پلے گراؤنڈ میں بھی وہ کتابوں کا کیڑا بنا ہوا نظر آتا۔ میں جب بھی اس کے سامنے سے گزرتا کسی نہ کسی طرح اس کا مذاق اڑانے کی کوشش ضرور کرتا۔ ایک آدھ طنزیہ جملہ بھی ضرور کہتا، اور پھر اس کو دکھانے اور چڑانے کے لئے کھیل کود میں مصروف ہو جاتا۔

گویا ان حرکتوں سے میں اس پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا کہ جو چاہے کرو، برتری تو میری ہی رہے گی۔ تجمل میرے ہر طنز کو بڑی متانت اور خاموشی کے ساتھ برداشت کر جاتا۔ گویا میری ان باتوں کا اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ امتحانات ہوئے اور نتیجہ بر آمد ہوا۔ تجمل نے میری نسبت اتنی نمایاں کامیابی حاصل کی تھی جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ احساس شکست اور شرمندگی کی وجہ سے جو میری حالت ہو سکتی تھی اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔

اور جب تجمل کو میری جگہ مانیٹر بنا کر کھڑا کیا گیا تو میں نے تحریری طور پر احتجاج کیا کہ تجمل کی ایک دفعہ کی اتفاقیہ کامیابی پر مجھ سے یہ اعزاز چھینا جانا زیادتی ہے۔ اور یہ کہ میرے سابقہ ریکارڈ کی بناء پر مجھے ہی کلاس کا مانیٹر رہنے دیا جائے۔ لیکن میری اس درخواست کو رد کر دیا گیا۔ مانیٹر مقرر ہونے کے دسرے روز جب حاضری لیتے وقت اس نے میرا رول نمبر پکارا تو میں نے صرف YES کہنے پر اکتفا کیا۔ اس پر اس نے ایک لمحہ کے لئے مجھے گھور کر میری طرف دیکھا اور پھر سے حاضری لینے میں مصروف ہو گیا۔ آخری نمبر پکارنے کے بعد رجسٹر بند کرتے ہوئے اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"مسٹر عزیز! آئندہ YES کے ساتھ SIR کہنا ہرگز نہ بھولئے گا۔"

میری قوت برداشت ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ احتجاج کے طور پر پیر پٹختا ہوا کلاس روم سے واک آؤٹ کر گیا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے مانیٹر بک میں میرا نام بلیک لسٹ میں لکھ دیا تھا۔ اور پھر دوسرے روز کلاس شروع ہوتے ہی ساری کلاس کے سامنے مجھے شدید سزا دی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اس قدر شدید سزا ملی۔ باون لڑکوں کی کلاس میں ماسٹر امان اللہ کے بید کی شڑاپ شڑاپ کے علاوہ دیگر کوئی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ سزا خفت اور ندامت کی وجہ سے میں رو پڑا۔ اور ڈیسک پر دونوں ہاتھوں کے درمیان سر ڈالے میں سسک رہا تھا۔ رونے کی وجہ سے میری ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ آج کلاس میں پڑھائی بھی نہیں ہوئی۔

مجھے سزا دینے کے بعد امان اللہ سر بھی تمام وقت اپنی کرسی پر خاموش بیٹھے رہے۔ پوری کلاس پر خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ صرف میری ہچکیوں کی آواز سنی جا سکتی تھی۔ حتیٰ کہ پیریڈ ختم ہو گیا۔ لڑکے اپنی اپنی کتابیں سنبھال کر چلے گئے۔ کلاس خالی ہو چکی تھی لیکن میں بدستور ڈیسک پر سر رکھے ہچکیاں لے رہا تھا۔ مجھے اپنے بالوں میں کسی کی انگلیوں کی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا وہ تجمل تھا۔ نفرت سے میں نے منہ پھیر لیا۔

"اب خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ میں تم سے شرمندہ ہوں.....!" یہ تجمل کی آواز تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے اپنا بھائی سمجھ کر معاف کر دو۔" وہ دوبارہ بولا۔ میں اس دفعہ بھی خاموش ہی رہا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنا FEEL کرو گے تو کبھی بھی ایسی کامیابی حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتا۔"

میں نے محسوس کیا اس کے لہجہ میں اپنائیت اور ہمدردی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس نے اپنے انگوٹھوں کے پوروں سے میرے آنسو صاف کر دیئے۔ مجھے شانوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور گلے سے لگا لیا۔

"آج سے ہم نہ صرف دوست ہیں بلکہ بھائی بھی ہیں۔" آواز یقیناً اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی۔ اور یہاں سے یوں ہماری بے مثال دوستی کا آغاز ہوا۔

تجمل اب بھی بدستور مانیٹر تھا۔ لیکن بس برائے نام! وہ بھری کلاس میں بار بار میری برتری کو تسلیم کرتا۔

اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ میرے تعاون ہی کی وجہ سے مانیٹری کرنے کا اہل ہے۔ ورنہ وہ شاید اس قابل نہیں۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ ماہ بعد ہی اس نے امان اللہ سر کی خدمت میں درخواست پیش کر دی کہ وہ چونکہ اپنی نسبت مجھے زیادہ اہل سمجھتا ہے اس لئے اس کے بجائے مجھے مانیٹر بنا دیا جائے۔

اسٹاف روم میں ہماری طلبی ہوئی جہاں تجمل کی درخواست کا متن پڑھ کر سنایا گیا۔ "نہیں سر ایسی کوئی بات نہیں یہ صرف مجھ سے دوستی کا حق نبھانا چاہتا ہے۔ ورنہ مانیٹر ہونے کا حق صرف اسی کا ہے۔" میرا جواب تھا۔

امان اللہ سر اور مشتاق حسین (ہیڈ ماسٹر) دونوں ہی ہنس پڑے اور تجمل کو بدستور مانیٹر رہنا پڑا۔ اب ہم دونوں کا بیشتر وقت ایک ساتھ گزرتا کلاس روم اور کلاس روم سے باہر ہم اکٹھے ہی دیکھے جاتے۔ اسکول میں ہمیں لازم و ملزوم کی سی حیثیت حاصل تھی۔ اسکول ٹائم ختم ہونے کے بعد میں اس کو اس کے گھر تک الوداع کہنے جاتا۔ اور اس کے بعد اپنے گھر واپس آتا۔ (حالانکہ اس طرح مجھے ایک میل کا چکر کاٹنا پڑتا) جونیئر کلاس کے اکثر لڑکے ہمیں آپس میں رشتہ دار اور بعض سگا بھائی تک سمجھنے لگے تھے۔ غرض یہ ہے کہ ہر آنے والا دن ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر کرتا جا رہا تھا اور یہیں سے ان واقعات نے جنم لینا شروع کیا جنہیں میں آپ کے سامنے پیش کرنے کے لئے بے چین ہوں۔

ایک روز جب میں تجمل کو چھوڑنے اس کے گھر کی طرف جا رہا تھا تو تجمل نے یکبارگی مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ اس دفعہ امتحان میں اتنی نمایاں کامیابی میں نے کس طرح حاصل کی؟"

"اس میں معلوم کرنے کی کیا بات ہے۔؟ ظاہر ہے محنت کر کے!" میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"لیکن یہ بھی پتہ ہے کہ میں نے پڑھا کس سے؟"

"کس سے؟" میں نے سرسری طور سے پوچھا۔

"غلام عباس سے!" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کون غلام عباس؟" میں نے استفسار کیا۔

"غلام عباس کو نہیں جانتے۔ بھئی اپنا کلاس فیلو!"

"تو کیا غلام عباس اتنا قابل ہے؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا!" تجمل نے بھرپور لہجہ میں جواب دیا۔

"لیکن اس کے اپنے نمبر تو کبھی سیکنڈ ڈویژن سے بھی زیادہ نہیں آئے۔" میں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں کہ وہ سات سوالوں میں سے صرف چار حل کر کے پرچہ دے آتا ہے۔" اس نے کہا کہ یہ چار سوال بھی میں اس لئے حل کرتا ہوں کہ کہیں میرے والدین مجھ سے بالکل ہی مایوس نہ ہو جائیں۔" ورنہ اس کا مقصد تعلیم حاصل کرنا ہے ہی نہیں۔"

"لیکن آخر یہ سب کچھ کیوں؟" میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"وہ کہتا ہے کہ پڑھائی، نوکری یا کاروبار قسم کی کسی چیز سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور نہ آئندہ ہوگا۔ بلکہ کوئی خاص کام اس کی ذات سے انجام پذیر ہوگا۔ اور وہ غیر فانی قوتوں کا مالک کہلائیگا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"بس بس! زیادہ نہ پھینکو صرف اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے یہ من گھڑت بات اس نے سنا دی ہے ورنہ قابلیت اس میں خاک بھی نہیں!" میری حسد عود کر آئی تھی۔

تجمل بھی ہنس کر خاموش ہو گیا اور بات آئی گئی ہو گی۔

یہاں میں غلام عباس کے کچھ حالات بتاتا چلوں، تو آپ کو آئندہ کے واقعات کے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ غلام عباس غریب والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ کھسے (پنجابی جوتیاں) بنا کر اپنے اخراجات پورے کرتا تھا۔ اور اس کے قریبی رشتہ داروں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کوئی فرد ایسا نہیں دکھائی دیتا تھا جو ان کی مالی اعانت کرتا ہو۔ غرض یہ کہ غلام عباس کے گھر کو ایک انتہائی غریب گھرانہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اسکول میں ہم نے غلام عباس کو کسی کے ساتھ زیادہ بات چیت کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اکثر اکیلا رہتا۔ اور کچھ نہ کچھ سوچتا ہوا پایا جاتا۔ اسکول کے اکثر لڑکے اسے فلاسفر کہہ کر چھیڑتے تھے۔ لیکن غلام عباس کی گفتگو میں جتنی شائستگی، تہذیب، بردباری اور عمدہ الفاظ کا ذخیرہ ہوتا وہ اسکول کے کسی لڑکے میں نہ تھا۔ اس کو ہم نے کبھی اسکول کی کسی ACTIVITY یا کھیل میں حصہ نہیں لیتے دیکھا۔ وہ شاید مہینہ میں ایک بار سر کے بالوں میں تیل لگاتا اور ہمیشہ سفید شلوار اور سفید قمیض میں ملبوس نظر آتا تھا۔ میرے خیال میں دو ہزار لڑکوں کے اجتماع میں بھی وہ منفرد حیثیت کا حامل تھا اور اس کی وجہ اس کا وہ لاابالی پن تھا جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔

کہنے کو بات آئی گئی ہوگئی تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تجمل کی بات میرے ذہن میں جم کر رہ گئی تھی اور اب میں خود بھی غلام عباس سے مل کر یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ تجمل کی بات میں کس قدر صداقت ہے۔ اور پھر اسی دن شام کے کوئی ساڑھے پانچ کا عمل ہوگا۔ جب میں غلام عباس کے گھر دستک دے رہا تھا۔

"حاضر ہو رہا ہوں!" اندر سے اس کی آواز آئی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کی گفتگو تہذیب اور شائستگی سے پر ہوتی تھی۔ باہر آ کر مجھے پہچاننے میں اس نے دیر نہیں کی۔

"اوہو! آپ! اندر تشریف لائیے! آج آپ نے کیسے زحمت فرمائی۔" وہ انتہائی انکساری سے بولا۔

کمرے میں ایک چارپائی ایک کرسی اور ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ ایک طرف کونے میں کچھ چمڑا اور جوتیاں بنانے کا سامان پڑا تھا۔ مجھے بیٹھا کر، وہ گھر میں چائے لینے کے لئے چلا گیا اور چند ہی لمحوں میں واپس آ گیا۔

"اب فرمائیے کیسے قدم رنجہ فرمایا آپ نے؟" اس نے کہا۔

میں نے کہا۔ "دیکھئے ایک تو آپ میرے آنے کو اتنی اہمیت نہ دیجئے کہ میں دوسری دفعہ آنے میں ہچکچاہٹ محسوس کروں۔ اور دوسری بات یہ کہ ہم آپ میں کلاس فیلو ہیں اور اس رشتہ سے ہمیں آپس میں بے تکلفی سے گفتگو کرنا چاہیے کیا خیال ہے آپ کا؟" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو عزیز میاں!" وہ ایک دم بے تکلفی پر اتر آیا۔

"اور میں بھی تم سے بے تکلف ہونے میں کوئی امر مانع نہیں سمجھتا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ تم تجمل کے دوست ہو اور میں اس گلی کی مٹی سے بھی پیار کرتا ہوں جس پر سے تجمل گزرتا ہے!" اس نے کہا۔

"لیکن اسکول میں تو میں نے کبھی تمہیں تجمل سے بات بھی کرتے نہیں دیکھا۔" میں بھی بے تکلفی پر اتر آیا۔

"یقیناً نہیں دیکھا ہوگا۔ اسکول تو کیا اسکول سے باہر بھی میں نے اس سے بالمشافہ بات نہیں کی۔ لیکن تم میری بات کا یقین کر لو کہ میں جو بات بھی تجمل سے کرنا چاہتا ہوں یہیں بیٹھ کر کر لیتا ہوں۔ اور اسے یہی محسوس ہوگا کہ گویا اس نے مجھ سے اور میں نے اس سے بالمشافہ بات چیت کی ہے۔ میرا اور تجمل کا یہ رشتہ جسمانی نہیں روحانی ہے۔ اور اس رشتہ کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ میں تمہیں یہ باتیں بلا جھجک اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم بھی اس راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ اور تم کیا خود تجمل بھی مجھے اس سے نہیں روک سکتا!" اس کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔

میں نے غلام عباس کا موڈ بدلتے دیکھ کر بات بدلنے کی کوشش کی۔

"غلام عباس میں تمہیں کریدنے یا ذہنی کرب میں مبتلا کرنے نہیں آیا بلکہ میں تو یہ پوچھنے آیا تھا کہ تم نے تجمل کو امتحان کے لئے تیاری کروائی تھی۔ ہو سکے تو تھوڑا سا وقت میرے لئے بھی نکال لیا کرو۔"

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"تم شاید بات بدلنے کی کوشش کر رہے ہو۔ سنو عزیز الرحمٰن! میں نے تجمل کو کبھی بھی نہیں پڑھایا بلکہ جو کچھ بھی سمجھانی چاہی یہیں سے بیٹھ کر سمجھا دی۔ اور تجمل سمجھتا رہے گا کہ میں اس کو باقاعدہ پڑھاتا رہا ہوں۔ تمہیں میری باتوں پر یقین ہرگز نہیں آ رہا ہوگا۔" اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوچ رہا ہوں کہ تمہاری باتوں پر یقین کروں یا نہ کروں!" میں نے جواب دیا۔

وہ بغیر کچھ کہے اندر گیا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے دانی اور دو پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے چائے دانی سے چائے انڈیلی۔ ایک پیالی مجھے دی اور دوسری خود تھام لی۔

"ہوں! تو تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا!" مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

"تمہاری گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے؟"

"سوا چھ!" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"دیکھو اب میں تجمل کے گھر جا رہا ہوں۔" وہ چائے کی پیالی ٹرے میں رکھتا ہوا بولا۔

"کب؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی اور اسی وقت جب کہ تم بھی یہیں رہو گے اور میں بھی یہیں رہوں گا۔ اور کل تجمل میری اس ملاقات کی تصدیق کر دے گا۔ پھر تو تمہیں یقین آ جائے گا!"

میں نے جواب میں صرف سر ہلا دیا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کیں جیسے مراقبے میں چلا گیا ہو۔ تقریباً آدھے منٹ بعد اس کی آواز دور سے آتی سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تجمل! باہر آؤ۔ غلام عباس آیا ہے۔ میں صرف یہ کہنے آیا تھا کہ آج عزیز الرحمٰن میرے پاس آیا تھا۔ دوستی کا ہاتھ بڑھانے، صرف اس لئے کہ وہ مجھ میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ اسے میری ذات مشکوک معلوم ہونے لگی ہے۔ بس اب میں چلتا ہوں اجازت دو۔" اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"اب کل تمہیں میری صداقت کا ثبوت مل جائے گا!" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ مجھے اس کی آنکھوں سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔

"گھر کی چائے میں مزہ نہیں آیا۔ چلو کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

میں بلا پس و پیش اس کے ساتھ ہو لیا۔ راستہ بھر میری اس سے بات نہ ہوئی۔ ہوٹل میں بیٹھ کر اس نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی اور ہم خاموشی سے چائے پینے لگے۔ اب تک ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی بات نہ کی تھی۔ مسلسل خاموشی سے اکتا کر میں نے اس سے اجازت چاہی۔

"کیا ٹائم ہوا ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"آٹھ بج کر بیس منٹ!" میں نے جواب دیا۔

"تم اس بات کے گواہ رہو کہ ساڑھے پانچ سے لے کر 8 بجکر 20 منٹ تک میں تمہارے ساتھ تھا۔"

جواب میں، میں نے گردن ہلا دی۔ اور اس سے رخصت ہو گیا۔ اس تمام رات میرا دماغ الجھنوں میں گرفتار رہا۔ تمام وقت غلام عباس میرے دماغ میں گھومتا رہا۔

دوسرے روز صبح اسکول کے گیٹ پر ہی حسب معمول میری تجمل سے ملاقات ہوئی۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے سوال کیا۔

"کل غلام عباس کے پاس کیا کرنے گئے تھے؟"

"تمہیں کس نے بتایا؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"خود غلام عباس نے اور کس نے!" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کب؟" میری پیشانی پسینے سے تر ہو چکی تھی۔

"بھئی کل کوئی چھ ساڑھے چھ بجے وہ خود میرے گھر آیا تھا۔ کہنے لگا" آج عزیز الرحمٰن میرے پاس آیا تھا دوستی کا ہاتھ بڑھانے!"

میں گویا گرنے والا ہو گیا تھا۔ میرا رنگ زرد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگیا تھا اور جسم پسینے میں بھیگ چکا تھا۔

تجمل میری حالت کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ شاید شرمندگی کی وجہ سے میری ایسی حالت ہورہی ہے۔ جھٹ سے بولا۔ ''بھئی اس میں کوئی برائی تھوڑی ہے۔ غلام عباس آخر ہمارا کلاس فیلو ہے۔ اگر تم اس سے ملنے چلے گئے تو کیا ہوگیا۔''

طوہاً و کرہاً میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ غلام عباس کی بات کی تصدیق ہوچکی تھی۔ اور اب مجھے مکمل یقین ہوگیا تھا کہ غلام عباس کے قبضہ میں کوئی پراسرار غیر مرئی قوت موجود ہے۔

بہرحال بات آئی گئی ہوگئی۔ اور میں غلام عباس اور تجمل دونوں سے کھچا کھچا رہنے لگا تھا۔ لیکن تجمل بدستور مجھ سے اسی طرح ملتا اور ہمیشہ محبت اور خلوص اس کی باتوں سے چھلکتا نظر آتا۔ دبے لفظوں میں اس نے کئی بار مجھ سے شکایت بھی کی کہ میرا رویہ اس کے ساتھ اب پہلے جیسا نہیں ہے۔ بہرحال وقت گزرتا رہا۔ حتیٰ کہ ہمارے ششماہی امتحانات سر پر آن پہنچے اور ہم ایک دفعہ پھر اپنی کتابوں میں گم ہوگئے۔

غلام عباس اب اسکول میں بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ وہ کلاس سے کئی کئی روز غائب رہتا اور پھر کسی دن اچانک ہی کلاس میں آدھمکتا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ غلام عباس اب پہلے کی نسبت کچھ کھویا کھویا سا رہتا اس کے بال اب زیادہ الجھے رہنے لگے تھے اور آنکھیں انگارے کی طرح سرخ رہنے لگی تھیں۔ میں اس سے دوبارہ تعلقات بڑھانے کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میرے دل میں اس کا خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ لیکن ایک روز جب کہ میں پلے گراؤنڈ میں پوئٹری کی کتاب کھولے بیٹھا تھا کہ اچانک ہی کسی طرف سے وہ آن دھمکا۔

''سناؤ عزیز میاں! کیا ہورہا ہے؟'' وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں بس ایسے ہی بیٹھا تھا۔''

جان چھڑانے کے لئے مختصر سا جواب دیا۔ وہ بے تکلفی سے میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''تم اس دن کے بعد پھر ملے ہی نہیں!'' اس نے پوچھا۔

''بس کچھ فرصت ہی نہیں مل سکی۔'' میں نے دوبارہ مختصر سا جواب دیا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ''نہ معلوم لوگ مجھے اتنا برا کیوں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ میں نے کبھی کسی کے متعلق برا نہیں سوچا۔''

''تمہیں برا تو کوئی نہیں سمجھتا۔ البتہ پراسرار ضرور سمجھتے ہیں!'' میں نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسا۔

''جب مجھے کوئی سمجھنے کی ہی کوشش نہیں کرتا تو یہ نتیجہ اخذ کرلینا کہ میں پراسرار ہوں، کہاں کا انصاف ہے؟'' اس کا لہجہ درد سے بھرپور تھا۔

''لیکن اس دن جو تم غائبانہ ہی تجمل سے ملاقات کرآئے تو وہ کیا کوئی کم پراسرار بات ہے؟'' میں نے اسے ٹٹولنے کے انداز میں پوچھا۔

وہ زیرلب مسکرایا اور بولا۔ ''یہ کوئی اسرار نہیں اس لئے کہ میں تجمل سے والہانہ لگاؤ رکھتا ہوں۔ اور اگر تم اس لگاؤ کو عشق کا نام بھی دے دو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مجھے بعض اوقات خود اپنی حرکات وسکنات پر شبہ گزرتا ہے کہ کہیں میں پاگل تو نہیں ہوگیا ہوں۔ مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ میرا جسم ہوا میں تحلیل ہوگیا ہے اور میری روح تجمل کے سر میں داخل ہوگئی ہے۔ اور میں بذات خود کچھ بھی نہیں!''

''اور تمہاری یہ حالت کب سے ہے؟'' اب میں اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

''تقریباً ایک سال سے!'' وہ جیسے خواب میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''میں مسلسل کئی دن اور کئی کئی راتیں جاگ کر گزار دیتا ہوں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے عزیز! میری ہر سوچ کا دائرہ تجمل کے گرد گھومتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے؟ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ دیوانگی ضرور کوئی رنگ لاکر رہے گی۔''

''اگر تجمل لڑکی ہوتا تو تمہاری اس سے شادی ہوجاتی!'' میں اب شرارت کے موڈ میں آچکا تھا۔

اس نے کڑی نظروں سے گھور کر مجھے دیکھا۔

''تمہاری غور وفکر کی حد ہی اتنی ہے اور شاید تم اس سے آگے سوچ بھی نہیں سکتے۔'' اس کا موڈ بالکل آف ہوچکا تھا۔ وہ یکدم اٹھا اور تیز تیز قدموں سے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

مجھے افسوس ہورہا تھا کہ میری بات سے ناحق اس کے جذبات مجروح ہوئے تھے۔ مجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اور اسی لئے میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب میں غلام عباس سے دوبارہ ملوں گا اور اس سے اپنی اس زیادتی کی معافی مانگ لوں گا۔ مجھے غلام عباس پر اب کچھ ترس سا آنے لگا تھا اور میں سوچنے لگا تھا کہ غلام عباس کے پاس اگر غیر مرئی طاقتیں موجود بھی ہیں تب بھی یہ شخص ان سے بجائے کوئی ناجائز کام لینے یا کسی کو تنگ کرکے صرف تجمل ہی کے بارے میں غور وفکر کرتا رہتا ہے۔

چنانچہ اسی شام میں غلام عباس کے گھر پہنچ گیا۔

''میں تم سے شرمندہ ہوں غلام عباس! صبح مجھ سے واقعی بڑی زیادتی ہوئی!'' میں نے اسے دیکھتے ہی دل کی بات کہہ ڈالی۔

''کوئی بات نہیں! کوئی بات نہیں!'' وہ اس طرح پرسکون تھا جیسے سمندر طغیانی آنے کے بعد پرسکون ہوجاتا ہے..... ''میں تمہاری بات کا برا مان ہی نہیں سکتا عزیز!'' وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوا بولا۔ ''کیوں کہ تم تجمل کے دوست ہو اور مجھے تمہارے ملنے سے دلی راحت ہوتی ہے۔ بولو کیا پیو گے؟''

''کچھ نہیں!'' میں نے جواب دیا! ''میں جلدی جاؤنگا کیوں کہ تمہیں معلوم ہے، پرسوں سے امتحان شروع ہورہے ہیں۔''

''تو خوب تیاری ہے نا!'' اس نے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں۔ بس گزارہ ہی سمجھو، ظاہر ہے کہ LEAD تو تجمل ہی کرے گا!'' میں نے اسے

بہادر، بزدل

☆ 1940ء میں چین میں چینی کا بحران آیا تو چینی قوم نے مل کر بائیکاٹ کیا۔

☆ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی میں دودھ کا بحران آیا تو ان لوگوں نے دودھ پینا چھوڑ دیا۔

☆ اسرائیل کی حمایت کرنے پر عرب دنیا نے امریکہ کا تیل بند کردیا تو 60 فیصد امریکیوں نے پیدل چلنا شروع کردیا۔ چنانچہ شدید نقصان اٹھانا پڑا اور انہیں تیل دینا پڑا۔

☆ یوکے میں انڈوں اور سوڈان میں چاول کا بحران آیا تو وہاں کی عوام نے ان کا بائیکاٹ کیا اور ضرورت ہونے پر بھی دوسرے ملکوں سے نہیں لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ سارے بحران ختم ہوگئے۔

☆ اور ایک ہم ہیں کہ پیٹرول 95 روپے منظور ہے، چینی 70 روپے وہ بھی منظور ہے۔ چاول 120 روپے منظور ہے دیگر اشیا بھی حکومت کے اضافی ٹیکس کے ساتھ قبول ہیں۔ شاعر مشرق نے بجا فرمایا ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھیڑنے کی کوشش کی۔ وہ کچھ بولا نہیں۔ میں نے دوبارہ بات چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ مبادا کہ پھر بات بگڑ جائے۔

"کیا سوچنے لگے غلام عباس؟" میں نے اس کی خاموشی سے اکتا کر کہا۔ اس کی یہ خاص عادت تھی کہ وہ بات کرتے کرتے ایک دم غائب ہو جاتا تھا۔

"کچھ نہیں!" وہ جیسے چونک سا گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سلسلہ گفتگو کیسے جاری رکھا جائے۔ غلام عباس پھر گم ہو چکا تھا۔ "سوائے تجمل کے ذکر کے یہ کسی اور بات میں دلچسپی نہیں لے گا۔" میں نے سوچا۔

"کیا تجمل سے ملنے چل دیئے غلام عباس؟" میں نے ہمت کر کے اسے چھیڑا۔ اس نے آہستہ سے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں اور بولا۔ "نہیں اب میں اس سے ملنے نہیں جاتا۔"

"کیوں؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"اس لئے کہ اس سے میری تسلی نہیں ہوتی بلکہ آگ کچھ اور بھڑک جاتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"بہر حال جب تم مجھے اس طرح چھیڑتے ہو عزیز! تو میں ایک عجیب سا لطف محسوس کرتا ہوں۔ تم یقین کرو میں تمہیں اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک یاد رکھوں گا، تمہاری باتیں میرے زخموں کے لئے مرہم کی حیثیت رکھتی ہیں۔"

"اچھا تو پھر اسی خوشی میں مجھے اجازت دو۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "کچھ پڑھائی وغیرہ بھی کرنی ہے۔" وہ باہر گلی تک مجھے چھوڑنے آیا۔

"اچھا تو پھر خدا حافظ!" اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں خوش تھا کہ میری باتوں سے اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ اور صبح کی بات سے پیدا شدہ تلخی ختم ہو گئی تھی۔

ہمارے ششماہی امتحان شروع ہو چکے تھے۔ اور غلام عباس امتحان میں شریک نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آج کل مسلسل اسکول سے غائب تھا اور اس کی غیر موجودگی کو میں محسوس کر رہا تھا۔ میں نے تجمل کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

"غلام عباس کیوں امتحان نہیں دینے آ رہا!" میں نے ایک روز تجمل سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا پتہ بھئی اس کی وہی جانے!" اس کا رویہ بالکل سرد تھا۔ "تو کیا تمہارے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں!" اس نے انتہائی مختصر جواب دیا۔ اس کے انداز گفتگو سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔

"لیکن پہلے تو تم اس کی بہت تعریفیں کیا کرتے تھے۔" میں کہنے سے نہ رہ سکا۔

"کیا کرتا تھا لیکن اب نہیں کرتا!" وہ منہ سیکڑ کر بولا۔ "کیوں اب کیا ہو گیا ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ وہ میرے متعلق بہت کچھ اول فول بکتا رہتا ہے۔"

"مثلاً کیا؟" میں نے اسے مزید کریدنے کی کوشش کی۔

"مثلاً یہی کہ اس کی روح میرے جسم میں سرائیت کر جاتی ہے۔ اور یہ کہ وہ مجھ سے عشق حقیقی کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور اسی قسم کی اور بہت سی بکواس۔" اس نے ناک بھنوں چڑھا کر کہا تو میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس گفتگو کو مزید طول دینے کی بجائے پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھنا چاہیے۔

مجھے خاموش ہوتا دیکھ کر اس نے خود ہی بات کا رخ بدل دیا۔

"تمہارا آج کا پیپر کیسا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہو گا!" میں نے جواب دیا۔

"اپنے دماغ سے غلام عباس کے خیال کو نکال پھینکو، کہیں فیل ہی نہ ہو جانا!" اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

اس کی اس حرکت پر مجھے خود ہنسی آ گئی۔ اس نے مجھے نارنگیاں کھانے کی دعوت دی۔ نارنگیاں وہ شوق سے کھاتا تھا، اور ہم اپنے موڈ کو مزید خوش گوار

بنانے کے لئے نارنگیاں کھانے چل دیئے۔

وقتی طور پر واقعی غلام عباس کا خیال ہمارے ذہن سے نکل گیا تھا۔ لیکن اسی روز شام کے وقت غلام عباس اچانک میرے گھر آن دھمکا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ غلام عباس میرے گھر آیا تھا۔ اس کی میرے ساتھ اب خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اس نے آتے ہی مجھ سے سوال کیا۔

"امتحان ہو رہے ہیں!" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن تم امتحان میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"بس ایسے ہی دل نہیں چاہا۔" اس نے لا پرواہی سے سر جھٹکا۔ "ایک بات بتاؤں۔" وہ قدرے توقف سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "میرے والدین میرے مستقبل سے اب بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔ اور ان کے خیال میں میرے سدھرنے کا ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ میری شادی کر دی جائے۔"

"خیال تو بہت حسین ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن سوال تو یہ ہے کہ جس غریب کی قسمت وہ میرے ساتھ پھوڑنا چاہتے ہیں، اس کے مستقبل کا کیا ہو گا؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"تو کیا واقعی معاملہ اس حد تک SERIOUS ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بالکل! بلکہ یہاں تک کہ میری دور کی ایک رشتہ دار لڑکی کے لئے رشتہ بھی بھیجا جا چکا ہے۔ اور تعجب اس بات کا ہے کہ لڑکی والوں کی طرف سے بھی تقریباً نیم رضا مندی کا اظہار ہو گیا ہے۔ بس معاملہ طے پایا ہی سمجھو!" اس نے جواب دیا۔

"مقدر کے تم بہت دھنی نکلے ابہت جلدی میدان مار لیا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ تقریباً میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا "لیکن آج میں نے بھی اپنے والد کے سامنے یہ بات پیش کر دی۔ کہ وہ لڑکی برائے نام میری بیوی ہو گی۔ اس کی حیثیت میرے لئے ایک واقف کار سے زیادہ نہ رہے گی۔ اور اس کو تجمل کی آمد و رفت پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

میں اس کی اس بات پر گم صم رہ گیا۔ "اور جانتے ہو اس کا ردعمل کیا ہوا؟" وہ خود ہی بولا۔

"کیا ہوا؟" میں نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

"میرے والد نے اسی وقت دھکے دے کر مجھے گھر سے نکال دیا۔" اس نے زہر خند مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"تمہیں اپنے والد سے فوراً معافی مانگنی چاہیے۔ تمہاری یہ بات ایسی ہے کہ اسے تمہارے والد تو کیا کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔" مجھے اب یہ خدشہ لاحق ہو رہا تھا کہ اب کہیں غلام عباس میرے گھر رہنے کا ہی مطالبہ نہ کر بیٹھے۔ اس لئے اب میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

"تو کیا تم میری صاف گوئی کی داد نہ دو گے۔ میں شادی ہونے کے بعد بھی تو یہی سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس وقت کوئی کیا کر لیتا۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیئے ہوئے کہا۔

"بہر حال معاف کرنا، میں تمہاری اس بات کی کوئی داد نہیں دے سکتا۔ میرے خیال میں تمہاری بات اس قابل نہیں کہ اس کی تعریف کی جائے۔" میں نے دو ٹوک جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے کوئی بھی نہیں سمجھ سکا تم کیا سمجھو گے!"

اس بات کو تقریباً ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ اس دوران میں غلام عباس اسکول یا اسکول سے باہر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اسکول سے اس کا نام خارج ہو چکا تھا۔ اور تجمل اس کے غائب ہونے کی وجہ سے خاصا مطمئن رہنے لگا تھا۔ ورنہ اسے ہر دم اپنی تذلیل کا خدشہ لاحق رہتا تھا۔

میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ اس دوران ہمارے ششماہی امتحانات کا نتیجہ برآمد ہو چکا تھا۔ اور اب چونکہ میری اور تجمل کی چپقلش ختم ہو چکی تھی۔ اس لئے ہم دونوں کی اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہمارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک کلاس فیلو رفیق چوہدری نے فرسٹ پوزیشن حاصل کرلی تھی۔ اور اس طرح ہم دونوں ہی کلاس مانیٹری سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ رفیق باوجود مانیٹر ہونے کے بھی ہم سے کافی مرعوب رہتا تھا۔ اس نے کسی سلسلے میں کبھی بھی ہم سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی ہم نے کبھی اس کا کوئی نوٹس لیا۔ میرا اور تجمل کا وقت اب بھی اکثر اکٹھے ہی گزرتا۔ اور اب ہم پہلے کی نسبت اور زیادہ قریب ہو چکے تھے۔

غلام عباس اب ایک بھولی بسری یاد بن کر رہ گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ ماضی کیسا بھی گزرا ہو۔ اس کے ہر ورق کا تحریر شدہ ہر لفظ کچھ نہ کچھ اثر رکھتا ضرور ہے۔ اسی لئے بعض اوقات شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے وہ ایک سائے کی طرح میرے ذہن میں منڈلاتا "نہ معلوم کس حال میں ہو بے چارہ؟"

میں سوچتا اور جب مسلسل سوچنے سے اکتا جاتا تو "ارے مجھے کیا" کہہ کر کروٹ بدل لیتا۔ ایک دو بار میں نے چاہا بھی کہ اس سلسلے میں تجمل سے کچھ بات کروں لیکن اس کا موڈ دیکھ کر بات کو گول کرنا پڑتا۔

موسم گرما کی وہ تپتی دوپہر تھی۔ میں اسکول سے واپس لوٹ رہا تھا۔ خلاف معمول آج تجمل اسکول نہ آیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ کتابیں گھر رکھنے کے بعد تجمل کی خیریت معلوم کرنے اس کے گھر جاؤں۔ کہ اچانک السلام وعلیکم کی آواز کر میں پلٹا۔ دیکھا تو غلام عباس میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی اور بال الجھے ہوئے تھے۔ کپڑے میلے کچیلے چیکٹ ہو رہے تھے پیروں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ چہرے سے نقاہت اور تھکاوٹ عیاں تھی۔

"کیا حال ہے غلام عباس؟" میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کہاں تھے اتنے دنوں سے؟" میں نے ایک دم سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔

وہ میری طرف آہستہ سے دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "کچھ وقت ہوگا تمہارے پاس!"

"کیوں نہیں!" میں نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

"تو چلو آؤ کہیں بیٹھتے ہیں!" وہ آگے بڑھ کر بولا۔

"یہ ہوٹل مناسب نہیں رہے گا کیا؟" میں نے سامنے ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! اس حال میں مجھے ہوٹل میں بیٹھنے تو کیا کوئی داخل بھی نہ ہونے دیگا!" اس نے جواب دیا۔

"بات تو ٹھیک ہے۔" میں نے سوچا اور بغیر کچھ کہے اس کے ساتھ ہولیا۔

وہاں سے تھوڑی دور گارڈن کے ایک خاموش سے گوشے میں پہنچ کر اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

"ہاں اب بولو!" میں گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں کیا بولوں۔ تم پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" وہ گویا اب ہر سوال کا جواب دینے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ "یہی کہ کہاں رہے اتنے دن کیا کرتے رہے؟" میں نے پوچھا۔

"دنیا کے مشاہدات کرتا رہا۔ در در کی خاک چھانتا رہا۔ وغیرہ وغیرہ اور کیا بتاؤں؟" اس کا جواب تھا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کم از کم امتحان ہی دے لیتے۔" میں نے نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر ایک دم کرب کے آثار پیدا ہوئے۔ "تمہارے خیال میں کیا امتحان دینے سے میری بگڑی ہوئی زندگی سنور سکتی تھی۔ میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے تعلیم وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تعلیم کو کاروباری ٹھگ بازی سمجھتا ہوں۔"

"ٹھگ بازی کا کاروبار! وہ کس طرح؟" اس کی یہ بات میرے لئے حیران کن تھی۔

"وہ اس طرح کہ یہ سیکنڈری بورڈ اور یونیورسٹی والے ہر سال لاکھوں لڑکوں کو بطور طالب علم بھرتی کرتے ہیں۔ اور پھر سالہا سال تک ان سے فیسیں اور جرمانے وصول کرتے رہتے ہیں۔ اور آخر کار کاغذ کا

ایک پرزہ ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں جس کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔ جس کو دکھا کر نہ تم نوکری حاصل کر سکتے ہو اور نہ ہی کاروبار۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک طالب علم سولہ سترہ سال میں جس قدر اخراجات اپنی تعلیم پر کر چکا ہوتا ہے، وہ اسے آنے والے سولہ سترہ سالوں میں بھی واپس نہیں مل پاتے۔ مجھے بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔

یا در کھو زندگی میں اصل تعلیم تمہارا اپنا مشاہدہ ہے۔ دنیا ایک کھلی ہوئی کتاب ہے اور اس کو پڑھنا اور سمجھنا ہی اصل علم ہے۔"

وہ فلسفیانہ انداز میں مسلسل بے تکان بول رہا تھا۔ میں اس کی اس عجیب منطق کا جواب دے کر اس بحث کو طول بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے گفتگو کا رخ خود ہی موڑ دیا۔ "اور سناؤ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں زندگی سے لاپرواہ ہوں۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ کون جی رہا ہے اور کون مر رہا ہے۔ بس اپنے حال میں مست ہوں!" اس نے لاپرواہی سے سر کو جھٹکا دیا۔

"تو کیا تجمل بھی اب یاد نہیں آتا؟" میں نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"تجمل کی یاد ہی تو میری زندگی ہے۔ کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ تو میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

"کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس!" اس نے ایک دم بات پلٹی۔

"یہی کوئی دو تین سو روپے ہوں گے!" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ کافی نہیں ہیں!" وہ بڑبڑایا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولا۔ "یہ لو سو روپے اور ابھی جا کر 57 پر لگا دو۔"

"57 نمبر کا کیا مطلب؟" میں نے اس طرح پوچھا جیسے مجھے اس کی صحیح الدماغی پر شبہ ہو۔

"سٹہ کا نمبر ہے!" اس نے پر زور الفاظ میں مجھے تقریباً گھورتے ہوئے کہا۔ "جاؤ جا کر لگا دو۔ پورے مہینہ کا جیب خرچ نکل آئے گا" اتنا کہہ کر اس نے سگریٹ کی ڈبیا پھاڑی اور اس پر کچھ لکھ کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ "لو یہ میرا پتہ ہے کل شام کو مل لینا!" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ میں اسے دیکھتے ہی رہ گیا۔ وہ جا چکا تھا۔

میں کبھی سو کے نوٹ کو دیکھتا اور کبھی 57 نمبر میرے ذہن میں گھومتا۔ "یا اللہ! مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ سٹہ کہاں ہوتا ہے۔ اور کیسے کھیلا جاتا ہے؟ اتفاق دیکھئے کہ میرے ذہن میں خود بخود یہ ترکیب آگئی کہ کیوں نہ اس سلسلے میں ملک صاحب کے خانساماں کی خدمات حاصل کی جائیں۔" ملک صاحب میرے گھر کے بالکل سامنے والی کوٹھی میں رہتے تھے۔ اور ان کا خانساماں بشیر سٹے اور جوئے کا بڑا رسیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی میں نے بشیر کو بلایا اور چپکے سے اس کے ہاتھ پر سو کا نوٹ رکھا۔ اور اسے نمبر بتا دیا۔ بشیر کو تو جیسے کوئی نعمت مل گئی تھی۔

اور دوسرے روز کلاس روم میں مجھے پتہ چلا کہ کوئی بشیر نامی شخص مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں باہر نکلا تو بشیر مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

"کمال ہو گیا عزیز، ایسا دھانسو نمبر تھا کہ ایک دم فٹ بیٹھ گیا۔ مزا آ گیا ایمان سے!" خوشی سے وہ بے حال ہو رہا تھا۔ اس نے صدری کی جیب سے نوٹ نکالے۔

"پورے پانچ ہزار روپے ہیں۔" اس نے نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا۔ ابھی انہیں رکھو۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "پھر بات کریں گے۔ اب جاؤ یہ اسکول ہے کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت آجائے گی میرے لئے!" اس نے جلدی سے نوٹ صدری میں رکھے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

اسکول سے چھٹی ملتے ہی میں سیدھا غلام عباس کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچا۔ مجھے امید نہ تھی کہ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گنجان علاقے میں غلام عباس کا گھر ڈھونڈ سکوں گا۔ مگر اس علاقے میں داخل ہوتے ہی میں نے جس پہلے شخص سے غلام عباس کا پتہ پوچھا، تو وہ فوراً اس کے گھر تک میری رہنمائی کرنے پر تیار ہوگیا۔

''غلام عباس سے کام ہے بابو جی!'' اس نے راستہ میں مجھ سے پوچھا۔

''ایسے ہی دوست ہے۔ ملنا ہے صرف!'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''اگر آپ کا دوست ہے تو میرا ایک کام کرا دیجئے۔ ایک نمبر تو پوچھ دیجئے!'' اس نے عاجزانہ لہجے میں مجھ سے درخواست کی۔

''کیسا نمبر؟'' میں نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا۔ کیا غلام عباس کوئی نمبر وغیرہ بھی بتاتا ہے!

''اجی صاحب! وہ کیا نہیں بتاتا۔ سٹہ کا نمبر، ریس کا گھوڑا، دکھ تکلیف، بیماری کا علاج، لڑکا ہوگا یا لڑکی، پاس ہوگا یا فیل۔ ہر مرض کا علاج ہے اس کے پاس لیکن بتاتا تب اپنی مرضی سے ہے۔ طبیعت آئی تو بتا دیا، ورنہ جھڑک دیا!''

اب میں واقعی حیرانی سے اس اجنبی شخص کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ غلام عباس کیا سے کیا ہوگیا۔ اس ادھیڑ بن میں ہم غلام عباس کی جھونپڑی تک پہنچ گئے۔

''لیجئے صاحب! یہ رہا غلام عباس کا گھر۔'' اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتلایا ''میری بات نہ بھولئے گا۔'' اس نے سرگوشی کی اور میں جواب میں سر ہلاتا ہوا غلام عباس کی کٹیا میں داخل ہوگیا۔ اندر غلام عباس فرش پر آلتی پالتی مارے کسی خیال میں گم بیٹھا تھا۔ میرے پیروں کی آہٹ سن کر وہ چونکا۔

''ارے آؤ بھئی۔ خوب آئے، گھر ڈھونڈنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی۔'' اس نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کرتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل تکلیف نہیں ہوئی۔ تم تو اس علاقے میں بہت مشہور و معروف ہو، پہلے ہی شخص سے میں نے تمہارا پوچھا تو اس نے یہاں تک پہنچا دیا۔'' میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے کل کے دیئے ہوئے سو روپوں کے پانچ ہزار روپے بن گئے ہیں، وہ ہے نا بشیر خانساماں اس کے پاس ہیں، میں دانستہ نہیں لایا کل لیتا آؤں گا!'' میں نے گویا اسے رپورٹ پیش کی۔

''مجھے ان پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں سے 1000 روپے لے کر اس گھوڑے پر لگا دو۔'' اس نے ایک چھوٹی سی پرچی پر کچھ لکھ کر دیا۔ میں نے دیکھا پرچی پر ''پرنس آف سرنیہ'' لکھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد میں اٹھ آیا۔ باہر وہی شخص میرا منتظر تھا جس نے غلام عباس کے گھر تک میری رہنمائی کی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا۔ ''کیوں بابو جی کچھ بتایا۔'' میں نے وہی پرچی اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے پرچی دیکھ کر واپس لوٹاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''صاحب! گھوڑے کا نہیں، مجھے تو سٹہ کا نمبر چاہئے، گھوڑے پر لگانے کے لئے اتنے پیسے کہاں سے لاؤں گا۔'' وہ منہ بسورتے ہوئے بولا۔

''اچھا اچھا اب دوبارہ آؤں گا تو سٹہ کا نمبر بھی پتہ کر دوں گا!'' میں نے اس کی آس بندھائی۔ لیکن میرے جواب سے شاید وہ مطمئن نہ ہوسکا تھا۔ بغیر کچھ کہے ایک طرف کو مڑ گیا۔

''شکر ہے پیچھا چھوٹا!'' میں نے دل میں کہا، گھر پہنچ کر سب سے پہلے میں نے بشیر خانساماں سے روپے لئے۔ میں اس دفعہ ایک ہزار روپے خود اپنے ہاتھوں سے گھوڑے پر کھیلنا چاہتا تھا۔

اس سے پیشتر کبھی میں نے ریس کورس کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ ریس کورس میں افراتفری کا ایک عجیب عالم تھا۔ عورتوں اور مردوں کی ایک بھرمار تھی۔ کھوے سے کھوا چھلا جاتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر داؤ لگا رہے تھے۔ غلام عباس کے بتلائے ہوئے گھوڑے پر میں نے بھی =/1000 روپے لگا دیئے۔ ریس شروع ہوئی غلام عباس کا بتلایا ہوا گھوڑا سب سے

آگے چلا آ رہا تھا۔ ریس ختم ہوئی تو میں جیت چکا تھا اور دس ہزار روپے کے کرکراتے ہوئے نوٹ میرے ہاتھ میں تھے۔

ٹیکسی لے کر میں سیدھا غلام عباس کے ٹھکانے پر پہنچا اس کے گھر کے سامنے پانچ چھ حاجت مند قسم کے مرد اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ غلام عباس نے بیٹھتے ہی مجھے دیکھا۔ میرا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''جیت گئے ہو؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

''تو پھر جاؤ اور جا کر عیش کرو۔ اور جب ختم ہونے کو آئیں تو پھر میرے پاس چلے آنا!'' وہ ایسے بول رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا بزرگ مجھ سے مخاطب ہو۔

''پانچ سو روپے سامنے بیٹھی اس بڑھیا کو دیدو ضرورت مند ہے بے چاری۔'' اس نے بڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پانچ سو روپے بڑھیا کو دے کر میں الٹے پاؤں واپس لوٹ آیا۔ سچ پوچھیے تو مجھے غلام عباس کا یہ انداز بالکل ہی نہ بھایا تھا۔ چند دن تک میں مصروفیت کی بناء پر غلام عباس کی طرف نہ جا سکا۔ اس دوران ہمارے سالانہ امتحان بھی سر پر آن پہنچے اور میں ایک دفعہ پھر اپنی کورس کی کتابوں میں گم ہوگیا۔ امتحانات کی تیاری اور امتحان دینے میں ڈیڑھ ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ اس دوران میں، میں غلام عباس کی طرف سے بالکل غافل رہا۔ امتحانات سے فراغت کے بعد ہر طالب علم کی طرح میرا زیادہ وقت نمازیں پڑھنے اور پاس ہونے کی دعائیں مانگنے میں صرف ہونے لگا تھا۔

ایک روز بیٹھے بیٹھے مجھے خود ہی خیال آیا کہ غلام عباس کے پاس تو پاس اور فیل کا پوچھنے والے بھی آتے ہیں۔ کیوں نہ اس سے ملا جائے۔ میں نے جب تجمل سے اپنے خیال کا اظہار کیا تو خلاف توقع تجمل نے بھی میرے ساتھ چلنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ دراصل میرے خیال میں ہر طالب علم کی کمزوری اس کے امتحان کا رزلٹ ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ تجمل فوراً ہی میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہوگیا۔

جس وقت ہم غلام عباس کے گھر پہنچے، اس کے گھر کے سامنے باقاعدہ ایک بھیڑ سی لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس دوران میں غلام عباس کی شہرت کافی پھیل گئی تھی۔ حاجتمندوں کی اس بھیڑ میں زیادہ تعداد ہم جیسے طالب علموں کی تھی، جن کو ہماری ہی طرح میٹرک کے رزلٹ کا انتظار تھا۔ غلام عباس نے ہمیں دیکھتے ہی باقی سب لوگوں کو اپنی کٹیا سے باہر نکال دیا۔ تجمل کو میرے ساتھ دیکھ کر اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی تھی جس کا اظہار الفاظ کے ذریعے مشکل ہے۔ اس کا سیاہی مائل رنگ گلابی ہوگیا تھا اور ہونٹوں پر جیسے کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔

''آؤ! آؤ! آج کیسے بھول پڑے؟ امتحان کا نتیجہ تو معلوم کرنے نہیں آئے کہیں!'' وہ زیر لب مسکرا کر جلدی جلدی بولا۔

''بات تو کچھ ایسی ہے!'' میں نے جواب دیا۔

''تم دونوں کو کون فیل کر سکتا ہے۔ بس جاؤ اور جا کر کالج میں داخلہ لینے کی تیاری کرو۔'' اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا جیسے کوئی شفیق باپ اپنی اولاد سے مخاطب ہو۔

''لیکن غلام عباس بھائی! کچھ پیسوں کی بھی ضرورت ہے نا!'' میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ وہ زور سے کھلکھلا کر ہنسا اور ایک پرچی پر کچھ لکھ کر مجھے پکڑا دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ گھوڑے کا نام ہے۔

''تجمل کو نہیں دو گے؟'' میری شرارت کی رگ پھر پھڑ پھڑائی۔

اس نے ایک لمحہ کے لئے تجمل کو اتنے پیار بھری نظروں سے دیکھا کہ تجمل کو جھرجھری سی آ گئی۔

''تجمل کی خوشی میری زندگی کی سب سے اہم خواہش ہے۔ اس کے سر پر کبھی مایوسی کے بادل نہ منڈلا پائیں گے۔ اس کی زندگی سنوارنے کے لئے میں نے اپنی زندگی جوا لگا ڈالی ہے!''

اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی سنائی دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی تھی اور اس وقت وہ مجھے کوئی محبت اور خلوص کا دیوتا معلوم ہو رہا تھا۔

تجمل نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر کہ تجمل کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ ڈالے، اٹھنا ہی مناسب سمجھا۔ غلام عباس نے بھی ہمیں روکنے کی کوشش نہ کی۔ البتہ کٹیا کے دروازے تک چھوڑنے ضرور آیا۔

وقت تیزی سے پر لگا کر اڑتا رہا۔ حتیٰ کہ ہم اسکول کی چہار دیواری سے نکل کر کالج کی آزاد فضاؤں میں داخل ہوگئے۔ غلام عباس سے میں ''حسب ضرورت ملتا رہتا۔ اور اسی کی پیشین گوئیوں'' کی وجہ تھی کہ میں تھوڑے ہی عرصہ میں پورے کالج میں شاہ خرچ مشہور ہوگیا۔ کالج کے کسی بھی لڑکے کی نسبت میرا کینٹین کا بل زیادہ بنتا اور ہر لڑکے کی چائے پانی سے خاطر تواضع کرنا میرے لئے گویا ایک عام سی بات تھی۔ ریس اور سٹے سے مجھے اتنی معقول آمدنی ہوتی کہ ضرورت سے کہیں زیادہ خرچ کرنے کے باوجود بھی جیب میں ہمیشہ دو چار سو پڑے ہی رہتے تھے۔

تجمل گو بذات خود کبھی غلام عباس کے پاس نہ جاتا۔ لیکن میری اس ناجائز کمائی میں وہ برابر کا شریک ہوتا تھا۔ اور اسی دوران ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے تجمل کی شہرت کو ایک دم چار چاند لگ گئے۔ ہوا یہ کہ ہمارے ایک غریب سے کلام فیلو کا نام بوجہ فیس داخل نہ کرنے کے خارج ہوا چاہتا تھا کہ تجمل نے بروقت اس کی طرف واجب الادا تین ماہ کی فیس اپنی گرہ سے ادا کردی۔ اور اس واقعہ نے پروفیسروں اور دوسرے لوگوں کی نظر میں تجمل کی عزت ایک دم کئی گنا بڑھادی۔ تجمل اب کالج میں اس قدر مقبول ہو چکا تھا کہ یونین کے انتخابات میں بھی وہ بلا مقابلہ سیکریٹری منتخب ہوگیا۔

اپنی باتوں میں میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ اس عرصہ میں غلام عباس اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ اب حاجتمندوں کے جتھے کے جتھے ہر وقت اس کے گھر کا گھیراؤ کئے رہتے تھے۔ غلام عباس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو لوگ اس طرح پلو میں باندھ لیتے گویا یہی بات ان کی پریشانیوں کو ختم کرنے کا ذریعہ ہو۔ اب غلام عباس ہر غریب آدمی پر ہر وقت مہربان رہتا تھا۔ شاید غریبوں سے اس کی ہمدردی کی بنیادی وجہ اس کا خود پیدائشی طور پر غریب ہونا تھا۔ بہر حال گردونواح کے علاقوں کے تمام لوگوں کا وہ ہیرو تھا اور یہ حقیقت ہے کہ لوگ اس سے بھرپور محبت بھی کرتے تھے۔

اور پھر اچانک ایک ایسا اندوہناک حادثہ وقوع پذیر ہوا کہ اس کہانی کے تمام ہنستے کھیلتے کردار ایک دم غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئے۔

وہ موسم سرما کی ایک خوشنما سی دوپہر تھی جب میں اور تجمل خوش گپیاں کرتے ہوئے کالج سے واپس گھر کی طرف آرہے تھے کہ اچانک کیلے کے ایک چھلکے پر سے تجمل کا پیر پھسلا اور تجمل سڑک پر جا پڑا۔ تیز رفتاری سے آتی ہوئی کار کی بریکیں لگنے کی آواز سنائی دی۔ اور بریک کی چیخوں میں تجمل کی چیخیں مدغم ہوگئیں۔ چند لمحے پیشتر کا ہنستا مسکراتا اور کھلکھلاتا ہوا تجمل خون میں لت پت بے حس و حرکت پڑا تھا۔

دہشت غم سے مجھ پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔ کب پولیس آئی اور کب تجمل کی لاش کو لے گئی۔ مجھے کچھ علم نہیں۔

چند روز کے بعد غم و اندوہ کی تصویر بنا جب میں غلام عباس کو یہ روح فرسا خبر سنانے کے لئے گیا تو یہ سن کر مجھ پر غم و حیرت کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ عین اسی روز جس دن تجمل نے زندگی کا ساتھ چھوڑا، اسی دن غلام عباس کا بھی انتقال ہوگیا اور عینی شاہدوں کے بیان کردہ وقت کے مطابق میں نے سوچا، اس کی موت ٹھیک اسی وقت واقع ہوئی تھی جس وقت تجمل نے دم توڑا تھا۔

مرتے وقت اس کے لبوں سے صرف یہی فقرہ سنا گیا۔

''جب وہ نہیں رہا تو ہم جی کر کیا کریں گے!''

بری آتما

خلیل جبار-حیدرآباد

نوجوان نے لڑکی کو اپنی بانہوں میں جکڑلیا مگر فوراً ہی اسے عجیب سا محسوس ہوا تو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور پھر وہ دھل کر رہ گیا اس کے اوسان خطا ہوگئے کیونکہ اب اس کے سامنے مجسم لڑکی کھڑی تھی مگر اس کا سرناگن کا تھا۔

سنسان اور پرہول رات کے گھپ اندھیرے میں جنم لینے والی ایک خوفناک مگر دلگداز کہانی

قیصر جس وقت ٹرین سے اترا، اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ اسے دن کے وقت اسٹیشن پر اترنا تھا۔ لیکن راستے میں ٹرین کا انجن خراب ہوجانے کی وجہ سے گاڑی دس گھنٹے لیٹ ہوگئی تھی۔ قیصر اکثر کاروباری سلسلے میں شہر جاتا رہتا تھا۔ اس کے گاؤں میں اسپیئر پارٹس کی دکان تھی جب سے موٹر سائیکل قسطوں پر ملنے لگی تھیں۔ گاؤں میں بھی موٹر سائیکلوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا تھا، گاؤں میں اس کی واحد اسپیئر پارٹس کی دکان تھی اس لئے وہ منہ مانگے داموں پارٹس کا سامان فروخت کرتا تھا۔ سامان خریدنے کے لئے وہ ہر ہفتہ شہر جاتا تھا۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ٹرین اتنی لیٹ ہوئی تھی ورنہ وہ دن میں ہی گاؤں پہنچ جاتا تھا۔

قیصر کو گھر جانے کے لئے کھیتوں سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ کچی سڑک سے گھر دیر سے آتا لیکن کھیتوں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزرنے پر فاصلہ کم ہوجاتا۔ گاؤں کے اس چھوٹے سے اسٹیشن پر مسافروں کے لئے ٹھہرنے کی جگہ نہیں تھی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ایسی سردی میں اس کا اسٹیشن کے کھلے پلیٹ فارم پر ٹھہرنا ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ سامان کا تھیلا اپنے کاندھے پر لاد کر تیز تیز قدم اٹھاتا کھیتوں کے راستے گھر کو چل دیا۔ اسٹیشن پر اترنے والا وہ واحد مسافر تھا اس لئے اسے اکیلے ہی گھر جانا تھا۔

ابھی اس نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی، ایسا محسوس ہورہا تھا کہ کوئی عورت چل رہی ہے اور اس کے پاؤں میں بندھی پائل کے گھنگھرو بج رہے ہوں۔ قیصر کو بڑی حیرت ہوئی کہ ''اس وقت رات کے دو بجے ایسی سردی میں کون عورت کھیتوں میں ہوسکتی ہے؟''

تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اچانک ایک سمت اسے ایک عورت نیم برہنہ حالت میں چلتی ہوئی نظر آئی۔ چودھویں کے چاند کی روشنی میں اس عورت کا سراپا قیامت ڈھا رہا تھا۔ قیصر اس عورت کو دیکھ کر بے قرار سا ہوگیا اور خود پر قابو نہ رکھتے ہوئے عورت کی جانب بڑھنے لگا۔ عورت نے بھی قیصر کو دیکھ لیا تھا اور اپنی جانب اس کو بڑھتا دیکھ کر وہ انداز دلربائی دکھانے لگی۔ اس کے انداز کو دیکھ کر قیصر کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔

اتنی خوبصورت عورت اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس عورت کو اپنی بانہوں میں بھر لینا چاہتا تھا، عورت کے جسم سے بھینی بھینی من موہنی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

قیصر نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں سمو لیا۔ عورت نے خود سپردگی کے انداز میں خود کو قیصر کے حوالے کردیا۔ قیصر نے عورت کو اپنی بانہوں میں لے کر بے خودی کے عالم میں اپنی آنکھیں چند لمحوں کے لئے بند کرلیں۔

اچانک قیصر کو محسوس ہوا جیسے وہ عورت اس کے ہاتھوں سے نکل گئی ہو، جیسا اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر دہل گیا، وہ مجسم لرزنے لگا، اس کے اوسان خطا ہوگئے کیونکہ اب اس کے سامنے مجسم عورت کھڑی تو تھی مگر اس کا سر ایک ناگن کا تھا، وہ ایک جھٹکے سے اس سے دور ہوگیا۔ اور اپنے سامان کا تھیلا چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ وہ ناگن ہوا میں اڑتی ہوئی آئی اور اس کے گلے میں لپٹ گئی۔ اس کا پھن قیصر کے چہرے کے عین سامنے تھا۔ ناگن کو دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے، ناگن کسی بھی لمحے ڈس سکتی تھی۔

قیصر خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا پھر ناگن اپنا پھن قیصر کے چہرے کے قریب لے آئی، موت قیصر سے چند سیکنڈ کے فاصلے پر تھی۔ پر ناگن نے اپنا منہ اس کے ہونٹوں سے مس کیا اور اگلے لمحے قیصر کے گلے سے اتر کر زمین پر رینگنے لگی اور لمحوں میں غائب ہوگئی۔

قیصر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا مگر ناگن کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ وہ خوفزدہ سا واپس پلٹا اور کھیت میں پڑا اپنے سامان کا تھیلا اٹھا کر گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ بہت دہشت زدہ تھا۔ ابھی تک اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ناگن واقعی چلی گئی ہے، ہر لمحے اسے لگتا جیسے وہ ناگن ابھی کہیں سے پھر نکل کر اس کے گلے میں لپٹ جائے گی۔ اسی خوف کے عالم میں وہ گھر پہنچ گیا اور اس نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سکھ کا سانس لیا کہ وہ موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا تھا۔

جب وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو اسے لگا جیسے ناگن کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ اس نے بستر کو اچھی طرح سے جھاڑ کر اپنی تسلی کرلی۔

وہ صبح دیر تک سوتا رہا کچھ تھکن اور کچھ نیند تھی۔ قیصر کو سوتا دیکھ کر اس کا چھوٹا بھائی نوید دکان کھولنے کے لئے صبح سویرے ہی چلا گیا تھا۔ گاؤں میں دکانیں جلد کھل جاتی ہیں۔

دیر سے اٹھنے پر قیصر کو اپنا بدن ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن میں جان ہی نہ ہو پھر ناشتہ کرکے وہ دکان پر چلا گیا۔ دکان پر بھی رات کا واقعہ اس کی نظروں کے سامنے جیتے جاگتے منظر کی طرح

بار، بار آرہا تھا وہ ناگن اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ اس نے قصے کہانیوں میں اس طرح کی باتیں پڑھی تھیں لیکن اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ دن بھر وہ رات کے واقعہ کے متعلق ہی سوچتا رہا اور خوفزدہ ہوتا رہا۔

رات میں جب وہ اپنے کمرے میں سونے کے لئے گیا تو اس نے اچھی طرح سے جائزہ لے کر تسلی کرلی کہ کہیں وہ ناگن کمرے میں موجود تو نہیں، پھر اچھی طرح اطمینان کرکے وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی وہ نیند کی وادی میں کھو گیا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کو اپنے سینے پر وزن محسوس ہوا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور چارپائی سے اٹھنا چاہا۔ لیکن وہ اٹھ نہ سکا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سینے پر نظر نہ آنے والی شے کو دیکھنے لگا۔ لیکن اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آیا تب اس نے اپنا ہاتھ اس شے پر پھیرا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کسی عورت کا بدن تھا۔ اسی وقت عورت کے ہنسنے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''کک..... کک..... کون ہو تم؟'' وہ بوکھلاتے ہوئے بولا۔

''میں! ..... میں تمہاری محبوبہ ہوں۔'' اس عورت نے سرگوشی کی۔

''تم مجھے نظر کیوں نہیں آرہی؟''

''اس لیے کہ کہیں تم کل رات کی طرح ڈر نہ جاؤ۔ اگر تم مجھ سے نہ بھاگنے کا وعدہ کرو تو میں تم کو نظر آسکتی ہوں۔'' نسوانی آواز سنائی دی۔

''میں نہیں بھاگوں گا تم سے وعدہ ہے۔'' قیصر نے کہا۔

اس کے وعدہ کرنے پر وہ عورت ظاہر ہوگئی۔ اس عورت کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا کیونکہ عورت وہی تھی جو اسے رات کھیتوں میں ملی تھی۔ اسے دیکھ کر اس پر پھر سے خوف طاری ہونے لگا۔

''ت..... تت..... تم..... ک..... کک..... کون ہو، کبھی عورت، کبھی ناگن؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''میں صرف اور صرف تمہاری چاہنے والی ہوں اور کچھ نہیں، مجھ میں یہ طاقت موجود ہے کہ میں جس شکل میں آنا چاہوں آسکتی ہوں، تم بتاؤ میں تم سے کس روپ میں ملاقات کروں۔'' وہ عورت مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم مجھ سے نہ ملو۔'' قیصر نے کہا۔

''نہیں! ہرگز نہیں! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تم سے مجھے ملنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔'' عورت نے غضبناکی سے کہا۔

اسے غصہ میں دیکھ کر قیصر گھبرا گیا۔

''م..... مم..... میرا..... م..... مم مطلب یہ نہیں کہ تم مجھ سے بالکل نہ ملو۔''

''پھر؟''

''میں چاہ رہا ہوں کبھی کبھی ملاقات کرلیا کرو۔'' قیصر نے کہا۔

''ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، میں ہر روز تم سے ملاقات کرنے آؤں گی، کیونکہ میں تمہاری ہوں اور دو دلوں کو ایک دوسرے سے ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

''ٹھ..... ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے جیسا تمہارا دل کرے وہ تم کرو، میں..... میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔'' قیصر نے کہا۔

وہ عورت مسکرانے لگی۔

''اچھا مجھ پر سے ہٹ جاؤ، تمہارے وزن سے میرا دم نکلا جارہا ہے۔''

''میں تمہارے سینے پر سے نہیں ہٹ سکتی، لیکن میرا وزن اتنا کم ہوجائے گا کہ تمہارا دم نہیں نکلے گا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

قیصر کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے بدن پر سرے سے وزن ہی نہیں تھا۔ وہ عورت پھول کی طرح ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔

''تم میرے سامنے ناگن کی صورت میں مت آیا کرو۔'' قیصر نے کہا۔

''کیوں؟ ناگن سے ڈر لگتا ہے، فکر نہ کرو میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناگن کے روپ میں آ کر بھی تمہیں ڈسوں گی نہیں، مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔'' وہ عورت بولی۔

''ہاں اس بات کا اندازہ تو مجھے کھیتوں میں ہی ہوگیا تھا لیکن کون جانے ناگن کے روپ میں تم ہو یا کوئی اور ناگن ہے۔ میں دھوکہ میں مارا جاسکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میرا نام کامنی ہے میں کسی ناگن کو تمہارے قریب پھٹکنے بھی نہ دوں گی۔ اگر کسی ناگن نے تمہارے قریب آنے کی کوشش بھی کی تو میں راستے کی دیوار بن جاؤں گی۔ اسے ختم کردوں گی۔''

قیصر کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اس لیے وہ کامنی کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

دو گھنٹے تک وہ اس کے پاس رہی اور پھر چلی گئی۔

اب یہ روز کا معمول بن گیا تھا۔ کامنی دو گھنٹے لازمی اس کے پاس آتی تھی۔ جاتے ہوئے وہ ناگن کا روپ دھار کر کھڑکی کے راستے باہر چلی جاتی تھی۔ قیصر کامنی کے بارے میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بتانا چاہتا تھا لیکن بتانے سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ ناگن غصے میں آ کر اسے نقصان نہ پہنچادے۔ اس لئے اس نے خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔

جب سے قیصر کی ناگن سے ملاقات ہوئی تھی وہ دن بدن کمزور ہوتا جارہا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی، اس کے دوست احباب اور عزیز واقارب اس کی صحت کے گرنے کا سبب پوچھتے لیکن وہ انہیں کیا بتاتا۔ اسے تو خود پتہ نہیں تھا۔

اس سلسلے میں قیصر نے شہر میں کئی اچھے ڈاکٹروں کو بھی دکھایا، سب کی رائے یہی تھی کہ اس کے جسم میں خون کی کمی ہوگئی ہے۔ خون کی کمی کو دور کرنے کے لئے اسے غذائیں اور پھل کے استعمال کا مشورہ دیا گیا کہ زیادہ سے زیادہ خون بنے اور اس کے جسم کی کمزوری دور ہو۔ اس نے ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اچھی غذا اور پھل کا استعمال شروع کردیا لیکن اس کی صحت روز بہ روز گرتی ہی رہی۔ اکثر ایسا ہونے لگا کہ چلتے پھرتے کمزوری سے چکر بھی آنے لگے تھے۔

حیدرآباد میں قیصر کے ایک عزیز بشیر میاں کے بیٹے کی شادی تھی۔ بشیر میاں نے قیصر کو بڑی اپنائیت اور خلوص سے شادی میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ قیصر ان کے خلوص کو دیکھ کر اپنی طبیعت بہتر نہ ہونے کے باوجود حیدرآباد پہنچ گیا۔ شادی میں شریک ہو کر واپسی میں اچانک اسے خیال آیا۔ ''آج جمعرات ہے۔ بابا مکی شاہ کے مزار پر لوگ دور، دور سے حاضری دینے آتے ہیں کیوں نہ میں بھی مزار پر آج حاضری دوں۔''

ویسے بھی ٹرین کے آنے میں وقت تھا۔ اس کے قدم مزار کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ مزار پر زائرین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ وہ بھی حاضری دینے والوں میں شامل ہوگیا۔ حاضری دے کر وہ جیسے ہی مزار سے باہر آیا تو ایک ملنگ نے زور سے ''اللہ ہو'' کا نعرہ لگایا۔ غیر متوقع طور پر قیصر چونک گیا۔ اور ملنگ کی طرف دیکھا۔ ملنگ نے اس کے چونکنے پر زوردار قہقہہ لگایا۔

''ڈر گیا۔ تو ڈرپوک ہے۔'' ملنگ نے کہا۔

''میں..... میں ڈرا نہیں رہا۔ وہ آپ نے اس طرح اچانک سامنے آ کر آپ نے زوردار نعرہ لگایا تو میں بے اختیار چونک پڑا۔''

''تو..... ڈرپوک ہے جبھی موت لمحہ بہ لمحہ تیرے نزدیک ہوتی جارہی ہے۔'' ملنگ نے کہا۔

''موت میرے نزدیک ہورہی ہے؟''

''بابا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' قیصر نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں تو ڈرپوک ہے، موت کے ڈر سے وہ راز کسی کو نہیں بتا رہا جو تجھے خوف زدہ کئے ہوئے ہے۔ وہی راز تیری جان لے لے گا۔''

ملنگ کی باتوں نے قیصر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ملنگ اس کے راز سے آشنا ہے۔

''بابا آپ کس راز کی بات کررہے ہیں؟''

''وہی راز جو کھیتوں سے ہو کر تیرے کمرے تک آچکا ہے۔ وہ ایک بری آتما ہے جو آہستہ آہستہ تیرا

خون پی رہی ہے اور تو انجانے میں موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔'' ملنگ نے کہا۔

''بابا میں اس سے جان چھڑانا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ مجھے سوتے میں ڈس نہ لے، وہ عورت سے ناگن کا روپ دھار لیتی ہے۔''

''وہ بہت چالاک ہے، وہ تجھے ڈسنا نہیں چاہتی ناگن کا روپ تجھے ڈرانے کے لئے دھار لیتی ہے تاکہ تو کسی اور کو اس راز کے بارے میں شریک نہ کرسکے۔ اور وہ بری آتما آہستہ آہستہ تیرے خون کا ایک، ایک قطرہ چوس لے گی۔'' ملنگ نے کہا۔

''میں کیا کروں؟''

''اس سے جان چھڑالے جتنی جلدی ہوسکے۔''

''وہ کیسے؟''

''یہ لے! اس پڑیا کو سنبھال کر رکھ لے، رات کو وہ آئے تو فوراً پڑیا نکال کر کھولنا اور اس کے جسم پر یہ سفوف ڈال دینا، پھر دیکھنا کیا تماشہ ہوتا ہے۔'' ملنگ نے پڑیا۔ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

قیصر نے وہ پڑیا ملنگ سے لے کر اپنی جیب میں ڈال لی اور آگے بڑھ گیا۔ لیکن جیسے ہی اسے یہ خیال آیا کہ اس نے ملنگ بابا کو اس پڑیا کے بدلے نذرانہ وغیرہ تو دیا ہی نہیں۔ وہ پلٹا لیکن جہاں وہ ملنگ کھڑا تھا، وہاں اب وہ نہیں تھا۔

قیصر حیرت زدہ رہ گیا کہ چند سیکنڈ میں وہ ملنگ کہاں غائب ہوگیا وہ حیران و پریشان اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ ٹرین اسٹیشن پر آچکی تھی۔ اس نے اسٹیشن پر پہنچ کر ٹکٹ لیا اور ٹرین میں سوار ہوگیا۔

ٹرین سے وہ مقررہ وقت پر گاؤں پہنچ گیا۔ سفر نے اس کو بری طرح سے تھکا دیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر وہ سونے کے لئے چارپائی پر لیٹ گیا۔ سونے سے پہلے اس نے تکیہ کے نیچے ملنگ بابا کی دی ہوئی پڑیا رکھ دی، تھکن کی وجہ سے جلد ہی اسے نیند آ گئی۔

آدھی رات کا پہر تھا کہ کسی نے اسے سوتے سے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو کامنی تھی۔

''بہت نیند آرہی ہے، کچھ وقت ہمیں بھی دے دو۔'' کامنی اس پر جھکتے ہوئے بولی۔

''مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔'' قیصر نے کہا۔

''جبھی تمہارے خراٹوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہے ہو۔'' کامنی نے کہا۔

''مذاق اچھا کرلیتی ہو۔'' قیصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور کامنی جیسے ہی اس کی بانہوں میں آئی تو قیصر نے لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر تکیہ کے نیچے سے پڑیا نکال کر کھول لی۔

کامنی اس کے سینے پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ پڑیا میں سے سفوف نکل کر اس کی کمر پر گرا، سفوف کمر پر گرنا تھا کہ کامنی کی دل دہلانے والی فلک شگاف چیخ نکل گئی۔

وہ قیصر کے سینے سے جھٹکے سے اٹھی اور کھڑکی سے باہر کود گئی۔

قیصر لپک کر لکڑی کے پاس پہنچا۔ کھڑکی کے باہر کا منظر انتہائی دہشت ناک تھا۔ کامنی کے بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ کچھ دیر تک اس کی چیخ و پکار جاری رہی پھر خاموشی چھا گئی اور آگ بھی غائب ہوگئی۔

قیصر نے سکون کا سانس لیا، رات کے اس پہر سناٹا تھا۔ قیصر کے علاوہ کسی نے بھی اس عورت کی آواز نہیں سنی تھی۔

اس رات کے بعد کئی دن گزر گئے پھر وہ عورت کامنی کبھی بھی قیصر کے کمرے میں نہیں آئی اور نہ کبھی راستے میں ملی۔ قیصر ملنگ بابا کا شکریہ ادا کرنے کئی بار بابا مکی شاہ کے مزار پر گیا لیکن وہ ملنگ بابا پھر کبھی اس کو وہاں دکھائی نہ دیئے، وہ حیران تھا کہ آخر بابا کہاں چلے گئے۔ قیصر کی صحت بھی روز بہ روز بہتر ہوتی چلی گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قاتل پیراہن

ایس حبیب خان-کراچی

نادیدہ قوت کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں اس کے قہر سے اچانک آئینہ چھناکے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگیا اور لڑکی کا گلا کسی کی گرفت میں آگیا اور دباؤ بڑھنے لگا اور بڑھتے بڑھتے اتنا شدید ہوگیا کہ لڑکی کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

کیا روحیں بھی پسند ناپسند کا حق رکھتی ہیں، اس حقیقت کو جاننے کیلئے یہ کہانی ضرور پڑھیں

آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ایک طوفان تھا جو خاموشی کی چادر اوڑھے آنسو کے ذریعے بہہ رہا تھا۔ یہ نرمین کا کمال ضبط تھا کہ وہ خاموش تھی ورنہ اس کا دل دھاڑے مار مار کر رونے کا چاہ رہا تھا۔ جہاز میں موجود پیسنجرز کی نگاہوں میں یہ سوال واضح تھا کہ اس کے آنسوؤں کی کیا وجہ ہے؟ مگر وہ سب سے بے نیاز آنسو بہا رہی تھی۔ وہ تو بس جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

وقار لئیق کا شمار دولتمند لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک بزنس مین تھے اور بہت بہترین انسان بھی، ان کی فیملی میں ان کے علاوہ بیگم طلعت، ایک بیٹی نرمین اور بیٹا فہد تھے۔ زندگی میں ہر لحہ انہوں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا تھا۔ ان کی فیملی میں ایک شخصیت اور تھیں بی بی جان، مگر ان کی جان اپنی بیٹی میں اٹکی رہتی تھی۔ نرمین نے اپنی پسند کی فیلڈ ''فیشن ڈیزائننگ'' کا انتخاب کیا، اور اس کی ڈگری باہر سے حاصل کرنے کا ارادہ اپنے باپ سے ظاہر کیا۔ نرمین کے منہ سے کوئی بات نکلے اور وقار لئیق اس کو پورا نہ کریں، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے باہر سے ڈگری حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔

اجازت ملنے کے بعد نرمین کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ایک طرف ڈگری حاصل کرنے کی خوشی تھی تو دوسری طرف اپنوں سے دور جانے کا غم، اس نے جانے سے پہلے اپنے آپ سے ایک عہد لیا کہ وہ پوری محنت اور لگن سے اپنی پڑھائی کرے گی اور اپنے پاپا کے بھروسے کو کبھی نہ توڑے گی اور اس نے اس عہد پر عمل بھی کیا۔ نرمین نے اپنی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر والوں کو خوشخبری دی کہ وہ فلاں تاریخ کو واپس آرہی ہے۔ مگر!! چند دن پہلے نرمین کو اپنی زندگی کی سب سے بھیانک حقیقت کا سامنا کرنا پڑا، اس قدر بھیانک کہ اس کی روح تک کانپ گئی۔ نرمین کے ماما، پاپا، اسے اور فہد کو اس بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ گئے! ایک زبردست کار ایکسیڈینٹ میں ان کی موت ہوگئی تھی۔ نرمین کے تو حواس ہی گم ہوگئے تھے۔ اس موقع پر اس کے ٹیچرز اور فرینڈز نے اس کو سپورٹ کیا اور فوراً واپس بھیجنے میں اس کی مدد کی۔ نرمین جہاز میں مسلسل اپنے ماں باپ کو یاد کر کے روئے جارہی تھی۔ جہاز لینڈ کر گیا اور وہ لاؤنج سے باہر آئی، وہاں بی بی جان کے برابر میں اس کی نظروں نے اپنے ماما، پاپا کو تلاش کرنا چاہا، مگر.....

بی بی جان نرمین کی دادی کی بہن اور وقار لئیق

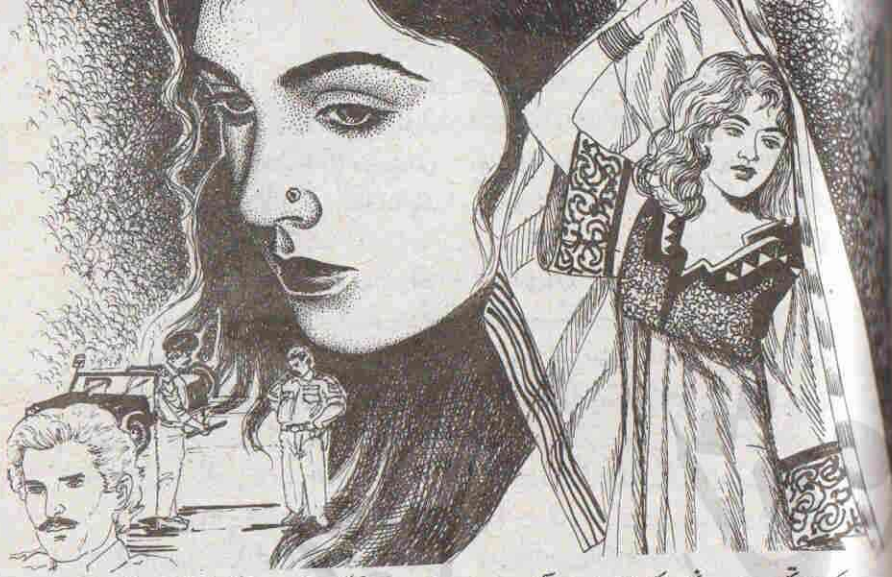

کی خالہ تھیں، اور وہ انہیں بھی اپنی ماں ہی سمجھتے تھے۔ بہت نورانی شخصیت تھی بی بی جان کی، اجلا سفید کرتا، پاجامہ، بڑی سی سفید چادر، دھیما انداز گفتگو، تسبیح تو ہر وقت حرکت کرتی تھی انکے ہاتھ میں، بہت عبادت گزار تھیں۔ وہ چلتی ہوئی نرمین کے پاس آئیں، نرمین گھٹنوں میں منہ دیئے ہلکے ہلکے سسک رہی تھی۔ ''نا میری بچی! ایسے نہیں روتے، جانے والوں کو اذیت ہوتی ہے رونے سے، تم انہیں تحفہ دو! جو انہیں چاہیے۔''

''کیسا تحفہ بی بی جان؟'' نرمین نے منہ اٹھا کر پوچھا۔ ''بیٹا نماز پڑھو، قرآن پاک پڑھ کر اس کا ثواب انہیں پہنچاؤ! یہ ہی تحفہ تو انہیں چاہیے ہوتا ہے۔'' پھر رک کر بولیں۔ ''بیٹا موت زندگی کی بھیانک مگر برحق حقیقت ہے! جس کا سامنا ہر انسان کو کرنا ہوتا ہے، تمہیں تو ماں باپ نے سمجھدار بنا دیا مگر فہد!، وہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے اور تمہارے علاوہ اس کا کوئی نہیں ہے، تم ہی ہمت ہاروگی تو اسے کون دیکھے گا بیٹا؟'' انہوں نے نرمین کو سمجھایا۔

''بی بی جان میں اتنی بڑی نہ سہی، مگر فہد اب میری ذمہ داری ہے اور میں پاپا، ماما کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی، میں اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی!'' نرمین نے ہتھیلی سے اپنے آنسو صاف کیے، پھر سوتے فہد کو پیار کیا اور وضو کر کے قرآن پاک پڑھنے بیٹھ گئی۔ بی بی جان کے لبوں سے اسے دیکھ کر نکلا۔ ''جیتی رہو! اللہ تمہیں ہمت اور صبر عطا کرے۔''

وقار لئیق کا بزنس ان کے پارٹنر مسعود احمد کے انڈر کامیابی سے چل رہا تھا۔ وہ بھی وقار لئیق کی طرح اچھے اور ایماندار انسان تھے۔ وقار صاحب کے بعد انہوں نے دونوں بچوں کو بالکل اکیلا نہیں چھوڑا، اور ہر طرف کی پریشانی کو اپنے سر لے لیا۔ اور وقار لئیق کا شیئر مقررہ وقت پر ان کے وارثوں کے ہاتھ پر رکھا۔ اس طرف سے تو بی بی جان اور بچے بے فکر تھے مگر ماں باپ کی موت کا صدمہ! اس سے نرمین بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ پھر ایک روز مسعود احمد نے نرمین سے بات کی۔ ''بیٹا تم نے باہر سے جو ڈگری حاصل کی ہے، اس کو کیا گھر بیٹھ کر ضائع کرو گی؟ بیٹا اسے اپلائی کرو! اس طرح تو تم وقار کی محنت کو ضائع کردو گی!'' یہ بات نرمین کے دل کو لگی اور اس نے اس طرف سوچنا شروع کردیا اور اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

مسعود انکل نے اس فیلڈ کے بہت سے لوگوں سے نرمین کو ملوایا اور نرمین نے کپڑے ڈیزائن کرنے شروع کردیئے۔ بہت سے سینئر ڈیزائنرز نے اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کام کو سراہا اور آہستہ آہستہ نرمین کا دماغ کھلتا گیا، وہ بہترین کپڑے ڈیزائن کرنے لگی۔ شروع شروع میں تو اس نے دوسرے ڈیزائنرز کے انڈر کام کیا اور جب اس کو تجربہ ہوتا گیا تو اس نے اپنا بوتیک کھولنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لئے سب سے پہلی چیز جگہ تھی۔

دو، تین جگہ دیکھنے کے بعد آخر اسے ایک جگہ پسند آ گئی۔ ''دیکھ لیں میڈم! جگہ کے حساب سے پیسے بالکل مناسب ہیں، ہم نے آپ سے گاہک والی بات نہیں کی، ورنہ تو نچلی منزل کے پیسے مل کر اور قیمت بنتی۔'' ایجنٹ نے مکاری سے کہا۔ ''پہلے میں دیکھ تو لوں؟'' نرمین نے کہا۔

''ہاں، ہاں بالکل۔'' ایجنٹ بولا۔

نرمین نے دیکھا نچلی منزل کیا تھی، بس تھوڑی سی جگہ تھی سامان رکھنے کی۔ پھر اس نے اللہ کا نام لے کر وہ جگہ لے لی۔ پھر اس نے اپنا سیٹ اپ کیا اور مسعود انکل اور بی بی جان کے ہاتھوں اپنے بوتیک کا افتتاح کروایا۔

نرمین اس روز مسلسل روئے جا رہی تھی اسے اپنے ماما، پاپا شدت سے یاد آ رہے تھے اگر آج وہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ مسعود انکل نے اس کی ہمت بندھائی اور نرمین نے کام شروع کر دیا۔ نرمین کے بوتیک پر دونوں طرح کے آپشنز تھے، کپڑے خریدنا اور رینٹ پر لینا پھر ایک روز نرمین نے نیچے سے پرانا سامان نکلوا کر جگہ خالی کرنے کا ارادہ کیا اور بندے بھی بلوا لیئے۔ کافی دیر بعد ایک بندہ اس کے پاس آیا ''میڈم ایک صندوق بھی ہے نیچے اس کا کیا کریں؟'' اس نے پوچھا۔

نرمین اس وقت مصروف تھی تو اس نے کہا۔ ''ایسا کریں وہ صندوق چھوڑ کر باقی کا فالتو سامان نکال دیں۔''

اب نرمین وقار کا نام مشہور ڈیزائنرز کے ساتھ آنے لگا تھا۔ وہ کتنی ذہین تھی، اس کا اندازہ اس کے کپڑوں سے بخوبی ہوتا تھا۔

دوپہر کے وقت نرمین نیچے آئی اور جب وہ واپس جانے لگی تو اس کی نظر اس صندوق پر پڑی، وہ چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور نیچے بیٹھ کر اس کو دیکھنے لگی۔ صندوق پر ایک تالا پڑا ہوا تھا جو کہ پورا سرخ رنگ کے دھاگے میں لپٹ کر چھپا ہوا تھا۔ اس نے تالا ہاتھ میں لے کر دھاگے کا سرا تلاش کیا اور اس کو کھولنا شروع کر دیا۔ جب دھاگے کا آخری سرا اس کے ہاتھ میں آیا تو کٹ! کی آواز کے ساتھ تالا خود بخود کھل گیا۔ ''جانے کتنا بوسیدہ ہو گیا ہے کہ خود ہی کھل گیا۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور صندوق کا ڈھکنا اوپر اٹھا دیا۔ صندوق میں ایک سرخ مخمل کا ڈبہ رکھا تھا۔ اس نے ڈبہ باہر نکالا اور اسے کھولنے لگی۔

ڈبے کے اندر ایک سرخ انار کے رنگ کا نفیس جوڑا موجود تھا۔ اس نے اسے باہر نکالا اور پھیلایا تو اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''اس قدر حسین جوڑا۔'' اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سرخ انار کے رنگ کا عروسی جوڑا تھا۔

فرشی غرارہ تھا بے حد گھیر والا جس پر سنہرے رنگ کا بہت باریک اور نفیس کام بنا ہوا تھا اور ساتھ ہی اس پر کندن جڑے ہوئے تھے۔ دوپٹہ بھی بہت خوبصورت تھا۔ سب سے زیادہ حسین اس کا بارڈر تھا۔ نرمین نے اسے سر پر اوڑھ کر دیکھنا چاہا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔ کوئی کلائینٹ تھی جو اپنے آرڈر کے بارے میں معلوم کر رہی تھی۔ نرمین اس سے باتوں میں لگ گئی اور پھر بات ختم کر کے جوڑا سمیٹ کر ڈبے میں رکھا اور اوپر آ گئی۔ نرمین کو لگ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہو۔ وہ جوڑا اس کے حواسوں پر سوار ہو گیا تھا اور رات کو بستر پر سوتے سوتے بھی اس کے بارے میں سوچتی رہی۔

اگلے روز اس نے اپنے بہترین اور تجربہ کار کاریگروں کو بلا کر وہ جوڑا انہیں دکھا کر ایسا کام بنانے کا کہا۔ کاریگر بہت غور سے اسے دیکھتے رہے اور پھر انہوں نے گردن ہلا کر صفائی سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا ''اب اس کام کے کاریگر ملنا بہت مشکل ہے۔ یہ سنہرا کام نہیں۔ اصلی سونے کے تاروں سے بنایا گیا کام ہے۔ وہ بھی اتنا

باریک! یہ نوابی اور پرانے دور کی بات ہے، اس زمانے میں صرف اس جوڑے پر لاگت ہی لاکھوں کی آئی ہوگی ''اور کپڑا ایسا تھا کہ خالص ریشم مٹھی میں لے لیا ہو!

نرمین کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ اس نے سوچا تھا ''اس ڈیزائن کے جوڑے وہ اپنی آنے والی برائیڈل کلیکشن میں رکھے گی۔'' پھر اس نے اس سے ملتے جلتے سوٹ بنوائے مگر وہ بالکل بے کار لگ رہے تھے۔ پھر اس نے سوچا۔ ''اس جوڑے کو بیچنا تو بے کار ہے کیونکہ یہ ڈیزائن دوبارہ ملنا ناممکن ہے اور رکھ کر کوئی فائدہ نہیں۔'' لہٰذا اس نے اس جوڑے کو منہ مانگی قیمت پر رینٹ پر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اسے پیسے بھی ملتے اور جوڑا بھی اس کے پاس رہتا۔

اس نے اس عروسی جوڑے کو ڈسپلے پر لگا دیا، جوڑے کا لگنا تھا کہ اس کے خریداروں کی بارش ہونی شروع ہو گئی۔ کوئی ایسا کام دوسرے کلر میں بنوانا چاہتا تھا، تو کوئی اس جوڑے کو ہی خریدنا چاہتا تھا، مگر نرمین نے صاف انکار کرتے ہوئے کہہ دیا۔ ''اس کے کاریگر ابھی دستیاب نہیں اور یہ صرف رینٹ پر دینے کے لئے ہے۔''

نرمین کو اس سرخ عروسی جوڑے کی پہلی کسٹمر مل گئی! ایک لڑکی اپنی ساس کے ساتھ آئی تھی وہ شادی کر کے باہر جا رہی تھی، اس نے وہ جوڑا کرائے پر لے لیا۔ شادی تین دن بعد تھی۔ ''شادی تو نہ ہوئی مگر شادی والے روز وہ اپنے بستر پر مردہ پائی گئی اور اس کی آنکھیں اذیت ناک حد تک پھٹی ہوئی تھیں اور چہرہ بگڑا ہوا تھا!''

نرمین کو جب جوڑا واپس کرنے اس کے گھر والے آئے تو انہوں نے یہ سب بتایا۔ جسے سن نرمین کو بہت دکھ ہوا۔

نرمین کو جب ایسا دوسرا جوڑا نہ ملا تو اس نے اپنے نام سے اس کو برائیڈل شو میں پیش کیا اور شو اسٹاپر کو وہی جوڑا پہنایا۔ سب سے زیادہ داد اس جوڑے کو ملی۔ مگر ماڈل چینجنگ روم میں مردہ پائی گئی اس کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔

نرمین نے دنیا زمانے کے کاریگروں سے رابطہ کیا مگر کسی نے ہاں نہ کی۔ کچھ نے اسے دیکھ کر کچھ جوڑے بنائے، مگر وہ سب نرمین کو بے کار معلوم ہو رہے تھے۔

نرمین کسی سے فون پر بات کر رہی تھی کہ اس کو اپنی پشت پر کسی کے گلا کھنکھارنے کی آواز آئی۔ نرمین نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ایک نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ نرمین نے اسے اشارے سے انتظار کرنے کا کہا اور بات ختم کر کے بولی۔ ''یس، واٹ کین آئی ڈو فور یو؟''

''دراصل مجھے ایک جوڑا چاہیے، شادی کا جوڑا۔'' نوجوان نے جھجکتے ہوئے کہا وہ کافی نروس ہو رہا تھا۔

''آپ آرام سے بتائیں آپ کو کس قسم کا جوڑا چاہئے؟'' نرمین نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''اصل میں بات یہ ہے کہ میری پوری فیملی باہر ہے۔ اور میرے کزن کی شادی ہے اور اس کے گھر میں بھی کوئی لیڈی نہیں ہے۔ اس لئے اس نے شادی کا جوڑا لانے کی ذمہ داری مجھے دے دی۔ اور مجھے اس بارے میں بالکل بھی آئیڈیا نہیں ہے!'' نوجوان نے تفصیل سے نرمین کو بتایا۔

''اوکے! آیئے میں آپ کو گائیڈ کرتی ہوں، ویسے آپ کے کزن کو اپنی ہونے والی بیوی کی پسند تو معلوم ہوگی؟ اس سے جوڑا پسند کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔'' نرمین نے کہا۔

''بس اس نے کہا تھا کہ کچھ الگ سا ہو، خوبصورت سا!''

''اوکے!'' پھر نرمین نے بہت طرح کے جوڑے اس نوجوان کو دکھائے مگر اس نوجوان کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ''میں تو کنفیوز ہو گیا ہوں کہ کیا لوں اور کیا نہیں؟ آپ بتائیں اگر آپ یہاں سوٹ لینے آئی ہوتیں تو کیا پسند کرتیں؟'' نوجوان نے نرمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں! اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو صرف اور صرف وہ سوٹ لیتی۔'' نرمین نے انگلی سے اسی سرخ عروسی جوڑے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ نوجوان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے ڈسپلے پر لگا ہوا جوڑا دیکھا اور بولا۔ ”بیوٹی فل! آپ نے اتنا خوبصورت جوڑا پہلے کیوں نہیں دکھایا۔“

نرمین نے اس کو بتایا کہ۔ ”یہ جوڑا بیچنے کا نہیں ہے ہاں اگر آپ چاہیں تو اسے رینٹ پر لے سکتے ہیں۔“

”رینٹ پر؟ تو پھر میں اپنے کزن سے بات کر کے آپ کو انفارم کردوں گا۔ آپ پلیز! کسی اور کو بک نہیں کیجئے گا۔ یہ میرا کارڈ رکھ لیں آپ، میرا نام عاشر ہے۔“ اور نوجوان چلا گیا۔

نرمین نے کارڈ بغیر پڑھے اپنے پرس میں ڈال دیا۔ اگلے روز عاشر وہ سوٹ لینے آ گیا۔ نرمین نے ایڈوانس لیا اور جوڑا اس کے حوالے کردیا۔ ”یہ لیجئے آپ کا انویٹیشن آپ بھی شادی میں آیئے گا، آپ نے میری بہت ہیلپ کی ہے!“ عاشر نے ایک کارڈ اسے دیتے ہوئے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو میرا کام ہے۔“ نرمین نے کہا۔

”آپ آئیں گی تو خوشی ہوگی۔“ اور پھر عاشر چلا گیا۔

نرمین نے کارڈ گھر لے جا کر ڈال دیا۔ بی بی جان نے دو دن بعد نرمین کو کارڈ کا یاد دلایا تو نرمین بولی۔ ”میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟ میں تو کسی کو جانتی تک نہیں۔“

”بیٹا اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کوئی خلوص سے دعوت دے تو سمجھو اس نے عزت دی ہے۔ تمہیں جانا چاہئے۔ آگے مرضی تمہاری۔“ بی بی جان نے نرمین کو سمجھایا۔

شام کو نرمین شادی میں جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ سی گرین سوٹ میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی، وہ تقریب میں چلی تو گئی مگر اس کو بہت عجیب لگ رہا تھا کیونکہ سب چہرے اجنبی تھے۔ ”ارے نرمین آپ یہاں؟“ اچانک آنے والی آواز پر اس نے بائیں جانب دیکھا تو وہ ”ماہا“ تھی۔ اس سے ملاقات بلکہ تھوڑی بہت دوستی ہوئی تھی نرمین کی انگلینڈ میں۔ ماہا اپنے بیٹے کو گود میں اٹھائے اس کے پاس آئی۔ ”کب آئیں انگلینڈ سے؟“ نرمین نے مختصراً اسے بتایا۔

”اوہ آئی ایم سوری!“ وہ بولی ”اور تم کب آئیں۔“

”میں کل ہی آئی ہوں۔“

”ہیلو مس نرمین! مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ آئیں گی، مگر یہ آپ کا بڑا پن ہے کہ آپ نے آ کر ہمیں عزت بخشی، ریئلی بہت خوشی ہوئی۔“ یہ عاشر کی آواز تھی۔

”پھر تو آپ کو میری بی بی جان کو شکریہ کہنا چاہئے۔ جنہوں نے زبردستی مجھے یہاں بھیجا۔“ اور وہ تینوں مسکرانے لگے۔ ”اوہ! میٹ مائی سسٹر ماہا۔“ عاشر نے تعارف کروایا۔ تو دونوں زور سے ہنسنے لگیں۔ ”عاشر! شی از مائی فرینڈ۔“ ماہا نے عاشر کو بتایا اور ان کی باتیں ہوتی رہیں۔

لڑکے والے تو بہت دیر سے آئے ہوئے تھے مگر دلہن والوں کا کہیں پتہ نہیں تھا، سب انتظار کر رہے تھے اور پھر سارے میں شور مچ گیا۔ ”لڑکی اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی ہے!“

تقریب فوراً ختم ہوگئی اور سب دلہن والوں کی طرف جانے لگے۔ نرمین بھی افسوس کرتی گھر آ گئی۔

دو، تین روز بعد عاشر وہ جوڑا واپس کرنے آیا اور پے منٹ کرنے لگا۔ ”نو! مسٹر عاشر اس کی ضرورت نہیں ہے!“ نرمین نے منع کیا۔ ”مگر آپ کا۔“

”نہیں! میں نے کہا ناں، آپ رکھ لیں پیسے۔“ اور عاشر نے اصرار نہیں کیا۔ ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں دلہن کو کیا ہوا تھا؟“ نرمین نے سوال کیا۔

عاشر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”غزل جس کی شادی تھی، وہ کمرے میں تھی، جب اس کی بہن پھول لے کر آئی تو غزل اوندھے منہ ڈریسنگ ٹیبل پر گری ہوئی تھی، جب اس کی بہن نے اس کو اٹھایا تو وہ لرز گئی، غزل کا پورا منہ کھرچا ہوا تھا، اور وہ مردہ تھی۔“ عاشر نے نرمین سے اجازت لی اور

وہاں سے چلا گیا۔

چند دن بعد۔ ”دیکھئے آپ پلیز مان جائیں!“ وہ مسلسل انسسٹ کر رہی تھی مگر نرمین نے وہ جوڑا بیچنے سے انکار کردیا۔ پھر لڑکی اور اس کی ماں جوڑا رینٹ پر لینے کے لئے راضی ہوگئیں۔ نرمین کو شرمندگی بھی ہوئی کیونکہ مسز حیدر اس کی پرانی کسٹمر تھیں اور وہ جوڑا لے کر چلی گئیں۔

دو دن بعد ایک لڑکا وہ جوڑا واپس کرنے آیا اور پے منٹ کردی۔ ”کیوں مسز حیدر نہیں آئیں آج؟“ نرمین نے سوال کیا۔

”وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ لڑکے نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔

”ایسا کیسے ہوا؟“ نرمین تقریباً اچھل پڑی۔ جس دن بہن کی شادی تھی، وہ اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی، جب کمرے میں لڑکیاں گئیں تو وہ اپنے کمرے میں دلہن بنی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی، ممی کا ہارٹ فیل ہوگیا۔“

یہ منحوس خبر سنا کر لڑکا چلا گیا، مگر نرمین اس کے جانے کے بعد سوچنے لگی۔ ”آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟ ایسا بھیانک اور عجیب اتفاق کیسے ہوسکتا ہے؟“ نرمین کو عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی، جو کہ کیوں ہو رہی تھی اس کی وجہ سے نرمین سمجھنے سے قاصر تھی۔

ایک ہفتے بعد نرمین کے ایک کسٹمر نے وہ عروسی جوڑا رینٹ پر لے لیا۔ دو دن بعد نرمین اپنے بوتیک میں تھی، دوپہر میں وہ فری ہوئی تو اخبار لے کر بیٹھ گئی۔ اس میں گزشتہ رات کا ایک حادثہ پڑھ کر وہ سن ہوگئی۔ یہ اسی کسٹمر کی خبر تھی۔ جو عروسی جوڑا رینٹ پر لے کر گیا تھا۔ ”شادی کے روز بستر پر دلہن مردہ پائی گئی، دلہن کے گلے پر خوفناک قسم کے نشانات تھے جو گوشت میں پیوست ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ نرمین نے اخبار ایک طرف رکھا۔

”مس نرمین وقار آپ ہیں؟“ سامنے ایک پولیس انسپکٹر موجود تھا۔

”جی ہاں! میرا ہی نام نرمین ہے!“ اس نے کہا۔

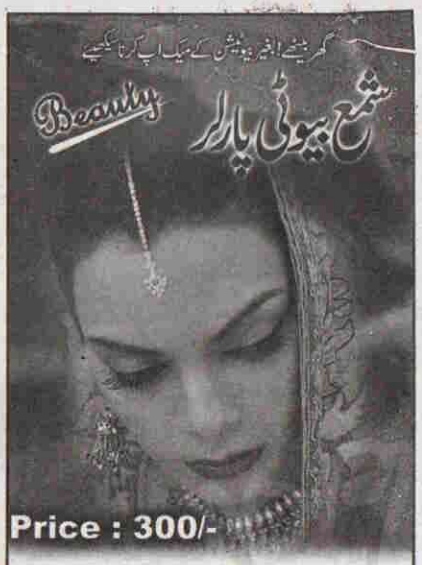

میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟۔

جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں نکھار، دلکشی نظر آتی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں ہر خواتین کا اپنا ہنر، سلیقہ اور نفاست بھی ظاہر ہوتا ہے۔

پیاری بہنیں! ایک بیوٹیشن ہونے کے ناطے، میں کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے کی لئے تربیت اور پریکٹس ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے سہارے کے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک اپ کے فن میں ماہر ہونے کے لئے پیاری بہنوں کے لئے یہ کتاب بڑی تگ و دو اور محنت شاقہ سے تیار کی گئی ہے۔ بڑی حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے میک اپ میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت ہاتھ پیروں کی حفاظت، بناؤ سنگھار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ صحت مند رہنے کے راز بھی اس کتاب میں درج ہیں۔

صابری دار لکتب
قذافی مارکیٹ اردو بازار لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بی بی آپ سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔ اب تک جتنی بھی لڑکیاں دلہن کے روپ میں مردہ پائی گئی ہیں، ان سب نے آپ کے بوتیک کا ہی جوڑا زیب تن کیا ہوا تھا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "سرخ انار کے رنگ کا عروسی جوڑا!"

نرمین میں کے دماغ میں کرنٹ دوڑنے لگا۔ "تو یہ الجھن تھی جو میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی، میں نے تو اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ کہ ان سب نے یہ ہی جوڑا پہنا تھا۔" پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"لک! آفیسر یہ تو ایک اتفاق ہے۔ میرا بوتیک سب کو سروس پر وائیڈ کرتا ہے۔ چاہے کوئی کپڑے خریدے یا رینٹ پر لے، میں کسی کو بھی ذاتی طور پر نہیں جانتی۔ لوگ کپڑے لیتے ہیں اور پے منٹ کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ میرا تعلق نہیں ہوتا ان لوگوں سے۔" نرمین نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"کوئی مسئلہ ہے مس نرمین؟" نرمین نے دوسری طرف دیکھا تو وہاں عاشر کھڑا تھا۔

انسپکٹر نے جو اس طرف دیکھا تو جلدی سے کھڑے ہو کر سیلوٹ کیا۔ "سر آپ؟"

"ہاں! میں تو یہاں سے گزر رہا تھا کہ آپ کی گاڑی یہاں دیکھ کر آ گیا۔ مس نرمین ہماری فیملی فرینڈ ہیں!" عاشر نے کہا۔

"سر میں تو نارمل انکوائری کر رہا تھا، اب جبکہ آپ انہیں جانتے ہیں تو..... او کے مس نرمین میں چلتا ہوں۔" انسپکٹر نے جلدی سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

"ہوں! مسٹر عاشر مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ اتنی بڑی شخصیت ہیں۔" نرمین نے عاشر سے کہا۔

"اب ایسی بھی کوئی خاص شخصیت نہیں ہے میری، ویسے یہ معاملہ ہے کیا؟" عاشر نے کہا۔

میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا۔" نرمین بولی۔

"یہ جوڑا کہاں سے بنوایا تھا آپ نے؟" عاشر نے پوچھا۔

"یہ دراصل مجھے اس بوتیک میں پہلے سے موجود ایک صندوق سے ملا تھا۔" اس نے عاشر کو بتایا۔

"تو پھر اس جگہ کے پرانے مالک کو ڈھونڈھنا پڑے گا۔" پھر انہوں نے اس مالک کو تلاش کر کے اس سے بات کی۔

اس آدمی نے بتایا۔ "یہ صندوق جانے کتنا پرانا ہے۔ یہ ہمیں اپنے گھر کے اسٹور روم سے ملا تھا، مگر ہماری دادی نے امانت سمجھ کر اسے کبھی نہیں کھولنے دیا، مگر ان کے انتقال کے بعد ہم نے اس کو کھول لیا۔ اس میں سے یہ جوڑا نکلا، میرا بھی کیونکہ کپڑے کا کاروبار تھا، میں نے اس کو منہ مانگی قیمت پر بیچ دیا۔ مگر اس کو پہننے والی مر گئی اور پھر ان لوگوں نے یہ مجھے واپس دے دیا۔ پھر تو یہی ہونے لگا۔ اس درمیان میرے بیٹے کی شادی طے ہو گئی اور میں نے یہی جوڑا اپنی بہو کو دیا اور وہ جس حالت میں مری تو پھر مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے ضرور، میں نے اس کے بارے میں معلومات کروائیں اور پھر حقیقت یہ سامنے آئی کہ جوڑا پہننے کے لئے نہیں ہے۔ میں نے اس کو صندوق میں رکھ کر عمل کروا کر اس کو بند کر دیا۔ پھر جب میں نے دکان بیچی تو شاید یہ وہیں رہ گیا۔"

وہاں سے بھی ان دونوں کو کچھ خاص معلوم نہ ہوا۔ نرمین عاشر کو اپنے ساتھ ضد کر کے گھر لے آئی۔ اور نوکر سے چائے لانے کا کہا۔ دونوں بیٹھ کر اس بارے میں بات کرنے لگے۔ "مسٹر عاشر مجھے تو یقین نہیں ہے کہ ایسا سب اس جوڑے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ساری اموات ایک اتفاق ہے۔ لوگ تو جانے کیا کیا باتیں کرتے ہیں، آپ کی رائے کیا ہے؟" نرمین نے عاشر سے سوال کیا۔

مگر عاشر کی طرف سے جواب نہ سن کر اس نے دیکھا تو عاشر سامنے دیکھ رہا تھا، وہاں بی بی جان کھڑی تھیں۔

"آپ کب آئیں؟" نرمین نے ان کو دیکھ کر کہا۔ مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کافی غصے میں لگ رہی تھیں۔

پھر وہ بولیں۔ "میں نے تمہاری ساری بات سن لی ہے! نرمین اگر تمہارے ماں باپ نہیں ہیں تو کیا، میں بھی کیا مر گئی تھی؟ اگر ایسی کوئی چیز ملے جو کچھ الگ ہو تو کسی بڑے سے پوچھنے کی زحمت نہیں کر سکتے تم بچے!"

"بی بی جان میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔" نرمین نے سر جھکا کر کہا۔

"خاموش ہو جاؤ! زیادہ عقلمند سمجھنے لگی ہو تم خود کو؟ جانتی ہو! کتنی بڑی حماقت کر چکی ہو! خیر مناؤ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ تم بچ گئیں!" بی بی جان غصے سے پھٹ پڑیں۔

نرمین کو نہیں مگر انہیں اس معاملے کی نزاکت کا احساس تھا۔ نرمین دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور رو رو کر ان سے معافی مانگنے لگی۔ بی بی جان ایک دم موم ہو گئیں۔ "بیٹا یہ کوئی عام معاملہ نہیں ہے۔ جس طرح تمہاری باتیں سنی ہیں میں نے! تم لوگ تو ان چیزوں پر یقین بھی نہیں کرو گے۔ خیر اب تم اس جوڑے کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔ جب تک میں اس مسئلے کا حل نہ ڈھونڈ لوں۔"

اگلے روز وہ اپنے جاننے والے حافظ صاحب کے پاس گئیں مگر حافظ صاحب نے انہیں بتایا کہ "اس طرح کا عمل ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ کو میں معلوم کر کے بتاتا ہوں۔" پھر انہوں نے بی بی جان کو بتایا۔ "ایک بہت بڑے اللہ والے ہیں، مگر یہاں نہیں، فلاں جگہ، اس مشکل کے لئے آپ کو سفر کر کے وہاں جانا پڑے گا۔ اور ان کی ہدایت ہے کہ مصیبت کی جڑ کو بھی ساتھ لے جانا ہوگا۔"

بی بی جان نے نرمین اور عاشر کو ساری باتیں بتا دیں۔

عاشر نے بی بی جان سے ساتھ چلنے کی ضد کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا کوئی رشتہ دار نہیں مگر اس نیک کام میں آپ کی مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی۔" اور عاشر کے زور دینے پر وہ مان گئیں۔

دوسرے دن عاشر نرمین اور بی بی جان مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئیں۔

بہت لمبی قطار تھی حاجت مندوں کی جو جانے کہاں کہاں سے اپنی مشکلیں لے کر آئے ہوئے تھے۔ ان تینوں کی باری آتے آتے شام ہو گئی، پھر انہیں اندر بلوایا گیا۔

"حضرت! میری بچی ایک مشکل میں پھنس گئی ہے، آپ سے التجا ہے کہ ہماری مشکل حل کریں۔" بی بی جان نے کہا۔

"ہماری کیا مجال جو ہم کسی مشکل کو حل کر سکیں، یہ شان میرے پروردگار کی ہے، اس پاک ذات کو صرف یہ اختیار ہے۔" بزرگ نے آسمان کی جانب انگلی اٹھا کر کہا۔ اور ان تینوں نے بے اختیار کہا۔ "بے شک!"

پھر بی بی جان نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی تو بزرگ کچھ دیر بعد بولے۔ "ہم اسے دیکھیں گے پھر آگے کچھ کریں گے" "اس جوڑے کو یہیں چھوڑ جائیں! پرسوں جمعرات کو مغرب کے بعد آنا۔"

عاشر نے سب کا ٹھہرنے کا انتظار کروایا۔ وہ لوگ جمعرات کو مغرب کے بعد ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

حضرت پہلے تو خاموش رہے پھر بولے۔ "بند تھی وہ مگر کسی کی نادانی سے آزاد ہو گئی۔"

"کون حضرت؟" بی بی جان نے سوال کیا۔

"آنکھوں سے دیکھو گے؟ لو دیکھو!" اور یکا یک ان تینوں پر غنودگی طاری ہو گئی۔ انہیں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی اور ہی جگہ موجود ہیں۔

نواب حشمت علی خان اپنی اکلوتی صاحبزادی مہربانو کو دیکھ رہے تھے جو اس وقت بے خبر سو رہی تھی۔ مہربانو ان کے آنگن کا اکلوتا چراغ تھی، بے حد حسین، مغرور اور نواب حشمت علی خان کے لاڈ پیار نے اسے خود سر بنا دیا تھا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آ کر اپنی بیگم سے مہربانو کے بارے میں بات کرنے لگے۔

خاندان کے بہت سارے لوگوں کی یہ دلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خواہش تھی کہ مہر بانو ان کی بہو بن جائے کیونکہ مہر بانو کے ساتھ ساتھ نواب حشمت علی خان کی ساری جائیداد بھی ملتی۔ اور ان تمام امیدواروں میں جو نام سرفہرست تھا وہ مہر بانو کے پھوپھی زاد دل آور کا تھا۔ مگر اس نام کے بارے میں کسی نے بھی ہاں نہیں کی کیونکہ سب جانتے تھے کہ دل آور نہایت ہی مکار، چالاک اور فضول قسم کا تھا اور مہر بانو، وہ تو اسے اپنے لائق ہی نہیں سمجھتی تھی کیونکہ وہ بالکل عام سی شکل وصورت کا تھا۔

مہر بانو کا جھکاؤ اپنی خالہ کی طرف تھا، ساتھ ہی مہر بانو کے گھر والوں کا بھی کیونکہ اس کا خالہ زاد نواب شہریار علی خان نہایت ہی سلجھا ہوا لڑکا تھا اور سب سے اہم جو مہر بانو کو لگتا تھا وہ اس کی خوبصورتی، پیغامات تو بہت آئے ہوئے تھے مگر فیصلہ شہریار علی خان کے حق میں ہوا اور یوں دونوں کی شادی طے ہوگئی۔ دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں زور وشور سے شروع ہوگئیں۔ نواب شہریار علی نے شادی کے جوڑے کے لئے جانے کہاں کہاں سے کاریگروں کو بلوایا اور کہا۔ ”ایسا جوڑا بناؤ جو کسی کے پاس نہ ہو!“ اور واقعی جب جوڑا تیار ہوا تو وہ اتنا شاندار تھا کہ دیکھنے کے قابل۔ مہر بانو نے جب وہ جوڑا دیکھا تو غرور سے اس کی گردن تن گئی اور اس نے اکڑ کر کہا۔ ”میری شان ہی ایسی ہے کہ یہ جوڑا میرے لئے بنا!“

مگر کسی کے دل پر تو سانپ لوٹ رہے تھے وہ دل تھا دل آور کا، جسے حسد، جلن اور ہاتھ سے نکلتی مہر بانو اور اس کی بے شمار جائیداد کی خلش کی کروٹ چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ آخر کار اس کے شیطانی دماغ نے شہریار کو راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا، اور اس کام کے لئے اس نے شادی والے دن کا انتخاب کیا تاکہ فوری اپنی خدمات پیش کر کے مہر بانو سے شادی کر سکے۔

منظر بدلا، مہر بانو سرخ انار کے رنگ کے عروسی جوڑے میں کسی اور ہی دنیا کی لگ رہی تھی، زیورات سے لدی، سجی سنوری ہر کوئی اس کی بلائیں لے رہا تھا اور مہر بانو کا غرور انتہا پر پہنچ رہا تھا وہ پازیب چھنکارتی ہوئی آئینے کے سامنے آئی۔ آئینہ دیکھ کر اسے اپنے آپ پر غرور آنے لگا۔ اور اس نے ایک بھنوں کو کمان کی طرف چڑھایا اور بولی۔ ”میرے حسین وجود نے اس جوڑ کو عزت بخشی ہے، یہ بنا ہی صرف میرے لئے ہے اور کسی کو اسے پہننے کا حق نہیں۔“

سب بارات کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا، پھر بارات تو نہ آئی مگر نواب شہریار علی خان کا جنازہ آ گیا، مہر بانو پر خاموشی طاری ہوگئی اور اس نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا، سب اسے آوزیں دے رہے تھے جبکہ نواب حشمت علی خان پاگلوں کی طرح دروازہ پیٹ رہے تھے۔ ”مہر بیٹا! دروازہ کھولو!“

مگر دروازہ نہیں کھلا۔ آخر تھک کر دروازہ توڑنے کا فیصلہ کیا گیا اور دروازہ توڑ دیا گیا۔ اندر مہر بانو عروسی لباس میں بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر جب نواب حشمت علی خان نے مہر بانو کو چھوا تو وہ ایک جانب گر گئی، اس کے ہونٹوں کے کنارے خون کی لکیر سے سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے شہریار علی خان کے غم میں جان دے دی تھی۔

نواب حشمت علی خان نے جو بیٹی کو دیکھا تو وہیں دل پکڑ کر گر گئے کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔

تین تین جنازے ایک ساتھ اٹھے، پورا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

مہر بانو کی والدہ کی حالت بھی بہت خراب تھی۔ وہ ہر وقت اپنے کمرے میں رہتیں اور مہر بانو کا عروسی جوڑا سینے سے لگائے اس کی یاد میں روتی رہتیں۔

جب تک نواب خاندان باقی رہا تو کچھ نہ ہوا کیونکہ وہ جوڑا ان کی بیٹی کی آخری نشانی تھا۔

منظر بدلا، ہجرت کے مناظر سامنے آئے۔ کچھ لوگ ہندوستان سے چلے گئے۔ کچھ آ گئے۔ ان سب میں وہ جوڑا جانے کہاں کہاں گھوما۔

ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور پھر بی بی جان، نرمین

اور عاشر تینوں ہوش کی دنیا میں واپس آ گئے۔ اور ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

پھر حضرت کی آواز آئی۔ ”نواب زادی مہر بانو کا دل اور روح اس جوڑے میں رہ گئی۔ اس کے لئے وہ صرف جوڑا نہیں بلکہ شہریار علی خان کی نشانی ہے جو صرف اس نے مہر بانو کے لئے بنوایا تھا۔ مرنے کے بعد بھی وہ اس جوڑے کی ملکیت سے دستبردار نہیں ہوئی اور اسے پہننے والے کو اس جرأت کی سزا اس نے موت کی دی۔“ اور حضرت خاموش ہوگئے۔

دلہن کے روپ میں سجی نرمین سر سے پیر تک لرز رہی تھی۔ اس کے جسم پر وہی سرخ انار کے رنگ کا عروسی جوڑا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے آئی اور پھر شیشے میں پانی کی طرح لہریں اٹھنے لگیں۔ نرمین نے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں۔ مگر لہریں بنا نہ رکیں اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ رکیں تو آئینے میں ایک عکس نظر آنے لگا۔ مگر یہ نرمین کا اپنا عکس نہ تھا۔ وہ تو کوئی اور تھی بے حد حسین، سنہرے بال، نیم وا آنکھیں سبز رنگ کی، گھنیری پلکیں، دودھیا رنگت جو کہ انار کے سرخ رنگ کے عروسی جوڑے میں اٹھ رہی تھی۔

نرمین پر سحر طاری ہونے لگا۔ ”کیوں ہوش گم ہوگئے میرے حسن کے جادو سے! میرا حسن دیکھ اور بول کیا تیرا وجود ہے اس قابل، جو میرا جوڑا پہننے کی گستاخی کی تو نے؟ نہیں ناں!“ وہ بہت زور سے دھاڑی۔ نرمین کی سٹی گم ہو رہی تھی۔

”تیری جرأت ہوئی کیسے؟ میرے اس جوڑے کو اپنے ناپاک وجود پر پہننے کی۔“ اس کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں اور اس کے قہر سے آئینہ چھناکے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگیا، نرمین کو لگا کہ اس کا گلا کسی انوکھی گرفت میں آ گیا اور دباؤ بڑھنے لگا اور بڑھتے بڑھتے اتنا شدید ہوگیا کہ اس کو اپنی سانسیں رکتی محسوس ہونے لگیں۔ اور پھر وہ کسی انوکھی طاقت کے جھٹکے سے پیچھے ہوا میں اچھل کر دور جا پڑی۔ نرمین نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور وہ اٹھ کر جب پلٹی تو دھک! سے رہ گئی اس نے بڑی مشکل سے تھوک حلق میں نگلا۔

مہر بانو اس کے بے انتہا قریب کھڑی تھی۔

تڑاخ کی آواز کے ساتھ ایک بھرپور تھپڑ نرمین کے منہ پر پڑا۔ نرمین چکرا کر بیڈ پر جا گری، اس کی باچھوں سے خون جاری ہونے لگا۔ ”بچ! تیری ہمت کیسے ہوئی میرے جوڑے کو اپنے گندے وجود پر پہننے کی۔“ مہر بانو کی سوئی اسی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔

وہ قہر برساتی آگے بڑھی مگر وہ ایک جھٹکے سے رک گئی اور آگے کے بجائے پیچھے کی جانب کھنچنے لگی۔ اس نے خوف سے ادھر ادھر دیکھا اور ساتھ ہی بری طرح چیخنے لگی۔ کوئی اندیکھی گرفت اسے جکڑے ہوئے تھی۔ پھر وہ جس کی گرفت میں تھی وہ شخصیت سامنے آ گئی۔ نورانی وجود لئے وہ اللہ کے کلام کی تلاوت کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر مہر بانو کی ساری اکڑ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی، اس کا انداز بالکل بدل گیا۔

”مجھے معاف کر دیجئے! جانے دیں مجھے۔“ اس کے انداز میں التجا تھی۔

حضرت نے آنکھیں بند کر لیں اور ان کے ایسا کرتے ہی مہر بانو کے وجود میں آگ بھڑک اٹھی اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرنے لگی۔

نرمین نے عروسی جوڑا حضرت کی ہدایت کے مطابق لا کر ان کے سامنے رکھ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں بھی آگ بھڑک اٹھی۔

ایک ماہ بعد بی بی جان سے عاشر اور نرمین کی شادی کی بات ماہا طے کر رہی تھی اور کچھ دنوں میں شادی ہونا تھی۔ نرمین نے اپنی شادی کا جوڑا ہاتھ میں لیا، مگر اس کے ذہن پر اب بھی ”وہی جوڑا“ سوار تھا۔ کیسے بھول سکتی تھی، وہ اس کو اب بھی یاد تھا۔ نرمین نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سوچا۔ ”کس قدر حسین تھا وہ۔ ”سرخ انار کے رنگ کا عروسی جوڑا!!!“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چندرا دیوی

ایم الیاس

بارہویں قسط

خوف و ہراس پھیلاتی، ذہن پر سکتہ طاری کرتی، حیرت انگیزی کی دھوم مچاتی، جور و ستم کی بجلی گراتی، کالی شکتیوں میں تھلکہ مچاتی، لہولہان وادی کی پگڈنڈیوں پر دوڑتی بھاگتی، جادوئی کرشمہ سازیاں دکھلاتی، دل و دماغ پر ڈر کا سکہ بٹھاتی، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چنگھاڑتی، ہر پل ہر سو ہیبت ڈھاتی، اپنی نوعیت کی انوکھی کہانی۔

پرتحیر کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ذہن سے محو نہ ہونے والی ایک اچھوتی کہانی

''**کیا** کہا......؟'' جگن ناتھ کی سٹی گم ہوگئی اس کے سارے جسم میں خوف و دہشت کی لہر کسی خنجر کی نوک کی طرح اتر گئی۔ اس کی ساری مسرت کافور ہوگئی۔ اس نے سنبھل کر پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''یہ کیا بات ہوئی...... ایک طرف تم مجھے سپنا دکھا رہے ہو۔ دوسری طرف مجھے موت کی بھینٹ اتارنا چاہتے ہو...... تمہاری یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

''اس لئے کہ جب تک تم میرے ہاتھوں مارے نہ جاؤ اس وقت تک وہاں کے مزے لوٹ نہیں سکتے......'' خونی مجسمہ بولا۔ ''تمہارے مرنے کے بعد تمہاری آتما وہاں چلی جائے گی۔ پھر تمہاری آتما وہاں سے کبھی بھی نکل نہ سکے گی...... میری دیوتا سے یہ سوگند ہے کہ اس سپنوں جیسی دنیا میں جس کسی کو سدا تک رکھنا ہے میرے ہاتھوں اس کی موت واقع ہوگی۔ ویسے کچھ دنوں کے لئے مرے بغیر بھی رکھ سکتا ہوں...... جیسے میں نے پرکاش مہرہ کو رکھا تھا۔ لیکن تمہیں اس دنیا میں زندہ رہنا دیکھنا نہیں چاہتا......؟''

''وہ کس لئے......؟'' جگن ناتھ نے پھنسی پھنسی آواز میں پھر کہا۔ ''میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے......؟ کیا جرم کیا ہے؟''

''اس لئے کہ تم ایک نہایت ہی ذہین اور باصلاحیت اور بہت سارے علوم کے ماہر ہو...... تمہارا زندہ رہنا میرے لئے نہ صرف خطرناک بلکہ مصیبت کا باعث بن سکتا ہے...... تم واحد شخص ہو جو میرے بارے میں معلومات کر سکتے ہو...... میں نہیں چاہتا کہ دنیا والوں کو میرے بارے میں علم ہو کہ میں کیوں اور کس لئے اس دنیا میں آیا ہوں۔ ایک نیا جنم لیا ہوں۔''

''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میری موت کے لئے تم یہ ساری باتیں کر رہے ہو......؟ جھوٹ بول رہے ہو...... فریب دے رہے ہو...... ایسی سپنوں کی دنیا کہیں نہیں جس کے بارے میں تم بتا رہے ہو۔ مجھے تمہاری کسی بات کا یقین نہیں......''

جگن ناتھ کا خیال تھا کہ اس کی کھری کھری باتیں سن کر مجسمہ غصے میں آجائے گا اور اسے موت کی بھینٹ چڑھا دے گا...... لیکن مجسمہ مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''تم بوڑھے اور دکھی نہ ہوتے تو میں تمہیں درندگی سے موت کے گھاٹ اتار چکا ہوتا...... میری سچائی جاننا چاہتے ہو...... میں تمہیں تھوڑی دیر کے لئے اس دنیا میں لے جا رہا ہوں۔ پھر وہاں سے واپس لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آؤں گا تاکہ تم جان لو کہ میں نے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں..... اس تھوڑی دیر میں تم بہت کچھ جان لو گے..... کہ یہ سپنا نہیں ایک حقیقت ہے۔ تم آنکھیں بند کرلو۔"

جگن ناتھ نے اس کی بات آزمانے کے لئے آنکھیں بند کرلیں..... لیکن اس کے دل کے کسی کونے میں ایک لرزہ خیز خیال نے جنم لیا کہ کہیں اس بہانے وہ اسے مارنا تو نہیں چاہتا ہے..... یہ دیکھنے کے لئے اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی..... لیکن وہ کھول نہ سکا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے اس مجسمہ کی آواز سنی۔ "اب تم اپنی آنکھیں کھول دو....."

جگن ناتھ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اپنے آپ کو ایک خوب صورت اور آراستہ کمرے میں پایا۔ اس کے سامنے اتنی بڑی مسہری تھی جس پر نرم و گداز بستر بچھا ہوا تھا۔ ایسا کمرا اس نے خواب میں کیا تصور میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس مسہری کے عقب میں جو کھڑکی تھی اس کا پردہ ہٹا تھا..... اس نے بہت ساری رنگین، چھوٹی اور بڑی مچھلیاں تیرتی ہوئی دیکھیں..... جو اوپر کی سطح اور تہہ میں جارہی تھیں۔

معاً اس کی نگاہ ایک بہت بڑی آبنوسی الماری پر پڑی جس میں خوب صورت اور چھوٹے بڑے مجسمے بھرے تھے..... اس لمحے وہ اپنے آپ کو بھول گیا۔ وہ تجسس اور اشتیاق کے زیر اثر الماری کی طرف بڑھا تو اسے لگا کسی نادیدہ طاقت نے اپنی طرف کھینچا ہو۔ جب وہ سامنے پہنچ کر رکا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اسے یقین نہ آیا۔

یہ نوادرات اور مجسمے کسی قیدیوں کی طرح جھانک رہے تھے..... مسکرا رہے تھے جیسے زندہ ہوں..... اس کے تین خانوں میں جو ہر سائز کے ہیرے جواہرات رکھے تھے اس نے ششدر کردیا تھا۔ وہ خواب ناک نظروں سے دیکھنے لگا۔

اس وقت وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ مجسمے کا پتا نہیں تھا۔ پھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ کمرے میں ایک تیس برس کی پرشباب گداز بدن کی عورت داخل ہوئی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی اس کی دنیا میں تھی۔ اسے بے حجابی کی حالت میں دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا۔ اس نے قریب آکر جگن ناتھ کا ہاتھ تھاما تو اس کے بوڑھے اور کمزور جسم میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔

وہ عورت اس کو ایک کمرے میں لے آئی۔ اس الماری میں سے ایک شراب کی بوتل نکال کر پلائی۔ شراب پیتے ہی اسے لگا وہ پھر سے سترہ اٹھارہ برس کا جوان ہوگیا۔ اس نے اپنے اندر ایسی بے پناہ قوت محسوس کی وہ عورت پر ٹوٹ پڑا..... پھر عورت اسے ایک کمرے میں لے آئی جہاں اس عورت کو ملا کر بیس حسین اور پرکشش لڑکیاں موجود تھیں..... وہ سب اس حالت میں تھیں جس حالت میں عورت تھی..... اس وقت مجسمہ کمرے میں آگیا اور بولا۔

"اب تمہیں میری بات کا..... یہ دوشیزائیں اور عورتیں تمہاری سیوا کریں گی..... یہ سورگ عورتوں کو..... اچھا اب واپس چلو..... آنکھیں بند کرلو..... عمر مرنے کے تم مرنے کے بعد یہاں ہوگے....."

چند لمحوں کے بعد وہ اپنے کمرے میں تھا۔ جگن ناتھ اس پر پہنے کا نہیں حقیقت کا گمان ہوا۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتا۔ مجسمے نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔

☆.....☆.....☆

ہندوستان میں ایک سے ایک گائیکی موجود تھا۔ فلمی دنیا کے گلوکاروں نے ملک بھر میں دھوم مچا رکھی تھی..... لیکن یہ آواز کیا تھی.....؟ اس نے کبھی اپنی زندگی میں ایسی مسحور کن آواز نہیں سنی تھی..... اس آواز میں نہ صرف مدھر پن تھا بلکہ سات سروں کی دنیا آباد تھی۔ ہر سو قوس قزح کا ایک رنگ تھا..... اس نے حیرت سے سوچا کہ ونود ریڈیو، فلم اور ٹی وی ہو کسی نغمہ سرا کیوں نہ ہوا۔ اگر وہ شوبز کی دنیا میں چلا جائے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں تہلکہ مچا سکتا ہے۔ لیکن اس

نے اپنی مہارت، خوبی اور فن سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا؟ کیا اس لئے کہ وہ دولت مند ہے.....؟ اسے کسی چیز کی کمی نہیں ہے.....؟ اپنی آواز کو روشناس نہ کرانا حیرت کی بات تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ نہ صرف دولت مند بلکہ شہرت کا مالک ایسی شہرت کسی کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔

ونود کھنہ ایک گیت بڑے جذباتی انداز سے گا رہا تھا۔ پونم اس کے سامنے بیٹھی اس کی آواز کے سحر میں ڈوب رہی تھی۔ اس کی آواز جادو جگا رہی تھی۔ پونم آنکھیں بند کئے سن رہی تھی..... ونود کھنہ کی نظروں کی گرفت میں پونم کا سراپا تھا۔ وہ اس حسن و شباب کی حشر سامانیاں نظروں میں جذب کررہا تھا۔ پونم کی سرکش جوانی، اس کا البلتا شباب اور اس کے انگ انگ سے ابلتی مستی کسی ناگن کی طرح اسے ڈس رہی تھی۔

یہ گیت ایسا تھا کہ اس کے پس پشت اظہار محبت تھی..... لیکن پونم نے محسوس کیا کہ اس میں کوئی اور جذبہ کارفرما ہے۔ یہ گیت اس کے جذبات کے ابھار رہے تھے جیسے ونود کھنہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی آواز اور گیت سے متاثر ہو کر اس کی جھولی میں کسی پکے پھل کی طرح گر جائے۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اپنے جذبات پر قابو نہ پاتی۔

اس گیت کے آخری مصرعہ نے پونم کو چونکا دیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ونود کھنہ کی آنکھوں میں ہوسنا کی بھری محسوس ہوئی۔ لیکن سولہ بے حد رومانی اور جذباتی تھی۔ مرنے کے بعد بھی تم سے پیار کروں گا۔

"مرنے کے بعد پیار کروں گا....." پونم بولی۔

"کیا مرنے کے بعد پیار کیا جاسکتا ہے.....؟ کیا آسمان پر یا پریوک میں....."

"ایک شاعر نے اپنے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔" ونود کھنہ بولا۔

"یہ گیت..... پراگندہ شعروں سے بھرا ہوا ہے۔" پونم بولی۔ "یہ سفلی جذبات کی بھرمار ہے..... یہ ایک فلم کا گیت ہے۔ آج کل فلموں میں ایسے گانوں اور گیتوں کی بھرمار ہے..... جس سے نئی نسل خراب ہورہی ہے۔"

"یہ وقت کا تقاضا ہے....." ونود کھنہ نے کہا۔ "آج کل کے نوجوانوں کو ایسے ہی گیت من بھاتے ہیں۔"

"یہ وقت کا تقاضا کیا ہوتا ہے.....؟" پونم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ فلموں میں جو بے ہودہ، لچر اور عریاں مناظر ہوتے ہیں وہ برائی کی طرف اکساتے ہیں کہ وہ بھی وقت کا تقاضا ہے.....؟ ویسے آپ کی آواز بہت سندر ہے۔ مسحور کن ہے۔ آپ نے شوبزنس کی دنیا میں قدم کیوں نہیں رکھا.....؟ میرا خیال ہے کہ آپ فلم، ٹی وی اور ریڈیو پر آئیں تو دھوم مچادیں۔"

"اس تعریف کا بہت بہت شکریہ۔" ونود کھنہ نے کہا۔ "میں نے کبھی اس دنیا میں جانے کا نہیں سوچا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری آواز اتنی اچھی ہے۔ چوں کہ آپ نے میری بہت تعریف کی ہے لہٰذا میں سوچوں گا۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

ونود کھنہ نے محسوس کرلیا تھا کہ پونم کا جھکاؤ اس کی طرف غیر محسوس انداز سے ہورہا ہے۔ لہٰذا اس گیت کے بول پونم پر جادو کردیں گے لیکن اس کا یہ جادو نہ چلا۔ وہ مایوس بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ میدان عشق تھا۔ محبت میں ہار اور جیت ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے اس کے ذہن میں تدبیر آئی تو اس نے پونم کو آزمانے کے لئے موضوع بدلا۔

"کل مجھے ایک بے حد ضروری کام سے ممبئی سے جانا پڑ رہا ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں..... نہیں....." پونم کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلا۔ وہ پریشان سی ہوگئی۔

"جب تک یہ نمائش ہے اس وقت تک کے لئے..... میں تمہارے اور شاستری کی رہائش کے لئے ہر طرح کا انتظام کرجاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "کسی بات کی کمی اور ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ لہٰذا کسی چنتا کی ضرورت پیش نہیں آئے گی....."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا ہم دونوں تمہارے بغیر یہاں رہیں گے.....؟" پونم کے چہرے پر ایک خوف کی سی لہر ابھری.....ایک ان جانے خیال نے اسے ڈسا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں..... شاستری کوئی فائدہ نہ اٹھائے۔ گو کہ اسے اپنے اوپر بھروسا تھا۔ شاستری پر بھی.....لیکن وہ یہ بات جانتی تھی کہ مرد اور ناگ کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ اکیلی عورت ہونے کا خیال مرد کو بہکا دیتا ہے۔

"میں نے کہا نا کہ میری غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ شانتی رکھو۔" ونود نے اسے دلاسا دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے ونود.....!" پونم نے فکرمندی سے کہا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ تمہاری جدائی میرے لئے سوہان روح بن جائے گی۔"

ونود کھنہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کے مخملیں شانے تھام لئے اور اسے کھڑا کر دیا۔ پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"میری جدائی تمہارے لئے ناقابل برداشت ہے تو میرے ساتھ چلو..... یہ میری دلی خواہش ہے کہ تم میری ہم سفر ہو.....تاکہ تمہاری رفاقت میں یہ سفر رنگین اور حسین ہو جائے..... میں یہ بات کہہ رہا ہوں تو تمہیں برا تو نہیں لگ رہا ہے.....؟"

پونم نے لمحے کے لئے سوچا کہ..... اس سے دریافت تو کرے کہ وہ کہاں اور کتنے عرصے کے لئے..... کیوں جا رہا ہے..... واپسی کب ہوگی.....اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ "کب روانگی ہوگی؟"

"کل علی الصباح....." ونود کھنہ نے جواب دیا۔ "میں روانگی کا پروگرام دو دن قبل ہی بنا چکا ہوں۔"

پونم.....شاستری اور ونود کھنہ کو صرف دوست اور ساتھی سمجھتی تھی۔ ابھی اس نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ کس کو اعتماد میں لے اور جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کرے..... ونود کھنہ سے وہ زیادہ متاثر تھی اس کے باوجود وہ اپنا دل، جیون اور مستقبل اس کے چرنوں میں رکھ دے۔

ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو شاستری کے قریب نہ پاتی.....اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح سے وہ شاستری سے یہ کہے کہ وہ ونود کے ساتھ جانا چاہ رہی ہے..... یہ بات اسی طرح سے اس کے علم میں لانا چاہتی تھی کہ شاستری کچھ محسوس نہ کرے اور اس کی دل آزاری نہ ہو.....ونود کھنہ کے ساتھ سفر کرنے کا تصور بڑا خوش گوار، سنسنی خیز اور فرحت بخش تھا۔ محبت کا اقرار بھی تو ممکن تھا.....

ونود کھنہ نے اس کا بشرہ بھانپ کر کہا۔ "تم اس کشمکش میں مبتلا ہو کہ اس حالت میں شاستری کو چھوڑ کر جانا مناسب نہیں ہے۔ شاستری کو بڑا دکھ ہوگا..... اسے تکلیف پہنچے گی۔ تم شاید یہ سوچ رہی ہو کہ اسے کس طرح اطلاع دی جائے۔" میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے جو تمہاری اس مشکل کو حل کر دے گی۔ تم اس سے صاف صاف کہہ دو کہ میں ونود کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

"مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" پونم نے کہا۔

"اس کے سامنے جا کر یہ بات کہوں گی تو جانے کیا سمجھے....."

"پھر ایسا کرو کہ ایک چٹھی اس کے نام لکھ دو..... یہ ایک آسان سیدھا سادا سا طریقہ ہے۔" ونود کھنہ کے لہجے میں خود غرضی نمایاں تھی۔

پونم کو ایسا لگا کہ وہ زندگی کے چوراہے پر کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کدھر جائے.....کیا کرے..... وہ بڑی بے بس اور مجبور سی ہے.....ونود کھنہ کے لہجے میں ایک طرف خود غرضی تھی اور وہ جیسے اسے حکم دے رہا تھا کہ اس کی بات، مشورے اور تدبیر پر عمل کرے.....آنکھیں بند کر کے.....لیکن وہ کسی کا حکم سننے کی عادی نہیں تھی۔ اسے ونود کھنہ کا یہ انداز اور لب و لہجہ سخت ناگوار لگا تھا۔ اس کی بے اختیاری قابو میں نہیں رہی تھی اور اعتماد کو چھینا جا رہا ہو۔ ایک دم سے اسے جیسے ہوش آ گیا ہو۔

اس نے چونک کر ونود کھنہ کی طرف دیکھا۔ وہ

اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے چکا تھا اور اس کے چہرے پر جھک رہا تھا.....اور اس کے ہاتھ جسم پر رینگ رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کھن کھجورے رینگ رہے ہوں..... اور پھر ونود کھنہ کی سانسیں اس کے چہرے کو جھلسا رہی ہوں.....اس نے محسوس کیا یہ سانس کسی مرد کی نہیں ہے۔ اس میں مرد کی سی خوشبو نہیں ہے.....ایک ناگوار سی بو ہے.....شاستری نے جب کبھی بھی اس کے ہونٹوں میں اپنے ہونٹ پیوست کئے تھے اس نے شاستری کو سانسوں میں کوئی بو محسوس نہیں کی تھی.....ایک مرد کی بو..... بے خود کر دینے والی اور خود سپردگی پیدا کر دیتی تھی..... اس ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں یہ خیال کسی سانپ کی طرح اس کے دل میں سرسرایا.....وہ ونود کھنہ کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی ہے..... وہ ایک بے حد پراسرار اور مشکوک سا شخص لگتا ہے.....اس کی دولت کیا ہے.....؟ وسائل کیا ہیں۔ اس کی آمدنی کا ایسا کون سا ذریعہ ہے جو ایک پرتعیش زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس میں خود نمائی اور تکبر بھی ہے..... کیا اسمگلر ہے.....؟ منشیات فروش ہے.....؟ مافیا ہے.....؟ وہ اپنی دولت کے زعم دوسروں کو اطاعت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ چاہتا ہے کہ لوگ زر خرید غلاموں کی طرح اس کے ہر حکم کو مانیں اور عمل کریں۔

اس سے پہلے کہ ونود کے ہونٹ اس کے ہونٹوں کو چھوتے وہ اس کے بازوؤں کی گرفت سے تڑپ کر نکلی۔

پونم نے کمرے میں آ کر سنگار میز کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال اور لباس کو درست کیا۔ ونود کھنہ کے ہاتھوں نے جسے بے ترتیب کر دیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ ونود کھنہ نے اسے کسی سحر میں گرفتار کر دیا تھا۔ اگر وہ اس سحر میں مبتلا رہتی تو اس وقت اپنا سب کچھ کھو دیتی.....اسے جیسے کسی نادیدہ ہستی نے ہوش میں لا دیا۔ ورنہ وہ اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کرنے والی تھی۔

وہ خط لکھنے کے لئے میز پر بیٹھی تو اس نے محسوس کیا کہ ونود کھنہ کی اس حرکت سے اس کے دل میں جس نفرت نے جنم لیا تھا اس پر ونود کھنہ کی محبت غالب آ گئی ہے..... اس محبت کے زیر اثر وہ شاستری کے نام خط لکھنے کے لئے قلم اور پیڈ اٹھایا.....اس کے سامنے دیوار میں جو آئینہ نصب تھا اس میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا تو تب نہ جانے کیوں اس کے دل کے کسی کونے میں ونود کھنہ کے لئے نفرت کی لہر اٹھی۔ اس نے کاغذ اور قلم ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اٹھنے والی تھی کہ اس کے دل میں کوئی اسے خط لکھنے پر مجبور کرنے لگا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ نفرت اور محبت کی کشمکش کیا ہے۔ پھر اس کی نفرت پر محبت کی شدت غالب آ گئی۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ جلدی سے خط ختم کر کے وہ ونود کھنہ کے کمرے میں جائے..... پہلے تو اپنی حرکت پر ندامت کا اظہار کرے۔ ونود کھنہ نے پیش قدمی کی تو وہ بھی پوری خود سپردگی سے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے۔ وہ بے تاب سی ہو رہی تھی کہ کب خط اختتام کو پہنچے اور اس کے پاس جائے۔ اس نے خط لکھنے کے بعد اسے بلند آواز پڑھا.....آخری سطر میں اس نے لکھا تھا۔ امید ہے کہ تم مجھے شاکر دو گے.....

جیسے ہی اس کی زبان سے یہ جملہ ادا ہوا اس کے ساتھ ہی شور شرابے اور دھماکے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

پونم ایک دم سے اچھل پڑی.....اسے ایسا لگا تھا کہ کوئی دو آدمی آپس میں لڑ رہے ہوں..... اور ایک دوسرے پر چیزیں پھینک رہے ہوں۔ پونم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کوٹھی میں اتنے سارے ملازمین موجود ہیں۔ کس شخص میں اتنی ہمت ہے کہ کوٹھی میں گھس کر ونود کھنہ..... کہیں شاستری سے نہیں لڑ رہے ہیں.....؟ شاستری سے لڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ ونود کھنہ ہو سکتا تھا۔

پونم فوراً ہی بجلی کی سرعت سے کمرے کی دہلیز پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ جہاں سے ہال کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ اس نے جو منظر دیکھا تو اسے نظروں پر یقین نہیں آیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکل کر خاموش فضا میں بکھر گئی۔

ونود کھنہ اور خونی مجسمہ ہال میں آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ پہلوانوں کی طرح گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ وہ خونی مجسمہ پتھر کا نہ تھا بلکہ کسی گوشت پوست کے انسان کی طرح تھا۔ اس کا جسم اس قدر سخت مضبوط اور صحت مند دکھائی دیتا تھا کہ جیسے وہ آہنی انسان ہو..... حیرت کی بات یہ تھی کہ ونود اس کے جسم پر اس طرح سے مکے برسا رہا تھا جیسے وہ ربڑ کا بنا ہوا ہو..... مجسمہ کی انگلیوں نے ونود کی گردن کو ہاتھوں کے شکنجے میں کس رکھا تھا جیسے وہ اسے ختم کر دینا چاہتا ہو۔ ونود کی گردن اس قدر سخت تھی کہ وہ اس کا گلا گھونٹ نہ پا رہا تھا۔

پونم کی دل خراش چیخ سن کر وہ دونوں ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لڑائی لمحے کے لئے رک گئی۔

مجسمے نے پونم کی طرف دیکھا اور اس نے اپنی گرفت کمزور کر دی تو ونود کی گردن آزاد ہو گئی۔

مجسمے نے اسے زور سے دھکا دیا کہ وہ اس طرح لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا جیسے پلاسٹک کا گڈا ہو۔ وہ فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔

مجسمہ زینے کی طرف برقی سرعت سے لپکا۔ راستے میں ونود آیا تو اسے ایک لات ماری تو وہ گیند کی طرح اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔

جب مجسمہ نے زینے پر ایک قدم رکھا تو پونم کے اوسان خطا ہو گئے اور اسے خود پر قابو نہ رہا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹی تو دیوار سے جا لگی..... اس نے اپنے کمرے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو اسے لگا اس کے پیر نہ صرف بلکہ منوں بھاری ہو گئے ہیں۔ وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی..... کمرے میں جا کر پناہ لینے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ کیوں کہ کمرے کا دروازہ توڑنے اور گرانے کے لئے اس کا صرف ایک ہی مکا کافی تھا۔ دروازہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

مکان سے باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ اوپر نہ تھا..... وہ بالکنی سے چھلانگ لگا کر کود بھی نہیں سکتی تھی۔ نیچے البتہ دو ایک راستے تھے۔ لیکن وہ جاتی کیسے..... کیوں زینے پر سے مجسمہ اوپر اور اس کی طرف آ رہا تھا۔

مجسمہ کے چہرے پر نہ تو غصہ تھا اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں ہونا کی..... پونم کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ جیسے اس کی عزت لوٹنے آ رہا ہو..... اگر اس کی نیت ایسی ہوتی تو بشرے اور آنکھوں سے صاف ظاہر ہو جاتا۔ جب مجسمہ اس کے قریب پہنچا تو وہ چکرائی اور مجسمے کے بازوؤں میں جھول گئی..... وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی تھی۔

وہ نیم بے ہوشی کی سی حالت میں تھی..... دیکھ رہی تھی..... محسوس کر رہی تھی..... وہ اس قدر دہشت زدہ ہو گئی کہ اس کی آغوش سے نکلنے کے لئے کوئی جدوجہد نہ کر سکی تھی..... اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالے کر دیا تھا..... مجسمے کی سانسیں گرم گرم تھیں لیکن ان میں ایک فرحت سی تھی..... اس کا لمس بڑا انوکھا اور لطیف سا تھا..... اس کے ہونٹوں میں مٹھاس تھی..... اس کے ہونٹ..... چہرے..... لبوں گردن کے نیچے رقص کرتے رہے..... وہ بے خودی سی ہوئی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ حد سے تجاوز کرنے والا ہے..... لذت اور ایسا سرور کیف تھا کہ اسے روکنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔

اچانک نیچے سے ونود کھنہ ہذیانی لہجے میں چیخ پڑا۔

"اوبہرام..... راجا رام..... شنکھو..... شوتم....."

مجسمہ جو حد سے تجاوز کرنے والا تھا ان الفاظ نے جادو کا اثر کیا اور یک لخت مجسمے نے اپنے بازوؤں سے پونم کو آزاد کر دیا تھا۔

ونود کھنہ فوراً ہی زینہ طے کر کے اوپر آ گیا۔ اس نے پھر سابقہ الفاظ دہرائے۔

پونم نے اس بات کی کوشش کی وہ کسی ایسی جگہ چھپ جائے کہ مجسمہ کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ لیکن کہاں چھپے اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کمرے میں رکھی الماری کے پیچھے اتنی جگہ تھی کہ وہ با آسانی چھپ سکتی

تھی۔ جب وہ الماری کی طرف بڑھی تو مجسمہ نے اسے دیکھ لیا۔ اسے پکڑنے کے لئے لپکا۔ ایک قدم بڑھایا تھا کہ ساڑی میں اس کا پیر آ گیا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ فرش پر بکھر گئی۔ وہ زور زور سے سسکیاں لینے لگی اور اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اب نہ تو اس کی عزت محفوظ ہو سکتی ہے اور جان..... مجسمہ اس کی بے حرمتی کر کے اسے جان سے مار دیگا۔

مجسمہ اس کے پاس فرش پر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کا لباس بے ترتیب ہو رہا تھا..... ساڑی کا پلو سینے اور شانے سے ڈھلک کر فرش پر بکھرا تھا..... اس کی ساڑی گھٹنوں سے اوپر تک کھسک آئی تھی..... وہ بے حجابی کی سی حالت میں پڑی تھی جس سے مرد کے جذبات بھڑک سکتے..... مجسمے نے اس کے چہرے اور سراپا پر ایک غلط نگاہ ڈالی اور اس پر جھک کر بولا۔

"تم نہایت حسین ہو..... اتنی حسین کہ کسی راج کماری کی طرح..... تمہاری تو پرستش کرنی چاہئے۔"

پونم نے جواب نہیں دیا۔ وہ جواب کیا دیتی..... دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم خوف زدہ اور پریشان نہ ہو دیوی.....! نہ صرف تمہاری عزت بلکہ زندگی بھی محفوظ رہے گی....." مجسمہ نے اسے دلاسا دیا۔ "میں ونود کی طرح سیاہ کار اور بدکار نہیں ہوں..... لیکن حسن کا پرستار ہوں۔ میں تمہیں صرف پیار کروں گا۔"

مجسمہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ پونم نے اس کے لہجے میں اور آنکھوں میں سچائی محسوس کی..... اس نے ونود کھنہ کے بارے میں غلط نہیں کہا تھا..... وہ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔

"تھوڑی دیر پہلے وہ بے ہودہ اور فحش گیت سنا کر تمہارے جذبات بھڑکا رہا تھا۔ اگر میں نے دیکھ اور محسوس نہ کر لیا ہوتا تو تم اس کی درندگی کا نشانہ بن چکی ہوتیں..... یہ میں تھا جو وہاں غائبانہ طور پر موجود تھا اور اس کے منتر کا توڑ کرتا رہا۔ اگر میں اس کی تلاش میں نہ آیا ہوتا تو تم اس کی ہوس کی نذر ہو چکی ہوتیں..... تم اس ذلیل اور کمینے سے ہوشیار رہنا..... وہ بھیڑیا صفت ہے....."

پھر اس نے پونم کا خوب صورت، سڈول اور مرمریں ہاتھ تھام لیا..... اس میں نہ صرف ملائمت تھی بلکہ چاہت کا سا انداز تھا اور آنکھوں میں محبت تھی..... چہرے پر نہ تو ہونا کی تھی اور اس کی کسی بات اور حرکت سے درندگی محسوس ہوئی..... مجسمہ نے ونود کھنہ کے بارے میں جو کچھ بھی کہا تھا وہ غلط نہ تھا..... ونود نے اس کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔

پونم کی دہشت میں کمی آ گئی تھی..... مجسمہ اس کے چہرے پر جھک گیا..... اس کے ہونٹ پونم کے چہرے، لبوں..... عریاں مرمریں بانہوں..... گردن کے نیچے طواف کرتے رہے..... آخر میں اس کا بوسہ طویل ترین تھا۔ وہ ایک عجیب سے نشے اور کیف میں ڈوب گئی..... یہ نشاط انگیز لمحات اس کے لئے جیسے یادگار تھے..... وہ اس کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ اسے حد سے تجاوز کرنے سے روک نہیں سکتی تھی..... مجسمہ نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

"اب تم جا سکتی ہو....." مجسمہ نے کہا۔ "میں نے تمہیں جی بھر کے پیار کیا وہ میرے لئے سرمایہ ہے۔"

وہ بال اور لباس درست کر کے زینہ اترنے لگی۔ وہ ونود کھنہ کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ مجسمہ نے جی بھر کے اس کے ساتھ من مانیاں کیں..... نیچے ونود کھنہ نامانوس زبان میں چلا رہا تھا۔ وہ مجسمہ کے ساتھ نیچے پہنچی تو اس کی جسامت کے عقب میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ اس وقت نظر آیا جب مجسمہ کا ہاتھ اس پر پڑا اور لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔

اس وقت بہت سارے لوگوں کا شور بلند ہوا..... لوگ زور زور سے دروازے پیٹ رہے تھے۔ مجسمہ تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ صرف ایک پل میں غائب ہو گیا۔ اس کا وجود نہیں رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ونود کھنہ نے دروازہ کھولا تو دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں سے ہال بھر گیا تھا۔ ایک آدمی تیزی سے زینہ پر چڑھ کر سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آیا۔ پھر وہ پونم کی طرف بڑھا۔ پونم پر ایسا نشہ اور سرشاری طاری تھی کہ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنے آپ کو مجسمے کے بازوؤں کے حصار میں محسوس کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ مجسمے کے بوسوں کی بوچھاڑ ابھی بھی ہو رہی ہے۔

"جان..... جان تمنا.....! جان دل.....! کیا ہوا!" اس کے کانوں میں ایک تحیر زدہ سی آواز گونجی۔

"پونم جیسے اس سحر سے نکل آئی۔ اس نے چونک کر اس آواز کی طرف دیکھا جو مانوس اور دل میں اتر جانے والی تھی۔

یہ شاستری تھا..... پونم کو اس بات پر حیرت، دکھ اور افسوس ہوا تھا کہ یہ شاستری کیوں تھا..... وہ کیوں اور کس لئے آیا تھا..... اسے آنے کی کوئی ضرورت نہ تھی..... اسے اپنے کمرے میں آرام کرنا چاہئے تھا۔

اور پھر یہ مجسمہ کیوں اور کس لئے آیا تھا.....؟ ونود کھنہ کی جان لینے.....؟ وہ ونود کھنہ کو زیر نہ کر سکا..... شاید زیر کر لیتا اور جان سے ختم کر دیتا دروازے پر ونود کے سارے ملازمین نہ آ جائے اور شور نہ کرتے..... کاش.....! وہ کچھ دیر نہ آتے..... ان لوگوں نے نہ صرف اس کا رنگین سپنا چھین لیا بلکہ کیف و سرور کے لئے اسے جہاں سے نکال لیا جس سے وہ کبھی آشنا نہ ہوئی تھی۔

ونود..... کیسا ہے ونود کھنہ.....!" پونم نے سرگوشی میں دریافت کیا۔

"آپ ٹھیک ہیں سر.....!" لیکن ناموس اور بھاری آواز ونود کھنہ سے مخاطب تھی۔

"ونود.....! ونود.....!" پونم نے شاستری کے سہارے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ اس کا سارا جسم درد کر رہا تھا..... جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن اس میں میٹھا میٹھا سا درد بھر گیا تھا۔ مجسمے نے تو اسے کسی گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔

پونم نے جب نیچے آ کر تشویش کا اظہار کیا اس ناموس اور بھاری آواز نے اسے دلاسا دیا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں..... یہ بالکل ٹھیک ہیں..... انہیں کچھ نہیں ہوا..... آپ بالکل پریشان نہ ہوں....."

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں..... بھگوان کرے۔ ایسا ہی ہو۔ میں تو دل میں بہت ڈر گئی تھی۔"

پونم نے گہری سانس لے کر کہا اور شاستری کے سہارے ہال کی طرف بڑھی..... اسے مجسمے نے منع کیا ہوا تھا کہ ان رنگین لمحات کے بارے میں وہ ونود کو بالکل بھی نہ بتائے۔ اس کا راز میں رہنا ہی بہتر ہے۔

"آپ نے مجھے پہچانا مس پونم.....!" انسپکٹر جگ دیپ نے کہا۔ "میں انسپکٹر جگ دیپ ہوں۔"

"جی ہاں....." پونم نے رسمی انداز میں سر ہلا دیا۔ "نمسکار....."

"مس.....!" انسپکٹر جگ دیپ نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ "کیا آپ مجھے بغیر کسی ڈر اور خوف کے بتائیں گی کہ کیا ہوا تھا..... آپ بے فکر رہیں..... اب وہ مجسمہ یہاں آنے سے رہا....."

"مجسمہ.....؟" پونم صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

اس کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا وہ کیسے اور کیوں کر ایک اجنبی مرد کو بتا سکتی تھی..... یہ سب صرف اور صرف کسی رازدار دوست یا سہیلی کو ہی بتایا جا سکتا تھا..... مجسمہ کے تصور نے اس کی زبان گنگ کر دی تھی..... اور پھر مجسمے نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کسی کو بھی اس واقعے کے بارے میں نہیں بتائے گی..... مجسمہ کی شخصیت سحر زدہ سی تھی۔ اس کا ہاتھ میں ہاتھ لینا جس میں بڑی ملائمت اور گداز سا تھا..... اس کی محبت بھری نظریں جس میں ہوسناکی بالکل بھی نہ تھی..... اور پھر اس نے اپنے بوسوں سے اس کا چہرہ، سراپا اور بانہیں تک چوم لی تھیں..... اس کی سانسیں کیسی فرحت بخش تھیں..... وہ اکیلی اور اس کے رحم و کرم پر

تھی۔ اس کے باوجود اس کی عزت پر آنچ نہیں آئی تھی۔ لیکن اس کے بوسوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

اس انسپکٹر کے ساتھ سنیل داس بھی آیا ہوا تھا۔ وہ بولا..... "کیا..... کہاں وہ یہاں آیا تھا.....؟" سنیل داس نے سوال کیا تو اس کا لہجہ نہ صرف تحیر زدہ تھا بلکہ غیر یقینی بھی.....

پونم نے چونک کر سنیل داس کی طرف دیکھا۔ پھر سوچا۔ یہ یہاں کیا لینے آیا ہے.....؟

"ہاں..... ہاں..... وہ یہاں آیا تھا....." پونم نے جواب دیا۔ "وہ مجسمہ زندہ ہو کر انسان کے روپ میں ڈھل گیا تھا یا ممی کہہ لیں..... وہ گوشت پوست کا دکھائی دیتا تھا۔ سچ مچ کا آدمی....."

"کیا آپ نے اسے واقعی دیکھا.....؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ "کہیں یہ آپ کا واہمہ تو نہیں ہے.....؟"

اس کے چہرے..... رخساروں..... اور عریاں بانہوں اور گردن کے نیچے گہرے گہرے سرخ نشان تھے۔ کسی نے اس پر غور نہیں کیا..... اگر وہ بتاتی کہ یہ مجسمہ کے ہونٹوں کے نشان ہیں۔ اس نے اسے بے تحاشا چوما تھا۔ اس کی بات کا یقین نہ کیا جاتا..... البتہ شاستری کو شک ہوتا کہ وہ حرکت یقیناً ونود کی ہے۔ اسے یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت نہ تھی۔

"جی ہاں..... یہ حقیقت ہے کہ میں نے اسے دیکھا..... میں کوئی بچی نہیں ہوں جو آپ میری بات پر یقین نہیں کر رہے ہیں۔" وہ تنک کر بولی۔ اس نے مسٹر ونود کھنہ پر بھی حملہ کیا تھا۔ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے تھے۔"

"کیا.....؟ اس نے ونود کھنہ پر حملہ کیا تھا.....؟"

شاستری نے جس لہجے میں یہ سوال کیا تھا پونم نے اس سے اندازہ کیا کہ اس مجسمہ کے زندہ ہو جانے سے شاستری کو اتنا اچنبھا نہیں جتنا ونود کھنہ پر حملہ کرنے سے..... اس بات کو صرف تینوں ہی سمجھ سکتے تھے۔

شاستری اور سنیل داس نے نظروں ہی نظروں میں دیکھ کر کچھ کہا..... لیکن یہ حرکت پونم کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہی۔ "لیکن اس مجسمے نے ایسا کیوں کیا.....؟" وہ انسپکٹر سے کہنے لگا۔ "وہ صرف مسٹر ونود کھنہ کو ختم کرنے آیا تھا..... اگر اسے گھر کے کسی فرد کو نقصان پہنچانا مقصود ہوتا تو وہ مجھے یا مس پونم کو نقصان پہنچا سکتا تھا..... ملازموں میں سے کسی اور کو..... صرف مسٹر ونود کھنہ کو یہ ایک معمہ ہے..... انسپکٹر! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو تھیوری ہم نے آپ کو پیش کی وہ غلط ثابت ہوئی..... میں حیران ہوں کہ ایسا کیوں ہوا.....؟ اس بات نے تو دماغ الٹ دیا ہے۔"

"قیدیوں کے ساتھ یہی مصیبت ہے۔" انسپکٹر کا لہجہ فکرمندی سے بھر گیا۔ وہ بسا اوقات غلط بھی ہو جاتی ہیں..... اس لئے ان کے متعلق وثوق سے کوئی بات نہیں کہی جاتی ہے..... اس طرح موسم کو لے لیں۔ ان کے متعلق جو پیشین گوئی کی جاتی ہے وہ کبھی درست ثابت نہیں ہوتی..... لہٰذا محکمہ موسمیات بہت بدنام ہے۔"

ہال کا بغلی دروازہ کھلا..... ونود کھنہ کا ملازم جوزف سراسیمہ سا اندر داخل ہوا۔ اس نے انسپکٹر اور دو سپاہیوں کی مدد سے اٹھایا جو ایک کمرے میں بستر پر پڑا تھا۔ اسے اس کی خواب گاہ میں لے جا کر بستر پر لٹایا۔

"دیکھئے انسپکٹر.....!" شاستری نے کہا۔ "کیا آپ ہمیں اپنی بات سچ ثابت کرنے کا ایک اور موقع دیں گے.....؟"

"ایک پیشہ ور سراغ رساں کے مقابلے میں ایک شوقیہ سراغ رسائی کرنے والے کو یہی تو ایک فائدہ رہتا ہے۔" انسپکٹر مسکرا دیا۔ "دوسرا موقع.....؟ اس امر کی اجازت کی کیا ضرورت ہے..... آپ لوگ ہر طرح سے آزاد ہیں۔ ہم نے کوئی قدغن نہیں لگائی اور نہ ہی آپ کے راستے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔"

ان کی گفتگو پونم کے پلے نہیں پڑ رہی تھی..... مبہم اور غیر واضح تھی۔ ایک طرح فلسفہ بگھارا جا رہا تھا۔ اپنی طرف متوجہ نہ پا کر وہاں سے کھسک گئی۔ پہلے وہ اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے میں گئی..... چہرے اور جسم پر جہاں گہرے سرخ نشانات تھے اسے صاف کیا۔ پھر اپنے کمرے سے نکل کر ونود کھنہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے باوجود کہ مجسمے نے اس کے دل میں ونود کھنہ کے بارے میں یہ گمان پیدا کر دیا تھا۔ اسے ونود کھنہ کی بڑی فکر اور پریشانی تھی وہ اس لئے تشویش میں مبتلا تھی کہ مجسمے نے ونود کھنہ کے جو ہاتھ مارا تھا بڑا بھرپور اور آہنی سا تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ بڑے پرسکون انداز سے بستر پر اس طرح لیٹا ہوا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا..... اس نے پونم کو دیکھ کر کمرے میں موجود سپاہیوں کو جو اس کی حفاظت کے لئے موجود تھے ان سے باہر چلے جانے کے لئے کہا۔ وہ ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے۔

پونم دل میں اس بات پر حیران پریشان تھی کہ اس کے دل میں ونود کھنہ کے لئے نفرت و محبت کے ملے جلے جذبات موجود کیوں ہیں..... جب وہ اس کے سامنے آتی ہے تو اپنے دل میں اس کے لئے بے پایاں محبت محسوس کرتی تھی..... آخر یہ کیا اسرار ہے.....؟ مجسمہ نے ونود کھنہ کے خلاف جو نفرت کا زہر اگلا تھا۔ اب ونود کھنہ کے سامنے آتے ہی وہ امرت میں بدل گیا تھا۔ سپاہیوں کے جانے کے بعد پونم نے دروازہ بند کیا اور اس کے پاس آ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ونود کھنہ نے بستر پر دراز ہونے کے بعد اس کا ہاتھ تھام لیا..... لیکن عجیب سی بات یہ تھی کہ ونود کھنہ کے ہاتھوں میں وہ لطیف اور انوکھا لمس نہ تھا جو مجسمہ میں تھا۔ ”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا ہے کہ یہ سب کیا تھا۔“ اس نے فکرمندی سے ونود کھنہ کی طرف دیکھا۔ ”یہ عقل میں آنے والی بات نہیں ہے..... میں تو سوچ سوچ کر خوف زدہ اور پریشان ہوئی جا رہی ہوں۔“

”کون سی بات.....؟“ ونود کھنہ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے بولا۔

”مجسمہ کا زندہ ہو کر آنا..... وہ ہو بہو کسی آدمی کی طرح لگ رہا تھا۔ گوشت پوست کا تھا..... کیا ایسا ممکن ہے.....؟ اگر ایک ممی بھی آدمی بن جائے ناقابل یقین سا لگے..... کیا ایسا ممکن ہے.....؟ یا پھر یہ پراسرار اور خوفناک واقعہ جسے پولیس تو کیا سائنس بھی تسلیم نہیں کرے گی.....“ اس کا چہرہ ابھی تک سفید تھا اور آواز میں لرزیدگی سی تھی۔

”ہاں..... یہ سب کچھ بڑا عجیب و غریب پراسرار..... ناقابل فہم سا لگ رہا ہے۔“ ونود کھنہ نے بے نیازی سے کہا۔ لیکن جب ان پر سے پردہ اٹھے گا تب تمہیں جلد ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا..... جب حقیقت کا علم ہو گا تب ساری باتیں معقول اور حقیقت سے قریب لگیں گی..... ان میں کوئی ابہام نہیں ہو گا۔“

”حقیقت.....؟ کیسی حقیت.....؟ کیا حقیقت پراسرار ہوتی ہے..... ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ مجسمے نے صرف تم پر حملہ کیوں کیا.....؟ اس نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا..... اگر وہ قصے کہانیاں غلط نہیں ہیں تو اسے سادھی کھودنے والوں کا پیچھا کرنا اور حملہ آور ہونا تھا..... یعنی میری مراد جگن ناتھ اور شاستری سے اور خود سے ہے.....“ یہ بات کہتے کہتے اس خیال سے لرز گئی، اگر مجسمہ اس کی عزت تاراج کرنے کے بعد جان سے مار دیتا.....؟ لیکن اس کے ساتھ ایسا نہیں کیا..... اسے ایک لذت سے آشنا کر گیا۔ ایسی لذت اور کیف جس سے وہ آشنا تھی..... چوں کہ ایک عورت ہونے کے ناتے ونود کو بتانے سے قاصر تھی.....“ اس نے اس لئے تو تمہیں نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ تم نے ہمیں مہمان بنایا اور ہمارا.....“ پونم نے دانستہ اپنا جملہ پورا نہیں کیا۔

ونود کھنہ نے اس کی بات پورے غور سے سنی۔ اس کے چہرے پر خوف کی علامت نہ تھی اور اس نے پونم کی بات کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ مجسمہ کے قاتلانہ حملے سے دہشت زدہ ہوتا۔ وہ ہر طرح سے پرسکون نظر آتا تھا۔

پونم کو اس بات پر سخت حیرت تھی کہ ونود کھنہ کو ہر وقت جس بات کا تجسس سا رہا تھا۔ اس وقت کیوں

نہیں.....؟

”تمہارے ذہن میں جو کش مکش ہو رہی ہے..... جو سوالات جنم لے رہے ہیں مجھے اس کا بہ خوبی اندازہ ہے..... تم خوف اور تجسس کے جس گرداب میں پھنسی ہو اس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا ہے.....؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”ہاں.....“ پونم نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں..... میں یہ جاننا چاہتی ہوں آخر یہ اسرار کیا تھا؟“

”نیچے جو لوگ ہیں انہیں جانے دو۔ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا اسرار ہے.....؟“ ونود نے کہا۔

”لیکن ابھی اتنی جلدی وہ ٹلنے والوں میں سے نہیں ہیں۔“ پونم نے کہا۔ ”وہ دھرنا مار کر بیٹھ گئے ہیں۔ لیکن ان کی موجودگی سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”بات کچھ ایسی ہے کہ میں ان کی موجودگی میں بتانا نہیں چاہتا۔“ ونود نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی پشت تھپتھپائی۔

”وہ سب نیچے ہیں..... کمرا بند ہے..... آواز نیچے جانے سے رہی۔“ پونم نے تکرار کیا۔

اس لمحے دروازے پر دستک ہوئی تو پونم کی بات کی تصدیق ہو گئی کہ لوگ نیچے دھرنا دیئے بیٹھے ہیں۔ ان کے جانے کا دور دور تک امکان نہیں ہے..... دوسرے لمحے کمرے میں شاستری داخل ہوا ونود کے ہاتھ میں پونم کا ہاتھ دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ پھر بظاہر لاتعلقی اور چہرے پر کوئی ردعمل لئے ان کی طرف بڑھا۔

”ہمیں اس اسرار کو ہر قیمت پر اور کسی نہ کسی طرح جاننا ہو گا۔“ شاستری نے کہا۔ ”ہمیں خاموش نہیں بیٹھنا ہے۔“

”لیکن کس طرح سے اس راز پر سے پردہ اٹھا سکتے ہیں.....“ پونم نے غیر محسوس انداز سے اپنا ہاتھ ونود کے ہاتھ سے چھڑا کر پوچھا۔ ”وہ دل میں بڑی خجالت سی محسوس کر رہی تھی کہ شاستری نے کیا سوچا اور خیال کیا ہو گا؟

”سر جگن ناتھ کے تعاون کے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا..... اس کے لئے انہیں کسی نہ کسی طرح آمادہ کرنا ہو گا۔ میرے خیال میں ہندوستان صرف وہی ایک ایسی ہستی ہیں جو اسرار علوم کے بارے میں جانتے ہیں..... گو کہ وہ پرکاش مہرہ کے رویے سے دل شکستہ ہو چکے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تجسس کے باعث اس راز کو بے نقاب کر دیں۔“ شاستری نے کہا۔

”گویا آپ نے تہیہ کر رکھا ہے کہ اس اسرار کو بے نقاب کر کے ہی دم لیں گے.....؟“ ونود کھنہ نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”جب بھی میں کسی بات کا ارادہ کرتا ہوں تو اسے پایہ تکمیل تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کے صحت یاب ہوتے ہی اس کام پر توجہ دی جائے.....“ شاستری کے لہجے میں بھرپور طنز تھا۔ پونم کے چہرے پر کسی اور خیال سے سرخی دوڑ گئی جس سے اس کے چہرے پر ایسا نکھار آیا کہ وہ اور حسین دکھائی دینے لگی۔

ونود کھنہ نے سوچا کہ اگر شاستری نہ ہوتا تو پونم کے چہرے کر نکھار کو ہونٹوں پر جذب کر لیتا۔

”آپ کو نہ صرف پولیس کو بیان دینا ہو گا بلکہ ان کے سوالات کی بوچھاڑ بھی سہنا ہو گا۔“ شاستری بولا۔ ”جب تک آپ بیان دے کر پولیس کو مطمئن نہیں کریں گے پولیس آپ کے گھر پر پہرا دیتی رہے گی..... کسی ملاقاتی کو اندر آنے نہیں دے گی..... کیوں کہ پولیس اس پراسرار واقعہ سے بہت ہی پریشان اور بری طرح الجھ گئی ہے..... پولیس اس واقعے کو سچ ماننے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں ہے۔ ان کے خیال میں پس پردہ کوئی اور ہی بات ہے۔ پولیس سے دانستہ چھپائی جا رہی ہے۔“

پونم نے صاف محسوس کیا کہ شاستری نے صاف دھمکی دی ہے۔ لیکن ونود نے کوئی اثر نہیں لیا۔

”دیکھ نہیں رہے ہو اس وقت ان کی کیا حالت ہو رہی ہے۔“ پونم بولی۔ ”اس وقت آرام کی سخت ضرورت ہے..... یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں..... پولیس سے کہو وہ کسی اور دن آ کر ان کا بیان لے لے۔"

ٹھیک ہے تم انہیں ہر طرح سے آرام پہنچاؤ..... ان کی سیوا میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔" شاستری کا لہجہ تلخی سے بھر گیا۔

وہ پونم سے یہ بات کہہ کر نکل گیا۔ انہیں زینے پر اس کی چاپیں دور ہوتی سنائی دیں..... پھر بیرونی دروازہ زور سے بند ہوا جیسے غصے سے بند کیا گیا..... ونود کھنہ کی دل کی مراد بر آئی تھی۔ اب اس کمرے میں آزادی ہی آزادی تھی۔ ونود نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے اوپر کھینچ لیا اور چہرے کر نکھار کو ہونٹوں میں جذب کر لیا تو وہ کسمسائی۔ پھر وہ اور جذباتی ہوتا گیا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" پونم نے چند لمحوں کے بعد بستر سے نکل کر لباس درست کیا۔ "تم مرد بڑے جلد باز ہوتے ہو۔"

شاستری کے جانے کے بعد ونود کھنہ نے جو اس سے کچھ دیر من مانی کی تھی اس کے بعد ان کے درمیان ایک سکوت سا طاری رہا۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ مجسمہ اور ونود کھنہ میں آخر اتنا فرق کیوں ہے..... دو ہزار برس قبل کی لاش اس میں آتما آ جاتی ہے اور وہ دنیا میں ایک آدمی کا جنم لیتی ہے تو اس کا لمس اتنا انوکھا، لطیف اور سنسنی خیز کیوں ہے، اس نے سنا تھا کہ جو کوئی روح دنیا میں آ جاتی ہے تو وہ غیر مرئی ہوتی ہے..... لیکن دو ہزار برسوں پہلے کی روح ایک عام انسان کی طرح تھی لیکن ایک غیر معمولی آدمی کی طرح..... اس میں انسانی جبلت تھی۔ اس میں انسانی حس موجود تھی۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک مجسمہ ہے۔

ونود کھنہ نے اسے گہری سوچ میں غرق دیکھ کر بھانپ لیا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے اور کس کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ اس موضوع پر پونم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اس گہرے سکوت کو توڑا۔

پولیس اتنی احمق ہوگی میں سوچ بھی نہیں سکتا..... کیا یہ سوچنے سمجھنے کی بات نہیں ہے کہ میں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو جاؤں گا.....؟ خود اپنے گھر سے..... آخر کیوں اور کس لئے.....؟ کیا میں کوئی مجرم ہوں..... مجھ سے سنگین جرم سرزد ہوا ہے..... دوسری بات جو ہے وہ اس پراسرار واقعہ کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے؟ کیا اس میں حیرت سے زیادہ عجیب بات نہیں لگتی ہے.....؟ وہ اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہے؟"

"پولیس سے جان چھڑانا کون سا مشکل کام ہے۔" پونم بولی۔ "وہ اپنی کارروائی پوری کرنا چاہتی ہے۔ ایک کوئی سا بھی بیان دے دو وہ یہاں سے چلی جائے گی..... آخر تم اس کی موجودگی سے اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہو۔"

"ہاں..... اب میں کل کسی وقت اسے کوئی بیان دے دوں۔" ونود کھنہ نے بے پرواہی سے کہا۔

"تو کیا.....؟" پونم بے صبری سے بولی۔ "کیا تم نے جو کل روانگی کا پروگرام بنایا ہے اسے ملتوی کر دو گے؟"

"روانگی سے پہلے میں تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔" ونود کھنہ نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ تم سے کوئی بات مخفی نہ رہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم میری بات غور سے سنو۔ اور ذہن نشین کرتے جاؤ۔"

اتنا کہہ کر ونود کھنہ نے اپنا چہرہ اس دیوار کی جانب کر دیا جو سامنے کی طرف تھا۔ جس کا ایک رخ پونم کی نظروں سے اوجھل تھا..... جب اس نے پہلی بار ونود کھنہ کو دیکھا تو اس کی مردانہ وجاہت، خوب صورتی اور دراز قد اس کے من کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گیا تھا..... اس طرح جیسے من کا دیوتا ہو اور جس کے خواب وہ نوجوانی کے آغاز سے دیکھتی آ رہی تھی۔

لیکن اب وہ چہرہ اس کی نظروں کے سامنے نہ تھا..... کوئی اور ہی چہرہ تھا جو اس چہرے کے پیچھے چھپا ہوا تھا اب وہ سامنے آ گیا تھا۔ بھیانک اور مکروہ.....

آج پہلی بار یہ چہرہ سامنے آیا تھا جسے دیکھتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کے جسم میں شدید سردی کی لہر دوڑ سی گئی تو کپکپی سی ہو گئی تھی۔ اس کی رگ رگ میں لہو برف ہو گیا..... اس کی سحر زدہ سی آنکھوں میں وہ ڈوب کر رہ جاتی تھی اس وقت وہ ویران کھنڈر دکھائی دے رہی تھی..... وہ ہونٹ جس میں اس کے لبوں کا امرت بھرا تھا وہ تارکول کی سڑک معلوم ہوتے تھے۔ جب یہ ہونٹ اس کے لبوں پر چپکے تھے تب اس نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا..... اس وقت وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے کو تیار تھی..... اب اسے ایک عجیب سی وحشت ہونے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھاگ جائے نجانے کیوں اسے ونود کھنہ پر کسی بدروح کا گمان ہونے لگا تھا..... اس نے ارادہ کیا تو اسے ایسا لگا کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے کیوں کہ کسی نادیدہ ہستی نے اسے جیسے حصار میں لے لیا ہو۔ اب اس کا کوئی اختیار نہیں رہا ہے۔ اسے جیسے سحر زدہ کر کے بے بس کر دیا گیا ہے۔ وہ اب اس کا چہرہ اور آنکھیں لمحے کے لئے بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں....." وہ بہ دقت تمام خود پر قابو پا کر بولی۔ "تمہیں آرام کی اشد ضرورت ہے۔ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ میں بھی بے حد تھکن سے نڈھال ہو رہی ہوں۔ چل کر آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم نہیں جاؤ گی..... اس لئے کہ مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں..... تم میرے آرام کی فکر نہ کرو۔" ونود کھنہ نے کہا۔

"میں بھاگی تھوڑی جا رہی ہوں۔" وہ بڑے جبر سے ہنس کر بولی۔ "تم سو جاؤ۔ میں کمرے میں ہی تمہاری دیکھ بھال کے لئے رہوں گی۔ برابر کا تو کمرا ہے۔ بس ایک آواز پر آ جاؤں گی۔"

"پونم جانے کی ضد نہ کرو اور اطمینان سے بیٹھ کر میری بات سنو..... ونود کھنہ اسے کسی صورت میں جانے دینے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "سب سے پہلے تم اپنا ذہن نگا رام سے منسوب داستان کی طرف لے جاؤ..... تم میں سے کوئی بھی اس کی تحریر پر نہ پہنچ سکا جو سادھی پر کندہ تھی..... نہ پہنچ بھی سکتا تھا..... اس کی وجہ یہ تھی کہ اس پر جو لکھا ہوا تھا وہ نامکمل تھا اور درمیان کی اہم کڑیاں غائب تھیں..... دانستہ ان تحریروں کو مٹا دیا گیا تھا۔"

"ایسا کیوں اور کس لئے کیا گیا تھا؟" پونم کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب بکھر گیا۔ اس نے تجسس سے پوچھا۔

"اس لئے کہ..... راز..... راز ہی رہے..... پھر وہ راز کیا جو افشا ہو جائے۔" وہ کہنے لگا۔ "تمہارے پتا جی کی نشاندہی جب اس کی کھدائی شروع ہوئی تو اس بات میں کسی قسم کی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی کہ سادھی برآمد ہو جائے..... اس لئے تمہارے پتا جی کو نہایت درندگی اور بے رحمی سے موت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا..... اس بات کا خدشہ تھا کہ تمہارے پتا جی اس تحریر کو با آسانی پڑھ لیں گے..... اہم کڑیاں غائب کرنے کے باوجود تمہارے پتا جی اسے پڑھ لیتے..... تمہارے ساتھی ان گم شدہ کڑیوں کو ملوانے کی پوری کوشش کرتے..... کوئی بعید نہ تھا کہ یہ اسرار ان پر کھل جاتا۔"

اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ پہلو بدل کر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

سنو..... اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں..... جب مہاراجا نے اپنے چہیتے بیٹے نگا رام کے مرنے کی خبر سنی تو اس پر جیسے آسمانی بجلی گر پڑی۔ اس پر سکتہ سا چھا گیا۔ اس کے دل کو اس قدر گہرا صدمہ پہنچا کہ وہ تین چار دنوں تک کسی سے بات کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس صدمے نے اس کی جان لے لی تھی..... مرنے سے پہلے اس نے حکم دیا تھا کہ اس کی سادھی کی عمارت بہت شان دار اور اس قدر عالی شان ہو کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے..... پورے شاہانہ وقار سے اس کی آخری رسومات ادا کی جائیں۔ اس عمارت میں جو اس کی سادھی بنائی جائے وہ قبر کی طرح ہو۔ اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سونے کا مجسمہ بنایا جائے۔ پھر اس کا خالص سونے کا مجسمہ بنا کر دفن کر دیا گیا..... یہاں تک اس معاملے کا ہر کسی کو علم ہے..... لیکن اس راز اور اس بات کا کسی کو علم نہیں ہے کہ جب ہمارا بادشاہ بستر مرگ پر تھا اس شخص کو بلا نہ بھیجا جو اس کے پیارے بیٹے کی موت کا ذمہ دار تھا۔ جس کے ہاتھوں تنگا رام کی موت واقع ہوئی تھی..... دلشان نے اسے بد دعائیں دی تھیں اور وہ خود اپنے بھائی کی آتما کے ہاتھ ہلاک ہو..... اس کی موت اتنی ہی دردناک ہو جتنی اس کے عزیز از جان بیٹے کی ہوئی تھی۔

اس نے سانس لینے کے لئے توقف کیا تو پونم جو بت بنی بیٹھی تھی باتیں سن رہی تھی اس نے فوراً ہی سوال کر ڈالا۔

"لیکن تمہیں دو ہزار برس کا یہ راز..... یہ تمام باتیں کس طرح اور کیسے معلوم ہوئیں..... جب کہ تم اس طرح بتا رہے ہو جیسے یہ کل کی باتیں ہیں.....؟" وہ ششدر ہو کر کہنے لگی۔ "اور پھر جب کہ تمہارا تعلق سائنس اور فنون لطیفہ سے ہے۔ جب کہ تم آثار قدیمہ سے متعلق نہ تو کوئی معلومات رکھتے ہو اور نہ ہی کبھی دلچسپی کا اظہار کیا۔"

"اس لئے کہ..... وہ شخص میں ہوں۔" ونود کھنہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کون شخص.....؟" پونم کی سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ "میں تمہاری بات سمجھی نہیں....."

ونود کھنہ یک لخت اٹھ بیٹھا اور بستر سے نکل کر کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے سرنخوت سے بلند کر کے اور سینہ تان کر پونم کو یک ٹک دیکھنے لگا..... اس کی نگاہیں پونم کے جسم سے آر پار ہو کر کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔

"میں مسرت کمار ہوں....." پونم کو اس کی آواز خلاؤں سے آتی محسوس ہوئی۔ "میں مہاراجا دلشان کا چھوٹا بیٹا..... اب سمجھیں..... یا مزید بتانے کی ضرورت ہے۔"

مکان پر ایک وحشت کسی آسیب کی طرح مسلط تھی۔ کمرے کی در و دیوار پونم کو زہریلے پھنکارتے سانپوں کی طرح اسے اپنے حلقے تنگ کرتی محسوس ہو رہی تھی..... وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک پاگل کی باتیں سن رہی ہے..... ایک نفسیاتی مریض..... لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس خوش فہمی میں رہنا نہیں چاہتی..... اس دنیا میں کیا کچھ ممکن نہیں ہے..... وہ ان اسرار کو جھٹلا نہیں سکی تھی اور نہ سکتی تھی جو اب تک پیش آ چکے تھے۔ ونود کھنہ نے اس سے سچ سچ کہنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اسے پوری سچائی سے پورا کر رہا تھا۔

"مجھے اس سنسار کے ختم ہونے تک بھٹکنے کی اذیت ناک بد دعا لگی ہے۔" ونود کھنہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے کبھی موت نہیں آئے گی..... وہ واحد شخص مجھے اس بد دعا سے نجات دلاتا تھا ان لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا ہے جنہیں میں نے بھائی کے قتل کے لئے معاوضہ دیا تھا۔ میرے باپ نے بہت سوچ سمجھ کر مجھے اس عذاب میں مبتلا کرا دیا تھا۔ میرے لئے اب اس کے سوا کوئی راہ نجات نہیں کہ اس شخص کے ہاتھوں مارا جاؤں جو خود مر چکا ہے..... اور ایک ناقابل یقین..... ناممکن سی بات ہے..... لیکن یہ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔"

ونود کھنہ کی آواز جو مترنم اور کانوں میں رس گھولنے والی سی تھی..... جب وہ بات کرتا تو پونم کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کئی سر بیک وقت بول رہے ہوں۔ وہ مسحور سی ہو جایا کرتی تھی..... اس آواز کے سحر نے تو اسے ونود کھنہ کا اسیر بنا دیا تھا..... لیکن اب اس کی آواز بڑی بھیانک اور صدیوں اور ہزاروں برسوں کی بازگشت تھی۔

بالآخر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے ابھی ابھی کہا تھا لیکن یہ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔ وہ وقت آن پہنچا ہے۔"

جگن ناتھ کی لاش اس طرح لائبریری میں پڑی تھی۔ اس کی ہلاکت کی کسی کو خبر نہ ہوئی تھی۔ اس کی آتما اس محل میں تھی جو موت کے بعد مجسمہ لے گیا۔ اب وہ

اس محل میں مجسمہ کا مہمان تھا۔ سب سے پہلے اسے وہ شراب پلائی گئی تھی جو بوڑھوں کو جوان بنا دیتی ہے۔ اب اس میں ایک جوان لڑکے کی سی جوان مردی، طاقت اور شباب تھا۔ سترہ اٹھارہ برس کے جوان لڑکے کی طرح..... نوجوان لڑکیوں اور عورتوں میں وہ راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔ دل میں بہت خوش تھا۔ دوسری دنیا میں پہنچ کر وہ خوش تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ مجسمہ نے اپنا وعدہ نبھایا ہے۔

ایک ملازم نے دو تین مرتبہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔ جب اس نے چوتھی مرتبہ بڑے زور سے کھٹ کھٹایا، تب بھی جواب نہ ملنے کی صورت میں اسے پریشانی سی ہوئی۔ کہیں کوئی گڑبڑ والی بات تو نہیں ہے..... اتفاق سے اس وقت پونم، سنیل داس..... شاستری اس کمرے کے دروازے پر دروازہ زور زور سے بجانے پر وہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ شاستری نے دروازے کا ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا۔

پھر وہ سب کمرے میں داخل ہوئے۔ پونم نے جو جگن ناتھ کی لاش دیکھی غش کھا گئی۔ شاستری اسے لپک کر فوراً نہ سنبھالتا تو وہ فرش پر گر پڑتی۔ اس نے پونم کو صوفے پر لے جا کر بٹھا دیا اور اس کی پشت لاش کی طرف رکھی۔ پونم جگن ناتھ کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ جگن ناتھ کو بھی اپنے باپ کی طرح چاہتی تھی۔

انسپکٹر نے فوراً ہی ایک ملازم کو دوڑایا کہ وہ سپاہیوں کو بلا لائے اور اس نے ایمبولینس کے لئے اسپتال فون کیا..... سنیل داس اور شاستری مل کر کتابوں کے انبار کھولنے لگے شاید انہیں کوئی کام کی چیز مل جائے..... پولیس والے فرش سے کرچیاں اور شیشے کے ٹکڑے معائنے کے لئے چن رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ایمبولینس آ گئی تو لاش پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دی گئی۔ اس سے تھوڑی دیر جو افسران بالا پہنچے تو انہوں نے جگن ناتھ کی لاش کا معائنہ کیا تھا..... وہ خود کوئی رائے قائم کرتے لیکن انہیں ساجن اور سنیل داس کی باتوں کا یقین کرنا پڑا۔ یہ واقعہ اور جگن ناتھ کی موت پراسرار حالت میں رونما ہوئی تھی۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ان کی بات کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ جھٹلانے کے لئے نہ تو ان کے پاس کوئی دلیل تھی اور نہ ہی جواز۔

"کھڑکی کو اسی طرح کھلا رہنے دیں۔" اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ "نہ کوئی اس کے پاس جائے اور نہ ہاتھ لگائے۔"

انسپکٹر نے کمرے میں پہرے پر دو سپاہیوں کو مامور کر دیا اور باقی سپاہیوں کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل گیا۔

سنیل داس کو جس بات کی تلاش تھی وہ کسی کتاب سے انہیں نہ مل سکی۔ وہ عام کتابوں کی طرح تھی لیکن شاستری کو وہی کچھ ملا جس کی وہ توقع کر رہا تھا اور اس کے نزدیک بے حد اہم بھی تھا۔ سنیل داس نے چوں کہ کسی اور خیال اور نظریے سے جو تلاش کیا اس لئے وہ کچھ بھی پا نہ سکا تھا۔ اس لئے اسے بڑی مایوسی ہوئی تھی..... لیکن ان دونوں کو ان کے شعبے کی کسی حد تک تو تقویت ہوئی تھی۔ یہ امر بھی ان کے لئے بڑا اہم تھا۔ وہ نظر انداز کرنا نہیں چاہتے تھے۔

میرے خیال میں کتابوں میں جو پراتھنائیں بھری ہوئی ہیں ان سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے نا.....؟" شاستری نے کہا۔

"وہ کیا.....؟" سنیل داس نے تجسس بھری نظروں سے دیکھا۔

"صرف انہی لوگوں کی ہلاکت کا خوف و خدشہ ہے جو براہ راست سادھی کھودنے میں ملوث ہیں۔" شاستری نے جواب دیا۔

شاستری نے جو خیال ظاہر کیا اس سے سنیل داس نے اتفاق کیا..... دونوں اس بات پر ہم خیال کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو کتابوں میں کسی اور انداز سے درج ہے۔ اس لئے ان دونوں کو بہت ہوشیار اور محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ کیوں کہ یہ مجسمہ اب خونی بن گیا ہے..... بھگوان جانے پرکاش مہرہ کا کیا انجام ہوا..... اگر وہ مر گیا ہے تو اس خونی مجسمہ کا یہ پہلا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قتل ہوا..... دوسرا قتل پروفیسر..... جانے وہ کس کس کو قتل کرتا پھرے۔

"مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ یہ مجسمہ دوبارہ جنم لے گا اور دنیا میں آئے گا..... وہ جنم لیتے ہی ایک آدمی کے روپ میں آ گیا اور اسے شکتی مل جائے گی۔ ناقابل یقین حد تک کی..... وہ آدمی کا روپ بھر کر ایک قاتل بن گیا۔ اس پر جیسے قتل کا اندھا جنون سوار ہو گیا ہے..... کیوں اور کس لئے.....؟" شاستری کہنے لگا۔

"نہ جانے وہ کتنے لوگوں کی موت کا باعث بنے گا..... یہ بات وہ شخص کیسے جان سکتا ہے جو خطرے کی زد میں ہے..... کب اس کی شامت یا تمہاری شامت آ جائے..... اب ہم دونوں ہی رہ گئے ہیں سادھی کی کھدائی میں شریک تھے اور ہم یہاں موجود ہیں۔ مجسمہ کو ہم دونوں تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش آنے سے رہی..... وہ جب اور جس وقت چاہے پہنچ سکتا ہے۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔"

شاستری نے غلط نہیں کہا تھا..... چند لمحات بھی نہیں گزرے تھے کہ کھڑکی کے پردے میں سرسراہٹ جیسے تیز ہوائیں چلنے سے ہوتی ہیں..... وہ جس طرح سے آہستہ سے اٹھا تا اس طرح آہستہ سے گھر میں گیا تھا۔ سنیل داس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"کیا ایسی کوئی بات ہے جس سے تم سراسیمہ ہو رہے ہو.....؟" شاستری نے کہا۔

"نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔" سنیل داس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "تمہاری بات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

دوسرے لمحے پردہ پھر سرسرایا..... اور پھر اس کا رخ قدرے شاستری کی طرف تھا۔ اس نے پٹیوں میں لپٹا ہوا ایک ہاتھ دیکھا۔ سنیل داس نے شاستری کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ اس نے شاستری کا چہرہ متغیر دیکھ کر خطرے کی بو محسوس کر لی۔ اس نے فوراً کرسی کھسکا کر میز کے قریب کر لی۔ وہ مستعد، چوکنا اور بے خوف سا تھا۔

اچانک کھڑکی کی چوکھٹ پر مجسمہ کا وجود ابھرا۔ وہ کسی ایسے شخص کی طرح زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ جیسے بہت دور سے دوڑتا ہوا آ رہا ہو۔ جس سے سینے میں سانس پھول جاتی ہے..... اس کی حرکت سے ظاہر ہو رہا تھا اسے اندر داخل ہونے میں بڑی دقت ہو رہی ہو، شاستری نے فوراً ہی لپک کر جلدی سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور اسے کھول کر دہلیز سے باہر ہو کر ہذیانی لہجے میں چلایا۔

"انسپکٹر..... انسپکٹر..... کمرے میں مجسمہ کھڑکی سے گھس رہا ہے۔"

باہر نیچے انسپکٹر جگ دیپ کے دوڑنے کی آواز آئی..... پھر وہ چند لمحوں میں دو سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے آدمیوں نے جال اٹھا رکھا تھا..... اس نے جو مجسمے کو دیکھا تو یقین نہیں آیا۔ وہ اب تک ان لوگوں کی باتوں کو ایک مفروضہ سمجھ رہا تھا۔ لیکن اسے اب اس اسرار کا یقین کرنا پڑا تھا۔ اس کے آدمی بھی بے حد خوف زدہ تھے اور وہ مجسمے کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عفریت ہو اور کسی بھی لمحے انہیں موت کی بھینٹ چڑھا سکتا ہے۔

"کھڑے تماشا کیا دیکھ رہے ہو..... اس پر جال پھینک دو۔" انسپکٹر غصے سے چیخ کر بولا۔ "جلدی کرو..... ایسا نہ ہو کہ وہ نکل جائے۔"

اس وقت مجسمہ کمرے کے وسط میں تھا۔ انہوں نے جال فضا میں اچھال کر مجسمہ پر پھینکا۔ جس میں مجسمہ کا شانہ اور سر پھنس گئے۔ انسپکٹر فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کا پھندا تنگ کرنے لگا۔ مجسمہ اس میں پھنستا چلا گیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی بڑی کوشش اور جدوجہد کی..... انسپکٹر کے آدمیوں نے انسپکٹر کے ساتھ مل کر جال کو جھٹکا دیا۔ وہ فرش پر گر کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

سنیل داس اس کے قریب گیا۔ مجسمہ کو بے بس دیکھ کر دفعتاً اس کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔

"بس کرو....." دفعتاً سنیل داس چیخ پڑا۔ "اب اسے اذیت نہ دو۔"

انسپکٹر نے سنیل داس کی اس حرکت کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ اسے یقین نہ آیا۔ شاستری نے قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا وہ اسے ہٹانا چاہتا تھا..... لیکن سنیل داس گھٹنوں کے بل دوزانو ہو گیا تھا مجسمہ کے پاس۔

"او مہاراجا..... جگا رام....." سنیل داس نے رندھے ہوئے لہجے میں مخاطب کیا۔ "آپ ہیں یہ.....؟"

مجسمہ نے جیسے ہی سنیل داس کی آواز سنی اس نے ایک دم سے ہاتھ پاؤں چلانا چھوڑ دیا..... پھر اچانک وہ ساکت و جامد ہو گیا۔ اس کی تیز تیز سانسیں بھی رک گئیں..... اب وہ زندہ مجسمہ نہیں رہا تھا..... اب یہ وہی مجسمہ تھا جسے پٹیوں میں لپیٹ کر تابوت میں رکھا گیا تھا۔ اب ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زندگی سے محروم ہو چکا ہو۔

اے سری لنکا کے باوقار اور عالی مرتبت مہاراجا..... مہاراجوں کے عظیم بیٹے..... اپنے حقیر ترین غلاموں کے حقیر ترین..... غلام کی طرف دیکھ..... جو حالات کے بندھن میں جکڑا تیرے چرنوں میں سر جھکائے بیٹھا ہے۔"

"سنیل داس.....!" شاستری نے اس کا بازو پکڑا تا کہ اسے سہارا دے کر اٹھانا چاہا۔

لیکن جیسے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا..... کسی بے نام..... نادیدہ اور طاقت ور شے تھی..... ایسی کوئی عظیم قوت جو انصاف میں توازن کی داعی ہو۔ اس کے سارے جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اس میں بازو چھڑانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

"میں تجھ سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ میرے اجداد کا تصور تیرے ذہن سے نکل جائے..... شما کرو....." وہ گڑگڑا کر کہہ رہا تھا۔ اس آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ "تیرے دل میں صرف میری حقیر ذات کا خیال رہ جائے..... میں نے ناقابل معافی پاپ کیا ہے..... خود کو پاپیوں میں شامل کر کے تیری سادھی اور مجسمے کی بے حرمتی کی ہے..... تجھ سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ میرے جسم کو نہایت بے دردی اور سفاکی..... اور بے رحمی سے ملیا میٹ کر دے..... روند دے..... تا کہ میری آتما تک میرے گناہوں کا خمیازہ بھگتتی رہے..... مجھے مر کر بھی کسی سے چین نہ ملے۔"

مجسمہ میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے..... اس کی سانس پھر سے چلنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا..... شاید نادیدہ قوت اس میں آتما پھونک دی تھی..... اس میں تواتر اور تیزی آتی گئی۔ اس میں جیسے توانائی میں جنم لینے لگی۔

پولیس والوں نے جو بڑی مضبوطی سے جال کو تھام رکھا تھا اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔ اس سے پہلے اسے سنبھالتے اور اسے قابو میں رکھتے مجسمہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جال سے باہر نکال کر پھیلا دیئے۔ جال اس کے سینے پر کڑکڑایا اور اس کے ہاتھوں نے اسے کچے دھاگے کی طرح توڑ کر پھینک دیا۔ اب جال فرش پر بکھرا پڑا تھا۔

ایک سپاہی دہشت زدہ ہو کر بدحواسی سے بھاگ نکلا۔

پھر مجسمہ سنیل داس کی طرف بڑھا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ سنیل داس کو غضب کا نشانہ بنانے والا ہے۔

سنیل داس کا سر فرش پر ٹکا ہوا تھا۔ مجسمہ نے اپنا ایک پاؤں آہستہ سے اٹھایا اور اس کے پاس لے گیا جیسے فاصلہ ناپ رہا ہو..... اس کا دوسرا پیر بھی اسی طرح سے اٹھا اور نیچے گرا۔

سنیل داس کے منہ سے ایک ایسی عجیب سی آواز نکلی جس میں نہ تو ہمت تھی اور نہ ہی التجا..... مجسمہ اپنا دایاں پیر بار بار اس کے سر امارنے لگا جیسے کوڑے سے ضربیں لگا رہا ہو۔ سنیل داس کا سر پھٹ کر خون میں لتھڑ گیا اور اس کا مغز باہر نکل آیا۔

شاستری نے محسوس کر لیا تھا موت اس کے سامنے کھڑی ہے اور وہ بچ نہیں سکے گا..... وہ جانتا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ یہ خونی مجسمہ پراسرار طاقت کا مالک ہے..... اس سے کوئی بچا نہیں سکتا..... مقابلہ نہیں کرسکتا..... اس پر نہ تو ریوالور..... پستول اور شارٹ گن گولیوں کی بوچھار بھی اس پر کوئی اثر کرسکتی ہے..... نہ ہی مہلک سے مہلک آتشیں اسلحہ بھی اس پر کارگر ہوگا..... اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو مجسمہ اسے بھاگنے نہیں دے گا..... ایسی کوئی تدبیر نہیں تھی کہ اس کے ہاتھوں مرنے سے بچا جائے..... اب اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو سنیل داس کا ہوا..... نہ ہی کوئی ایسی طاقت جس کے بل پر وہ بچ سکے..... یہ ایک پراسرار بلا تھی۔ فرار کی اس نے تمام راہیں مسدود دیکھیں تو وہ ذہنی طور پر موت کے لئے تیار ہوچکا تھا۔

مجسمہ متوجہ ہوکر اس کی طرف بڑھا۔ انسپکٹر اور اس کے مسلح ساتھی بڑی بہادری اور بے خوفی سے ان دونوں کی راہ میں حائل ہوگئے۔ جال ان کے ہاتھ سے کب کا چھوٹ چکا تھا۔ پھر انہوں نے اپنی بندوقوں کی نالیں اس کی طرف کی ہوئی تھیں..... انسپکٹر بھی ہولسٹر سے ریوالور نکال چکا تھا..... اس سے پہلے کہ وہ تینوں مجسمہ پر فائر کھولتے مجسمہ نے ایک لمحے میں سب کو قہر آلود نگاہوں سے گھور کر دیکھا۔ پھر وہ اس قدر سرعت سے کھڑکی کی طرف لپکا کہ وہ دیکھتے رہ گئے اور انہیں اس پر فائر کرنے کی مہلت بھی نہ مل سکی..... چشم زدن میں جو کچھ دیکھا اس نے انسپکٹر کو بھونچکا کردیا۔ مجسمہ کھڑکی سے کود گیا تھا۔

انسپکٹر نے فوری طور پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دیں۔ پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔

جلدی سے سب انسپکٹر کپور کمار کو بلالو اور اس کا پیچھا کرو..... لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ فاصلہ اس کے درمیان ضرور قائم رہے..... جب اس کے قریب ہوجاؤ..... وہ تم پر حملہ آور تو کوشش کرکے اس پر چادر یا کمبل ڈال دینا..... پھر جال ڈال کر اس کا جسم رسی سے باندھ دینا..... وہ اس طرح قابو میں آجائے گا۔"

شاستری نے اس کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا..... کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اب مجسمہ کو دنیا کی کوئی طاقت نہ تو قیدی بنا سکتی تھی اور نہ ہی نجات دلا سکتا تھا..... یہ خون کا پیاسا ہوچکا تھا۔ سمادھی کھودنے والوں کو موت کی بھینٹ چڑھائے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا..... وہ سوچ رہا تھا..... "کاش! پروفیسر زندہ ہوتا.....! وہ اس خونی مجسمہ سے نجات دلا دیتا۔"

چند لمحوں کے بعد انسپکٹر نے سنیل داس کی لاش پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اس نے شاستری کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ کو اندازہ ہے کہ خونی مجسمہ نے اب کس طرف کا رخ کیا ہوگا.....؟"

"اس کا شکار وہی لوگ بن رہے ہیں جن کی ذات سے اسے اذیت اور تکلیف پہنچی۔" شاستری نے جواب دیا۔ "اسے صرف انہی لوگوں کی تلاش ہے، وہ ایک ایک کو چن چن کر جب تک نہیں مار لے گا۔ اس وقت تک چین نہیں لے گا۔"

"اس کا مطلب تو صاف، واضح اور ظاہر یہ ہوا کہ اب آپ اور مس پونم ہی رہ جاتے ہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "یہ محض اتفاق تھا کہ صورت حال کچھ ایسی ہوگئی تھی جس سے آپ دونوں محظوظ رہے۔"

"مجھے کوئی نہ کوئی ایسی تدبیر کرنی ہے جس سے میں اور پونم اس سے ہر طرح محفوظ رہیں۔" شاستری نے کہا۔ "ورنہ پونم کی نہ صرف زندگی بلکہ عزت پر آنچ آسکتی ہے۔ میں اس وقت سب انسپکٹر کے ساتھ جارہا ہوں۔" شاستری نے دروازے کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔

"آپ اکیلے مت جائیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "میں بھی ساتھ ساتھ چلوں گا۔" انسپکٹر اس کے پیچھے لپکا۔

☆.....☆.....☆

وہ تہہ خانہ..... پونم کو مکان کے مقابلے میں بہت بڑا لگ رہا تھا..... وہ نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑی متوحش تھی۔

اس کی حیرت کی وجہ صرف اور محض جگہ کی کشادگی نہیں تھی..... بلکہ اسے جس طرح سے بھرا گیا تھا وہ اس کی حیرانی کا باعث تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ کسی خالی جگہ کو اس طرح سے بھی بھرا جاسکتا ہے کہ وہ کباڑ خانہ معلوم ہو۔

سیڑھیوں کے قریب اور زینے کے درمیان جو جگہ تھی وہاں بھیڑیا..... اوہ بھگوان.....! بھیڑیا پر نگاہ پڑتے ہی اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور اس کا جسم کانپ گیا۔ لمحے کے لئے دل دھڑکنا بھول گیا.....

رامون..... جس سے سری لنکا کے لوگ عاجز تھے یہ اس کا مجسمہ تھا۔ اسے خونی بھیڑیا کہا جاتا تھا..... اس کی آنکھیں اندھیرے میں یوں چمک رہی تھیں جیسے وہ زندہ ہو..... اس کی خوف ناک اور بڑی بڑی آنکھوں میں شیطنیت بھری ہوئی تھی۔ ہوس کی چنگاریاں تھیں..... اس کے متعلق جو قصہ کہانیاں برسوں سے زد عام تھیں اسے سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے..... یہ مہاراجا تھا..... اس کی رعایا میں جو بھی لڑکی سیانی ہوتی تھی اس کی عزت و آبرو محفوظ نہ ہوتی تھی۔ اس کے پاس ان لڑکیوں کی فہرست ہوتی تھی جو پیدا ہوئی تھیں..... ان کی عمریں..... اور وہ جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والی ہوتی تھیں..... اس نے منادی کرائی ہوئی تھی جیسے ہی لڑکی نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا اس کی خدمت میں پیش کیا جائے..... وہ شب بسری کے بعد کسی چڑیل کی طرح اس کا خون پی جاتا..... اس کی جان کسی نہ کسی طرح بچالی جاتی تھی لیکن وہ ایک ماہ تک ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا رہتی..... پھر اس کی موت تک لوگ بڑے پریشان، خوف زدہ اور ہراساں تھے۔ اس کی موت کی دعائیں مانگتے تھے..... آخر اس کی موت بارہ برس کی ایک نوجوان لڑکی کے ہاتھوں ہوئی۔ اس نے مہاراجا کے کمرے میں پہنچ کر اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکالا اور اس کے پیٹ اور سینے میں دل کی جگہ اتار دیا..... اس لڑکی کو قتل کرنے کے بجائے مہارانی بنادیا گیا۔ کیوں کہ مہاراجا سے سپاہی بھی پریشان تھے۔ ان کی جوان ہونے والی لڑکیوں کو بھی بستر کی زینت بناتا تھا۔ انکار کی صورت میں لڑکی کے ماں باپ کو قتل کرکے ان کا گوشت کتوں کو کھلا دیا جاتا تھا۔ اس کی موت سے پھر جانے سکھ کا سانس لیا تھا۔

اس کے طویل القامت مجسمے کے قدموں میں ایک انتہائی بدصورت کسی آدمی کا مجسمہ تھا جسے دیکھتے ہی جسم پر جھرجھری سی آجاتی تھی..... پونم نے سوچا..... شاید یہ بھی خون آشامی ہوگا۔ اس کی صورت سے ظاہر ہوتا تھا۔

چاروں دیواروں پر بڑے بڑے شیلف تھے جن پر بڑی بڑی بیش بہا اور نادر اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ان میں سے بہت ساری اشیا کو نہ صرف پہچانتی تھی بلکہ ان کے بارے میں ان کی بڑی وسیع معلومات بھی تھیں۔ البتہ اس نے ساری چیزوں کو یک جا پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک طرح سے اس کمرے میں کسی میوزیم کا دھوکا ہوتا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ ان ساری چیزوں کو..... نوادرات کو یک جا دیکھ کر کیا محسوس کررہی ہو.....؟" ونود کھنہ نے پوچھا۔

"مجھے..... مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا ہے..... بس ایسا محسوس ہورہا ہے کہ میں کوئی سندر سا سپنا دیکھ رہی ہوں۔" پونم نے جواب دیا۔ ساری کی ساری چیزیں اس سلیقے اور قرینے اور ترتیب سے رکھی ہوئی ہیں کہ اس نے ان کی خوب صورتی میں اضافہ کردیا ہے۔ اس اعلیٰ اور نفیس ذوق کی تعداد نہ دینا بدذوقی ہوگی۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں کسی میوزیم میں کھڑی ہوں۔"

چلتے چلتے فرش پر نگاہ پڑی تو وہ ٹھٹک کر رکی۔ ایک سکہ پڑا ہوا چمک رہا تھا۔ اس کی آب و تاب نظروں کو خیرہ کررہی تھی۔ اس نے جھک کر اٹھالیا..... اس پر کسی دیوی کا چہرہ تھا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی بولی۔

"یہ مصر کے کسی فرعون کے عہد کا ہے..... فرعون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی کوشش ہوتی کہ ان کے دور کے سکے بہت شان دار اور جاذب نظر ہوں۔"

"شروع ہی سے اسے میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔" ونود کھنہ نے عقب سے کہا۔ "معلوم نہیں فرش پر کیسے گر گیا اور سکے سامنے والی الماری میں رکھے ہیں۔"

پونم نے وہ سکہ شیلف میں رکھ دیا۔ پھر مڑ کر اس کے روبہ رو ہوئی تو اس کے سارے جسم میں سن سناہٹ دوڑ گئی..... کیا یہ اس وقت مسرت کمار ہے..... پونم نے خوف کی سی حالت میں سوچا۔ جانے کیوں اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی جال میں پھنس گئی ہے۔ کیوں کہ اسے یہاں وحشت سی ہو رہی تھی۔ یہ ساری چیزیں اور در و دیوار کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھیں۔

"کیا ہونے والا ہے.....؟" پونم سے رہا نہیں گیا۔ وہ دہشت زدہ سی ہو کر بولی۔ "میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ کچھ ہونے والا ہے..... تم اور میں..... آخر یہ سب کیا ہے.....؟ یہ کیسا اسرار اور ان جانا خوف ہے؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ جان تمنا.....! اب میں مرنے والا ہوں۔" ونود کھنہ کا لہجہ بے حد سرد اور سپاٹ تھا۔ "میری موت میرے سامنے کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے کہ..... اب تم مرنے سے بچ نہیں سکتے۔"

"ونود.....!" پونم نے اس کا نام لیا تو اس کے لہجے کی طرز زندگی چھپی نہ رہ سکی۔

یہ ایک انسان کا کام تھا..... اس کے عہد اس کی دنیا کا باسی تھا اور اس سے چھین لیا گیا تھا..... اس نے کتنا ٹوٹ کر چاہا تھا..... لیکن اب وہ ونود کھنہ نہیں رہا تھا..... مسرت کمار تھا..... حال کا نہیں ماضی کا آدمی تھا۔

"جب تمہارے پتا جی نے میرے بھائی کی سادھی دریافت کی تو اس نے میرے مرنے کے ذرائع مہیا کر دیئے..... لیکن یہ ذرائع اس وقت بے جان..... بے وقعت اور بے اثر تھے..... یہ تم پر چھوڑ دیا گیا تھا..... صرف تم پر میری جان پونم.....! ان ذریعے کو کیا زبان دوں..... تاکہ یہ اب تک کے لئے جان دار ہو جائیں۔"

"مجھ پر.....؟" وہ بھونچکی سی ہو گئی..... اس پر لمحے کے لئے سکتہ سا طاری ہو گیا..... اسے اپنی سماعت پر فتور سا محسوس ہوا۔ وہ اسے پھٹی پھٹی نظروں سے گھورنے لگی۔ اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

ونود کھنہ نے جیب سے نقش نکالا تو پونم نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ یہ سوال کرتی کہ تمہارے پاس کہاں سے آیا۔ ونود کھنہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔

"جب تک میرا بھائی میرا دشمن اور میری موت کا خواہش مند ہے اور اس کا ہاتھ موجود ہے..... مجھے اسے استعمال کرتے رہنا چاہئے..... اس کے بعد میں اور تم ایک ہو جائیں گے جیسا کہ میں چاہتا تھا..... تم اور میں..... پونم میری جان ہم یک جان دو قالب ہو جائیں گے..... تم نے کہا تھا میرے ساتھ چلو گی..... نہیں کیا تھا.....؟" ونود کھنہ نے اس کا چہرہ نظروں کی گرفت میں لے کر بولا۔

"اب.....؟"

"وہ پونم کا خوب صورت..... سڈول اور مرمریں ہاتھ تھام کر اسے تہہ خانہ کے وسط میں لے گیا جہاں ان پر شیلف پر رکھے سروں کی نظریں پڑ رہی تھیں..... پونم کو اس جگہ پر کھلونوں کی دکان کا گمان ہو رہا تھا۔

اتنے میں ونود کھنہ گھٹنوں کے بل تعظیم کے انداز میں جھک گیا..... اور اس نے پونم سے بھی ایسا ہی کرنے کے لئے کہا۔ پونم نے نہیں چاہتے ہوئے بھی اس کی ہدایت پر عمل کیا..... اس نے محسوس کیا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت اس کی بات ماننے پر مجبور کر رہی ہے۔ اس لئے اسے عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اس نے اتنا تو جان لیا تھا کہ کوئی سحر ہے جس نے اسے جکڑ لیا ہے۔

"میں جو کہتا جاؤں گا اسے دہراتی جاؤ گی....." ونود کھنہ بولا۔ "تم تیار ہو نا.....؟"

"ہاں..... میں تیار ہوں....." پونم کو اپنی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔

"جاگ..... اے خاموش شے..... جو ابدی نیند کی طرح سو رہی ہے....." ونود کھنہ نے سحر زدہ آواز میں کہا۔

لیکن پونم نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ اس نے جملہ دہرایا نہیں۔

"ظاہر ہو جا....." ونود کھنہ نے کہا تو اس کے لہجے میں انکساری تھی اور تحکمانہ انداز بھی تھا۔ "یہ تو ان لوگوں کو سزا دینے میں حق بجانب ہے جنہوں نے تجھے اذیت پہنچائی..... تیری ابدی آرام گاہ کو نقصان پہنچایا۔

ظاہر ہو جاؤ....." پونم نے دیکھا کہ تہہ خانہ کی دیوار ایک جگہ سے پھٹ گئی اور شگاف میں مجسمہ کا ہیولا کھڑا تھا..... پھر اس نے قدم شگاف سے باہر رکھا تو پونم دہشت زدہ سی ہو گئی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔

ونود کھنہ نے جو پوجا کے انداز میں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا..... سر اٹھا کر دیکھا اور پھر مسرت بھرے لہجے میں بولا۔

"اوہ..... دلشان کمار..... سب کے باپ..... اپنے اس حقیر غلام کو وہ چیز دان کرو جو انڈے میں بند پرندے کو دیتا ہے..... اسے زندگی اور موت کی لازوال طاقتیں دو....."

پھر اس نے اپنا ہاتھ مجسمہ کی طرف پھیلایا۔ "گنگا رام..... اب وہ وقت لے آ کہ..... میں دو ہزار برس قبل جیسا بن جاؤں..... سری لنکا کے عظیم مہاراج دلشان کمار کے بیٹے..... جاگ..... اب نہیں تو کب جاگے گا.....؟" مجسمہ آہستہ آہستہ باوقار انداز سے اس کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

ونود کھنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے مجسمہ کو مخاطب کیا۔

خوش آمدید..... میرے پیارے بھائی.....! اب وقت ہے اور غیر معمولی طاقت تیرے قدموں میں ہے..... تیری مٹھی میں ہے کہ دنیا کو تسخیر کرے اور دنیاوی کام پورا کرے..... ابد تک سکون سے آرام کر سکے..... میں تجھ سے دیا کا..... کرپا کا طالب ہوں..... اور مجھ سے پہلے....."

پھر اس نے پونم کی طرف دیکھے بغیر کہنے لگا۔

"میں نہایت عاجزی سے تجھے اس چیز کا نذرانہ پیش کرتا ہوں جس کا تو ہمیشہ طلب گار رہا..... دیکھ ذرا غور اور توجہ سے دیکھ..... تو ہمیشہ حسن پرست رہا..... پرشباب گداز بدن تیری کم زوری رہی..... اس کا سراپا دیکھ..... جسمانی نشیب و فراز کی قیامتیں..... اس میں کیسی کیسی بجلیاں بھری ہیں..... جسم کیسے کیسے فتنے جگا رہا ہے..... انگ انگ سے مستی ابلی پڑ رہی ہے..... جس طرح اس کے باپ نے سادھی کو تباہ کیا..... اس لڑکی نے بے حرمتی کی..... تو بھی اس کی بے حرمتی کر دے..... یہ دنیا کی سب سے حسین اور کومل شے ہے۔"

"تو نے اسے نقش ثانی کیوں دیا..... اسے تو اب ہاتھ لگا سکتا ہے اور نہ میں..... ہم دونوں کو یہ جلا کر بھسم کر دے گا۔"

"لیکن جب تک میرے پاس نقش ثانی رہا مجھے کچھ نہیں ہوا..... میرا بال تک بیکا نہیں ہوا..... تھوڑی دیر پہلے تو میں نے اسے اس لڑکی کے گلے میں پہنایا ہے..... اس لئے کہ یہ ہماری ہر طرح سے تابع ہو جائے گی..... یہ کیسے نقصان پہنچا سکتا ہے....."

"ابھی ابھی میں نے اپنے باپ کی آتما کو دیکھا ہے..... جانتے ہو اس کی آتما کس لئے آئی ہے..... وہ اس لڑکی کی مدد کرنے..... وہ اس بات کا سخت مخالف ہے کہ عورت کی عزت و آبرو خاک میں نہ ملائی جائے..... اس کی آتما نے مجھ سے وچن لیا تھا کہ میں جس سنسار میں جاؤں بھلے وہاں کی عورت سے پریم کروں..... اس کے جسم سے کھیلوں..... لیکن اس کی عزت و آبرو کو برباد نہ کروں..... میں نے اس لڑکی سے خوب جی بہلایا..... لیکن حد سے تجاوز نہیں کیا..... پتا جی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی آتما نے اس نقش میں ایسا سحر پھونک دیا ہے کہ جو بھی اس عورت کو برے ارادے سے ہاتھ لگائے گا جس کے گلے میں نقش ثانی ہے اس کے جسم سے ایک آگ سی نکل کر اسے جھلسا دے گی..... اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے تو اسے ہاتھ لگا کر دیکھو.....؟"

ونود دھنہ کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو..... اس لئے کہ اسے اپنی ملکیت بنالو۔"

اس نے پونم کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ اسے بے لباس کر کے..... اپنی آغوش میں لے کر اس کی عزت کو بھائی کے سامنے ہی پامال کردے۔ اس نے جیسے ہی پونم کا بازو پکڑا اسے ایسا لگا جیسے وہ دہکتا ہوا انگارہ ہو..... اس کا ہاتھ بری طرح جھلس گیا۔ وہ اپنے متاثرہ ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر تڑپنے اور ناچنے لگا.....

شاستری دروازے کی دہلیز پر کھڑا جو یہ تماشا دیکھ رہا تھا وہ وہاں سے چیخ کر بولا۔

"پونم..... انقش ثانی کو اس مردود کے جسم سے لگا دو..... یہ جل کر مر جائے گا..... جلدی کرو۔"

پونم نے فوراً ہی نقش ثانی نکال کر ونود دھنہ کے جسم سے لگا دیا..... اس کے سارے بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا سارا جسم شعلوں کی نذر ہو رہا تھا..... اسی وقت انسپکٹر اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہنچا..... اس نے ونود دھنہ کو نذر آتش دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا..... اس کی دل خراش چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں..... تھوڑے دیر بعد وہاں سوختہ لاش پڑی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جو کچھ پیش آیا وہ ہر ایک کے لئے ناقابل یقین اور کسی جادوئی فلم کے منظر کی طرح حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھا۔

ونود دھنہ نے جو چار ہزار گز کے رقبے پر عالی شان کوٹھی بنائی ہوئی تھی وہ ایک کالونی کے عقب میں ویرانے میں تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں سے گھری ہوئی..... اس پر حویلی کا دھوکا ہوتا تھا..... ایک دم سے ایک کثیف دھواں اٹھا جس نے ان سب کو لپیٹ میں لے لیا..... انہیں کچھ سجھائی نہیں دیا..... وہ کھانسنے اور آنکھیں ملنے لگے..... تھوڑی دیر بعد جب دھواں چھٹ گیا تو ان سب کی آنکھیں اس قابل ہوئیں کہ دیکھ سکیں..... انہوں نے دیکھا کہ اس کوٹھی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ وہاں ایک بہت بڑا خالی پلاٹ پڑا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہاں اس عالی شان کوٹھی کا وجود ہی نہیں تھا۔

انسپکٹر اور اس کے ساتھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے شاستری سے کہا۔

"کہیں یہ خواب تو نہیں ہے جو میں دیکھ رہا ہوں..... یہ کوٹھی کہاں گئی..... سوختہ لاش اور مجسمہ....."

"شاید اب بھی آپ میری کسی بات کا یقین نہیں کریں گے۔" شاستری نے کہا۔ "یہ محل جادوئی تھا..... اسے جادو کے زور سے بنایا گیا تھا..... اس کا جادو ختم ہوا تو محل بھی ختم ہو گیا..... کیا اب بھی جادو کے اسرار اور علوم کے قائل نہیں ہوئے؟"

"ہو تو گیا ہوں....." انسپکٹر نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "کیا وہ مجسمہ بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہے.....؟"

"جی نہیں....." شاستری بولا۔ "اس کا وجود ابھی ہے..... وہ غائب ہو گیا ہے..... معلوم نہیں وہ اب کیا کرنے والا ہے۔ اس کے عزائم کیا ہیں.....؟ بہر حال ہمیں اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا....."

"یہ کام اب یہاں نہیں سادھی پر ہوگا....." مجسمہ نے جواب دیا۔ "اسے ہم سادھی پر لے چلتے ہیں....."

شاستری اس طرف آنکلا تھا۔ اس نے مجسمہ کی بات سن لی تھی۔ اس نے پونم کے پاس آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہ چیخ کر بولا۔

"پونم.....! بھاگ چلو..... نیچے انسپکٹر اور اس کے آدمی مسلح ہیں۔ وہ ہمیں بچا لیں گے....."

"بچا لیں گے.....؟" ونود دھنہ قہقہہ مار کر بڑے

زور سے ہنسا۔ اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ وہ مجسمہ سے غائب ہو کر بولا۔ "اچھا ہوا یہ آ گیا..... اسے بھی لے چلو..... سادھی پر اس سے بھی انتقام لیں گے۔"

مجسمہ نے اپنا منہ کھول کر ان دونوں پر ایک زور سے پھونک ماری۔ اس کے منہ سے دھوئیں کا ایک مرغولا نکلا ان دونوں کے چہروں پر ایک بڑا سا مرغولہ بن کر چھا گیا..... پھر ان دونوں کو کچھ خبر نہیں رہی۔ اس دھوئیں کے مرغولے میں انہیں ایسا لگا وہ تاریکیوں میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ جب وہ ہوش میں آئے تو انہیں یہ بھی یاد نہیں آ سکا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہے..... انہوں نے اپنے آپ کو سادھی پر پایا..... ان سے خاصے فاصلے پر ونود دھنہ اور مجسمہ کھڑے ان کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پونم کو یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ آناً فاناً وہ ہندوستان سے یہاں سادھی پر کیسے آ گئے..... لیکن اسے یاد آیا کہ جادو کے زور پر کیا نہیں ہو سکتا..... یہ بھی طلسماتی کرشمہ ہے جس نے ان دونوں کو پلک جھپکتے میں لاڈالا ہے۔ وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تو ونود دھنہ نے اسے فوراً ہی جکڑ لیا۔

"میرے بھائی.....! تم نے کیا فیصلہ کیا..... کیا تم اپنے بھڑکتے جذبات کی پیاس نہیں بجھاؤ گے.....؟ کیا رسیلا بدن ہے..... کسی پکے ہوئے پھل کی طرح..... نس نس میں امرت بھرا ہوا ہے..... تجھے ایسی رسیلی ناری نہیں ملے گی.....؟ اس کی بھرپور نوجوانی اور ابلتا شباب دیکھ..... اگر تجھے میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو کیا اسے کسی تلوار کی طرح بے نیام کر دوں.....؟ اس کی دھار اور چمک دیکھنا چاہتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ ونود دھنہ کا ہاتھ اسے بے لباس کرنے کے لئے بڑھتا پونم نے ایک چیخ ماری اور اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی، اس کا بدن کسمسایا۔ ونود دھنہ کے ہاتھوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ اس کا حلقہ توڑ نہ سکی۔ وہ اسے چومنے کے لئے چہرے پر جھکا تو پونم نے اس کے چہرے کو ناخنوں سے لہولہان کر دیا۔ پھر وہ اسے چوما تو نہیں البتہ اسے مضبوطی سے تھامے فاتحانہ انداز اور تکبر سے دیکھتا رہا۔ پونم کے گداز جسم کا لمس سارے جسم میں سنسنی دوڑاتا رہا۔

مجسمہ نے ایک قدم بڑھ کر ایک ہاتھ اوپر اٹھایا تو اس نے پونم کو مجسمہ کے سامنے کر دیا۔

اس سے پہلے کہ ہم دونوں بھائی اس دنیا سے واپس پرلوک میں جائیں..... دنیا والوں کے لئے محض قصہ کہانیاں ہوں..... اس پاپی قوم کو نیست و نابود کر دے..... یہ اس قابل نہیں کہ ہمارے انجام کو دیکھے..... ہمارے درمیان کوئی انسانی وجود آ کر ہمیں نجس اور پاپی کر دے....." ونود دھنہ کسی شیر کی مانند گرج رہا تھا۔

پونم نے اس کشمکش کے دوران شاستری کو دیکھا جو نیم غشی کی سی حالت میں فرش پر پڑا ہوا تھا..... اس نے شاستری کو بیدار کرنے کے لئے ایک فلک شگاف چیخ ماری..... ونود دھنہ نہیں چاہتا تھا کہ شاستری بیدار ہو کر اس کی مدد کو آئے..... اس نے پونم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ پھر چیخ نہ سکے..... پونم نے اس کے بازوؤں کے حلقے میں کسمسا رہی تھی..... مچل رہی تھی..... اس کی ہر کوشش بے سود اور ناکام ہو رہی تھی۔ لیکن اس نے اپنی جدوجہد ترک نہیں کی.....

مجسمہ نے اسے اس طرح سے گود میں لے لیا جیسے وہ نوزائیدہ بچی ہو..... ابھی ابھی پیدا ہوئی ہو..... پھر وہ اسے اٹھائے ہوئے مخالف سمت غار نما گوشے میں داخل ہو گیا۔

پونم نے اپنے عقب میں شاستری کی آواز سنی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "کمینے بتا..... پونم کہاں ہے.....؟"

پونم مزید کچھ نہ سن سکی..... کیوں کہ اس کے دائیں بائیں اور سامنے ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے..... وہ کسی عفریت کی طرح گھور رہا تھا..... یہ مجسمہ یوں تو اس کے لئے کسی عفریت سے کم نہ تھا..... لیکن وہ جو اس کے ساتھ ایک محبوب کی طرح پیش آیا تھا..... جی بھر کے من مانیاں کی تھیں بلکہ اس نے بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو خود سپردگی سے اپنے آپ کو مجسمہ کے حوالے کردیا تھا۔ مجسمہ کیف وسرور کے ایک ایسے جہاں میں لے گیا تھا جس سے وہ ناآشنا تھی...... وہ بہکتا رہا تھا...... لیکن اس نے حد سے تجاوز پیش کیا تھا۔ پونم کی عزت پر آنچ نہیں آئی تھی۔ اگر وہ فاصلہ مٹادیتا تو پونم مزاحمت بھی نہ کرتی۔

بہت ساری باتیں جتنی عجیب وغریب تھیں اتنی ہی ناقابل فہم بھی...... اس کے کسی ساتھی نے سوچا نہیں تھا...... اور وہم وگمان میں یہ بات آسکتی تھی دو ہزار برسوں کے مجسمے میں جان بھی پڑسکتی ہے...... تنگارام کی آتما اس میں سما کر مجسمہ کو حیات نو بخشے گی...... اب وہ مجسمہ کے رحم وکرم پر تھی اور اسے کوئی بچا نہیں سکتا تھا...... پراسرار اور نادیدہ قوتوں کا سائنس اور جدید ترین اسلحہ...... جو اس مجسمے کے مقابلے میں ناکارہ تھا۔

پونم کو اندازہ نہیں ہو پارہا تھا کہ مجسمہ اسے کہاں اور کیوں اٹھا کر لے جارہا ہے؟...... اس کی زندگی ختم کردینا تھا تو وہ ابھی اور اسی وقت بھی کرسکتا تھا...... اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوگئی تھیں...... کیا وہ اسے کسی ایسے گوشے میں لے جارہا ہے جہاں وہ اس سے کسی کھلونے کی طرح کھیل سکے......؟ اس کی عزت تار تار کردے...... اگر ایسا اس نے کیا تو وہ اپنی عزت اس سے بچا سکے گی...... وہ ایک موم کی سی گڑیا ہے...... وہ سات فٹ کا دراز قد اور کسی پتھر کی طرح سخت ہے...... لیکن گوشت پوست کا تو ہے...... اس میں ہر قسم کی حیات موجود ہیں...... وہ ایک بھرپور اور مکمل انسان ہے...... اس کے جذبات بھی ہیں......

پونم کو اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ قدم بہ قدم زمین کی تہہ کی طرف لے جارہا ہے...... جیسے جیسے مجسمہ آگے بڑھتا جارہا تھا ویسے ویسے راستہ تنگ ہوتا جارہا تھا...... اور پھر پانی بہنے کا ایک مدھم سا شور سنائی دیا...... شاید دریا یا سمندر ہوگا...... پونم نے سوچا...... وہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک طاقت ور ٹارچ کی روشنی نے اس گھپ اندھیرے کو منور کردیا۔ پونم نے دیکھا۔ ونود کھنہ ان کے پیچھے دوڑتا ہوا آرہا ہے...... اس کے پیچھے پیچھے شاستری ہے...... ٹارچ شاستری کے ہاتھ میں تھی۔

پھر پونم نے دیکھا کہ...... ونود کھنہ کو شاستری نے دبوچ لیا۔ دونوں گتھم گتھا ہوگئے...... مجسمہ نے ان دونوں کو پلٹ کر دیکھا اور پھر ان کی بے پروا کئے بغیر چلتا رہا۔ ونود کھنہ نے شاستری کی گرفت سے نکل کر اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ دور جا گرا۔ پتھریلی زمین پر گرنے سے اسے چوٹ آئی تو وہ بے ہوش ہوگیا۔

ونود کھنہ لپک کر مجسمہ سے آملا۔ وہ دونوں تیز رفتاری سے ایک کشادہ تہہ خانہ میں نکل آئے...... اس کے ایک کونے میں ایک بہت بڑی شان دار اور لمبی چوڑی مسہری تھی۔ اس پر جو بستر تھا وہ نہ صرف صاف ستھرا بلکہ بے حد نرم وگداز تھا۔ مجسمہ نے ونود کھنہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔

مجسمہ نے پونم کو ریوالور کے سہارے کھڑا کردیا۔ پونم کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا جس سے ایک ہیجان پیدا ہورہا تھا۔ ونود کھنہ اور مجسمہ تہہ خانے کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ پھر مجسمہ نے پلٹ کر پونم کی طرف دیکھا...... پونم نے اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کی آنکھوں میں درندگی دیکھی تو اسے لگا یہ وہ مجسمہ نہیں ہے جس نے اس سے پریم کا اظہار کیا...... من مانیاں کی تھیں...... اس وقت وہ اسے شیطان معلوم دیتا تھا۔

"ونود......! پلیز......! ونود......!" وہ مجسمہ سے اس قدر خوف زدہ ہوگئی تھی کہ اس نے رحم طلب نظروں سے ونود کی طرف دیکھا شاید وہ اس کی کوئی مدد کرے...... اس مجسمے سے بچالے...... آخر اس نے بھی تو ونود کو اپنی محبت سے کسی حد تک خوش کیا تھا...... شاید وہ اس کا لحاظ کرے۔ شاستری بے ہوش ہوچکا تھا۔ یہ امید کی آخری کرن تھا۔ "اسے روکو...... بھگوان کے لئے...... وہ میری جان لینے کے درپے ہوگیا ہے...... تمہیں میری محبت کی سوگند......"

"موت سے مت ڈرو میری جان......!" ونود کھنہ نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ اسے دلاسا دینے لگا۔ "تم موت کی آغوش میں جانے سے بچ نہیں سکتی ہو...... دنیا میں اس سے پیاری چیز کوئی نہیں ہے۔"

"میری زندگی ختم کرنے سے کیا حاصل ہوگا......؟" پونم کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ "بلاوجہ مجھے موت سے ہم کنار نہ کرو۔"

"مر کر تم مجھے پالوگی...... ہم دونوں ابد تک کے لئے ایک ہوجائیں گے...... پھر ہماری محبت امر ہوجائے گی......" ونود کھنہ کہنے لگا۔ موت سے صرف بزدل...... بے وقوف اور ڈرپوک ڈرتے ہیں...... تم جتنی حسین ہو...... اتنی بہادر بھی تو ہو...... پھر یہ ڈر کیسا......؟"

"نہیں...... نہیں...... میں اس طرح مرنا نہیں چاہتی...... میں زندہ رہنا چاہتی ہوں...... مجھے نہ مارو۔" وہ التجا کرنے لگی۔

"تمہارا دوسرا جنم کتنا سندر ہوگا۔ تم اس کا تصور تک نہیں کرسکتی ہو......" ونود کھنہ کہنے لگا۔ "تم مر کر بہت خوش ہوگی۔ کیوں کہ نہ صرف تمہارے پتا جی...... بلکہ جگن ناتھ...... اور سنیل داس بھی ہوگا...... وہ تمہارے منتظر ہیں کہ تم کب آؤ گی...... میں تمہیں اس دنیا کے بارے میں بتاؤں...... وہ بڑی انوکھی، انمول اور اتنی خوب صورت اور پیاری سی ہے کہ وہاں صرف اور صرف خوشیاں ہیں...... وہاں دنیا کے پاپ نہیں ہوتے ہیں...... تم شاید موت سے اس لئے دہشت زدہ ہو کہ وہ بہت اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتی ہے...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... تمہیں مرتے وقت ذرہ برابر بھی تکلیف نہیں ہوگی...... موت اتنی آسانی سے ہوگی تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا...... اس میں ایک عجیب سی لذت، کیف اور راحت محسوس کروگی...... یہ اس اذیت کے مقابلے میں کچھ بھی نہ ہوگی جو میں نے تین ہزار برس دربدر بھٹکتے گزارا ہے...... طاعون...... قحط...... غربت و افلاس...... وبائیں اور خوف ناک قسم کی جنگیں...... انسان...... انسان کے لہو کا پیاسا...... آدمی...... آدمی کا دشمن...... خون آشام بھیڑیا...... اس سے زیادہ کوئی عذاب نہیں ہے...... کیا ہم دائمی اور پرسکون زندگی کی کوئی خواہش نہ کریں...... پونم! تم بہت خوش نصیب ہو کہ دنیا کی حسین ترین دوشیزہ ہو......"

"نہیں...... نہیں......" پونم کانپ کر بولی۔ "مجھے فلسفہ نہیں...... زندگی چاہئے۔"

ونود کھنہ نے معنی خیز مسکراہٹ سے مجسمہ کی طرف دیکھا۔ "تنگارام......! تم اس شبھ کام میں دیر کس لئے کررہے ہو......؟ اسے موت کی میٹھی، ابدی اور پرسکون نیند سلادو......"

مجسمہ کا ہاتھ پونم کے گلے کی طرف بڑھا...... پونم میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی کہ وہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتی...... مزاحمت کرتی اور پیچھے ہٹ جاتی...... پھر اس نے گلے پر مجسمہ کی انگلیاں محسوس کیں...... جو برف کی طرح یخ تھیں...... ریشم کی طرح نرم نرم تھیں، لیکن اس کے ہاتھ میں...... انگلیوں میں اس روز والی بات بالکل بھی نہیں تھی...... جب مجسمہ کا ہاتھ اس کے بدن پر رقصاں تھا تو اس پر کیسی مدہوشی سی طاری ہوگئی...... لیکن اب ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی کھن کھجورا ہو...... جب مجسمہ کا ہاتھ اس کے سینے کے زانو پر آیا تو وہ نقش ثانی سے چھوگیا...... مجسمہ نے ایک دم سے اپنا ہاتھ ہٹالیا۔

"اسے مار کیوں نہیں رہے ہو تنگارام......!" ونود کھنہ ہذیانی لہجے میں چیخا۔

لیکن مجسمہ ساکت کھڑا اس کی آنکھوں میں محبت سے جھانکتا رہا۔

"تم کیا بہرے ہوگئے ہو...... میں کیا کہہ رہا ہوں......" ونود کھنہ کا لہجہ تڑپ رہا تھا۔ پھر اس نے جیب سے ایک خنجر نکالا۔ جس کی خوف ناک دھار چمک رہی تھی...... "یہ طلسماتی خنجر لو...... اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہے مرتے وقت......" لیکن مجسمہ اس طرح نظر آرہا تھا جیسے اس میں زندگی ہی نہیں ہے......"

"تنگارام......!" ونود کھنہ غضب ناک ہوگیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنے ہاتھوں سے مرجاؤں..... یہ مرجائے گی تو اس کا ایک حسین جنم شروع ہوگا..... تم اس کے ساتھ دائمی سندر زندگی گزارو گے۔ وہاں یہ صرف تمہاری ہوگی۔"

ونود کھنہ نے جب دیکھا کہ مجسمہ پھر بھی بے حس و حرکت ہے..... اس نے اپنا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پونم پر وار کرتا مجسمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا..... پھر چشم زدن میں خنجر ونود کھنہ کے سینے میں دل کی جگہ اتر گیا۔ ونود کھنہ نے ایک دل خراش چیخ ماری..... جب خنجر نکالا تو خون کا فوارہ ابل پڑا۔ پھر اسے گہرے پانی میں دھکیل دیا۔ سطح خون سے سرخ ہوگئی۔ لیکن اس کی لاش نہیں ابھری۔

"پتا جی.....!" مجسمہ سرشاری سے بولا۔ "میں نے دو ہزار برسوں کے بعد ونود سے انتقام لے لیا..... میری آشا پوری ہوگئی۔ میں بہت خوش ہوں۔"

پونم تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ تیزی سے ایک طرف سرکنے لگی تو مجسمہ اس کی راہ میں حائل ہوگیا۔

"اب تم اپنا لباس اتار دو..... مہری پر چلو..... میں ونود کی موت کا جشن منانا چاہتا ہوں....."

"لیکن....." پونم پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ "اس روز میں نے تمہیں بہت پیار کیا..... اب مجھے جانے دو۔"

"سنو.....! میں تم سے ہر قیمت پر اپنی آشا پوری کرکے رہوں گا..... اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو پھر اس خنجر سے لباس تار تار کردوں گا....."

پونم کے لئے اس کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا..... اس نے قدرے تذبذب اور ہچکچاہٹ سے لباس اتار دیا..... مجسمہ کی ہوسناکی نظریں ناقدانہ انداز سے اس کے بدن کا جائزہ لے رہی تھیں.....

شاستری اس وقت پہنچا تھا۔ جب اس نے پونم کے سینے کے فراز پر نقش ثانی دیکھا تو حیران ہوا..... پھر وہ چیخ کر بولا۔

"پونم.....! نقش ثانی کے درمیان جو ہیرا ہے اسے دبادو..... یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا....."

مجسمہ نے چاہا کہ نقش ثانی نکال لے..... پونم نے فوراً ہی وہ ہیرا دبادیا۔ اس میں سے شعاعیں نکلنے لگیں۔ مجسمہ ایک دم سے ہٹا اور گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب ہوگیا۔ پونم نے ہیرے پر سے ہاتھ ہٹالیا۔

پونم..... شاستری کو دیکھ کر بھول گئی کہ وہ کس حالت میں ہے۔ وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک جذباتی کیفیت میں رہے..... پھر اس نے پونم کو الگ کرکے کہا۔ "کپڑے پہن لو....."

جب وہ کپڑے پہن چکی تو شاستری نے پوچھا۔ "یہ نقش ثانی کہاں سے ملا تمہیں.....؟"

"ونود کھنہ نے دیا تھا۔" وہ بولی۔ "تھوڑی دیر پہلے....."

"جب تک یہ ہمارے پاس ہے مجسمہ نقصان نہیں پہنچا سکتا....." شاستری نے کہا۔ "اس کی بڑی حفاظت کرنا ہے..... مجسمہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرے گا..... ویسے اب وہ بڑی تباہی و بربادی پھیلائے گا۔"

"تمہیں اس بات کا علم کیسے ہوا تھا کہ نقش ثانی میں جو جڑاؤ ہیرا ہے اسے دبانے سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔" پونم نے پوچھا۔

"پہلے یہاں سے نکلو پھر تمہیں بتاتا ہوں۔" شاستری نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ مجسمہ سادھی میں ہمیں بند کردے اور ہم گھٹ کر مرجائیں۔"

دونوں فوراً ہی نکل آئے۔ جب سادھی سے خاصی دور آگئے تب شاستری نے کہا۔

"مجھے آخری وقت میں علم ہوا تھا کہ اس نقش ثانی کی خصوصیت کیا ہے۔ یہ بڑی خوف ناک قسم کی شعاعیں ہیں..... یہ نہ صرف ہر قسم کے بڑے سے بڑے جادو کو بے اثر کردیتی ہے بلکہ نہ صرف آدمی بلکہ آتما کو بھی جلا کر بھسم کردیتی ہے۔ ونود کھنہ نے معلوم نہیں کیوں اسے تمہارے گلے میں ڈال دیا تھا۔ چوں

کہ مجسمہ اس کی خصوصیت سے آگاہ تھا۔ اس لئے اس میں سے شعاعیں نکلتے ہی غائب ہوگیا۔"

سریش کمار نے سانس لینے کے لئے توقف کیا تو چندرا دیوی بولی۔

"تم نے ایک طویل ترین داستان سنادی..... کیا یہ ختم ہوئی کہ نہیں.....؟"

"اصل کہانی تو اب شروع ہوتی ہے۔" سریش کمار کہنے لگا۔ "پونم اور شاستری سری لنکا میں موجود ہیں تاکہ وہ خونی مجسمہ سے بدلہ لیں۔ ادھر خونی مجسمہ ان کا بدترین دشمن بنا ہوا ہے۔ چوں کہ نقش ثانی پونم کے پاس ہے اس لئے اب تک وہ ان کا بال بیکا نہیں کرسکا اس کی ساری کوشش اور جدوجہد یہ ہے کہ کسی طرح نقش ثانی حاصل کرکے انہیں موت کی بھینٹ چڑھادے..... اور مجسمہ انتقام کے اندھے جنون میں غریب لوگوں کا دشمن بن گیا ہے..... وہ ہر حسین ترین عورتوں کی عزت کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اس نے کئی جوان لڑکوں کا خون بھی کیا ہے..... اس کے سامنے قانون اور بڑے بڑے جادوگر بھی بے بس ہیں۔ اب آپ کا وہاں جلد سے جلد پہنچنا ضروری ہے..... وہ ایک عفریت بنا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے..... میں آج ہی جارہی ہوں۔" چندرا دیوی بولی۔ "خونی مجسمہ کا خاتمہ کرکے آتی ہوں۔"

☆.....☆.....☆

رات سوتے وقت پونم نقش ثانی گردن سے نکال کر سرہانے والی میز پر رکھ دیتی تھی یا نہانے جاتے وقت..... پونم اور شاستری نے شادی کرلی تھی۔ ایک روز پونم نے نہا کر آنے کے بعد دیکھا تو سرہانے کی میز پر نقش ثانی نہیں تھا۔ کمرے میں شاستری بھی نہیں تھا۔ وہ کچن میں ناشتا تیار کررہا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ نقش ثانی میز پر رکھ کر گئی تھی۔ اس نے تکیے کے نیچے، فرش پر اور پلنگ کے نیچے بھی جھانک کر دیکھا۔ کہیں بھی نقش ثانی نظر نہ آیا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"شاستری..... شاستری.....!" وہ ہذیانی لہجے میں چیخنے لگی۔ "جلدی سے آؤ..... کہاں ہو تم.....؟"

شاستری خوف زدہ ہوکر بھاگا ہوا آیا کہ کہیں خونی مجسمہ تو نہیں آگیا..... اس نے کمرے میں آکر دیکھا۔ پونم کی حالت بڑی غیر ہورہی ہے۔ اس کی سانس سینے میں بے ترتیب ہورہی ہے اور پسینے میں نہا رہی ہے۔ اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا ہے۔

"کیا بات ہے.....؟" شاستری نے اس کے پاس جاکر پوچھا۔

"نقش..... ثانی..... غائب ہے....." وہ گھبرا کر بولی۔ "کیا تم نے اسے دیکھا.....؟"

"نہیں تو....." شاستری نے نفی میں سر ہلادیا۔

"تم نے اسے کہاں رکھا تھا.....؟"

"میں نے غسل خانے میں نہانے جاتے سمے اسے میز پر رکھا اور نہانے چلی گئی....." وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ "آکر دیکھا تو غائب ہے۔"

"یہ رہا نقش ثانی.....!" ان دونوں نے جو آواز سنی تو تیزی سے گھوم کر دیکھا۔

کمرے میں مجسمہ کھڑا استہزائیہ انداز سے ان سے مخاطب تھا۔ اس کے ہاتھ میں نقش ثانی تھا جس کی زنجیر پکڑ کر اسے ہلا رہا تھا اور اس کے چہرے پر غرور و تکبر تھا اور آنکھوں میں شیطنیت ناچ رہی تھی۔

"آخر میں نے اسے حاصل کرلیا نا.....؟" وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔

اس کے ہاتھ میں نقش ثانی دیکھ کر ان کی حالت مردوں سے بھی بدتر ہورہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجسمہ کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر دہشت چپکی ہوئی تھی۔ وہ قوت گویائی سے جیسے محروم ہوگئے تھے۔

"آخر تم ہمارے جانی دشمن کیوں بن گئے ہو.....؟" شاستری نے ہمت کرکے سکوت کو توڑا۔ "ہم نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا.....؟"

"اس لئے کہ میں اپنی سادھی میں سکون کی ابدی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نیند سو رہا تھا۔ میری آتما بھی شانت تھی..... میری سمادھی کھود کر تم لوگوں نے میرا سکون برباد کر دیا..... بہت بڑا پاپ کیا..... میں اس کی سزا دینا چاہتا ہوں۔"

"ہم نے اس عمارت میں اس لئے کھدائی کی تھی کہ اس میں نوادرات ہوں گے لیکن تمہاری سمادھی نکل آئی۔" شاستری نے صفائی پیش کی۔

"تم کچھ بھی کہہ لو..... تمہاری کسی بات کا یقین نہیں....." مجسمہ بولا۔ "میں اس نقش ثانی کی شعاعوں سے تم دونوں کو جلا کر بھسم کر دوں گا..... اب تمہیں دنیا کی کوئی طاقت بھسم ہونے سے بچا نہیں سکتی..... میں اس سے دشمنوں اور پورے ملک کو جلا دوں گا۔"

"لیکن ایک طاقت ایسی ہے جو انہیں اور اس ملک کو جلنے سے بچا سکتی ہے....."

ایک نسوانی آواز کمرے میں گونجی تو ان تینوں نے تیزی سے پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا۔ دہلیز پر چندرا دیوی کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ان تینوں کو حیرت ہوئی۔

"کون ہو تم.....؟" مجسمہ غرایا۔

"میں ان دونوں کی دوست اور ہم درد ہوں۔" چندرا دیوی نے جواب دیا۔ "میں نہ صرف ان دونوں کو بلکہ پورے ملک کو تم سے نجات دلانے آئی ہوں..... تم نے ظلم و بربریت کی انتہا کر دی ہے۔"

"اچھا....." وہ زہر خند بولا۔ "تم گویا نجات دہندہ بن کر آئی ہو..... کیوں نہ میں پہلے تمہیں جلا کر خاکستر کر دوں؟ تا کہ یہ تمہارے دوست تمہارا تماشا دیکھ لیں گے کہ تم نقش ثانی کی شعاعوں سے کیسے جل کر مرتی ہو....."

"لیکن اب یہ نقش ثانی ناکارہ ہو چکا ہے۔" چندرا دیوی نے کہا۔ "اس میں سے شعاع تو کیا روشنی بھی خارج نہیں ہوگی۔ میری بات کا یقین نہیں ہے تو آزما کر دیکھ لو۔"

چندرا دیوی اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی..... مجسمہ نے اس کا رخ چندرا دیوی کی طرف کیا..... ہیرے کو دبایا..... ایک نہیں کئی بار زور زور سے دبایا..... اس میں سے شعاع نہیں نکلی..... مجسمہ حیران اور پریشان ہو گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟" وہ پیچ و تاب کھاتے ہوئے بڑبڑایا۔ "یہ ہزاروں سال سے جلاتا اور بھسم کرتا آ رہا ہے۔"

"اسے میں نے اپنے جادو کے زور سے ناکارہ کر دیا ہے۔" چندرا دیوی بولی۔ "اب یہ کھلونا ہو کر رہ گیا ہے۔"

اس نے غصے میں آ کر نقش ثانی چندرا دیوی پر کھینچ کر دے مارا۔ وہ چندرا دیوی کے پیروں کے پاس فرش پر جا گرا تو چندرا دیوی نے اسے اٹھا لیا۔

"میں پونم کو لے جا رہا ہوں....." وہ پونم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "تا کہ اپنے باپ کی سمادھی پر اسے قربان کر دوں۔"

"خبردار.....!" چندرا دیوی نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "اسے جو ہاتھ لگایا۔ تو میں تمہیں بھسم کر دوں گی۔"

مجسمہ نے چندرا دیوی کی دھمکی کی پروا نہیں کی۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ چندرا دیوی نے نقش ثانی کا ہیرا دبایا..... اس میں سے شعاعیں خارج ہونے لگیں تو مجسمہ نے بھونچکا ہو کر دیکھا اور بولا۔

"یہ تو ناکارہ ہو گیا تھا۔ اب..... اب کیسے کارآمد ہو گیا۔"

"ایک منٹ....." چندرا دیوی بولی۔ "تمہیں بتاتی ہوں۔"

"میں نے اسے اپنی پراسرار قوت سے ناکارہ اور بے اثر کر دیا تھا تا کہ تم اسے ایک فضول سی چیز سمجھ کر پھینک دو۔" چندرا دیوی بولی۔ "دوسری طرف ایک نفسیاتی حربہ بھی جو بڑا کارگر ثابت ہوا جس کی مجھے توقع نہیں تھی..... کیوں کہ یہ تمہیں بہت عزیز تھا

اسے میرے ہاتھوں میں جادو سے بیکار ہونے پر تم بری طرح جھنجھلا گیا۔ تم نے غصے کی حالت میں یہ

سمجھ کر پھینک دیا کہ اب یہ کسی کام کا نہ رہا..... دراصل تمہیں غصے میں کچھ سجھائی نہیں دیا تھا۔" چندرا دیوی نے بڑی وضاحت سے بتایا۔

"تو..... تو کیا آپ کوئی مہان جادوگرنی ہیں جس کے آگے مجسمہ بے بس ہو گیا.....؟" پونم نے پلکیں جھپکاتے ہوئے تحیر زدہ لہجے میں کہا..... وہ دل میں عش عش کر اٹھی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی ایک اجنبی عورت جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی کہ وہ کون ہے..... کیا ہے.....؟ اس کے لئے مسیحا بن کر آئی اور اس نے اس خونی مجسمہ سے نجات دلا دی۔

"نہیں..... نہیں..... یہ جادوگرنی ہی نہیں ہیں..... بلکہ کچھ اور بھی بہت کچھ معلوم ہوتی ہیں۔" چندرا دیوی کے جواب دینے سے پہلے شاستری بول اٹھا۔ "ایک ایسی عظیم ہستی جس نے بروقت آ کر تمہیں موت کے منہ سے اور بے عزت ہونے سے بچا لیا۔ خونی مجسمہ کہیں بھی کبھی بھی ناکام اور نامراد نہیں ہوا۔ اپنا گھناؤنا مقصد ہر صورت میں پیدا کر کے رہتا ہے۔"

"کیا تم ان سے پہلے سے واقف ہو.....؟" پونم نے متعجب لہجے میں کہا۔ "تم نے کبھی ان کا ذکر نہیں کیا..... اگر تم نے بتا دیا ہوتا تو ہم ان کی خدمات حاصل کر کے اس خونی مجسمہ سے کب کا نجات حاصل کر چکے ہوتے.....؟"

"نہیں..... میں ان سے پہلے سے بالکل بھی واقف نہیں ہوں۔" شاستری نے جواب دیا۔ "میں انہیں آج اور اسی وقت دیکھ رہا ہوں..... اگر ان سے واقف ہوتا تو کیا میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوتا.....؟"

"تمہیں ان کے بارے میں کیسے اندازہ ہوا کہ یہ ایک غیر معمولی ہستی ہیں.....؟" پونم بولی۔ "جو تم نے اتنا کچھ بتا دیا۔"

"ان کا کمال دیکھ کر.....؟ کیا تمہیں اس سے ان کے متعلق یہ اندازہ نہیں ہوا.....؟" شاستری کہنے لگا۔ "نقش ثانی کو بے اثر اور ناکارہ کر دینا..... خونی مجسمہ ان سے اس قدر مرعوب اور خوف زدہ ہوا کہ وہ ایک دم سے غائب ہو گیا..... میرا خیال ہے کہ اس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ان سے مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے..... یہ کوئی مہان ہستی ہیں۔ اس لئے میدان چھوڑ گیا..... جب کہ میرا خیال تھا کہ شاید وہ ان سے مقابلہ کرے..... تمہارے ساتھ ساتھ انہیں بھی لے جائے۔ کیوں کہ وہ حسین....." اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اوہ بھگوان....." پونم نے گہرا سانس لیا۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس شیطان کے ہاتھوں محفوظ رہی....."

"اگر آپ بروقت نہ پہنچتیں تو بھگوان جانے کیا ہوتا.....؟" شاستری نے قدرے سہم کر چندرا دیوی سے کہا۔ "اس کے سارے بدن پر ایک انجانے خوف اور اندیشے سے جھرجھری سی آ گئی۔" وہ پونم کو لے جانے کے لئے موقع کی تاک میں تھا۔ پونم نے تھوڑی دیر کے لئے نقش ثانی نکال کر رکھا اور نہانے کے لئے گئی تو معلوم نہیں کیسے خبر ہو گئی..... یا پھر گھر میں چھپا ہوا ہوگا؟ وہ پونم کو لے جانے پر تلا ہوا تھا..... وہ پونم کو لے جائے گا تو پھر مجھے جانے کتنے دنوں بعد اس کی لاش ملتی..... وہ اس سے جی بھرنے تک ساتھ رکھتا..... میری زندگی اندھیر ہو جاتی....."

"مجھے اس بات کا یقین تھا کہ مجسمہ مجھے اٹھا کر لے جائے بغیر نہیں رہے گا..... چوں کہ نقش ثانی میرے پاس نہیں تھا اس لئے اس پر قابو ممکن نہیں رہا تھا..... وہ اس لئے فرار ہو گیا کہ اس میں آپ سے مقابلہ کی ہمت نہیں رہی تھی۔" پونم بولی۔

"جی ہاں۔" چندرا دیوی نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ "جب اس نے دیکھا کہ نقش ثانی ناکارہ اور بے اثر ہو گیا ہے تو اسے اندازہ ہو گیا اس کا پالا کسی عام ہستی سے نہیں بلکہ کسی غیر معمولی جادوگرنی سے پڑا ہے..... اس لئے نقش ثانی کو اس ہستی نے ناکارہ بنا دیا ہے....."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اس بات سے ڈر گیا تھا کہ مقابلہ کرنے سے کہیں وہ فنا نہ ہو جائے.....؟"

"یہ بات آپ کے علم میں کیسے اور کیوں کر آئی کہ مجسمہ یہاں ہے اور ہم مصیبت میں گھرے ہوئے ہیں.....؟" پونم نے سوال کیا۔ "اور پھر کیا نقش ثانی کے متعلق جانتی تھیں جو آپ نے اسے ناکارہ کر کے رکھ دیا....."

"مجھے میرے ایک صحافی دوست نے جو کولمبو میں ایک سیمینار میں شرکت کرنے آئے تھے انہیں ایک سری لنکن صحافی نے اس خونی مجسمہ کے بارے میں بتایا..... بڑی تفصیل سے ساری کہانی سنائی..... تمام واقعات اور ایک ایک بات بتائی..... شاید شاستری نے بتائی ہوگی اس صحافی کو..... جب سریش سری لنکا سے ممبئی آئے تو انہوں نے بتایا کہ سری لنکا میں خونی مجسمہ نے موت اور دہشت گردی کا راج قائم کر رکھا ہے وہ معصوم اور بے گناہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے..... سری لنکا کے بڑے بڑے جادوگروں نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے بڑے جتن کئے..... لیکن وہ ناکام رہے..... اس وقت سخت ضرورت ہے ان لوگوں کو خونی مجسمہ سے نجات دلانے کے لئے..... یہ بات کل ہی میرے علم میں آئی اور میں یہاں آ گئی مدد کے لئے..... میں آپ لوگوں سے ملنے آئی تھی۔ اتفاق سے میں بروقت پہنچی اور خونی مجسمہ نامراد لوٹ گیا..... مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کی زندگی اور عزت پر آنچ نہیں آئی۔ میں اس شیطان سے نجات دلا کر ہی واپس جاؤں گی۔"

"ہم آپ کا یہ احسان ساری زندگی فراموش نہیں کر سکیں گے۔" شاستری نے بڑی ممنونیت سے کہا۔

"اس میں احسان کی کوئی بات نہیں بلکہ ایک انسان کا کام ہوتا ہے کہ وہ مصیبت زدہ انسان کے کام آئے....." چندرا دیوی نے کہا۔

"اب تو خونی مجسمہ آپ کا بدترین دشمن ہو گیا ہوگا.....؟" شاستری نے کہا۔ "آپ کو اس سے ہوشیار رہنا ہوگا۔"

"ہاں..... چندرا دیوی بولی۔ "لیکن مجھے اس سے کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے..... وہ میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ آپ بے فکر رہیں۔"

"مجھے ایک بات کا یقین نہیں آیا.....؟" پونم حیرت اور تجسس سے بولی۔

"کس بات کا.....؟" چندرا دیوی بات کی تہہ میں پہنچ کر مسکرا دی۔

"ایک نہایت حسین و جمیل اور جوان عورت اتنی بڑی جادوگرنی.....؟ پونم بولی۔ "لیکن میرے دل میں ایک انجانا ڈر اور خوف جنم لے رہا ہے کہ خونی مجسمہ جو آپ کی زندگی، عزت اور جان کا دشمن ہو گیا ہوگا اس کے کارن آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔"

"دراصل بھگوان نے مجھے جو صلاحیت دی ہے وہ ماضی میں ہندوستان کے کسی جادوگر میں نہیں تھی..... نہ ہی بنگال کے جادوگروں میں..... میں نے بتایا نا کہ خونی مجسمہ میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتا..... اسے اپنی خیر منانی چاہئے..... بہرحال میرا واسطہ ایک بہت خطرناک اور شیطان صفت سے پڑا ہے..... میں نے اپنے پراسرار علوم سے دو ہزار برس قبل کے حالات معلوم کر لئے ہیں..... تنگا رام..... ونود کھنہ..... اور ان کے پتا جی مہاراجا دلشان کے بارے میں..... آپ پریشان اور ہراساں نہ ہوں۔"

"آخر یہ نقش ثانی ہے کیا بلا جس کے حصول کے لئے وہ پاگل ہو رہا ہے؟" پونم کہنے لگی۔ "اسے پانے کے لئے ونود کھنہ نے شاستری کے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا..... شاستری کو حملہ آور کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا کہ یہ کس کی حرکت ہے..... اس کا شبہ سنیل داس پر ہوا..... ونود کھنہ کے پاس یہ تھا..... اس نے میرے گلے میں ڈال دیا تھا..... اسے مجسمہ نے حاصل کرنے کی کوشش کی..... آج وہ اس مقصد میں کامیاب آپ کی وجہ سے وہ اس سے محروم رہا..... میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ چکر کیا ہے؟"

"یہ نقش ثانی سادھی میں نوادرات میں ملا تھا۔ اس پر جو زبان لکھی ہوئی تھی وہ ناقابل فہم تھی..... جگن ناتھ نے اس کی زبان کچھ سمجھ لی تھی..... شاستری اس کے بہت قریب پہنچ گیا تھا کہ یہ نقش ثانی کیا ہے..... ونود کھنہ نے اپنے جادو کے زور سے بہت کچھ بھانپ لیا تھا اس لئے وہ لے اڑا..... لیکن اسے اس نقش ثانی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ یہ نوادرات میں سے ایک ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ تنگا رام..... یعنی خونی مجسمہ اور اس کے بھائی کی ملکیت تھا۔ اس کی خصوصیت کے بارے میں صرف باپ اور بیٹا جانتے تھے۔ اس لئے اسے سادھی میں نوادرات کے ساتھ رکھ دیا گیا....."

"کیا یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ نقش ثانی کا پس منظر کیا ہے.....؟ یہ نقش ثانی تنگا کمار کو کہاں سے اور کیسے ملا؟ کس نے دیا؟" شاستری نے کہا۔

"اوہ معاف کیجئے....." پونم کے چہرے پر ندامت کی سرخی دوڑ گئی۔ "ہم اتنی دیر سے کھڑے کھڑے باتیں کر رہے ہیں..... آپ کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہا..... آپ تشریف رکھیں..... میں چائے لے آتی ہوں..... آپ رات کا کھانا کھا کر جائیں گی۔"

تھوڑی دیر بعد پونم تین کپ بھاپ اڑاتی چائے اور ایک پلیٹ میں نمکین کا جو لے آئی..... یوں تو ہندوستان میں کاجو ملتا تھا۔ لیکن سری لنکا کے کاجو میں جو ذائقہ اور مزا تھا وہ ہندوستان کے کاجو میں نہیں۔

پھر چندرا دیوی نقش ثانی کا پس منظر بتانے لگی۔

آج سے دو ہزار برس پہلے تنگا رام ایک انسان دوست تھا جس کے کارن وہ رعایا میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اس کی انسانیت کی وجہ سے نہ صرف شہرت تھی بلکہ مقبولیت بھی تھی۔ وہ دلوں میں بسا ہوا تھا۔ حالاں کہ وہ صرف راج کمار تھا۔ چوں کہ باپ زندہ تھا اس لئے اس نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی ہوئی تھی۔ وہ ابھی اپنے بڑے بیٹے کو اس لئے گدی پر بٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ اس کا چھوٹا بیٹا ونود کھنہ نہ صرف اوباش تھا بلکہ جرم پیشہ بنا ہوا تھا۔ باپ کو یہ ڈر اور اندیشہ تھا کہ کہیں وہ بھائی کے تخت پر بیٹھتے ہی اسے قتل نہ کر دے۔ باپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ بڑے بیٹے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور عزت سے ونود کھنہ حسد کرتا ہے..... بات یہاں تک محدود ہوتی تو وہ نظر انداز کر جاتا..... لیکن اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ ونود کھنہ کی نظروں میں بڑا بھائی کھٹک رہا ہے۔ وہ اس کے قتل کے درپے ہے۔ اس لئے بھی کہ رعایا تنگا رام پر جان چھڑکتی ہے۔ وہ عورتوں کی عزت و آبرو کا محافظ اور ظلم و ستم سے انسان کو بچاتا ہے۔

ونود کھنہ ایک ظالم و جابر اور خون آشام بھیڑیا صفت تھا..... وہ نہ صرف کنواریوں بلکہ حسین اور پرکشش شادی شدہ عورتوں کا بھی رسیا تھا۔ انہیں جبر و زیادتی سے ان کی عزت کو نشانہ بناتا تھا..... اسے اس کے علاوہ کوئی شوق نہیں تھا۔ اس کی راہ میں اس کا بڑا بھائی تنگا رام سب سے بڑی رکاوٹ تھا..... اس نے اپنی جان پر کھیل کر نہ صرف لڑکیوں اور عورتوں کی عزت و آبرو اور ظلم و ستم سے بچایا تھا بلکہ ان لوگوں کو بھی جو اسے لگان نہیں دیتے تھے..... وہ ان کا اناج لوٹ کر لے جاتا تھا۔ تنگا رام مزاحمت کرتا تھا۔ دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ اور خون ریزی ہوتے ہوتے کئی بار رہ گئی تھی۔ کیوں کہ وزیراعظم نے بیچ بچاؤ کرایا تھا اور قنوج نے تنگا رام کا ساتھ دیا تھا اور پھر تنگا رام غریبوں کی مشکلات کے بارے میں بتا کر اس کا سدباب کراتا تھا۔

ونود کھنہ کے ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ تنگا رام جو اس کا سب سے بڑا دشمن اور اس کی راہ میں رکاوٹ ہے اسے اس طرح سے قتل کر دیا جائے گا مہاراجا دلشان اور کسی کو بھی اس پر قتل کا شبہ نہ ہو۔ اس کا قتل ایک حادثاتی موت لگے..... ایک ساتھی نے اسے مشورہ دیا کہ تنگا رام کو ایک درخت سے باندھ کر اس پر کوئی درندہ چھوڑ دیا جائے۔ جب اس کے ہاتھوں تنگا رام کی موت واقع ہو جائے تو اس درندے کو ہلاک کر کے کہیں پھینک دیا جائے اور لاش کو درخت سے آزاد کر دیا جائے۔ اس طرح تنگا رام کی موت کو حادثاتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قرار دے دیا جائے گا..... راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جائے گی۔ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔

اس منصوبے کا علم اتفاق سے اس بوڑھے اور وفادار ملازم کو ہو گیا جس نے تنگا رام کو بچپن میں گودوں کھلایا تھا۔ اس نے تنگا رام کو اس سازش اور منصوبے سے آگاہ کیا..... پھر اس نے اپنے پتاجی کو بتایا۔ مہاراجا دلشان بڑا دور اندیش اور عقل مند تھا۔ اس نے بیٹے سے کہا کہ خانہ جنگی سے بچنے کے لئے وہ بن باس لے لے۔ یہی ایک صورت ہے۔ وہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ وہ خود کو راہ راست پر لے آئے۔ نہ آنے کی صورت میں وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کا سر تن سے جدا کر دے گا۔ کیوں کہ اسے یہ بات پسند نہیں کہ وہ رعایا کے جان و مال اور عورتوں کی عزت سے کھیلے۔

تنگا رام نے اپنے سات وفادار ساتھیوں کو ساتھ لے جانے کے لئے آمادہ کرایا۔ اس کے باپ نے اپنے بیٹے کو اتنی دولت دی وہ نہ صرف اپنے ساتھیوں کی بیس برس ضروریات پوری کرے بلکہ کسی کی بھلائی اور مدد کے لئے دل کھول کر بھی خرچ کرے تو اس میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہ ہو۔ پریشانی اور کسی بات کی محتاجی نہ ہو۔ تنگا رام ویران اور سنسان علاقوں کی طرف نکل گیا۔

ایک دور افتادہ بستی میں ایک جادوگر واسو ناتھ رہتا تھا۔ وہ بڑا رحم دل تھا۔ اس کی بستی میں قحط اور خشک سالی تھی..... جب کہ اس سے دور ایک اور بستی میں غلہ اور اناج کی فراوانی تھی۔ تنگا رام نے اس بستی سے اتنا غلہ خرید کر بستی والوں کو دیا جس سے ایک برس تک گزارا ہو سکتا تھا..... اس جادوگر کو تنگا رام نے اپنی کہانی سنائی تھی کہ اسے کس لئے اپنا دیس چھوڑنا پڑا۔ وہ اپنے بھائی کی سرکوبی کرنا چاہتا ہے جس نے رعایا کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ پھر جادوگر نے اسے نقش ثانی بنا کر دیا اور اس کی خصوصیت کے بارے میں بتایا اس کے پہنے رہنے سے اس پر کوئی ہتھیار اثر نہیں کرے گا..... اس نقش کے درمیان جو جڑاؤ ہیرا ہے اسے دبانے سے ایسی شعاعیں خارج ہوں گی جو جلا کر بھسم کر دیں گی۔ اسے تم نے لمحے کے لئے بھی اپنے سے جدا نہ کرنا..... اور ہاں تم پر کوئی جادو اثر نہیں کر سکے گا۔

تنگا رام کے کانوں تک صرف یہ خبر پہنچی کہ وہاں برائی عروج پر ہے۔ کسی کی عزت اور جان و مال و نود دکھنہ اور اس کے ساتھیوں کے باعث محفوظ نہیں ہے..... پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نود دکھنہ کو کیفر کردار تک پہنچائے بغیر چین نہیں لے گا۔ نود دکھنہ کے کانوں میں یہ بھنک پڑ گئی کہ اس کا بھائی اس کی جان کے درپے ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھی نے نود دکھنہ سے کہا کہ اگر وہ تنگا رام کو قتل کر دے گا تو اسے کیا انعام و اکرام دے گا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ نہ صرف منہ مانگا بلکہ وہ اسے اپنا وزیر بنائے گا۔ وہ گدی پر بیٹھنے والا ہے کیوں کہ اس کا باپ کچھ دنوں کا مہمان ہے۔ اس شخص نے ایک قریبی بستی میں پہنچ کر تنگا رام اور اس کے ساتھیوں کا سواگت کیا اور انہیں ایک مکان میں ٹھہرایا۔ اسے شراب میں بے ہوشی کی دوا ملا کر پلا دی۔ اتفاق سے اس رات تنگا رام نے نقش ثانی نکال کر اپنے اتارے ہوئے لباس میں کسی وجہ سے رکھ لیا تھا..... رات کے وقت قاتل نے اس کا بایاں بازو کاٹ لیا۔ جس کی کلائی پر خاندانی سونے کا کڑا تھا۔ وہ بطور نشانی اور ثبوت کے طور پر لے گیا۔ اس کی لاش بے سروسامانی کی حالت میں ایک گڑھے میں ڈال دی گئی..... اس کے باپ نے اپنے محبوب بیٹے کی لاش مرنے سے پہلے منگوالی۔ اس کی چتا کی راکھ فضا میں بکھیر دی۔ پھر اس کی شاہانہ سادھی میں بیٹے کا مجسمہ بنا کر دفن کر دیا۔ کچھ نوادرات بھی..... اس میں وہ نقش ثانی بھی تھا..... نود دکھنہ کو اس نقش ثانی کے خصوصیت کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔

پھر ایک روز ایک نہایت حسین لڑکی کو شادی کے وقت نود دکھنہ نے منڈپ سے اٹھوالیا..... اس لڑکی کو علم تھا کہ نود دکھنہ ایسی حرکت کرے گا..... لیکن کیوں کہ وہ ہر دلہن کے ساتھ ایسا کرتا تھا۔ وہ اس کے لئے ذہنی طور پر تیار تھی۔ وہ اس کی بہن کے ساتھ ہی ایسا کر چکا تھا۔ وہ

اپنی بہن کا بھی انتقام لینا چاہتی تھی..... وہ ایسی گرم جوشی، وارفتگی اور والہانہ پن اور خود سپردگی سے نود دکھنہ کے ساتھ پیش آئی کہ وہ حیران اور خوش ہو گیا۔ کیوں کہ آج تک کوئی بھی نئی نویلی دلہن اس طرح پیش نہیں آئی تھی۔ وہ مزاحمت کرتی..... روتی اور بھاگنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس لڑکی نے اپنے کپڑوں میں ایک خنجر چھپایا ہوا تھا جس کی دھار زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ اس نے موقع پا کر پوری قوت سے خنجر نود دکھنہ کے سینے میں دل کی جگہ گھونپ دیا۔ وہ لمحہ بھر میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ پھر وہ لڑکی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ اس طرح نود دکھنہ عبرتناک موت مر گیا۔

نود دکھنہ نے جب دوسرا جنم لیا تو اس وقت اس کی عمر سات برس کی تھی۔ ممبئی کے ایک کروڑ پتی کا بیٹا رمیش تھا۔ اس نے رمیش کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس نے رمیش کا بہروپ بھر کر اس گھر میں رہنے لگا۔ اس نے تعلیم بھی حاصل کی۔ جب وہ تیس برس کی عمر کا ہوا تو اس نے ماں باپ کو ایک کار کے حادثے میں مار دیا۔ چوں کہ وہ ایک بدروح تھا اس لئے اسے طاغوتی طاقت تھی۔ وہ جادو وغیرہ سے بھی واقف تھا۔ وہ ممبئی میں حسن و شباب سے جی بہلاتا رہا۔ کئی اداکاراؤں نے اس کے ساتھ راتیں کالی کیں۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں..... کیوں کہ ایک طوائف اور اداکارہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ پرکاش مہرہ سری لنکا میں کھدائی کے لئے اپنی کمپنی کے ماہرین کو لے جا رہا ہے جو وہاں خزانہ تلاش کریں گے۔ وہ بھی اس خیال سے سری لنکا پہنچ گیا کہ کہیں کھدائی میں اس کے بھائی کی سادھی نہ نکل آئے۔ آخر وہی جس کا اسے اندیشہ تھا وہ پورا ہو گیا۔

پرکاش مہرہ نے دنیا کا سب سے بڑا دولت مند بننے کے لئے سری لنکا کی حکومت سے ایک معاہدہ کیا..... معاہدہ کے مطابق ایک بڑی رقم کروڑوں میں ادا کی کہ کھدائی کی اجازت دے۔ جو بھی نوادرات اور خزانہ کھدائی سے نکلے گا وہ اس کی اپنی ملکیت ہو گا.....

سری لنکا حکومت نے اس لئے اجازت دے دی کہ اسے دولت کی اشد ضرورت تھی۔ خزانہ خالی ہو رہا تھا۔ اس رقم سے اس کے بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں..... حکومت یہ بھی جانتی تھی کہ برسوں سے بہت سے اداروں نے خزانے کی تلاش میں کھدائی کی لیکن ڈھاک کے تین پات ملے..... انہیں ایک تولہ بھی سونا نہیں ملا..... ایک کہانی جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھیں وہ یہ تھی کہ دو ہزار برس قبل مہاراجا بیش بہا خزانہ اور نوادرات چھوڑ گیا راجو اس کے بیٹے کی سادھی میں محفوظ رہے۔ قسمت نے پرکاش مہرہ کا ساتھ دیا..... یہ آپ کے پتاجی کے کارن سادھی دریافت ہوئی..... نود دکھنہ کو سونے کے مجسمہ اور نوادرات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تنگا رام کی آتما نے اس کی آتما کو بتایا تھا کہ میں سادھی سے باہر آتے ہی جنم لے لوں گا اور تم سے بدلہ لوں گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تابوت سادھی سے باہر آئے..... اس لئے اس نے آپ کے پتاجی کو کرائے کے بدمعاشوں کی مدد سے قتل کروا دیا تھا کہ آپ لوگ دہشت زدہ ہو کر فرار ہو جائیں۔ کام اور یہ ملک چھوڑ دیں۔ لیکن آپ لوگ باز نہیں آئے؟

جب مجسمہ ممبئی لایا گیا تب تنگا رام نے دوسرا جنم لیا۔ اس بات کا علم نود دکھنہ کو ہو گیا تھا..... لیکن یہ مجسمہ وہ تنگا رام نہیں رہا جو مایے میں تھا..... اس مجسمہ کی آتما پر کالی ماتا کا سایہ پڑ گیا جو شر کی دیوی ہے..... سری لنکا میں یہ وہی حرکتیں کر رہا ہے جو ماضی میں وجود دکھنہ کر رہا تھا..... اور پھر کالی ماتا نے اسے ایک اور صلاحیت دی ہے۔ وہ یہ کہ جب، جس وقت، جس گھڑی بھی چاہے جو روپ بہروپ چاہے بھر سکتا ہے۔ لڑکی، عورت، جانور، درندہ اور پرند چرند..... چڑیل، بھوت..... ہاتھی بھی.....

ممبئی میں سمندر کے اندر..... شہر سے سو میل دور ایک شان دار محل بنا ہوا ہے..... اسے ایک بنگال کے جادوگر نے دو ہزار تین برس قبل اپنے جادو کے زور سے بنایا تھا۔ اس دور کی بیس عورتوں کی روحوں کو اس میں قید کر رکھا ہے۔ اتنی حسین عورتیں دنیا میں نہیں ہیں..... وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک سے ایک بڑھ کر ہیں..... اس میں دس نوجوان لڑکیاں اور عورتیں موجود ہیں..... انہیں صرف اس بات کی اجازت ہے کہ وہ سمندر کے کنارے کسی شکار کی تلاش میں جاسکتی ہیں اور اپنی پیاس بجھا سکتی ہیں..... وہ بے لباس رہتی ہیں۔ پرکاش مہرہ کو جب مجسمہ نے نمائش گاہ سے اٹھا کر پھینکا تھا وہ اس محل میں پہنچا تھا..... پرکاش مہرہ وہاں تین دن رہا۔ اس نے خوب جی بہلایا۔ وہاں ایک کمرے میں تین چار مجسمے ہیں جو صرف بات کرسکتے ہیں..... اس کے علاوہ وہاں ایسے اور اتنے بڑے بڑے گلابی ہیرے الماری میں سجے ہوئے ہیں کہ انہیں کوئی ہاتھ لگائے تو ہاتھ جھلس جاتا ہے..... پرکاش مہرہ کو تیسرے دن مجسمے نے سمندر کے کنارے لا ڈالا تو پرکاش مہرہ کے خیال میں وہ ایک سپنا تھا۔

یہ تنگا رام چوں کہ جانتا ہے کہ یہ نقش ثانی کن خصوصیت کا حامل ہے..... وہ اس کے حصول کے لئے جان توڑ کوشش کرے گا۔ لہٰذا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے..... اس کے خیال میں یہ ناکارہ اور بے اثر نہیں ہوا ہوگا.....؟ وہ کالی ماتا سے معلوم کرے گا۔ کالی ماتا بھی اس نقش ثانی کو گلے سے نکال کر اس کے حوالے نہیں کرسکتی..... اسے کسی بھی لمحے جدا نہیں کرسکتی.....

میں اس وقت تک یہاں سے یعنی سری لنکا سے نہیں جاؤں گی تاوقتیکہ وہ فنا ہوجائے اور کوئی جنم لے سکے..... ہاں اس سمندر کے محل میں جگن ناتھ کا دوسرا جنم ہوا ہے..... وہ وہاں ان بیس لڑکیوں اور عورتوں کی معیت میں خواب ناک اور پرتعیش زندگی گزار رہے ہیں وہ بیس برس کے جوان بنے ہوئے ہیں..... میرے خیال میں اب مجھے مزید کہنے کی ضرورت نہیں رہی۔"

"میں ایک سوال اس سمندری محل کے بارے میں کرنا چاہوں گا۔" شاستری نے کہا۔ "وہ محل صدیوں سے سمندر میں واقع ہے..... کیا ابھی تک کسی کو بھی..... نیول والوں کو بھی اس کی موجودگی کا علم نہ ہوسکا.....؟"

"بات یہ ہے کہ وہ محل ہر کسی کو نظر نہیں آتا ہے..... کیوں کہ وہ طلسماتی محل ہے۔" چندرا دیوی نے جواب دیا۔

"ہم آپ کی طرف سے سخت فکر مند اور پریشان ہیں۔" شاستری نے کہا۔ "اس لئے کہ نقش ثانی دوبارہ مل جانے کے بعد وہ نہ صرف ہمارا بلکہ آپ کا بھی بدترین دشمن بن گیا ہے..... آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ وہ آپ کو نقصان نہ پہنچائے۔"

"مجھے اس سے کیوں اور کس لئے نقصان پہنچے گا.....؟" چندرا دیوی مسکرادی۔

"آپ تنگا رام..... یعنی اس خونی مجسمے سے کب اس ملک کو نجات دلائیں گی؟" پونم بولی۔

"میرے لئے یہ بڑا اچھا موقع تھا کہ میں اسی وقت اسے ختم کردیتی....." چندرا دیوی بولی۔ "اسے تلاش کرنا ہوگا..... کیوں کہ وہ روپ بدلتا رہے گا..... کبھی انسان کے تو..... کبھی جانور..... کبھی چرند پرند..... کسی بھی روپ میں کیوں نہ ہو بس اس سے سامنا ہونا شرط ہے..... میں اسے فوراً ہی تلاش کرلوں گی..... تاہم اس کی گھات میں ہوں....."

"آپ کسی بات کی چنتا نہ کریں۔" چندرا دیوی نے دلاسا دیا۔ "وہ یقیناً اپنے موکلوں سے ہراساں، دہشت زدہ اور پریشان کرے؟" چندرا دیوی نے توقف کرکے اپنے پرس سے دو گلابی رنگ بہت ہی مضبوط دھاگے نکالے جو راکھی کے بندھن کے سائز کے تھے۔ اس نے ان کی کلائیوں پر باندھ دیئے..... اور پھر بولی۔ "کوئی بھی آجائے تو وہ آپ دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا..... لیکن وہ خونی مجسمہ شاید آجائے..... خونی مجسمہ نقش ثانی مانگے تو اسے دیدیں..... لیکن.....؟ وہ جیسے ہی اسے تھامے گا اس کا ہاتھ اس بری طرح جھلس جائے گا کہ وہ چیخیں مارتا ہوا غائب ہوجائے گا۔ اچھا..... اب میں چلتی ہوں۔ کل رات آکر کھانا کھاؤں گی..... ویسے آپ دونوں سے وقتاً فوقتاً ملتی رہوں گی۔ مجھے پہلی فرصت میں مجسمہ کو تلاش کرنا ہے۔"

(جاری ہے)

زندہ بھوت

انور فرہاد

بیٹی کو جب معلوم ہوا کہ اس کی ماں کو اس کے باپ نے اذیت ناک موت مارا ہے تو اسے باپ سے شدید نفرت ہوگئی اور پھر ایک دن اس نے باپ کو تیزاب سے نہلا دیا اور پھر اس کا وجود اس قدر بھیانک ہوگیا کہ وہ بھوت سے مشابہ ہوگیا۔

ایک عجیب و غریب ہوش سے بیگانہ کرتی خوفناک دہشت ناک اور ناقابل فراموش کہانی

مجھے یوں لگا جیسے کھڑکی کے باہر کھڑا کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ وہ کون ہوسکتا ہے۔ جو اس وقت اس طرح مجھے دیکھ رہا ہے؟ یہ سوال فوری طور پر میں نے اپنے آپ سے کیا تھا۔ وہ آنٹی تو ہرگز نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ ان کا چہرہ تو بڑا نرم و نازک اور شفق ہے جبکہ گھورنے والے کا چہرہ..... مجھے ڈر کے مارے جھرجھری سی آگئی..... خدا کی پناہ کیسا بھیانک تھا۔ مانا کہ میں وہ چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکی تھی کیونکہ اس چہرے پر پوری روشنی نہیں پڑ رہی تھی۔ کمرے کی مدھم روشنی کا ہلکا سا شیڈ پڑ رہا تھا جبکہ کھڑکی کے باہر کی روشنی کمرے سے بھی زیادہ کمزور تھی۔ کہیں دور سے آنے والی روشنی وہاں تک پہنچتے پہنچتے بالکل نحیف ہوگئی تھی۔ میں ایسی ڈرپوک لڑکیوں میں نہیں جو چھپکلی یا کاکروچ کو بھی دیکھ کر چیخ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پڑتی ہیں۔اس لئے میں نے اپنے اعصاب پر قابو رکھنے کی کوشش کی۔اور خاصے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

"کون ہے۔؟"

میری آواز کے ساتھ ہی جھانکنے والا چہرہ ایک دم غائب ہوگیا۔اب مجھے احساس ہوا کہ وہ کوئی مکمل وجود نہیں تھا۔سایہ جیسا تھا، جو اچانک معدوم ہوگیا۔اس احساس سے ایک بار پھر مجھے جھرجھری سی آ گئی تھی.....اگلے لمحہ میں اپنے بستر پر اٹھ بیٹھی اور اس خوف کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے اٹھ کر کمرے کا بلب روشن کردیا۔دیوار گیر گھڑی پر نظر پڑی رات کے دو بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔چند لمحوں کے بعد کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی باہر کا بلب جلایا اور اس کی روشنی میں اس کھڑکی کا جائزہ لیا جہاں کھڑا کوئی مجھے گھور رہا تھا لیکن کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس سے کسی کی موجودگی کا احساس ہو۔اس کے بعد میں آنٹی کے کمرے تک گئی۔وہ اپنے بستر پر بے خبر سو رہی تھی اور ان کا چہرہ بدستور شگفتہ اور تر و تازہ نظر آرہا تھا۔میں نے انکے کمرے کے علاوہ بھی ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس سے کسی کی موجودگی کا کچھ اندازہ ہو سکے میں واپس اپنے کمرے میں آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

اس گھر میں تین نوارد تھے۔گزشتہ صبح ہی آئی تھی۔آنٹی کو جب میں نے بتایا کہ میں آپ کی خیر خیریت لینے کے لئے امریکا سے آئی ہوں۔آپ کے بیٹے نوید نے مجھے خاص تاکید کی تھی کہ میری والدہ سے ضرور ملنا اور ان کی خیریت سے مجھے مطلع کرنا کہ وہ مزے میں تو ہیں۔؟

آنٹی نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی....."ہاں میں بہت مزے میں ہوں۔ایک ماں اپنے تمام جگر گوشوں سے جدا ہو کر جتنے مزے کر سکتی ہے، وہ کر رہی ہوں۔" پھر انہیں اچانک میری موجودگی کا خیال آیا تھا۔

"بیٹا! باہر کیوں کھڑی ہو، اندر تو آؤ۔"

پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لیکر بنگلے کے اندر آ گئیں۔اور ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔"تو تم نیویارک سے آرہی ہو؟"

"جی ہاں آنٹی۔"

"نوید کس حال میں ہے۔؟"

"ٹھیک ہے۔"

"اور اس کے بیوی بچے۔؟"

"وہ بھی مزے میں ہیں۔"

"تم اپنے ماں باپ سے ملنے آئی ہو یا.....؟"

"جی نہیں، میں آفیشل کام سے دو مہینے کے دورے پر آئی ہوں۔کراچی میں پندرہ دن رہ کر کام کرنے کے بعد مجھے دیگر شہروں میں بھی جا کر اپنا کام کرنا پڑے گا۔"

"ارے.....پھر تو تم یہیں، میرے پاس رک جاؤ۔کیوں ہوٹل میں رہ کر پیسے برباد کرو گی۔؟"

میں نے بغیر کسی تکلف کے آنٹی کی آفر قبول کرلی۔نوید کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی امی بنگلے میں اکیلے رہتی ہیں۔آنٹی کو یہاں اس بنگلے میں بظاہر کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔بس ایک بات کا دکھ تھا کہ ان کی اولاد اپنے بہتر مستقبل کے لئے انہیں چھوڑ کر امریکہ، برطانیہ، کینیڈا وغیرہ گئی تو وہیں کی ہو رہی۔اور وہ یہاں تنہا رہ گئیں۔انہوں نے بڑے بیٹے کو اس کے بے حد اصرار پر پیسے جوڑ جوڑ کر بڑی مشکلوں سے امریکا بھیجا تھا۔بیٹے نے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ ٹھیک ٹھاک کما لے گا تو واپس انکے پاس لوٹ آئے گا۔مگر اس کے برعکس اس نے ایک ایک کر کے اپنے دیگر بھائی بہنوں کو بھی اپنے ملک سے بلا کر مختلف جگہ سیٹ کرادیا۔یہ ٹھیک ہے کہ اس کے پیسوں سے یہ بنگلہ خریدا گیا اور والدہ کے نام بینک میں معقول رقم جمع کرادی گئی۔بھائیوں نے نہ صرف بہنوں کو اپنے پاس بلایا بلکہ ان کی شادیاں بھی وہیں کرادی۔

"آنٹی! آپ خود کیوں نہیں گئیں اپنے بچوں کے پاس؟" میں نے ان سے پوچھا تھا۔

"ارے بیٹا! وطن کی مٹی نے مجھے کہیں اور جانے کی اجازت نہیں دی۔اس سرزمین سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں، میری زندگی کی بہت سی بہاریں یہیں گزری ہیں۔میرا بچپن، لڑکپن اور میری جوانی یہیں گزری ہیں میرے بہت سے پیارے آسودۂ خاک ہیں۔میں اس وطن کی مٹی کو چھوڑ کر کہاں جاتی؟ افسوس کہ میرے بچوں کو اپنے وطن سے، اپنے وطن کی مٹی سے وہ محبت نہیں، وہ تو یہاں سے باہر جا کر ماں کی محبت بھی بھول گئے۔"

نوید سے بھی میں نے امریکا میں یہی سوال کیا تھا۔"تم اپنی والدہ کو بھی اپنے پاس کیوں نہیں بلا لیتے۔؟"

"وہ پرانے خیال کی ہیں، انکی ساری محبت وطن کی سرزمین سے ہے، وہ وہیں جینا اور وہیں مرنا چاہتی ہیں۔"

اگلی صبح میں نے ناشتے کی میز پر آنٹی سے پوچھا۔"آپ کو اتنے بڑے بنگلے میں تنہا رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔؟"

"ڈر.....!!" کہہ کر وہ مسکرائیں۔"کیسا ڈر؟ ڈر کا تعلق اپنی جان سے ہوتا ہے اپنی زندگی سے ہوتا ہے ..... مجھے نہ اپنی جان کی اب کوئی فکر ہے نہ ہی زندہ رہنے کا کوئی ارمان، اس لئے چور، اچکا.....ڈاکو.....جو آئے، آئے کہ ہر دل کشادہ رکھتے ہیں۔زیادہ سے زیادہ مجھے تنہا دیکھ کر مار ہی دے گا نا.....میں تو ہر وقت موت کا انتظار کرتی رہتی ہوں کہ اب جینے کا کوئی مزہ باقی نہیں رہا۔جن کو دیکھ کر زندہ رہنے کی آرزو ہوتی ہے۔ایسا کوئی میری آنکھوں کے قریب نہیں۔"

میرا جی چاہا کہ میں رات والے بھیانک چہرے کا ذکر کروں۔مگر کچھ سوچ کر ارادہ ملتوی کردیا۔

دن بھر میں اپنے کام کے سلسلے میں شہر میں مصروف رہی۔شام کو لوٹی تو کچھ پھل اور کھانے پینے کی کچھ دیگر چیزیں لیتی ہوئی آئی۔جنہیں دیکھ کر آنٹی ناراض ہوگئی۔"یہ کیا حرکت ہے تمہاری؟ کیوں پیسے برباد کر رہی ہو؟ سنبھال کر خرچ کرو۔" میں مسکرا کر رہ گئی۔آج مجھے ایک بات کا احساس ہوا کہ اتنا بڑا بنگلہ ہے۔آنٹی اکیلے اس میں رہتی رہیں۔مگر سارا گھر اور سارے کمرے صاف ستھرے اور سجے بنے ہوئے ہیں جبکہ کل سے آج تک میں نے کسی ملازمہ یا ماسی کو نہیں دیکھا جس کا مطلب ہے آنٹی اس عمر میں یہ سارا کام خود کرتی ہیں۔

"تم فریش ہو کر آؤ.....میں کھانا لگاتی ہوں .....بھوک لگی ہے نا تمہیں؟"

"جی ہاں.....بہت زور کی بھوک لگی ہے۔"

"تو پھر جلدی سے آجاؤ۔"

اور میں واقعی جلدی ہی نہیں بہت جلد ڈائننگ ٹیبل پر پہنچ گئی مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اتنے مختصر وقت میں میز پر اتنی ساری ڈشیں سجی تھیں۔اتنے برتنوں کا کچن سے یہاں تک اتنے کم وقت میں لانا حیران کن بات تھی۔کل تو دو چار آئٹم ہی تھے مگر آج انہوں نے خاصا اہتمام کردیا تھا۔ڈشوں کی تعداد خاصی تھی اور سب کی سب مزے دار۔"خوب ڈٹ کر کھاؤ۔" انہوں نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔"تم نوید کی دوست ہو، اس لئے میرے لئے بیٹی ہی ہو۔" انہوں نے لمبی سانس لیکر کہا۔"میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ میرے بچے میرے ساتھ کھانے میں شریک ہوں۔"

میں ان کا دکھ.....ان کا درد اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔آخری عمر میں والدین کی یہ خواہش بڑی فطری ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزاریں۔اگر بچے والدین کو بھول کر، ان سے جدا ہو کر اپنی دنیا الگ بسالیں تو ان کی جو حالت ہوگی وہی آنٹی کی تھی۔ہر لمحہ وہ بچوں کے لئے تڑپتی تھیں۔

کھاتے کھاتے میں نے ایک شوشہ چھوڑ دیا۔"آنٹی! آپ جب تن تنہا ہیں تو ایک بڑا، اس قدر کشادہ بنگلہ کیوں خریدا۔؟ آپ کے لئے تو دو کمرے کا فلیٹ بھی کافی تھا۔"

"ارے جی بیٹا! میں نے یہ بنگلہ اس وقت خریدا تھا جب اس بات کی امید تھی کہ سارے بال بچوں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ لے کر یہاں رہوں گی۔ بیٹے نے یہی وعدہ کیا تھا کہ میں واپس آجاؤں گا۔ مگر وہ نہ صرف خود نہیں آیا بلکہ اس کے بھائی بہن جو میرے پاس تھے انہیں بھی یہاں سے بلالیا..... مجھ سے چھین لیا۔"

"تو پھر اب اسے بیچ کر کوئی مختصر سا فلیٹ لے لیں۔"

"نہیں جمی! یہاں کچھ دنوں تک میرے کئی بچے رہے ہیں، ان کی خوشبو اس کے در و دیوار اب تک لپٹی ہوئی ہے۔" آنٹی کو میں نے اپنی بتایا تھا کہ میرا نام جمیلہ ہے لیکن سب مجھے جمی کے نام سے پکارتے ہیں۔ "اور پھر اب تو اس بنگلے سے....." آنٹی اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولیں۔ مگر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ "ارے بھئی تم کھا کیوں نہیں رہی ہو۔؟" وہ اچانک بول پڑیں۔ میں سمجھ گئی کہ انہوں نے دانستہ جملہ مکمل نہیں کیا تھا۔ اور اس کی جگہ کھانے والی بات کہہ دی تھی۔

کھانے کے بعد جب میں ڈرائنگ روم میں آنٹی کے ساتھ بیٹھی کافی پی رہی تھی تو مجھے ان پر کچھ عجیب طرح کا شک و شبہ ہو رہا تھا۔ کھانے کے بعد جب میں ہاتھ دھونے واش روم گئی تھی تو چند منٹوں کے بعد ہی وہاں سے لوٹ گئی تھی مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ڈائننگ ٹیبل پر ایک بھی برتن موجود نہیں تھا۔ البتہ وہاں آنٹی کھڑی نظر آئی تھیں۔ کمال ہے بھئی، میں نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ چند منٹوں میں اتنے ڈھیر سارے برتن یہاں سے کچن منتقل ہو گئے!! اس عمر میں اس پھرتی کی تو ان سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ مگر اپنے اس جذبے کا اظہار میں نے ان سے نہیں کیا تھا۔

رات کو سوتے وقت میں نے دروازے کے علاوہ کمرے میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ بھی اچھی طرح بند کر دیئے تھے۔ رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلی تو میں نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ مجھے دور..... آنٹی کے کمرے کے پاس دروازے کے قریب ایک سایہ سا نظر آیا..... جیسے کوئی کھڑا پہرہ دے رہا ہو۔ مگر وہاں بھی بہت مدھم روشنی تھی۔ اس لئے اس سائے کو میں ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی۔ دل چاہا کہ باہر نکل کر دیکھوں لیکن اس سے آگے کا حوصلہ نہیں ہوا اور میں کھڑکی بند کر کے بستر پر دراز ہو گئی۔

اگلی صبح جب میں بنگلے سے نکل کر اپنے کام کے سلسلے میں باہر جا رہی تھی تو تھوڑی دور جانے کے بعد ایک آواز نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔ "ذرا سنئے گا۔" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت دھیرے دھیرے میرے قریب آرہی تھی۔ "آپ اس بھوت بنگلے میں غالباً مہمان آئی ہیں؟"

بھوت بنگلے کے نام پر میں چونکے بغیر نہیں رہی تھی۔ لیکن اپنے احساسات کو قابو میں رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ "جی ہاں۔"

"اگر آپ کو اپنی زندگی عزیز ہے تو اس بنگلے کی میزبانی پر لعنت بھیج کر کہیں اور چلی جائیں۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں محترمہ! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔"

خاتون نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "توبہ ہے..... آپ میری سیدھی سادی بات بھی نہیں سمجھ سکیں۔ یہ بنگلہ جہاں آپ ٹھہری ہوئی ہیں۔ بھوتوں کا مسکن ہے۔ جو اس بنگلے میں ٹھہرنے والوں کو بہت کم زندہ چھوڑتے ہیں۔ ایک بار کوئی چور یا ڈاکو اس بنگلے میں گھس گیا..... وہاں سے اس طرح گھبرا کر بھاگا کہ باہر آکر ایک گاڑی کے نیچے آکر ہلاک ہو گیا۔ ایک دو مہمان بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔"

"کیا بنگلے کے اندر سے انکی لاشیں ملیں؟"

"نہیں..... بنگلے کے باہر انکی موت ہوئی۔ ایک کو تو پل سے کسی نے اٹھا کر نیچے سمندر میں پھینک دیا ایک کو ایک بلڈنگ کی اوپری منزل سے کسی نے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ ایک نے دم توڑنے سے پہلے بیان دیا۔" پتہ نہیں، وہ کوئی بلا تھا یا بھوت، جس نے مجھے ایک تیز رفتار گاڑی کے سامنے دھکا دے دیا۔"

میں نے خاتون کی اس اطلاع کا شکریہ ادا کر کے ان سے جان چھڑائی۔ اور آگے بڑھ گئی لیکن یہ

سوچنے پر مجبور ضرور ہوئی کہ اس بنگلے سے منسوب کوئی بات ضرور ہے۔ یقیناً وہاں کوئی بھوت ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی وہاں کوئی بھوت ہے تو اس کی موجودگی میں آنٹی کس طرح وہاں رہ رہی ہیں۔؟ جس طرح لوگ جنوں کو اور ہم زادوں کو قابو کر لیتے ہیں۔ کیا آنٹی نے بھی کسی بھوت کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔؟

شام کو جب میں بنگلے میں واپس آئی تو کھانے کے بعد چائے پینے کے دوران میں نے ڈرائنگ میں آنٹی سے کہا۔ "کیا یہ بات سچ ہے کہ اس بنگلے کو کچھ لوگ بھوت بنگلے کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں؟"

آنٹی پہلے چونکیں پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔ "شاید باہر والے یہ سمجھتے ہیں کہ میں کوئی بھوت بلا ہوں کہ تن تنہا اس وسیع بنگلے میں رہتی ہوں۔" پھر ایک دم اداس ہو گئیں۔ "میرا دکھ کوئی نہیں جانتا کہ میں شوق سے تنہا زندگی بسر نہیں کر رہی ہوں۔ میں نے تو اپنے تمام بچوں اور انکے بچوں کے ساتھ رہنے کا خواب دیکھا تھا مگر میرے بچوں نے میرے سارے خواب چکنا چور کر دیئے۔ اور میں آج بھی ان کی کرچیاں دامن میں سمیٹے بیٹھی ہوں کہ شاید کل وہ میرے پاس آجائیں۔"

پھر جب وہ ذرا نارمل ہوئیں تو میں نے صبح گھر کے باہر جس خاتون سے ملاقات ہوئی تھی، اس کی باتیں آہستہ آہستہ دھرا دیں۔ آنٹی نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک گم صم بیٹھی دیواروں کو گھورتی رہیں پھر یوں بولیں، جیسے ان کی مخاطب خود وہی ہیں۔ "جب اپنے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ جیتے جی ناطہ توڑ لیتے ہیں تو ایسے میں کسی مرنے والی کی روح بھی ہمدرد بن جائے تو، اپنوں سے، زندوں سے زیادہ عزیز اور پیاری بن جاتی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ رک گئیں۔ اور کسی خیال میں گم ہو گئیں پھر میری طرف دیکھ کر بولیں۔ "ایک وقت تھا جب میں بہت ڈپریس ہو گئی تھی۔ بچوں کے رویوں سے مایوس ہو کر یہ سوچتی رہتی تھی کہ زندہ رہنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ یہ تن تنہا زندگی اب مجھ سے کاٹی نہیں جاتی۔ اس لئے اب مر جانا ہی چاہئے کہ ایک دم وہ میرے سامنے آگئی۔ "آپ تنہا کہاں امی! آپ کی بیٹی بھی تو آپ کے ساتھ ہے۔"

"اگرچہ اس کا چہرہ اتنا بھیانک تھا کہ ڈر اور دہشت سے میرا دم نکل جانا چاہئے تھا لیکن اس کی باتوں میں..... امی کہہ کر مخاطب کرنے میں اور اپنے آپ کو میری بیٹی کہنے میں جانے کیسا جادو تھا کہ ڈر کا احساس آہستہ آہستہ زائل ہو گیا اور اس پر مجھے بیٹی ہی کی طرح پیار آنے لگا۔"

"تم کون ہو بیٹی۔؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں اس بنگلے کی بھوت ہوں۔ مجھے اس بنگلے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ قتل ہونے سے پہلے میں بہت حسین، بہت خوبصورت تھی۔ مجھے میرے شوہر نے قتل کیا تھا۔ مجھے مارنے کے لئے اس نے میرے چہرے پر تیزاب پھینکا تھا جس کے بعد میرا خوبصورت چہرہ جل بھن کر اتنا بھیانک ہو گیا۔ اس تیزاب کے زہر نے مجھے زندہ بھی رہنے نہیں دیا۔

"مگر میری جان!" تمہیں تمہارے شوہر نے کیوں مارا.....؟ تمہارا پھولوں جیسا چہرہ کیوں مسخ کیا؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "مرد تو حسین چہروں پر جان چھڑکتے ہیں۔"

"اسے شک ہو گیا تھا کہ میرے حسن پر کچھ اور لوگ بھی فریفتہ ہو گئے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات تھی بھی تو مجھے اس کا کوئی علم نہیں تھا، کیونکہ میں تو صرف اس پر فدا تھی..... مگر اس نے جلن اور حسد میں نہ صرف میرے حسن کو تباہ کر دیا بلکہ میری موت کا سبب بھی بنا۔ مجھے مردہ حالت میں چھوڑ کر یہاں سے فرار ہو گیا اور لوٹ کر یہاں پھر کبھی نہیں آیا۔ بہت دنوں کے بعد اس بنگلے کی مالک بن کر آپ یہاں آئیں۔ میں بھوت بن چکی تھی اور میرا روپ اب چونکہ بہت بھیانک تھا۔ اس لئے میں کبھی آپ کے سامنے نہیں آئی، مگر جب مجھے آپ کے بارے میں معلوم ہوا کہ آپ بھی میری طرح دکھی ہیں۔ مرد شوہر ہو یا بیٹا، عورت کو دکھ دینے میں زیادہ سوچتا سمجھتا نہیں۔ آپ کو اس بنگلے میں تنہا چھوڑ کر جب آپ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے تمام رفو چکر ہوگئے تو ایک بھوت ہونے کے باوجود میں آپ کے دکھ کو بھی اپنا ہی دکھ سمجھنے لگی۔ آپ کے سامنے آنے سے میں اس لئے گریز کرتی رہی کہ آپ میری بھیانک شکل دیکھ کر خوفزدہ نہ ہو جائیں، لیکن آج جب آپ اپنی زندگی کو ختم کرنے کا ارادہ کر رہی تھیں، مجھے مجبوراً آپ کے سامنے آنا پڑا۔"

میں نے ایک طویل سانس لی اور کہا۔ "تو اب وہ بھوتنی آپ کی بیٹی بن کر نہ صرف آپ کے ساتھ رہتی ہے بلکہ آپ کا سارا کام کاج بھی وہی کرتی ہے۔؟"

"ہاں جمی! وہ مجھے ماں کہتی ہی نہیں، بیٹی بن کر بھی اس کا ثبوت دیتی ہے۔"

مجھے اس بات پر بے حد خوشی ہوئی کہ آنٹی نے مجھ سے کوئی بات چھپائی نہیں۔ سب کچھ بتا دیا "اور آنٹی!" میں نے ان سے پوچھا..... "وہ جو کچھ لوگ اس گھر میں آنے والے افراد کی موت کے بارے میں کہتے ہیں وہ کہاں تک حقیقت ہے؟"

"نرگس کچھ کریزی لڑکی ہے۔ ہر وقت میری نگرانی پر معمور رہتی ہے۔ ایک بار ایک چور شاید اس نیت سے بنگلے میں داخل ہو گیا تھا کہ بڑھیا اکیلے رہتی ہے۔ اطمینان سے اس کے گھر کا صفایا کر کے چلا جائے گا۔ وہ اپنی تمام تر ہیبت ناک شکل وصورت کے ساتھ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی جس کے بعد وہ مارے دہشت کے ایسا بھاگا کہ باہر جا کر کسی گاڑی کے پہیوں کے نیچے آ گیا۔ باقی لوگوں کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔ یہاں، اس بنگلے میں وقتاً فوقتاً کچھ لوگ آتے تھے، کچھ دنوں تک میرے پاس ٹھہرے تھے، پھر جس طرح خود آئے تھے خود ہی چلے گئے۔ البتہ اس بات پر مجھے دکھ ہوا تھا کہ اپنے جانے کی اطلاع انہوں نے مجھے نہیں دی۔"

آج رات جب آنٹی گہری نیند سو رہی تھیں تو میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر دھیرے سے آواز دی۔

"نرگس! میری پیاری بہن! کیا تم مجھ سے ملنے میرے پاس نہیں آؤ گی؟"

چاروں طرف سناٹا تھا، وہ نزدیک یا دور، کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ وہ اگر اس بنگلے کی بھوت ہے تو جہاں بھی ہوگی میری آواز خود سنے گی۔

میں نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تم آنٹی کی دوست بن کر، بیٹی بن کر ان کی خدمت کر رہی ہو، انکی دل جوئی کر رہی ہو۔ میرے لئے تمہاری قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ چونکہ جو دکھی دلوں کے دکھ بانٹتے ہیں وہ بڑے عظیم ہوتے ہیں۔ میں تم جیسی عظیم بہن سے اس لئے ملنا چاہتی ہوں۔"

ابھی میری بات ختم ہی ہوئی تھی کہ دوسرے کمرے میں وہ موجود تھی۔ اپنی تمام تر ہیبت ناکیوں کے ساتھ۔ وہ کب اور کیسے اور کہاں سے کمرے میں آئی مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ "لو، میں آ گئی۔ تم نے پیار سے بلایا اس لئے میں انکار نہ کر سکی۔"

میں جو دروازے کے پاس کھڑی اسے آواز دے رہی تھی، پلٹ کر دیکھا وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں سر سے پیر تک لرز کر رہ گئی لیکن جلد ہی میں نے اپنے آپ کو کنٹرول کر لیا۔ "خوش آمد! میری پیاری بہن! تم نے میری درخواست قبول کر کے میرا مان بڑھا دیا ہے۔"

"تم پر کشش لڑکی ہی نہیں، تمہاری باتیں بھی بڑی دل فریب ہیں۔ بتاؤ، تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہو۔؟" میں دروازے کو بند کر کے اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ اور اس سے کہا۔

"تم بھی، میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ نا۔"

"شکریہ! مجھے یہیں کھڑی رہنے دو۔ میرے کھڑے رہنے یا بیٹھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

آج، اس وقت وہ بہت واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ ہی نہیں، جسم کے بیشتر حصے تیزاب سے جھلس کر کریہہ صورت اختیار کر گئے تھے۔ اگرچہ وہ اس وقت گوشت پوست کی حالت میں نہیں تھی، محض سایہ کی صورت میں تھی لیکن تیزاب سے جلنے کے تمام اثرات نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔

"میری بہن!" میں نے اس سے کہا۔ "تمہارے بارے میں سن کر اور اب تمہیں دیکھ کر مجھے دلی طور پر بہت دکھ ہوا ہے۔ کیا تمہارا شوہر اتنا شقی القلب تھا کہ تمہیں اس حال کو پہنچاتے ہوئے اسے ذرا دکھ نہ ہوا؟ افسوس نہ ہوا۔؟"

"اسکے شقی القلب ہونے کا اندازہ تو مجھے بعد میں ہوا۔ البتہ اس کے شکی ہونے کا مجھے علم تھا اور اس لئے میں بہت محتاط رہتی تھی۔ اپنے بھائیوں اور عزیزوں تک کو اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس کے رشتے دار کبھی کبھار آتے تھے۔ جنہیں میں روک نہیں سکتی تھی۔ اگر کوئی مجھے گھور کر دیکھ بھی لیتا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور وہ مجھ سے کہتا۔ "وہ تمہیں اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا۔؟"

"میں کیا جانوں..... تم اسی سے پوچھو۔"

"کیا تم واقعی بہت خوبصورت تھیں؟"

"ہاں جمی! اور اس خوبصورتی کی سزا کے طور پر اس حال کو پہنچی ہوں۔ کاش کہ میں۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔

"خوبصورت بیویوں کے شوہر تو بہت خوش ہوتے ہیں اور فخریہ اپنے دوستوں اور عزیزوں سے انہیں ملواتے ہیں۔ تمہارا شوہر کیسا تھا کہ خوبصورت بیوی کی قدر نہیں کی۔"

"اور تو اس کی ساری باتیں اچھی تھیں۔ بس بے حد شکی مزاج تھا۔"

"تمہارے ساتھ اس نے جو سلوک کیا، تم نے اس کا انتقام کیوں نہیں لیا۔؟"

"بھوت بننے کے بعد کئی بار مجھے انتقام لینے کا خیال آیا۔ اسے ڈھونڈ نکالنا بھی میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مگر میں اس سے جو محبت کرتی تھی، اس محبت نے اس کی نفرت کا انتقام لینے کی مجھے اجازت نہیں دی۔" ذرا رکی پھر بولی۔ "تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ تم تو بھوت ہو یعنی روح ہو، پھر تم اپنے سابقہ جسمانی ہیت میں کیوں گھبراتی ہو؟ چلو میں خود ہی بتا دیتی ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اب تک اس کرب میں مبتلا ہوں جس کے زیر اثر میری موت واقع ہوئی تھی۔ غالباً جب تک میں ایک بے چین روح کی طرح اس دنیا میں بھٹکتی رہوں گی اپنے اس روپ میں نظر آؤں گی جس میں، میں کرب ناک موت سے مری تھی۔"

اب میں نے گفتگو کا موضوع بدلا۔ "نرگس! لوگوں کا خیال ہے کہ اس بنگلے میں تم کسی آؤٹ سائیڈر کا وجود برداشت نہیں کرتیں۔ جتنے لوگ یہاں آئے سب کو تم نے ہلاک کر دیا۔"

"ہاں..... میں نے ہلاک کیا۔ مگر کسی بغض یا مفاد کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ ان ہی کو مارا جو میری ماں یعنی تمہاری آنٹی کو نقصان پہنچانے کی نیت سے یہاں آئے تھے۔"

"چور یا ڈاکو، وہ جو بھی تھا، اس کی ہلاکت کا تو جواز ہے مگر دوسروں کو تم نے کیوں مارا؟"

"میں نے کہا ناں کہ بے وجہ میں نے کسی کو نہیں مارا۔ ایک وہ جسے پل پر سے میں نے سمندر میں پھینکا۔ میری ماں کا اپنے آپ کو دور پار کا رشتہ دار ظاہر کر کے انکے گھر مہمان ہوا۔ میں نے اس کی نگرانی کی تو معلوم ہوا وہ ایک دھوکے باز شخص ہے۔ پل پر وہ اپنے کچھ دوستوں کو بتا رہا تھا کہ بڑھیا کے گھر میں زیورات نام کی چیزیں بالکل نہیں ہیں۔ جبکہ نقدی بھی وہ بہت کم رکھتی ہے۔ اس لئے سوچ رہا ہوں کہ کسی طرح کوئی بڑی چیز پر کیسے ہاتھ صاف کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ جسے بلڈنگ کی اوپری منزل سے میں نے نیچے پھینکا، اس کے فراڈی ساتھی اس بلڈنگ میں سر جوڑ کر ملتے تھے۔ ان کا کام ہی بڑے لوگوں کو لوٹنا ہے۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے ایسے لوگوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور انکے بارے میں معلومات حاصل کر کے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ اور وہ جسے میں نے تیز رفتار گاڑی کے آگے دھکیل دیا۔ وہ تو بہت بڑا فراڈ کرنے والا تھا۔ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ بڑھیا کا بینک میں ایک بہت بڑا اکاؤنٹ ہے۔ وہ انکے دستخط کی نقل کرنے کی پریکٹس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہا تھا۔ اور کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہو چکا تھا مگر ابھی مکمل طور پر اس پر عبور حاصل نہیں کیا تھا۔ جیسے ہی مجھے اس بات کا علم ہوا..... میں نے اسے اس کے سارے خوابوں سمیت گاڑی کے پہیوں تلے کچل دیا۔"

"آفرین ہے تم پر۔" میں نے کہا۔ "تم نے بیٹی ہونے کا بھرپور ثبوت دیا اور اپنی ماں کو خطرناک دشمنوں کے شکنجے سے بچالیا۔" "پھر مسکراتے ہوئے بولی۔" تم نے میرے عزائم کے بارے میں بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ میں تمہاری ماں کو....."

"ہاں میں نے معلوم کرلیا ہے۔ اور اس لئے تم یہاں، اس بنگلے میں نظر آرہی ہو۔ ورنہ تم بھی، کہیں اور کا سفر کرچکی ہوتیں۔" پھر وہ مسکرائی..... خدا کی پناہ اس کی مسکراہٹ بھی کسی قدر بھیانک تھی۔ "مجھے تم سے اس لئے پیار ہوگیا ہے کہ تمہارے دل میں میری ماں کے دکھوں کا درد ہے۔ جمی! انسان اگر ایک دوسرے سے محبت کرے تو یہ دنیا جنت سے کم نہیں، لیکن انسانوں نے تو نفرت کے بیج بو بو کر اس دنیا کو جہنم سے بدتر بنادیا ہے۔"

"تم درست کہہ رہی ہو۔" میں نے اس کی تائید کی پھر اس سے کہا۔ "اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ میں نے تو سنا تھا کہ بھوت نظر آتے ہیں لیکن نہ بول سکتے ہیں نہ دوسروں کی باتیں سن سکتے ہیں، مگر تم تو باتیں بھی کررہی ہو، اور میری باتیں بھی سن رہی ہو۔"

"بات دراصل یہ ہے جمی! کہ میں بھوت تو ہوں مگر بدروح نہیں۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں تمہارے اس جملے کا مطلب۔"

"جو لوگ حرام موت مرتے ہیں ان کی روحیں، بدروحوں کی صورت میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ میری موت چونکہ دوسرے کے ہاتھوں ہوئی اس لئے میں بدروح نہیں، بھوت کی صورت میں اس لئے ہوں کہ نہ میری تدفین ہوئی نہ میرے لئے کسی نے دعا درود کی۔ میرے خیال میں میرے بھوت بننے کی یہی وجہ ہوسکتی ہے۔ رہی تمہاری یہ بات کہ میں بھوت ہوں کے باوجود بول بھی سکتی ہوں اور دوسروں کی باتیں سن بھی سکتی ہوں۔ تو مجھے بھوتوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا کرسکتے ہیں اور کیا نہیں کرسکتے۔ البتہ اپنے متعلق میں بس اتنا کہہ سکتی ہوں۔ کہ اللہ قادر مطلق ہے۔ اس کے قبضۂ قدرت سے کوئی بھی بات ناممکن نہیں۔ شاید اس نے مجھے بھوت کی صورت میں بھی بولنے اور سننے کی صلاحیت بغور انعام کے دی ہے۔ اب تم پوچھوگی کہ کس بات کا انعام، تو میری دانست میں یہ انعام اس بات کا ہوسکتا ہے کہ میں نے اپنے دشمن، اپنے قاتل کو بھی معاف کردیا، اسکے باوجود کہ اس نے مجھے اس حال کو پہنچادیا اس سے نفرت نہیں کی، اس سے محبت ہی کرتی رہی۔ اللہ خود محبت کرتا ہے اور محبت کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

"اور شاید۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر اس کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس لئے بھی کہ تم سے اللہ کو اپنی ایک دکھی بندی کی خدمت بھی کروانی تھی۔"

"شاید..... یہ وجہ بھی ہو۔" اس نے کہا پھر ذرا توقف کے بعد بولی..... "تو اب میں جاؤں؟"

ہاں جاؤ..... مگر یہ بتانے کے بعد کہ اگر میں تمہاری روح کو سکون پہنچانے کے لئے اور اس بھوت سے چھٹکارا دلوانے کے لئے تمہارے لئے دعا درود کرواؤں، تمہارے لئے ایصال ثواب کرواؤں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"اچھا کیا تم نے ایسا کچھ کرنے یا کرانے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیا۔ میری بہن! میں اپنی ماں کو بے سہارا چھوڑ کر اس جہنم سے جنت میں جانا بھی پسند نہیں کروں گی۔ جب تک میری ماں زندہ ہیں، میں انکی خدمت کرتی رہوں گی، انکے بعد میرے مولا کو جو منظور ہوگا میں اس پر راضی بہ رضا رہوں گی۔"

میں کراچی میں اپنا پندرہ دنوں کا کام مکمل کرکے لاہور گئی۔ وہاں بھی پندرہ دنوں تک مطلوبہ کام کرتی رہی۔ وہاں سے مجھے اسلام آباد اور پنڈی جانا پڑا۔ یہاں

جن لوگوں سے مل کر مجھے اپنا کام کرنا تھا۔ ان میں سے ایک جلال چوہدری بھی تھے۔ بڑے اچھے، ہنس مکھ، ملنسار اور صحیح معنوں میں انسان دوست ایک دن فرصت کے لمحات میں کہنے لگے۔

"جمی جی! آپ بھوت پریت پر یقین رکھتی ہیں۔؟"

میں نے بس یونہی کہہ دیا۔ "جی نہیں۔"

"تو پھر چلئے، آپ کو ایک بھوت سے ملواؤں۔"

میں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے کسی ایسے دوست سے ملوانا چاہتے ہیں جس کو یہ لوگ کسی وجہ سے بھوت کے نام سے پکارتے ہوں گے۔ لیکن جب وہ پنڈی کے ایک پرانے محلے کے ایک مکان میں مجھے لے گئے اور ایک شخص کو دکھایا تو مارے دہشت کے میرے منہ سے چیخ نکل پڑی۔ وہ سر سے پیر تک اس قدر بھیانک تھا کہ اس کے کریہہ وجود پر نگاہیں ٹھہرتی نہیں تھیں۔ میں جلد ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔ جلال چوہدری بھی میرے پیچھے کمرے سے باہر آ گیا۔

"اب تو آپ کو یقین آ گیا بھوتوں کے وجود پر۔؟ بھوت روحوں کی شکل میں بھی ہوتے ہیں اور ایسے زندہ ملامت بھی۔" جب ذرا دیر بعد میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے پوچھا۔

"چوہدری صاحب! آخر اس زندہ بھوت کا کیا جغرافیہ ہے؟"

چوہدری صاحب جیسا ہر وقت چہکنے والا شخص ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ "یہ مکافات عمل کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ تبھی اس نے اپنی بیوی پر تیزاب پھینک کر اسے اذیت ناک موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا اور اپنی بیٹی کو لیکر فرار ہوگیا تھا۔ اس بیٹی کو اس نے بڑے لاڈ پیار سے پالا پوسا، اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ایک دن اس بیٹی کو باپ کی ایک پرانی ڈائری ملی جس میں انکے سارے گناہوں کی تفصیل تھی۔ بیٹی کو جب معلوم ہوا کہ اس کی ماں کو اس کے باپ نے ایسی اذیت ناک موت مارا ہے تو اسے اس باپ سے جسے وہ بے پناہ چاہتی تھی، شدید نفرت ہوگئی۔ اور ایک دن اسی نفرت کے زیر اثر اس نے باپ کو سر سے پیر تک تیزاب سے نہلا دیا۔ وہ سر سے پاؤں تک جھلس گیا، اور اس کا وجود اس قدر بھیانک ہوگیا کہ اس پر نظر پڑتے ہی لوگ "بھوت" کہہ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ اس قدر مجروح اور مفلوج ہونے کے باوجود وہ اب تک زندہ ہے، بھوت کا نشان بنا ہوا ہے۔"

جلال چوہدری خاموش ہوئے تو میں نے ان سے کہا۔ "چوہدری صاحب! اب اس کی دیکھ ریکھ کون آتا ہے، کیا اس کی وہی بیٹی.....؟"

"نہیں جمی جی! بیٹی نے تو اپنے جرم کا اعتراف کرکے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کردیا تھا، اب وہ جیل میں ہے۔ جب مجھے اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں، اس کے منہ میں پانی کا قطرہ ٹپکانے والا بھی کوئی نہیں تو میں اسے اٹھا کر اس مکان میں لے آیا اور اک سخت دل بندے کو اس کی خدمت پر معمور کردیا۔

"چوہدری صاحب! آپ نے ایسے مجرم کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا۔ جسے اس کی بیٹی بھی معاف نہیں کرسکی؟"

"آپ کا یہ سوال بڑا عجیب ہے۔ اس کے جواب میں میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ جس کا وہ مجرم تھا، اس نے اسے سزا دے دی۔ اب اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میں نے کربھلا ہو بھلا کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے یہ ارادہ کرلیا کہ جب تک وہ اپنی سانسوں کی ڈوری سے بندھا ہوا ہے۔ اس کی جو خدمت کرسکتا ہوں کرتا رہوں گا۔ جمی جی! اچھوں سے تو سبھی محبت کرتے ہیں، بروں سے بھی اگر نفرت کے بجائے محبت کی جائے تو شاید برائی ایک دن اس دنیا سے ختم ہوجائے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

گئے موسم میں جو کھلتے تھے گلابوں کی طرح
دل پہ اتریں گے وہی خواب عذابوں کی طرح
کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح
شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار

تمام کائنات میں تمہی کو کس لئے چنا
ناراضگی سے پیشتر یہ سوچ تو لیا کرو
بڑے ہی قیمتی ہیں تمہارے موتیوں سے اشک
ذرا سی بات پہ تم یوں نہ رو دیا کرو
شگفتہ جبین.....کراچی

آنکھوں میں رکا ہوا ہے مدت سے اک سیلاب
برسنے کو یہ آنکھیں بڑی ہیں بے تاب
سن نہیں سکے گا کوئی میرے دل کی داستان
کرنا کوئی چاہے تو بھی میرے غموں کا نہ کر سکے گا حساب
کائنات جاوید.....حیدرآباد

تیری چاہت میں تیرے دیوانے ہوگئے
اب تو ہم اپنوں سے بیگانے ہوگئے
تیری پھول سی صورت کے ہم طلبگار تھے
پھر آنکھوں میں کیسے خواب سہانے ہوگئے
محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد

ساری زندگی میں اپنے پیار کو نبھاتی رہوں گی
تمہارے سپنوں کو میں اپنی آنکھوں میں سجاتی رہوں گی
تم نے مجھ سے جو وعدے کئے ہیں وہ تم نبھاتے رہنا
تمہاری یاد میں میں آنسو بہاتی رہوں گی
صبا محمد اسلم.....گوجرانوالہ

محفل میں نہ سہی تنہائی میں تو یاد کرو گے دوست
کبھی تو اس خدا سے فریاد کرو گے
نہ ملا ہے نہ ملے گا میرے جیسا دوست
کبھی تو اس بات پہ ناز کرو گے
سید وہاب علی.....کراچی

کچھ برس پہلے جو خط تم نے لکھے تھے مجھ کو
اب پڑھا ان کو تو کچھ اور معانی نکلے
میرا کمرہ ہے کہ اک دنیا تیری یادوں کی
چھیڑوں جس چیز کو تیری ہی نشانی نکلے
محمد عثمان علی.....میاں چنوں

تمہارے بن نہیں رہنا مجھے تم سے محبت ہے
ہے تم سے بس یہی کہنا مجھے تم سے محبت ہے
زبان تو کہہ نہیں سکتی تمہیں احساس تو ہوگا
میری آنکھوں کو پڑھ لینا مجھے تم سے محبت ہے
انتخاب: محمد شفیق رضا.....میاں چنوں

کیا ملا مجھ کو تیرے نام کے بعد
زندگی کٹ گئی اک شام کے بعد
حرف تسلی بھی وہ نہ دے پایا
منیر مجھے حسرت ناکام کے بعد
منیر احمد ساغر.....میاں چنوں

آنسوؤں سے زمین دھل گئی
خون سے آسماں رنگ گیا!!
آج پھر خون کے رکھوالے سوگئے
پھر سے گل گلزار کو ویران کردیا
ملک عبدالجبار.....فیصل آباد

سوچا تھا تیری سادگی پر لکھیں گے اک غزل
افسوس کہ تیرے معیار کے الفاظ نہ مل سکے
حبیب اللہ جٹ.....نول

وہ بے وفا نہ تھا یونہی بدنام ہوگیا فراز
چاہنے والے ہزاروں تھے کس کس سے وفا کرتا
سلمان خان.....نول

کیسے بھلائے گا وہ میری برسوں کی چاہت کو فراز
دریا اگر سوکھ بھی جائے پر نمی نہیں جاتی!
اویس امجد.....کھڈیاں خاص

غم ہی غم تھا زندگی میں
نہ جانے کیا کرگیا کوئی
شکوہ نہ تھا زندگی سے فرحت
یہ تو تھے قدرت کے فیصلے
اعجاز علی.....کھڈیاں خاص

☆☆

کرتے ہیں بات گرمئ بازار دیکھ کر
ہم بیچتے ہیں غم بھی خریدار دیکھ کر
اپنے کئے پہ آج پشیمان ہوں، مگر
دل دے دیا تھا اس کو طلب گار دیکھ کر
اس دیس کا تو ہی ہے نگہبان اے خدا!
دل ڈر رہا ہے وقت کے آثار دیکھ کر
بھٹکے ہوئے ہیں آج بھی منزل سے اپنی وہ
جو رک گئے تھے سایہ دیوار دیکھ کر
لب کھولنے سے پہلے ہی خاموش ہوگئے
آنکھوں میں ان کی صورت انکار دیکھ کر
دنیا سمجھ رہی تھی جسے بے وفا حکیم
وہ رو رہا تھا مجھ کو سردار دیکھ کر
(حکیم خان حکیم.....کامل پور موسیٰ)

سکھ چین اپنا گنواؤ گے، تو سمجھ جاؤ گے
چوٹ محبت کی اگر کھاؤ گے، تو سمجھ جاؤ گے
روکنے آنکھ سے یہ اشک کتنے مشکل ہیں
آنسو کوئی تم جو چھپاؤ گے، تو سمجھ جاؤ گے
کیوں دن رات تڑپتے ہیں یہ دیوانے لوگ
کسی کو دل میں بساؤ گے، تو سمجھ جاؤ گے
بیاں ہوتی ہیں کیسے یہ حقیقتیں دل کی اے منیر
داستاں اپنی سناؤ گے، تو سمجھ جاؤ گے
زندگی کیسے گزرتی ہے غموں میں کسی کے
دکھ محبت کے اٹھاؤ گے تو سمجھ جاؤ گے
حوصلہ کیا ہے اور ہمت کسے کہتے ہیں لوگ
کشتیاں جب اپنی جلاؤ گے تو سمجھ جاؤ گے
رتجگے کیوں ہیں عذاب جاں اے دوست
جاگ کر رات بتاؤ گے تو سمجھ جاؤ گے
مزہ کیا ملتا ہے مجھے اس حال فقیری میں ساغر
جب اپنا گھر بار لٹاؤ گے تو سمجھ جاؤ گے
امید جب کوئی نہ ہو تو کیسے گزرتی ہے زندگی
آس کی شمع بجھاؤ گے، تو سمجھ جاؤ گے
دکھ میں ہوتا نہیں کوئی بھی شریک یہاں
جب کسی سے ہاتھ ملاؤ گے تو سمجھ جاؤ گے
قسطوں میں خودکشی کا مزہ نہ ہم سے پوچھئے
محبت کا زہر جب پیو گے تو سمجھ جاؤ گے
ملتا کچھ بھی نہیں ہجر میں جل مرنے سے
یاد کی شمع جلاؤ گے تو سمجھ جاؤ گے
کیسے ہوگئے عشق میں فنا ہم لوگ اے منیر
میری طرح خود کو مٹاؤ گے، تو سمجھ جاؤ گے
(منیر احمد ساغر.....میاں چنوں)

بنگال کی ملکہ الگ تھی ترکی کا سلطان الگ
کیا ۱۴ اگست کو ہوگئے تھے مصر اور سوڈان الگ
مشرقی دلہن نے دیا اپنے باوفا ہونے کا کچھ یوں ثبوت
تین ماہ میں شوہر کو لے کے کرلیا مکان الگ
بہت خوشی میں جارہا تھا سائیکل پر سستے پیاز ٹماٹر لے کر
اچانک گڑھا آیا پھر سائیکل الگ میں الگ سامان الگ
وہ بھی سوچتی ہوگی وفا کیوں نبھائے اکیلے باقر سے
سو کامران الگ نعمان الگ حسان الگ فرقان الگ
بہت محبت سے پھینکا بیگم نے گلاب کا پھول میری جانب
اور اس کے بعد میں الگ پھول الگ گلدان الگ
(ذیشان اقبال عظمی.....کراچی)

حق کی عظمت کا علمبردار ہے میرا قلم
فکر کی دنیا کا اک سردار ہے میرا قلم
حرف گوئی کی صداقت کا یہاں ہو منحرف
بول اٹھنا پھر سبھی بے کار ہے میرا قلم
دشمنان حق کے رستوں میں کھڑا ہے بے دھڑک
آج دیکھ برسر پیکار ہے میرا قلم
جیسے فرعون جہاں کے واسطے موسیٰ کوئی
ظالموں کے واسطے تلوار ہے میرا قلم
یہ جلائے گا یقیناً کالے چہروں کے نقاب
یہ حقیقت ہے کہ اک انگار ہے میرا قلم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روشنی دے مولا تو خانم کے ہر اک لفظ میں
ہاں اگر سچائی کا شہکار ہے میرا قلم
(زریدہ خانم.....لاہور)

یہ دیکھ کر وہ بھی تو تڑپ جاتا ہوگا
جب کوئی کسی سے بچھڑتا ہوگا
اک مدت ہوئی اس سے بچھڑے ہوئے
نہ جانے اب وہ کیسا ہوگا
یہی سوچتے ہوئے دن گزر جاتا ہے
کیا وہ بھی مجھے یونہی سوچتا ہوگا
اسے یاد کرکے جیسے پلکیں بھیگ جاتی ہیں
مجھے یاد کرکے وہ بھی تو روتا ہوگا
بیتی یادیں اسے بھی تو ستاتی ہوں گی
وہ روز جیتا ہوگا وہ روز مرتا ہوگا
مجھے سلگاتا ہے وحشت تنہائی کا غم
وہ بھی تنہائی میں میری طرح جلتا ہوگا
انا کے نشتر سے اس نے قتل کیا ہے میرا
خلش کی سولی پر وہ روز چڑھتا ہوگا
(شائستہ سحر.....راولپنڈی)

تیری یادوں نے مسلسل دل کو گھیرا ہے
تیرے بغیر ہر طرف یہ کیسا اندھیرا ہے
یہ کیسی رات ہے جو تیرے بغیر آئی ہے
تیرے بغیر آیا یہ کیسا سویرا ہے
میرے دل میں گزری ہوئی رتوں کا خیال ہے
اور ذہن میں آنے والی نامشی کا بسیرا ہے
اس پہ بھی بھلا کیا بھروسہ کرنا
وہ وقت جو تیرا ہے نہ میرا ہے
(ساجدہ راجا.....ہنداواں سرگودھا)

چہرہ کوئی بھی آنکھ میں ٹھہرا نہ پھر کبھی
دل نے کسی بھی شخص کو چاہا نہ پھر کبھی
روٹھا ذرا سی بات پہ اٹھ کر چلا گیا
ایسا گیا کہ لوٹ کے آیا نہ پھر کبھی
کچھ یوں ملا تپاک سے بس عشق ہوگیا
وہ اجنبی تھا کون تھا سوچا نہ پھر کبھی
اس نے بطور تحفہ دیا تھا لباس ہجر
پہنا جو ایک بار اترا نہ پھر کبھی
محسن گزر چکا تھا حد اعتدال سے
جانے کہاں گیا اسے دیکھا نہ پھر کبھی
(انیلہ غزل.....حافظ آباد)

مجھ کو بتا رہی ہیں میرے گھر کی دیواریں
کہ تجھ کو بلا رہی ہیں میرے گھر کی دیواریں
آنسو میری آنکھوں سے بھی مسلسل نکل رہے ہیں
میرے ساتھ رو رہی ہیں میرے گھر کی دیواریں
یہ پرچھائیں نہیں بلکہ اس کے آنے کی خوشی ہے
اس کو آمد آمد کہہ رہی ہیں میرے گھر کی دیواریں
وہ کون سا دن ہوگا جب جی بھر کے دیکھوں گی اسے
اور میرے ساتھ خوش ہوں گی میرے گھر کی دیواریں
وہ آنگن میں آئے گا تو دروازے بھی خوش ہونگے
اس کے آنے سے مہک جائیں گی میرے گھر کی دیواریں
(فوزیہ کنول.....منڈی کنگن پور)

جسم و جاں رکھتا ہوں لیکن یہ حوالہ کچھ نہیں
آپ کی نسبت ہے سب کچھ میرا اپنا کچھ نہیں
عشق جس کوچے میں رہتا ہے وہ کوچہ ہے بہشت
عقل جس دنیا میں رہتی ہے وہ دنیا کچھ نہیں
کتنے سادہ لوح تھے اگلے زمانے کے وہ لوگ
کہہ دیا جو دل میں آیا دل میں رکھا کچھ نہیں
اس طرف ہے میری وحشت اس طرف تیرا جمال
وہ حقیقت دائمی ہے یہ تماشا کچھ نہیں
دیکھنے والا کوئی ہوتا تو ہم بھی کھیلتے
تھے تماشے سیکڑوں لیکن دکھایا کچھ نہیں
آکے جو سیراب کرتی ہے زمین خشک کو
اصل میں ہے موج دریا شور دریا کچھ نہیں
سوچتا ہوں جا کے اس کو پیش کر دوں دل امتیاز
یار کی نظروں میں دنیا کا اثاثہ کچھ نہیں
(ایس امتیاز احمد.....کراچی)

دیکھتی ہیں میری آنکھیں نظارے کیسے کیسے
آشیاں سے اٹھتے ہیں شرارے کیسے کیسے
جان بوجھ کے بھی نہیں ملتا وہ مجھے
زمانے میں مہرباں ہیں ہمارے کیسے کیسے
نہیں گلہ تجھ سے بے وفائی کا ہمنشیں
تقدیر میں اپنی ہیں انگارے کیسے کیسے
نظروں سے دور جا کے بھی تو خوش رہے
چمکتے ہیں آسماں پہ ستارے کیسے کیسے
بدنصیبی ہے میری تیرے ستم سہتا ہوں
تیری مسکراہٹ کے ہیں نظارے کیسے کیسے
زندگی بھی ہم نے داؤ پہ لگادی ہے جاوید
چمن میں پھول مہکتے ہیں پیارے کیسے کیسے
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

یا تو محرومی کا ہے احساس یا تنہا ہے غم
کیسی تقریب مسرت ہے میری آنکھیں ہیں غم
اے کرم کو انگلیوں پہ گننے والے آج کیوں
دیکھ کر مجھ کو لگا رونے ترا ہر اک ستم
موسموں کی لوریوں سے سارے جذبے سوگئے
سوچ کی دہلیز سے پیچھے رہے سب کے قدم
زندگی کا حال کے ہاتھوں میں جب کردار ہے
وقت کا ہے فیصلہ انسان کے ماتھے پر رقم
لاکھ خود غرضی سفیدی خون میں شامل کرے
پیار کا جذبہ تو ہر اک عہد میں لے گا جنم
وصل کے دامن میں تو ہیں خوشبوئیں اور روشنی
ہجر تیری انگلیوں میں شاعری کا ہے قلم
نام پر قمر جن کے آنکھ تر ہونے لگے
ہم نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے پیاسوں کا علم
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

تجھے بھولنا بھی چاہیں تو بھلا نہیں سکتے
اپنی آنکھوں کے آنسو ہر روز چھپا نہیں سکتے
دل میں بسی ہے ایک پیاری سی تصویر تیری
وہ تصویر ہم لوگوں کو دکھا نہیں سکتے
پیار تو ہم صرف اور صرف تم سے کرتے ہیں
لوگوں کے سامنے وہ پیار ہم جتا نہیں سکتے
ہم جانتے ہیں تمہیں ہماری جدائی کا کوئی رنج نہیں
تمہیں تو اپنے دل کی بات بھی ہم بتا نہیں سکتے
تم نے کیا تھا وعدہ کہ تمہیں بھول جائیں ہم
افسوس کہ وہ وعدہ ہم نبھا بھی نہیں سکتے
(صبا محمد اسلم.....گوجرانوالہ)

اسے حال و قال سے واسطہ، نہ غرض مقام و قیام سے
جسے کوئی نسبت خاص ہو، ترے حسن برق خرام سے
مجھے دے رہے ہیں تسلیاں، وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آ کے منظر عام پر، کبھی ہٹ کے منظر عام سے
کہوں کیا؟ رہا جو مقابلہ خطرات گام بہ گام سے
سر بام عشق تمام تک، رہ شوق نیم تمام سے
نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے
ترے ذکر سے، تری فکر سے، تیری یاد سے، ترے نام سے
مرے ساقیا، مرے ساقیا؟ تجھے مرحبا، تجھے مرحبا؟
تو پلائے جا، تو پلائے جا، اسی چشم جام بہ جام سے
تری صبح عشق ہے کیا بلا؟ تجھے اے فلک؟ جو ہو حوصلہ
کبھی کر لے آ کے مقابلہ، غم ہجر یار کی شام سے
مجھے یوں نہ خاک میں تو ملا میں اگرچہ ہوں ترا نقش پا
ترے جلوے جلوے کی ہے بقا، مرے شوق نام بنام سے
تری چشم مست کو کیا کہوں کہ نظر نظر ہے فسوں فسوں
یہ تمام ہوش، یہ سب جنوں، اسی ایک گردش جام سے
یہ کتاب دل کی ہیں آیتیں، میں بتاؤں کیا جو ہیں نسبتیں
مرے سجدہ ہائے دوام کو، ترے نقش ہائے خرام سے
مجھے چاہئے وہی ساقیا؟ جو برس چلے، جو چھلک چلے
ترے حسن شیشہ بدست سے، تری چشم بادہ بجام سے
جو اٹھا ہے درد اٹھا کرے، کوئی خالی اس سے گلہ کرے
جسے ضد ہو حسن کے سے، جسے چڑ ہو عشق کے نام سے
وہیں چشم حور پھڑک گئی، ابھی پی نہ تھی کہ بہک گئی
کبھی یک بہ یک جو چھلک گئی، کسی رندمست کے جام سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو ہزار عذر کرے مگر ہمیں شک ہے اور ہی کچھ مگر!
ترے اضطراب نگاہ سے تری احتیاط کلام سے
(انتخاب: محمد عثمان علی......میاں چنوں)

کبھی کبھی ہی سہی سوگوار ہے کہ نہیں
بچھڑ کے مجھ سے یہ دل بے قرار ہے کہ نہیں
وہ آنکھ جس میں محبت کے خواب بنتے تھے
وہ اب بھی میرے لئے آب دار ہے کہ نہیں
وہ پہلے پیار کا پہلا وطن ہوا تھا جہاں
کیا یاد تم کو بھی وہ یاد ہے کہ نہیں
کسی کو اور وہ چاہے کیا یوں بھی ہوتا ہے
کہ بے وفائی سے وہ سرمسار ہے کہ نہیں
اسے سب ہی ملا تم کو اس زمانے میں
مگر نصیب میں کیا ان کا پیار ہے کہ نہیں
(انتخاب: شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

اپروں اپروں پیار کرنا ایں پیار سجناں
جبکہ دلوں وی کریں تے تاں گل ہے
مزہ آجائے سجناں پیاراندر
قدم عشق وچ دھریں تے تاں گل ہے
جیویں دکھاں نے مینوں آج ساڑیاں ای
میرے وانگ جے سڑیں تے تاں گل ہے
دلوں تائیں میں آکھساں یار فرحت
یاد یار وچ مریں تے تاں گل ہے
(لاہوتی عمار......آھدی موڑ دولتالہ)

میرے خیالوں میں حسین چہرے والی انجان سی لڑکی رہتی ہے
کبھی نظریں ملاتی ہے کبھی نظریں چراتی ہے
کبھی دیوانہ کرتی ہے کبھی پاگل بناتی ہے
کبھی معصوم سا چہرہ بنا کر سہم جاتی ہے
میرے خیالوں میں حسین چہرے والی انجان سی لڑکی رہتی ہے
کبھی آنچل سمیٹتی ہے کبھی خود سمٹ جاتی ہے
کبھی چلتے ہی چلتے تھوڑا سا رک جاتی ہے
کبھی خاموش سی خاموش چپ رہتی ہے
میرے خیالوں میں حسین چہرے والی انجان سی لڑکی رہتی ہے
کبھی چلتی ہے تو مٹک مٹک کے چلتی ہے
کبھی پائل کی چھن چھن سے نیندوں کو اڑاتی ہے
کبھی خوابوں میں آکر پریوں کی طرح مسکراتی ہے
میرے خیالوں میں حسین چہرے والی انجان سی لڑکی رہتی ہے
کبھی بس ساتھ رہنے کے جھوٹے وعدے کرتی ہے
کبھی چھوٹی چھوٹی بات پر روٹھ جاتی ہے
کبھی غیروں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے
میرے خیالوں میں حسین چہرے والی انجان سی لڑکی رہتی ہے
کبھی بیگانا کرتی ہے کبھی اپنا بناتی ہے
کبھی اپنی چیزوں پہ میرا نام لکھے جاتی ہے
اس لئے انس اتنا مجھ کو بھاتی ہے
میرے خیالوں میں حسین چہرے والی انجان سی لڑکی رہتی ہے
(ایم انس نہال......میاں چنوں)

لباس تن سے اتار دینا
کسی کو بانہوں کے ہار دینا
پھر اس کے جذبوں کو مار دینا
اگر ''محبت'' یہ ہے جاناں تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے
گناہ کرنے کا سوچ لینا
حسین پریاں ''دبوچ'' لینا
پھر اس کی آنکھیں ہی نوچ لینا
اگر ''محبت'' یہی ہے جاناں تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے
کسی کو لفظوں کے جال دینا
کسی کو جذبوں کی ڈھال دینا
پھر اس کی ''عزت'' اچھال دینا
اگر ''محبت'' یہی ہے جاناں تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے
اندھیر نگری میں ''چلتے'' جانا
حسین ''کلیاں'' مسلتے جانا
اور اپنی ''فطرت'' پہ مسکرانا
اگر ''محبت'' یہی ہے جانا تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے
(احسان سحر......زادے خیلانوالہ۔ میانوالی)
☆☆

زندگی گزر گئی ہے خوف میں
خوف کے ساتھ زندگی ہے
خوف ہی ہے سیدھا راستہ
خوف زندگی کا امتحان ہے
خوف ہی نے دوڑایا سب کو
خوف ہی زندگی کا سہارا ہے
خوف سے دل کا اطمینان ہے
خوف ہی اللہ سے ملاتا ہے
خوف ہی جہنم سے بچاتا ہے
مشرک و منافق بلا خوف ہیں
خوف ہی جنت کا دروازہ ہے
جو نہیں ڈرتا خدا کے خوف سے
جہنم ہی صرف ان کا ٹھکانا ہے
(سلیم بیگ ہمدانی......کراچی)

اگر یقین نہیں تو آزما مجھے
یا خود کرشمہ کوئی دکھا مجھے
مجھ سے دور جا کے بھی
ملا کیا سکون، دکھا مجھے
چاہت ہے اگر تیرے دل میں
پہلو میں اپنے لے جا مجھے!
پتھروں کی طرح کیوں خاموش ہو
اپنوں کی طرح گلے لگا مجھے
چاہت نہیں اگر ترے دل میں
نفرت سے اپنی رلا مجھے
(محمد اسحاق انجم......کنگن پور)

یاد آئے گلاب جیسے لب
لالہ گوں لعل ناب جیسے لب
چھو نہیں سکتا دیکھ لیتا ہوں
ہیں ترے لب بھی خواب جیسے لب
چشم ویراں کو مست کرتے ہیں
تیرے گل گوں شراب جیسے لب
جب بھی بولیں تو سحر چھا جائے
یہ خطابت مآب جیسے لب
کر گئے خون میرے سپنوں کا
تیرے چنچل شباب جیسے لب
کیوں کرے وہ گناہ کی جرأت
جب ہوں دل میں ثواب جیسے لب
ساری دنیا میں گھوم کر دیکھا
کس کے لب تھے عتاب جیسے لب
کوئی تاریخ سی رقم کردیں
یہ ترے انقلاب جیسے لب
ظلمت شب مہیب ہے شہزاد
لایئے ماہتاب جیسے لب
(آصف شہزاد......فیصل آباد)

نہ سوچا تھا ان کو بلانے سے پہلے
دکھائے گا دل وہ ہنسانے سے پہلے
اگر دکھ اٹھانا ہے تقدیر اپنی
سکون کیوں ملا رنج اٹھانے سے پہلے
مقدر پہ اپنے نہ آنسو بہاتے
اگر سوچتے دل لگانے سے پہلے
کہو! زلزلوں سے کریں نہ تباہی
مٹادو مجھے تم زمانے سے پہلے
پشیمان ہوتا نہیں آدمی وہ!
سنبھل جائے جو چوٹ کھانے سے پہلے
شفیق اپنے دل کو نہ بہلاؤ ایسے
نہ آئے گا اب وہ منانے سے پہلے
(محمد شفیق اعوان......حضرو اٹک)

آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سایہ کوئی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب شاخ کوئی ہاتھ لگاتے ہی چمن میں
شرمائے لچک جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
رستے کے دھندلکے میں کسی موڑ پہ کچھ دور
اک لو سی چمک جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
صندل سی مہکتی ہوئی پر کیف ہوا کا
جھونکا کوئی ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
اوڑھے ہوئے تاروں کی چمکتی ہوئی چادر
ندی کوئی بل کھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب رات گئے کوئی کرن واجد میرے برابر
چپ چاپ سی سوجائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

جاناں تیری باتوں سے راہ نہ کی
اتفاق سے زندگانی تباہ نہ کی
محبت میں ہم نے بڑا جوش کھایا
آئے بھی در تیرے مگر کوئی چاہ نہ کی
لوٹ لوٹ کر دیکھا چشم سیری کیلئے
تیرے وصل کیلئے دوبارہ دعا نہ کی
تیری ستمگری و جفاگری پہ نہ اشک بہائے
قلب و جگر پتھر تھا جس نے آہ نہ کی
شب ہجر کی لذت کیلئے اے جاناں
ہم نے انداز سوچ تباہ نہ کی
(دلکش امیر پوری......کہروڑ پکا)

محبت اک سراب زندگی ہے
میں جس کی جستجو میں
کوبہ کو قریہ بہ قریہ معتبر ٹھہرا
اب کسی منزل کا رستہ ہی نہیں ہے
پہاڑوں پر، نہ ویرانوں کی بستی میں
نہ خوشبو میں، نہ پھولوں میں
نہ خاموشی کے صحرا میں
نہ مسجد میں نہ مندر میں
نہ صحرا میں نہ بادل میں
نہ دریا میں نہ موسم میں
نہ ہستی میں، نہ سوچوں میں
مگر اب مجھے محسوس ہوتا ہے
جانے وہ کون خوش نصیب ہوتے ہیں
جنہیں چاہت کے رستے پر وفائیں ڈھونڈ لیتی ہیں
(ارشاد العصر جعفری......مظفر گڑھ)
☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

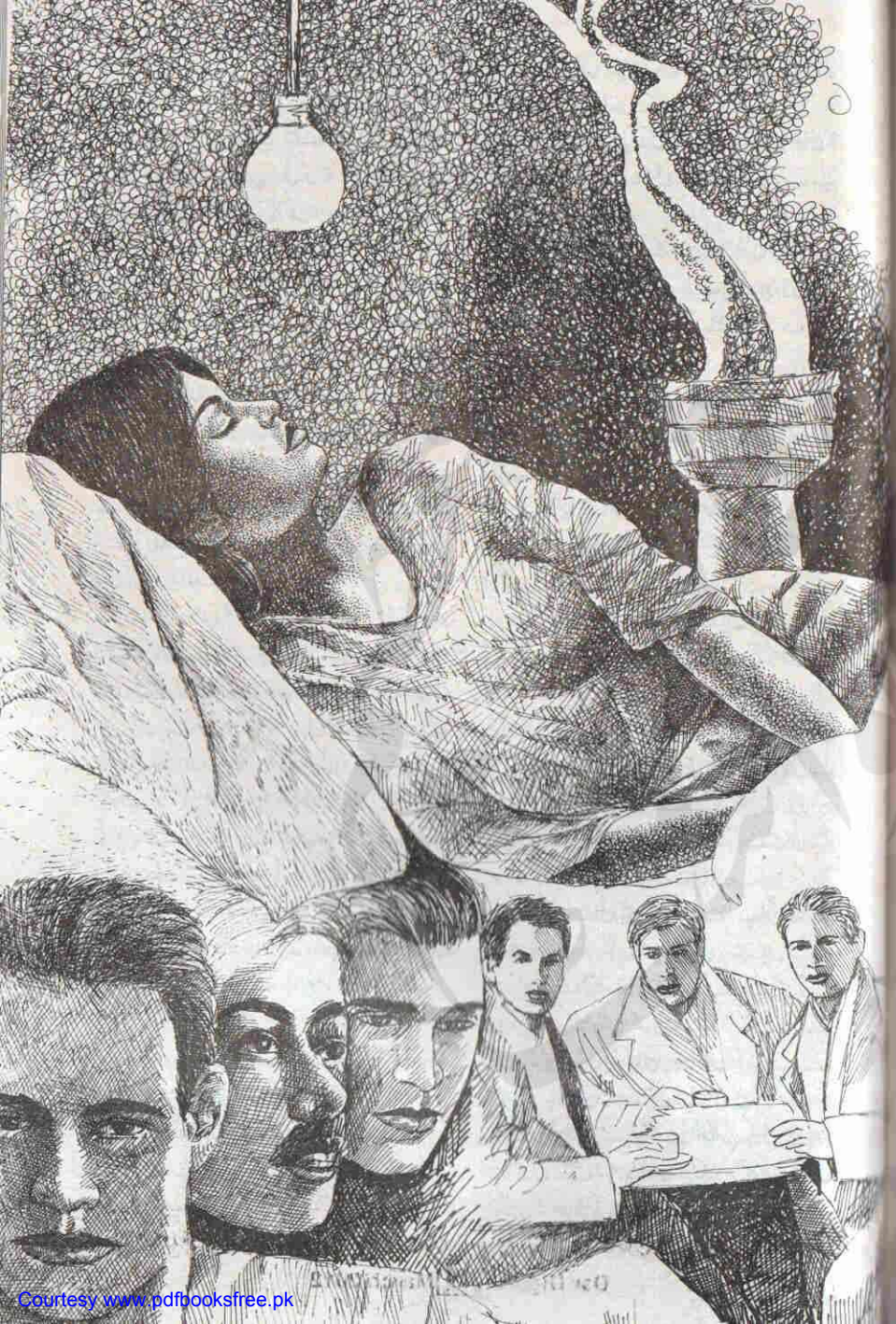

شمیکا

ڈاکٹر اختر ہاشمی۔کراچی

پہلا حصہ

ایک انسان اور ایک ماورائی مخلوق کی چاہت و خلوص اور دیدہ دلیری پر مبنی شر کے خلاف برسر پیکار، خوفناک حیرت ناک عجیب و غریب حالات و واقعات کے گرد گھومتی ہوئی سوچ کے افق پر محو پرواز اپنی نوعیت کی ناقابل فراموش دلفریبی سے معمور، دل میں کسک پیدا کرتی اپنی مثال آپ داستان حیرت جو کہ پڑھنے والوں کے ذہن سے برسوں محو نہ ہوگی۔

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کیلئے دل پر اثر کرنیوالی ایک زبردست اور حیرت انگیز روداد

جب وہ ذوق شیریں مٹھائی کی دکان میں داخل ہوئی تو ساری فضا خوشبو سے مہک اُٹھی۔ یہ خوشبو ایسی تھی جو میں نے آج تک لگائی تھی اور نہ کہیں سونگھی تھی۔ مٹھائی کی دکان پر موجود سیلز مین مجھ سے باتیں کر رہا تھا... وہ یک دم خاموش اور سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔

''مجھے دس کلو مکس مٹھائی چاہیے۔''

اُس کی آواز بڑی مترنم تھی۔ اُس نے یہ بات اپنی دانش میں بڑی عام فہم بول چال میں کہی تھی مگر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کی گفتگو میں چاشنی ملی ہو اور وہ کسی سُر میں بات کر رہی ہو۔ مٹھائی کا بتا کر اُس نے پانچ ہزار کا نوٹ شوکیس پر رکھ دیا۔ سیلز مین نے نوٹ اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''مٹھائی ڈبوں میں پیک کر دوں یا ٹوکرا تیار کر دوں۔''

''ڈبوں میں پیک کر دیں، بھلا اتنی رات کو ٹوکرا اُٹھا کر کون لے جائے گا۔ میرے ساتھ تو کوئی مرد بھی نہیں ہے۔'' اس لڑکی نے اپنی نازک اندامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سیلز مین خاموشی سے دس کلو مکس مٹھائی ڈبوں میں پیک کرنے لگا۔ فضا اب بھی اسی مہک سے معطر ہو رہی تھی۔ یہ مہک میری کم زوری تھی، میں مسحور ہوا جا رہا تھا کیوں کہ مجھے بھی عطر اور دوسری تمام قسم کی خوشبوئیں حد درجہ پسند تھیں۔ وہ بالکل میرے قریب کھڑی تھی۔ ساڑھے پانچ فٹ قد اور اس پر اسمارٹ نس قیامت ڈھا رہی تھی۔ اگر اس نے برقع نہ پہنا ہوتا تو اس کے جسم و بدن کے نشیب و فراز آنکھوں میں روشنی پیدا کر دیتے، جب کہ اس کی سریلی آواز کا جادو ابھی تک کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ سیلز مین نے دس کلو مکس مٹھائی کو ڈبوں میں پیک کر کے شاپروں میں سلیقے سے رکھ دیا۔

''لیجیے آپ کی دس کلو مٹھائی تیار ہے۔'' سیلز مین نے دو ہزار روپے اس کو واپس کرتے ہوئے مٹھائی کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟'' میں نے اسٹول چھوڑتے ہوئے کہا۔

''بڑی مہربانی ہوگی۔ وہاں ذرا سی دور مین روڈ پر میری کار پارک ہے، بس وہاں تک آپ کو زحمت کرنا پڑے گی۔'' اس لڑکی نے مجھ سے نظریں ملا کر بات کی تو مجھ پر عجیب سا خمار چھانے لگا۔ خمار اس لیے نہیں کہ میں نے کسی لڑکی سے بات کی تھی بلکہ اس کی نشیلی آنکھوں میں کوئی بات تھی کہ انسان بن پیے ہی بہک جاتا ہوگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ دکان سے باہر نکل کر میرا انتظار کرنے لگی۔ میں نے مٹھائی کے ڈبوں والے شاپروں کو دونوں ہاتھوں میں لٹکایا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ایک بات تو مجھے مٹھائی کی دکان میں محسوس ہوگئی تھی جو واقعی حقیقت پر مبنی تھی..... وہ یہ کہ اس نے کوئی خوشبو اپنے لباس پر نہیں لگا رکھی تھی بلکہ وہ مہک اس کے بدن سے اُٹھ رہی تھی جو تمام خوشبوؤں سے زیادہ بھینی بھینی تھی۔ دوسری بات اب محسوس ہو رہی تھی جب وہ میرے آگے آگے چل رہی تھی کہ اس کی چال میں انتہائی مست کر دینے والی مستی شامل تھی۔ شاید اس بات کا اسے بھی اندازہ نہیں ہوگا کہ وہ جب چلتی ہے تو کسی مورنی کی طرح دکھتی ہے، اس کا انگ انگ نشیلا ہوگا۔ میرا اشتیاق اس سے بات کرنے کے بعد بڑھ چلا تھا کہ اس سے مزید باتیں کروں، اس سے دوستی ہو جائے اور ہم روز ملا کریں..... کچھ زندگی میں رنگینی پیدا ہو۔

''بس اس گاڑی کی پچھلی سیٹ پر مٹھائی رکھ دیجیے۔'' اس نے کار تک پہنچ کر کب اس کا دروازہ کھولا، مجھے پتا بھی نہ چلا۔ میں تو اس کے تصور میں اور اس کی چال میں اس قدر محو ہو گیا تھا کہ بس اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ کوئی دوسرا مجھے دیکھتا تو خیال کرتا کہ میں اپنے محبوب کے نقشِ قدم پر چلا جا رہا ہوں یا اس کے نقشِ قدم پر سجدے کر رہا ہوں۔ میں نے مٹھائی کار کی پچھلی سیٹ پر رکھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور کار میں جا بیٹھی۔ میں پتھر کا بت بنے، اس کے ہاتھوں کی رنگت کو تکے جا رہا تھا جو دودھ سے کہیں زیادہ سفید تھے اور یقیناً بالائی سے زیادہ نرم بھی ہوں گے۔

''آپ کون سی خوشبو استعمال کرتی ہیں۔؟ بہت ہی مسحور کن ہے۔'' میں نے اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے سوال کیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ واقعی یہ مصنوعی خوشبو نہیں بلکہ اس کے بدن کی مہک ہے۔

''اس کا جواب میں آپ کو دوسری ملاقات میں دوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس لڑکی نے کار اسٹارٹ کی اور مسکراتے ہوئے مجھے خدا حافظ کہہ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں سوچوں میں گم بادلِ نخواستہ اس مٹھائی کی دکان پر لوٹ آیا۔

''منے بھائی یہ آدھی رات کے بعد اس مٹھائی کا کیا کرے گی۔'' میں نے اپنی حیرت کو کم کرنے کے لیے منے بھائی سے سوال کیا۔

''ہو سکتا ہے ان کے گھر پر کوئی خوشی کی تقریب منعقد ہو رہی ہو اور اس میں ضرورت پڑ گئی ہو، اس لیے وہ مٹھائی خریدنے چلی آئی۔'' منے بھائی نے کچھ چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا ان کے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا..... ہر تقریب میں مرد لازمی شریک ہوتے ہیں۔'' میں نے متعجب لہجے میں پوچھا۔

''کیا مہمانوں سے کام کرانا اچھی بات ہے۔؟'' منے بھائی نے مختصراً مگر طنزیہ کہا تو میں خاموش ہو گیا۔

''چل رات کے دو بج رہے ہیں جا سو جا۔ باقی باتیں کل کریں گے۔'' منے بھائی نے میری آنکھوں میں نیند کے آثار دیکھ کر کہا۔

''نہیں منے بھائی! میں آج آپ سے جو معلومات کرنے آیا تھا وہ کر کے ہی جاؤں گا۔'' میں نے اس بار بڑے اصرار سے کہا تھا۔

''تو پوچھ کیا پوچھنا چاہتا ہے۔'' منے بھائی نے میرے قریب کرسی ڈالتے ہوئے کہا۔

''منے بھائی میں نے سنا ہے آپ لوگ رات گئے تک مٹھائی کی دکان اس لیے کھلی رکھتے ہیں کہ آپ سے رات کے وقت مٹھائی خریدنے کے لیے جن آتے ہیں۔ کیا اس بات میں صداقت ہے۔؟'' میں نے اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں فیڈ کیا ہوا پہلا سوال کیا۔

''ہاں ایسا ہے۔ میں نے بھی کئی بار محسوس کیا ہے کہ آدھی رات کے بعد آنے والا گاہک کوئی جن ہوتا ہے، کیوں کہ اتنی زیادہ مٹھائی کا ایک ساتھ خریدنا، کسی انسان کے بس کی بات نہیں اور نہ اس انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بار تو میری دکان پر دو فرد آئے، یہی کوئی

تین بج رہے ہوں گے اور مجھے ساری مٹھائی کا تخمینہ لگانے کا کہا۔ میں نے اندازاً دل میں تمام مٹھائیوں کا حساب لگایا تو بیس ہزار روپے کی بن رہی تھی، پھر بھی میں نے اس خیال سے تیس ہزار بتائے کہ سامنے موجود گاہک یا تو جن ہیں یا کوئی مال دار پارٹی ہے۔ تیس ہزار کا سن کر اس نے تمام مٹھائی خرید لی اور فوراً ادائیگی کر دی۔ میں نے پوچھا کیا مٹھائی کو ڈبوں میں پیک کر دوں..... تو انہوں نے جواب دیا، نہیں ہمارے بچے یہیں آنے والے ہیں، ہم نے اسی دکان کا انہیں پتا سمجھایا ہے۔ ہمارے بچوں میں سے ایک بچے کی سالگرہ ہے، لہٰذا ہم یہیں پر سیلی بریٹ کریں گے اور یہیں پر مٹھائی کھائیں گے۔ رات کے تین بجے مشکل ہے کوئی دوسرا گاہک آئے اور اگر آئے تو تم سچ بتا دینا کہ تمام مٹھائی فروخت ہو چکی ہے۔ اس طرح ہم اپنے بچے کی سالگرہ منانے کے دوران یہ تمام مٹھائی کھا جائیں گے۔ سودا طے ہوتے اور بات ختم ہوتے ہی ان کے بچوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر بچہ ایک سے بڑھ کر ایک تھا، ایسا کہ بس اسے گود میں دبوچ کر پیار کرنے کو جی چاہتا تھا۔ بہر حال میں نے تیس ہزار روپے الماری کی دراز میں ڈال کر دراز کو مقفل کر دیا اور خود باہر آ کھڑا ہو گیا تاکہ یہ لوگ اپنے بچے کی سالگرہ خوب خوشی سے منا سکیں اور میں باہر ہی کسی دوسرے گاہک کو روک سکوں۔ میں حیران تھا کہ فقط پندرہ منٹ میں ان دو افراد اور ان کے دس پندرہ بچوں نے تیس ہزار روپے کی مٹھائی کا صفایا کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک چم چم بھی نہ چھوڑی۔ ان کے جانے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہ انسان نہیں..... جن تھے۔ کیوں کہ کبھی بھی انسانوں نے اس طرح رات کے تین بجے آ کر اتنی مٹھائی خریدی اور نہ ہی اس قدر کھائی۔ صبح میں نے مالک کو تمام مٹھائی بکنے کی اور پندرہ ہزار منافع ہونے کی خوش خبری تو سنا دی مگر رات کو پیش آنے والا واقعہ ہرگز نہیں سنایا۔''

منے بھائی کی وضاحت کے دوران میری آنکھیں حیرت سے نہ صرف پھیل رہی تھیں بلکہ میرے جسم میں خواب کی لہریں سرایت بھی کر رہی تھیں۔

''تو کیا منے بھائی..... یہ لڑکی بھی جنوں میں سے تھی جو ابھی مٹھائی خرید کر لے گئی ہے۔؟'' میں نے اپنے تجسس کو بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ممکن ہے اس کا تعلق بھی جنوں کی نسل سے ہو، کیوں کہ میں نے اکثر نوٹ کیا ہے کہ جب یہ جن میری دکان میں داخل ہوتے ہیں تو اسی قسم کی معطر خوشبوؤں سے دکان کی فضا مہک اُٹھتی ہے جیسا کہ تم نے بھی محسوس کیا کہ اس لڑکی کے دکان میں داخل ہوتے ہی کس قدر بھینی بھینی خوشبوئیں فضا میں رچ بس گئی تھیں۔'' منے بھائی نے اس مہک کا تذکرہ کیا۔

''ہاں منے بھائی..... واقعی میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ یہ خوشبو عام نہیں ہے بلکہ اس کے بدن سے اُٹھ رہی ہے، ماحول کو مسحور کن بنا رہی ہے۔ تو کیا آج میں نے اپنی دیرینہ خواہش کو پورا کر لیا۔؟'' میں نے برجستہ کہا۔

''دیرینہ خواہش..... کون سی دیرینہ خواہش۔؟'' منے بھائی نے مجھے حیرت سے دیکھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں منے بھائی! میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں کسی جن یا جن زادی سے بات کروں، اس سے دوستی کروں، اس کے ساتھ سیر و تفریح کرتا پھروں اور اس کی طرح ہواؤں میں اُڑوں، اس کی طرح لوگوں کو ستاؤں، اس کی طرح طاقت آزماؤں اور دوسروں پر رعب جماؤں..... مگر.....'' میں نے افسردہ ہوتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''مگر..... مگر کیا۔'' منے بھائی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''مگر منے بھائی، ابھی تو میری ایک جن زادی سے فقط چند کلمات کی بات ہوئی ہے۔ میری باقی خواہشات تو اپنی جگہ ہیں۔ ہاں..... مگر.....'' اس بار میں خیالات میں کھو گیا تھا۔

''ہاں مگر کیا..... اوسلان، کہانیاں کیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بجھوا رہے ہو، بات پوری کیوں نہیں بتاتے۔'' منے بھائی نے مجھے خیالات کی دنیا سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔

''منے بھائی! وہ جاتے ہوئے دوسری ملاقات کی اُمید دِلا گئی ہے۔ میں نے اس سے پوچھ لیا تھا کہ وہ کون سی خوشبو استعمال کرتی ہے۔ اس نے جواباً مسکرا کر کہا تھا کہ دوسری ملاقات پر بتاؤں گی، لیکن.....'' میرا سانس ٹوٹ گیا تھا۔

''لیکن کیا ارسلان، تم نے پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔''

''لیکن منے بھائی مجھے کیا معلوم اس سے میری دوسری ملاقات کب، کہاں اور کیسے ہوگی، میں کب تک انتظار کروں اور تب تک دل کو دلاسا دوں۔'' میں نے منے بھائی سے ملتجی لہجے میں کہا۔

''چل اب تو دکان بند کرتے ہیں۔ کل اس سلسلے میں سوچیں گے اور ہاں تم مجھے بتانا کہ تم جنوں سے دوستی کرنا کیوں پسند کرتے ہو، اس کے پیچھے تمہارے مقاصد یا عزائم کیا ہیں۔ یہ سب سن کر ہی تمہاری مدد کی جاسکتی ہے۔'' منے بھائی نے دکان کا شٹر گراتے ہوئے کہا۔ تب مجھے پراگندہ ذہن کے ساتھ گھر لوٹنا پڑا۔

میں ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا مگر بے روزگار، لہٰذا جس رات دیر سے سوتا، صبح کیا..... دوپہر تک سوتا رہتا تھا۔ مگر جس رات جلدی سو جاتا، صبح وسویرے اُٹھ کر کوئی کام تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ کام نہ ملنے کی صورت میں مزدوری کرتا تھا اور شام کو تھکا ہارا چند سکے کما کر آجاتا تھا۔ آج بھی میں رات دیر سے سویا تھا، لہٰذا دن کے بارہ بجے تک سوتا رہا۔ میں اس شہر میں ملازمت کی غرض سے آبسا تھا جب کہ میرے والدین اپنے گاؤں ہی میں موجود تھے۔ میں ابھی تک ان کو پیسے بھی نہ بھیج سکا تھا۔ مجھے شرمندگی کا سامنا تھا کہ میرے والدین نے مجھے پڑھایا لکھایا، کسی قابل کیا مگر ملازمت یا کاروبار صرف پیسے سے ہوتا ہے جو میرے پاس نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ملازمت اگر سفارش سے ملتی تھی تو میرے پاس سفارش بھی نہیں تھی۔ میں گاؤں سے آیا تھا، میرا اس بھرے شہر میں کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ گاؤں دیہات کی آب وہوا غیر آلودہ اور خوراک یعنی کھانا پینا اچھا ہونے اور والدین کی محبت نے مجھے صحت مند وتوانا کر دیا تھا جس کی بدولت میں محنت مزدوری کر لیتا تھا۔ شام تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ رات ہوتے ہی منے بھائی کی دکان پر چلا گیا۔ مجھے بڑی بے تابی سے اس حسینہ سے دوسری ملاقات کا انتظار تھا۔ میری بے تابی میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا تھا جب میں نے سوچا تھا کہ وہ کوئی جن زادی ہے۔ کہتے ہیں خالی ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے، لہٰذا میں فرصت کے اوقات میں یہی سوچتا اور پلاننگ کرتا رہتا تھا کہ کسی جن سے دوستی کروں۔ دولت حاصل ہو اور خوب عیش و نشاط میں زندگی گزرے۔ والدین کی خدمت بھی کروں اور دوسرے غریب و نادار لوگوں کے کام آؤں اور فقیروں، مسکینوں اور بے سہارا لوگوں کا سہارا بھی بنوں۔

منا بھائی دکان پر موجود نہیں تھا۔ لہٰذا میں دکان کے اندر کھڑا اس کا انتظار کرنے لگا۔ بارہ بجے کے بعد کا وقت تھا۔ یکا یک اسی مہک سے میرا دماغ معطر ہونے لگا تو میں بے چین و مضطر ہوگیا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی مگر مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میری نظریں دکان سے باہر بھی بہت دور تک طواف کر آئی تھیں مگر مجھے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ یہ مہک وہی تھی جو اس دوشیزہ کے بدن سے اُٹھ رہی تھی مگر وہ ہے کہاں، یہ مہک اور اس کی یاد مجھے پاگل کیے دے رہی تھی۔ ذرا سی دیر اور گزرتی تو میں دیوانوں کی طرح چیخنے لگتا کہ اے مہک والی شہزادی! کہاں ہو تم، میری نظروں سے اوجھل رہ کر میرا امتحان کیوں لے رہی ہو، میرے تجسس میں اضافہ کیوں کر رہی ہو، میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے والا ہے، خدارا میرے سامنے آکر جلوہ دکھاؤ اور میری پیاسی نظروں کی پیاس بجھاؤ۔ مجھ پر یہ دورہ پڑنے ہی والا تھا کہ وہ دکان کی دوسری طرف سے مجھے آتی نظر آئی۔ میں بے اختیار اس کی طرف بڑھ جانا چاہتا تھا مگر یہ دیکھ کر میرے قدم رک گئے کہ وہ میری طرف ہی آرہی ہے۔ چند لمحوں میں

وہ دکان کے اندر اور میرے سامنے موجود تھی۔

''جی..... کیا آج بھی مٹھائی چاہیے..... دس کلو!'' میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں آج بھی دس کلو مٹھائی درکار ہے مگر.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''مگر کیا جی..... کوئی پریشانی والی بات ہے تو مجھے بتائیں، میں حاضر ہوں۔ آپ کی ہر طرح مدد کرنے کے لیے۔'' میں بلا سوچے سمجھے ہی بولتا چلا گیا۔

''مگر..... آج میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔'' اس نے اپنی مجبوری بتائی۔

''تو کیا ہوا، میں ہوں نا، آپ جتنی دور چاہیں گی، میں آپ کے ساتھ یہ مٹھائی لے کر چلنے کو تیار ہوں۔'' میں نے اپنی مردانگی ظاہر کرتے ہوئے اسے پیش کش کی۔

''میں آپ کی شکر گزار رہوں گی اور اس احسان کا بدلا موقع ملنے پر چکا دوں گی۔'' اس کے کھنکھناتے لہجے میں سچائی تھی۔ اس کے چہرے پر مختلف قسم کے تاثرات تھے۔ ان تاثرات کو فی الحال میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے دس کلو مٹھائی تول کر ڈبوں میں پیک کی اور ان ڈبوں کو شاپروں میں رکھ کر تیار کر دیا۔ اس نے مجھے پیسے دیے تو میں سوچنے لگا، ان پیسوں کو کہاں رکھوں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ منا بھائی سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔

''منے بھائی یہ دس کلو مٹھائی کے پیسے رکھے ہیں، میں ان کے ساتھ مٹھائی لے کر جا رہا ہوں۔ آج یہ اپنی گاڑی نہیں لائیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے یک زبان ساری باتیں منے بھائی سے کہہ دی تھیں اور مٹھائی کے شاپر اُٹھا کر چلنے لگا۔

''یہ تو کیا کر رہا ہے، ان کے ساتھ کیوں جا رہا ہے۔'' منے بھائی نے میرا راستہ روکتے ہوئے پوچھا۔

''منے بھائی پلیز۔'' میں نے اتنا کہا اور غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ ہم مین روڈ سے ہو کر ایک سروس روڈ پر آچکے تھے۔ آج بھی اس کی چال کسی ناگن سے کم نہیں تھی۔ وہ لہرا لہرا کر چل رہی تھی اور میں اس کی چال کی مستی میں مست ہو کر بے خود چلا جا رہا تھا۔ دس کلو کا وزن میرے دونوں ہاتھوں میں لٹک رہا تھا۔

''آپ گاڑی نہیں لائیں تو کیا..... ہم ٹیکسی میں چل سکتے ہیں۔؟'' میں نے وزن محسوس کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

''ہاں ایسا ممکن تھا مگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اگر تم تھک گئے ہو تو یہ شاپر مجھے دے دو میں کچھ دور اُٹھا لیتی ہوں۔'' اس نے بلا تکلف کہا تو مجھے اچھا نہیں لگا۔ ایک تو یہ کہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے، ورنہ وہ خود ٹیکسی یا رکشے میں سوار ہو جاتی۔ مجھے اپنی بات پر افسوس ہوا۔ کچھ دیر ہم خاموشی سے چلتے رہے، پھر مجھے یاد آیا۔

''آپ نے کون سی خوشبو لگا رکھی ہے۔؟ اس بات کا جواب دینے کے لیے آپ نے دوسری ملاقات پر وعدہ کیا تھا اور آج میری آپ سے دوسری ملاقات ہے۔''

''کیا کرو گے یہ بات جان کر، تمہیں افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ میں کچھ دیر تو ہکا بکا اس کی بات کے متعلق سوچتا رہا۔

''جی مجھے آپ کے بارے میں معلومات چاہیے، مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ میری زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ بے روزگاری، ناکامی، نامرادی اور حسرت و یاس کے سوا میرے پاس ہے ہی کیا، اگر میں آپ کے کسی کام آسکتا ہوں تو میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی۔'' میری بات سن کر وہ چلتے چلتے رک گئی۔

''کیا تم میرے کام آسکتے ہو، میری خاطر جان کی بازی لگا سکتے ہو۔؟'' اس نے متجسس نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں محترمہ!'' میں نے برجستہ کہا۔

''تم مجھے فی الحال شمیکا کہہ سکتے ہو۔'' اس نے اپنا پیارا اور منفرد نام بتایا تو میری جان میں جان آئی کہ وہ مجھ سے باتیں کرنے اور دوستی کرنے پر رضامند ہوگئی ہے۔ مجھے اپنی اندھیری زندگی میں امید کی ایک روشن کرن نظر آئی۔ اس کی بات نے مجھ میں جینے کا حوصلہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیدا کردیا۔

"شمیکا جی، اگر مناسب سمجھیں تو کہیں بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں، یوں سرِ راہ تو عجیب سا محسوس ہو رہا ہے اور اس طرح رواروی میں اہم بات کا اثر بھی زائل ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔" میں نے اسے مشورہ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے ہم کل ملتے ہیں اور کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" اس نے کھلی پیش کش کی تھی، مجھے میری امیدیں بر آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میری امنگیں انگڑائیاں لینے لگی تھیں۔ میرے ارمانوں پر جوانی چھانے لگی تھی۔

"جی ٹھیک ہے..... میں کل رات ایک بجے کے قریب آپ کو اس کیفے کے سامنے ملوں گا۔ مگر یہ مٹھائی۔" میں نے مٹھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے ٹیکسی میں سوار کرادو، میں گھر جا کر کرایہ ادا کردوں گی۔" میں نے ٹیکسی روک کر اسے سوار کردیا اور مٹھائی کے ڈبے بھی رکھ دیے اور وہ وہی مسکراہٹ میرے حوالے کر کے چلتی بنی۔ میں منے بھائی کی دکان پر جانے کے بجائے اپنے گھر لوٹ آیا۔ کیوں کہ آج مجھے جلد سونا تھا تاکہ میں صبح اُٹھ کر مزدوری کے لیے کام پر جا سکتا، کیوں کہ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ مزدوری ملتی تو اس کو کیفے میں کچھ کھلا پلا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں جلد سو گیا۔

ٹھیک سات بجے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے اس چوراہے کا رخ کیا جہاں پر بے روزگار یا نوجوان مزدوری کے لیے جمع ہوتے تھے اور ٹھیکے دار آ کر وہاں سے راج گیری کرنے والوں اور مزدوروں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ مجھے بھی ایک ٹھیکے دار اپنے ساتھ مزدوری پر لے گیا۔ سارا دن محنت مشقت کر کے تین سو روپے ہاتھ آئے، میں نے غنیمت جانا اور گھر پہنچ کر نہایا دھویا اور دھوبی سے کپڑے لا کر پہنے۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اندھیرا پورے شہر کو اپنے گھیرے میں لے رہا تھا۔ مجھے رات کا ایک پہر بھی کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں شمیکا جی کو جلد یعنی ابھی کیفے میں بلا سکتا تھا مگر میں نے سن رکھا تھا کہ جن اور بدروحیں رات بارہ بجے سے پہلے اپنی کمین گاہوں سے باہر نہیں نکلتی اور فجر کی اذان سن کر یا طلوعِ سحر کی روشنی سے پہلے روپوش ہو جاتی ہیں یعنی اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ جاتی ہیں۔ اس لیے میں نے شمیکا جی کو ایک بجے کا وقت دیا تھا۔ ابھی آٹھ بجے تھے اور میرے لیے ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ منے بھائی کی دکان پر وقت گزارا جائے تاکہ ان سے مزید معلومات حاصل کی جاسکیں۔ مگر میں نے اس خیال سے اپنا ارادہ ترک کردیا کہ منا بھائی مجھے ہرگز شمیکا سے ملنے جانے نہیں دے گا۔ کیوں کہ عام انسان بھی جن، بھوت پریت، چڑیل، پچھل پیری، عفریت، دیو اور بدروحوں سے دوستی کو کسی طور پسند نہیں کرتے، عام انسان تو ان کے سائے سے بھی بچتے ہیں۔ آسیب چیز ہی ایسی ہوتی ہے جس کی دوستی بھی خطرناک اور دشمنی بھی، مگر مجھے معلوم تھا میں ایسا کیوں کرنا چاہتا ہوں۔ میں وقت گزارنے کے لیے سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ پھر مجھے خیال آیا کیوں نا، نو سے بارہ بجے والا فلم شو دیکھ لیا جائے مگر پھر سوچا کہ میرے پاس پہلے ہی پیسے کم ہیں، خرچ کیے تو اور کم ہو جائیں گے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کیفے میں شمیکا کے سامنے ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔ لہٰذا میں ایسے آئیڈیے سے باز رہا۔ کافی دیر اِدھر اُدھر پھرتا رہا، جب گھڑی پر نظر پڑی تو بارہ بجے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں کیفے سے بہت دور نکل آیا تھا، لہٰذا میں نے اپنا رخ اسی کیفے کی طرف موڑ لیا، جہاں میں نے شمیکا کو وقت دیا تھا۔ میں وقت سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شمیکا وہاں پہلے سے موجود ہے اور بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر میری جانب بجلی کے کوندے کی طرح لپکی۔ میں بھی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اس کی طرف چل دیا۔

"شمیکا جی آپ..... مجھ سے پہلے ہی۔" میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں جلد پہنچ گئی تھی۔ تم نے اپنا نام نہیں

بتایا۔" اس بار اس کے لہجے میں نہ صرف نرماہٹ تھی بلکہ بے تکلفی بھی نمایاں تھی۔

"میرا نام ارسلان ہے۔"

"اچھا نام ہے۔ تمہارے نام میں "س" اور میرے نام میں "ش" ہے جو بالترتیب آتے ہیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"سرِ راہ باتیں کرنا مناسب نہیں، کیوں نا، اندر بیٹھ کر تسلی سے گفتگو کریں۔" شمیکا نے مسکراتے ہوئے مجھے یاد دلایا۔

"اوہ، سوری، میں تو بھول ہی گیا تھا۔ آیئے کیفے میں چلتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر تفصیل سے بات چیت ہو سکتی ہے۔"

میں نے شمیکا کو اشارہ کیا تو وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ ہم بالائی منزل پر بنے فیملی ہال میں جا پہنچے۔ اتفاق تھا کہ لوگ گنے چنے تھے۔ میں ایک کونے میں میز کی طرف بڑھ گیا۔ شمیکا بھی میرے ساتھ وہیں آ بیٹھی۔

"جی شمیکا جی، پلیز اپنے بارے میں ذرا تفصیل سے بتایئے تاکہ میں آپ کے کسی کام آسکوں۔" میں نے ہر کسی قسم کے خوف و خطر سے بے گانہ ہوتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں ایک جن زادی ہوں، میرا تعلق انسانوں سے نہیں ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ کو بھی مجھ پر شک ہو چلا تھا، جواب یقین میں بدل گیا ہوگا اور آپ ذہنی طور پر تیار ہو گئے ہوں گے کہ آپ مجھ سے ملنے آرہے ہیں۔"

میں اثبات میں گردن ہلاتا رہا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ شمیکا نے مجھے ہمہ تن گوش دیکھا تو پھر اس نے اپنے بارے میں تفصیل سے بتانا شروع کیا۔

"مسٹر ارسلان، میں جنوں کے جس قبیلے سے تعلق رکھتی ہوں اس قبیلے کے سردار نے میرے والدین کے پاس ایک ہیرا امانتاً رکھوایا تھا۔ وہ ہیرا میرے والدین سے کہیں گم ہو گیا ہے، جس کی پاداش میں اس جن سردار نے میرے بوڑھے والدین کو اپنی قید میں رکھا ہوا ہے اور مجھ سے میری ساری شکتیاں اور جناتی طاقتیں چھین لی ہیں۔ اب نہ تو میں انسانوں کی نظروں سے غائب ہو سکتی ہوں اور نہ ہی پلک جھپکتے میں کہیں آجا سکتی ہوں۔ کوئی طاقت یا زور آزمائی والا کام بھی نہیں کر سکتی ہوں۔ سردار نے کہا تھا کہ جب تک میرا ہیرا واپس نہ ہوگا، وہ میرے والدین کو اپنی قید ہی میں رکھے گا اور میری ساری جناتی طاقتیں سلب رکھے گا اور سزا کے طور پر مجھ سے مشقت والے کام بھی کراتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ہر روز سردار کے لیے دس کلو مٹھائی خرید کر پہنچانی پڑتی ہے۔ یہ ہے میری روداد، اگر میری جناتی طاقتیں بحال ہوتیں تو میں کچھ نہ کچھ کوشش کر کے ہیرے کو تلاش کرتی اور سردار کو ہیرا واپس کر کے اپنے بوڑھے والدین کو اس کی قید سے نجات دلاتی اور اپنی جناتی طاقتیں بحال کراتی۔"

شمیکا کی آواز رندھ گئی تھی، اس کے الفاظ ٹوٹ رہے تھے، اس کی چشمِ نرگس سے آنسوؤں کے موتیوں کی لڑی بہہ نکلی تھی۔

"شمیکا..... تم جن ہو یا انسان، مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ مجھے تم اور تمہارے والدین سے ہم دردی ہے۔ میں ہر چند کوشش کروں گا کہ سردار کو ہیرا نہ دے سکوں تو اس کو کسی شرط پر راضی کرلوں کہ وہ تمہارے بوڑھے والدین کو اپنی قید سے رہائی دے دے اور تمہاری جناتی طاقتیں نہ صرف بحال کردے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارا خیال دل سے نکال دے اور تم پر سے نگاہ اُٹھالے۔" میں شمیکا کو دلاسا دیتے ہوئے یقین دہانی کرانے لگا۔

"کیا تم مجھے اس جنوں کے سردار سے ملوا سکتی ہو، جس نے تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا ہوا ہے۔" میں نے ایک فیصلہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں، لیکن تم اس سے مل کر کیا کرو گے۔؟" شمیکا نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اوّل بات تو یہ ہے کہ مجھے جنوں کی دنیا دیکھنے کا موقع ملے گا اور ساتھ ہی جنوں کے سردار سے شرفِ ملاقات حاصل ہوگا۔ دوم یہ کہ ہوسکتا ہے کوئی حل نکل آئے یا سردار سے مل کر کوئی سبیل اسے منانے کی بن جائے یا اس سے گفتگو کر کے کوئی تدبیر سجھائی دے۔'' میں نے وضاحت کی تو شمیکا مجھے جنوں کے سردار سے ملوانے پر تیار ہوگئی۔

''کب چلو گے، مجھے دن اور وقت بتا دو، میں تمہیں ساتھ لے چلوں گی۔'' شمیکا نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دیتا، ویٹر آ گیا، میں نے دو چکن تکّہ، دو پراٹھے، دو سیخ بوٹی، دو سیخ کباب اور ایک ڈیڑھ لیٹر کولڈ ڈرنک کی بوتل لانے کا آڈر دے دیا۔

''آج ہی چلتے ہیں، کھانا کھانے کے بعد، کیا خیال ہے۔؟'' میں نے اس کی رائے معلوم کی۔

''جیسے تمہارے مرضی، مگر کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم میرے لیے یہ سب کچھ کیوں کرنا چاہتے ہو۔؟'' شمیکا نے عجلت میں دریافت کیا، کیوں کہ ویٹر آڈر بجالایا تھا۔

''شمیکا..... اس بھرے شہر میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میری زندگی بے کار بلکہ فضول سی گزر رہی ہے، تم مجھے پہلی ہی نظر میں بھلی لڑکی لگی، تم سے الفت پیدا ہوگئی۔ اب اگر تمہاری اپنائیت کے بدلے کچھ کرنا پڑ رہا ہے تو بھلا مجھے انکار کیوں ہوسکتا ہے۔'' میں نے لقمہ لیتے ہوئے بتایا۔

''کیا تمہارا بھری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔؟'' شمیکا نے دکھ بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''نہیں بھری دنیا میں تو میرے گاؤں میں میرے رشتے دار ہیں۔ میں نے اس بھرے شہر کی بات کی ہے کہ اس بھرے شہر میں میرا کوئی نہیں ہے۔ مگر اب تو یہ جملہ بھی غلط ثابت ہوگیا۔ اس گنجان آباد شہر میں تم ہو تو سہی جسے میں اپنا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے کن انکھیوں سے شمیکا کے چہرے کو دیکھا تو اس کا چہرہ حیا سے گلنار ہو رہا تھا۔ وہ سر جھکا کر کھانے میں مگن ہوگئی۔ کھانے سے فراغت کے بعد میں نے بل ادا کیا اور شمیکا سے کہا کہ مجھے اس سردار کے پاس لے چلے۔

''میں تمہیں ابھی نہیں ٹھیک پانچ دن کے بعد سردار کے پاس لے چلوں گی۔'' شمیکا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیوں..... پانچ دن تک آپ کو سردار کے لیے دس کلو مٹھائی خرید کر پہنچانا پڑے گی اور تمہارے والدین بھی قید میں رہیں گے۔؟'' میں نے کچھ نا سمجھتے ہوئے کہا۔

''میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی۔ بہتر ہے ہم ٹھیک پانچ دن بعد سردار سے ملیں۔'' شمیکا کے چہرے پر ایک اَن جانا سا خوف اُمڈ آیا تھا۔ میں نے بھی ضد نہیں کی اور ٹھیک پانچ دن بعد اسی جگہ ملنے کا وعدہ کر کے اور شمیکا سے سردار سے ملوانے کا وعدہ لے کر رخصت ہوگیا۔ میں آج بھی دور تک اس کی متوالی چال دیکھتا رہا تھا۔ آج تو جی بھر کر میں نے اس کے حسن کی دولت کو نظروں سے چرایا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ آج وہ برقعے میں ملبوس نہیں تھی۔ اس کا سڈول جسم میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کے حسن کی شعاعیں میری آنکھوں کو چکا چوند کرتی رہی تھیں۔ آج اس نے اپنے ریشم جیسے سیاہ، گھنے اور دراز بالوں کو جوڑے کی صورت میں گوندھا ہوا تھا مگر اس نے کئی بار اپنی چشمِ نرگس سے حسین پلکیں اُٹھا اُٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں انتہائی نشیلی تھیں، بلکہ اس کے پورے جسم میں شراب بھری تھی۔ وہ شراب کی وہ سربند بوتل تھی جسے ابھی تک کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اس قدر حسن کا خزانہ میرا ہونے والا تھا۔ ایک کنگال شخص کو ہیروں جڑا شخص ملنے والا تھا۔ مجھے خود پر رشک آ رہا تھا۔ میں اپنی قسمت پر فخر کرنے لگا کہ کل تک جو بے کار زندگی گزارتا رہا تھا، وہ چند دنوں میں ایک ایسی حسینہ کو پالے گا جس کے پاس حسن و جمال کے خزانے ہیں، خوب صورتی کی انتہا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے گداز بدن میں جو بن کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے۔ میں

انہیں حسین یادوں اور پانچ دن بعد اس سے ملاقات کو خوشی سے سرشار گھر لوٹ آیا۔

آج پہلا دن تھا۔ دن کے گیارہ بجے میری آنکھ کھلی تھی۔ صرف ناشتے کے پیسے بچے تھے۔ لہٰذا میں نے ناشتہ کیا اور روزی کمانے کی غرض سے نکل کھڑا ہوا۔ گھر سے ذرا دور مجھے ایک شخص ملا جس نے اپنا نام عبداللطیف بتایا تھا۔ اس نے مجھے مزدوری کرنے کو کہا۔ میں نے ہامی بھر لی۔ وہ مجھے اپنی کار میں بٹھا کر اس شہر کے مضافات میں لے گیا۔ جہاں ایک بڑی اونچی عمارت زیرِ تعمیر تھی۔ اس نے مجھے ایک بجری کا بڑا ڈھیر اور سیمنٹ کی بوریاں دکھائی جو مجھے اکیلے تیسری منزل پر لے جانا تھیں۔ عبداللطیف نے مجھے اس مزدوری کا ٹھیکہ دے دیا تھا، جس کا مختانہ ایک ہزار روپے بتایا۔ میں خوش ہوگیا۔ ایک ہزار روپے تو میرے پاس چار دن میں جمع ہوتے تھے۔ میں نے شام چھ بجے تک اپنی تمام تر ہمت اور حوصلہ جمع کر کے کام تمام کیا اور ایک ہزار روپے لے کر گھر لوٹ رہا تھا کہ مجھے شہر کے اس مضافاتی علاقے سے گزرتے ہوئے ایک گھر سے کسی بوڑھی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ اس بوڑھی عورت کی آواز میں اس قدر درد شامل تھا کہ مجھ سے کان دبا کر گزر نا نہیں گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دے ڈالی۔ دوسری دستک پر دروازہ کھلا تو ایک عمر رسیدہ خاتون اپنے دوپٹے کے آنچل میں آنسو صاف کرتی ہوئی باہر نکلی۔ میں نے پوچھا۔

''اماں جی کیوں رو رہی ہیں آپ۔؟ کیا دکھ ہے۔ کیا آپ مجھے مسئلہ بتائیں گی۔'' عمر رسیدہ عورت نے دروازہ پورا کھول دیا۔ سامنے چارپائی پر کسی کی میت رکھی تھی۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ اس کے جوان بیٹے کو کسی نے گولی مار دی ہے اور ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ وہ تجہیز و تکفین کا بندوبست کر سکیں۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ ایک تو اماں جی کو نوجوان بیٹے کے داغِ مفارقت دے جانے کا غم اور دوسرا ناداری کا دکھ۔ میں نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لمحے میں ایک ہزار روپے عمر رسیدہ عورت کو دے کر کہا۔

''اماں جی..... یہ رکھ لیں، آپ کے کام آئیں گے۔ بوڑھی عورت نے مجھے بہت دعائیں دیں۔ میں ایک اَن جانی سی مسرت لیے گھر لوٹ آیا۔

آج دوسرا دن تھا۔ کل دن بھر کی تھکاوٹ سے گہری نیند آئی تھی اور ضمیر کو سکون بھی ملا تھا۔ لہٰذا میں میٹھی نیند سوتا رہا۔ دیر سے جاگنے کے سبب کام پر بھی نہ جا سکا۔ ہوٹل والے سے اتنی تو جان پہچان تھی کہ وہ مجھ سے ایک دو وقت کی اُدھار کر لیا کرتا تھا۔ میں نے ناشتہ کیا اور ایک دو دن میں اُدھار چکانے کا وعدہ کر لیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے منا بھائی سے ملاقات کا سوچا۔ اس وقت وہ گھر پر ہوگا۔ لہٰذا میں نے منے بھائی کے گھر کا رخ کیا۔ منے بھائی کے گھر تک پہنچنے کے لیے ایک بہت بڑے میدان سے گزرنا پڑتا تھا، سو میں وہ میدان پار کرنے لگا۔ جیسے ہی میں میدان کے وسط میں آیا، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے کوئی گھیرے میں لینے والا ہو۔ میں نے ایک دم پلٹ کر دیکھا تو سات نوجوان مرد تھے جن کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ہاکیاں تھیں۔ پلک جھپکتے میں انہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے اپنا قصور معلوم کرتا، انہوں نے بلا سوچے سمجھے مجھ پر حملہ کر دیا۔ دو چار لاٹھیاں میرے جسم پر پڑی تو میرا لہو گرم ہوگیا اور مجھ میں بھی مردانگی جاگ اُٹھی۔ بڑی مشکل سے ایک ہاکی میرے ہاتھ آئی، جس سے ہاکی چھینی تھی سب سے پہلے اسی پر وار کیا تو وہ اس قدر بھرپور وار نہ سہ سکا اور اتنی زور سے چلایا کہ میدان گونج اُٹھا۔ اس کی اس حرکت سے اس کے ساتھی ہوشیار ہوگئے۔ اب تو جس کے ہاکی پڑتی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔ جب ساتوں ساتھیوں کے جسم ہاکی کے وار سے سوج گئے تو ان میں سے دو نے تیز دھار خنجر نکال لیے اور زخمی شیر کی طرح میری جانب بڑھے، یہ تو بھلا ہو ہاکی کا ڈیزائن بنانے والے کا کہ اس نے ہاکی اس طرح بنائی ہے کہ اس سے کسی کی گردن پکڑی جاسکتی ہے اور با آسانی کسی کے ہاتھ سے پستول یا خنجر چھڑایا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاسکتا ہے۔ میں نے بھی موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایسا ہی کیا۔ دونوں حملہ آوروں کے ہاتھوں سے خنجر گرادیے مگر ساتھ ہی ان کے ہاتھ کی ہڈیاں بھی ٹوٹ چکی تھیں۔ ان میں ایک جی دار دکھائی دیتا تھا مگر سب سے زیادہ بزدلی کا مظاہرہ بھی اسی نے کیا۔ سب ساتھیوں کو بے بس اور ناکام ہوتے دیکھا تو ریوالور نکال لیا اور ٹرائیگر پر انگلی کس لی۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرکے مجھے موت کے منہ میں دھکیل دیتا..... میں نے قریب کھڑے ہوئے اس کے ساتھی کو اپنی ڈھال بنا لیا۔ اس کے ساتھی کی گردن اپنے بازو سے اس قدر زور سے کسی کہ وہ کراہنے لگا اور اس نے اپنے ریوالور والے ساتھی سے خود ہی کہہ دیا کہ وہ ریوالور پھینک دے، ورنہ اس کی گردن ٹوٹ جائے گی۔ اس نے ریوالور پھینک دیا۔ میں نے انہیں بھاگ جانے کو بولا، وہ سب الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے اس کی گردن تو چھوڑ دی مگر مکا ہوا میں لہراتے ہوئے پوچھا کہ بتاؤ تم لوگوں کو مجھے مارنے کے لیے کس نے بھیجا ہے۔ اس نے بھاگتے ہوئے جواب دیا۔ مرجاؤں گا مگر یہ نہیں بتاؤں گا۔ بہرحال وہ سب بھاگ گئے تو میں منے بھائی کی طرف جانے کے بجائے گھر کی طرف لوٹ آیا۔ گھر کے قریب ایک پڑوسی نے بتایا کہ میری کمر سے خون بہہ رہا ہے۔ میں نے قمیض ہٹا کر اس پڑوسی کو دکھایا تو اس نے کہا کہ ایک زخم سا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تازہ چوٹ لگی ہے۔ لہٰذا وہ انسانی ہم دردی کے ناتے مجھے کچھ دور واقع کلینک پر لے گیا۔ پٹی کروائی، دوا دلوائی اور گھر چھوڑ گیا۔ میں نے تہہ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ دوا میں شاید نیند کی گولیاں بھی شامل تھیں۔ لہٰذا دوا کھا کر میں خواب نوشین کے مزے لینے لگا۔

آج تیسرا دن تھا حد ہوگئی تھی۔ دوپہر دو بجے میری آنکھ کھلی۔ ہاتھ منہ دھو کر سیدھا منے بھائی کی طرف چل دیا۔ منے بھائی نے لاکھ کریدا مگر میں نے شمیکا کی بات چیت کے متعلق یا اس سے گفتگو کے بارے میں ہوا تک نہیں لگنے دی۔ منے بھائی نے دن میں آنے کا مقصد دریافت کیا تو میں نے پانچ سو روپے اُدھار طلب کیے، جو انھوں نے ایک بار کہے میں ہی دے دیے۔ روپے لے کر میں نے کھانا کھایا۔ ہوٹل والے کا اُدھار ادا کیا اور شام ہوتے ہی اپنی من پسند فلم کا ۹ر سے ۱۲ر والا شو دیکھنے لگا۔ جہاں فلم بینی سے وقت پاس ہوجاتا ہے، وقتی تفریح مہیا ہوتی ہے، وہاں بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ میں بھی اس فلم سے بہت کچھ معلوماتی باتیں سیکھ کر آرہا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے ایک بجے کا وقت ہوگیا تھا۔ میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی دوا کھائی اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے لائٹ آف ہی کی تھی کہ دروازے پر کسی نے عجلت میں دستک دی یا یوں کہنا چاہیے کہ دروازہ پیٹ ڈالا۔ میں نے اچانک اس عمل پر حیرت کا اظہار کیا اور دروازہ کھول دیا۔ بڑی برق رفتاری سے ایک نوجوان دوشیزہ گھر کے اندر داخل ہوگئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ انتہائی گھبرائی ہوئی ہے، ورنہ وہ بغیر اجازت کے گھر میں داخل نہ ہوتی یا مجھے دھکیلنے کی گستاخی نہ کرتی۔

"چند نوجوان اوباش لڑکے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے چند لمحوں کے لیے پناہ دے دیں۔" اس دوشیزہ نے اندر آکر خود اپنے ہاتھوں سے کنڈی لگاتے ہوئے التجا کی۔

"آؤ..... یہاں بیٹھ جاؤ۔" میں نے راستے سے ہٹتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیا اور لائٹ جلا کر پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بے تکلفی سے پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنی سانسوں کو درست کرنے لگی۔

"کون لڑکے تھے اور تمہیں تنگ کیوں کر رہے تھے۔" میں نے کچھ دیر بعد اس سے سوال کیا۔

"میں انہیں نہیں جانتی۔ وہ گلی کے نکڑ پر بیٹھے شاید شراب نوشی کر رہے تھے، مجھے تنہا دیکھا تو میرے پیچھے ہولیے۔ ایک نے تو آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا، میں نے بہ مشکل اسے دھکا دے کر ہاتھ چھڑایا اور بھاگتے ہوئے یہاں تک آپہنچی۔"

وہ اپنی کہانی سنا کر اپنے اس ہاتھ کو سہلانے لگی

جس ہاتھ کو اس اوباش لڑکے نے پکڑا تھا۔ شاید ہاتھ پر نیل کا نشان پڑ گیا تھا۔ دو چار چوڑیاں ٹوٹنے سے کلائی بھی سرخی مائل ہوگئی تھی۔

"مگر تم اتنی رات کو گھر سے باہر کیوں نکلی تھیں۔" میں نے اپنی حیرت کو دور کرنے کے لیے پوچھا۔

"میری ماں بیمار ہے اور کوئی دوا لانے والا نہیں ہے۔ میں فارمیسی کی دکان تلاش کر رہی تھی کہ ان لڑکوں نے گھیر لیا۔" اس نے مزید وضاحت کی اور اپنے حالات بتائے۔ میں نے افسوس کیا اور اس کے لباس و بدن پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

"مگر تم اس شب خوابی کے لباس کو زیب تن کر کے گھر سے کیوں نکلی ہو۔؟" میں نے اس کے لباس پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ دوپٹہ نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ اتنا باریک لباس تھا کہ اس کا جسم شیشے کی طرح شفاف نظر آرہا تھا۔ وہ انتہائی چست جسامت کی مالک تھی مگر ڈھیلا ڈھالا لباس پہننے کی وجہ سے اس کے بدن کے نشیب و فراز زیادہ نمایاں نہ ہوسکے تھے مگر رات کی اس تاریکی، تنہائی اور اکیلے پن کی وجہ سے وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔

"جی ہاں! میں سونے کے لیے بستر پر جا چکی تھی، تب اماں کی طبیعت اچانک خراب ہوئی تو دوا ختم ہوچکی تھی۔ لہٰذا مجھے جلد بازی میں لباس تبدیل کرنے کا خیال تک نہ آیا۔"

اس بار بھی اس کی بات معقول تھی۔ میں حیران اس لیے تھا کہ اس کے چہرے پر اپنی عزت و آبرو لٹنے سے متعلق ذرا سا بھی خوف و ہراس نہیں تھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی شاید باکرہ بھی۔ اس کی عمر بہکنے والی تھی اور اس کے پاس حسن و جمال و شباب کا وہ خزانہ تھا جسے کسی بھی عمر کا شخص پیار سے، دھوکے سے یا زبردستی لوٹ سکتا تھا۔ مگر اسے ذرّہ برابر بھی پروا نہیں تھی۔ میں پریشان اس لیے تھا کہ کہیں اس دوشیزہ کو میرے گھر کے اندر آتے ہوئے کسی پڑوسی نے نہ دیکھ لیا ہو اور صبح نہ صرف محلے میں میری بے عزتی ہو بلکہ گھر بھی خالی کرنا پڑے، کیوں کہ اس محلے کے لوگ ایک تو چھڑے آدمی کو گھر کرائے پر نہیں دیتے تھے اور دیتے تھے تو ذرا شکایت ہونے پر خالی کرا لیتے تھے۔ گھروں کی کمی تو نہیں تھی مگر ذرا مشکل سے ملتے تھے اور پھر ایڈوانس کا مسئلہ اپنی جگہ رہتا تھا۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ کہیں وہی اوباش لڑکے کھوج لگا کر گھر پر دھاوا نہ بول دیں، اس طرح ہم گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے ہاتھوں پکڑے جانے پر گناہ گار تصور کیے جائیں گے۔

"ایسا کرو ابھی رات بہت زیادہ بیت چکی ہے اور ان اوباش لڑکوں کا خطرہ بھی ٹلا نہیں ہے، لہٰذا تم یہیں سو جاؤ۔ میں صبح ہونے پر تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔" جب مجھے کچھ نہ سوجھا تو میں نے اسے یہی مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے میں آپ کی شکر گزار رہوں گی۔"

شاید وہ اسی انتظار میں تھی۔ اشارہ پاتے ہی اس نے چارپائی پر پاؤں پھیلا دیے۔ میں اُٹھ کر صحن میں آگیا۔ میں نے اپنے گھر کی کھڑکی سے باہر گلی میں جھانک کر دیکھا تو وہاں دور دور تک کسی انسان کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اس لڑکی کو بتا دوں کہ وہ آرام و راحت سے سو جائے، باہر کوئی موجود نہیں ہے۔ میں یہ بتانے کے لیے کمرے میں آیا تو وہ بے سدھ سو رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ چند منٹ میں ہی نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ میں پلٹ کر کمرے سے باہر جانے لگا تو ایک نظر اس کے سراپے پر ڈالی۔ اس منظر نے تو میرے پاؤں جکڑ لیے تھے۔ جس طرح ایک سوتا ہوا بچہ زیادہ پیارا لگتا ہے..... اسی طرح وہ سوتے میں پہلے سے زیادہ سندر لگ رہی تھی۔ اس پر مجھے ٹوٹ کر پیار آنے لگا۔ واقعی عورت کے حسن کا جادو تمام جادوؤں سے سخت ہوتا ہے، تبھی تو بادشاہ، عورت کے قدموں میں اپنا تاج، شہزادہ اپنا تخت اور عاشق اپنا دل نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ سوتے میں اس کے انگ انگ سے جوبن چھلک رہا تھا، اس کے حسین و نرم اور گداز بدن کے نشیب و فراز نمایاں ہوگئے تھے جو مجھے نہ صرف دعوتِ گناہ دے رہے تھے بلکہ اپنی طرف ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زوردار کشش سے کھینچ بھی رہے تھے، جیسے کوئی ہائی پاور مقناطیس ایک لوہے کے ٹکڑے کو اپنی طرف آسانی سے کھینچ لیتا ہے اور لوہے کا ٹکرا بے بسی میں کھنچتا چلا جاتا ہے۔ واقعی اس کے نشیلے انگ انگ کا جادو میرے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اب مجھے سمجھ آیا کہ آج تک عورت کی خاطر فوجیں اور قومیں کیوں لڑتی آئی ہیں۔ وہ سوتے میں ایک ساحرہ لگ رہی تھی۔ اتنی کشش اس کی بیداری میں نہیں تھی جتنی عالم مدہوشی میں تھی۔ اس کے حسن و جمال نے مجھ پر یہ کیسا جادو کر دیا تھا کہ میں چاہتے ہوئے بھی کمرے سے باہر نہیں جا رہا تھا۔ میں جتنا پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتا...... اس کے گداز بدن کی کشش مجھے اتنا اس کے قریب ہونے کی دعوت دیتی۔ میں اسے خود سپردگی ہی کہوں گا، ورنہ کون اجنبی دوشیزہ اس طرح کسی غیر، نوجوان اور اجنبی کی پناہ میں آ کر بے فکری کی نیند سوتی ہے۔ کیا اسے اپنی عزت کھو دینے کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس دوشیزہ کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی کے کوئی آثار نہیں تھے بلکہ وہ تو ایسے سو رہی تھی جیسے اپنی خواب گاہ میں اطمینان اور سکون سے سوتی ہوگی اور وہ یہاں بھی خواب نوشین کے مزے لے رہی تھی۔ میں نے اپنے جذبات کو لگام دی اور نا چاہتے ہوئے بھی وہاں سے لوٹ آیا۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ میری آنکھوں میں بھی نیند کے آثار ہویدا ہو چلے تھے۔ لہٰذا میں نے باہر صحن میں زمین پر چادر بچھائی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ مجھے ایک دو نیند کے جھونکے آ گئے تھے۔ میں پوری طرح سو نہیں پایا تھا کہ مجھے چارپائی کے چرکنے کی آواز آئی۔ پہلے تو میں سمجھا شاید وہ کروٹ بدل رہی ہے مگر پھر میں نے قدموں کی آہٹ سنی تو میں نے جان بوجھ کر سونے کی اداکاری شروع کر دی۔ قدموں کی چاپ میرے نزدیک تر آتی گئی، یہاں تک کہ میرے منہ پر اس کے سانسوں کی گرم گرم لہریں محسوس ہونے لگیں۔ اس دوشیزہ کے سوتے وقت تو میں بڑی مشکل سے خود کو بچا کر لے آیا تھا مگر اب شاید اسی کافر ادا حسینہ سے ایمان بچانا مشکل ہو گیا۔ کیوں کہ پیاسا تو کنویں پر جا کر پیاسا ہی لوٹ آیا تھا مگر اب کیا کیا جائے، جب پیاسے کے پاس چل کر خود کنواں آ جائے۔ اس کی نرم و نازک انگلیاں میرے ہونٹوں پر حرکت کرنے لگیں تو ایک مدہوش کرنے والا لمس میری رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ میرے ہیجان کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم گناہوں کے سمندر میں ڈوب جاتے۔ میں نے اگلے لمحے میں اس کا ہاتھ پکڑ کر آنکھیں کھول دیں۔

''تم یہ کیا کر رہی ہو۔؟'' میں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں بڑی مشکل سے موقع نکال کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس گھر میں تم اکیلے رہتے ہو، نوجوان ہو، اسمارٹ ہو، خوبرو ہو اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے مضبوط بھی۔ میں نے کئی مہینوں تک دور دور رہ کر تمہیں تکا ہے۔ تمہاری دید سے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھائی ہے۔ اب تم میری چاہتوں کے دائرے میں مقید ہوئے تو مجھے ناکام لوٹ جانے کا کہتے ہو۔ نہیں آج میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کر کے رہوں گی۔'' اس نے اچانک مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''محترمہ! میں ایک شریف النفس انسان ہوں اور مجھے میری بیوی کے سوا کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔'' میں نے اپنا ارادہ پختہ کرتے ہوئے وضاحت کی۔

''اتنے بارعب اور شباب والے نوجوان کے سینے میں پتھر کا دل ہوگا...... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ موسم، تنہائی، موقع اور میرا جوبن بھی تمہیں میری طرف راغب نہ کر سکا۔ نہ جانے کتنے نوجوان میرے قدموں میں اپنا دل نکال کر رکھنے کے لیے تیار ہیں۔ میں ان سے آنے کا وعدہ کر لوں تو وہ میری راہ میں اپنی پلکیں بچھا دیں۔ میرے ایک اشارے پر وجیہہ سے وجیہہ شخص اپنی جان قربان کر دینے کو تیار ہو جائے مگر تم ایک پتھر ہو اور نا سمجھ بھی، جو موقع سے فائدہ اُٹھانا نہیں جانتا۔'' اس نے اپنی حسین جبین پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم انتہائی حسین و جمیل ہو، کافر ادا ہو، تمہارا حسن پوجنے کے لائق ہے، مگر میں گناہوں کی دلدل میں گرنا نہیں چاہتا۔ برائے مہربانی ایسے گناہ کے خیال کو دل سے نکال دو اور کسی نوجوان سے شادی کر کے اپنا گھر بساؤ تا کہ تم بھی گناہ گار نہ ہو سکو اور اپنے ساتھ کسی کو گناہ میں شریک بھی نہ کر سکو۔'' میں نے اسے نصیحت کی اور اُٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔

''مجھے جانا پڑے گا۔'' اس نے آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے عجلت میں کہا۔ پو پھٹنے والی تھی اور صبحِ کاذب ہونے کی تھی۔

''کچھ دیر اور ٹھہرو میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑنے جاؤں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''نہیں جب تم نے میرا کہا نہیں مانا تو میں بھی تمہارا کہا نہیں مانوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے اونچی ہیل کے سینڈل پہنے اور دروازہ کھول کر چلتی بنی۔ وہ اس قدر عجلت میں روانہ ہوئی تھی جیسے کہ کچھ دیر اور رکتی تو قیامت آ جاتی۔ نہ جانے آسمان پر ذرا سی سفیدی دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدل کیوں گئے تھے۔ اس کے دل و دماغ اور ذہن پر چھایا ہوا مستی کا خمار اچانک اُتر کیوں گیا تھا اور اس کی جگہ بے چینی اور اضطرابی نے کیوں لے لی تھی۔ اس نے الوداع کہنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ بس دروازہ کھول کر چلتی بنی، میں نے کسی خطرے کے پیشِ نظر باہر جھانکا تھا مگر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ بہرحال میں کنڈی لگا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

نہ جانے کب نیند نے تھپک کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ آنکھ کھلی تو وہی دوپہر کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے بستر چھوڑ کر ہاتھ منہ دھویا اور ناشتہ کرنے کے بعد آوارہ گردی کرتے ہوئے ایک پہاڑی علاقے کی طرف نکل آیا۔ پہاڑی پر ایک میمنا (بکری کا بچہ) چڑھ چکا تھا اور وہ نیچے اُترنے کے لیے شور مچا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا۔ میمنا بھی تو ایک بچہ ہے اور بچوں کو خطرات کا علم نہیں ہوتا۔ یہ میمنا کھیل کھیل میں اوپر تو چڑھ چکا تھا مگر نیچے اُترتے ہوئے اس کے پاؤں پھسل رہے تھے، جس سے اسے گرنے کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ شور مچا رہا تھا۔ اس کے ماں باپ یعنی بکری اور بکرے کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا کہ اس کی مدد کو آتے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں میمنے کو بچانے کے لیے پہاڑ پر اس کی جانب چڑھنے لگا۔ کافی اونچائی پر چڑھنا پڑا۔ میں اس کی جانب بڑھ رہا تھا، جب اس میمنے نے مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ اوپر چڑھ دوڑا۔ میں نے اسے بہلایا پھسلایا مگر وہ بہت کم عمر تھا۔ اوپر چڑھتا ہی گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اب وہ اس اونچے پہاڑ کے وسط میں پہنچ چکا تھا اور میں بھی تقریباً اس کے قریب ہی تھا۔

جیسے ہی میں نے اسے پکڑنے کے لیے اپنے ہاتھ دراز کیے اس میمنے نے اپنا قد بڑھانا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بکرے جتنا بڑا ہو گیا۔ ایک عجیب سا خوف میرے جسم میں لہو کو منجمد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں حیرت سے بت بنا اس میمنے کو دیکھتا رہا۔ اس نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کا قد مزید دراز ہونے لگا۔ اب اس نے ایک ہیبت ناک گدھے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ میں نے جان بچانے کے لیے پہاڑ سے نیچے کودنے کے خیال سے دیکھا تو میری جان نکل گئی۔ میں اس قدر اونچائی پر آ گیا تھا کہ نیچے چھلانگ لگانے کا مطلب اپنی ہڈیوں کا سرمہ بنوانا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے ہمت کی اور رفتہ رفتہ نیچے کی طرف قدم جمانے لگا۔ وہ شاید مجھ پر حملہ آور ہونا چاہ رہا تھا۔ اب تو اس نے ایک عجیب و غریب ہیئت کے جانور کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایسی بھیانک صورت میں نے زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ پھر حوصلہ کیا کہ کہیں میں اس لرزنے میں پہاڑ سے نیچے ہی نہ گر جاؤں اور بنا موت مارا جاؤں۔ لہٰذا میں نے اپنی رفتار کو تیز کر دیا۔ میں جس طرح احتیاط سے اوپر چڑھا تھا...... اسی احتیاط سے نیچے اُترنے لگا۔ یہ حقیقت ہے کہ پہاڑ پر یا ایسی جگہوں پر چڑھنے اور اُترنے کے لیے ترکیب و تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے جو میں نے اختیار کیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے تھا۔ جب اس بد ہیئت جانور نے مجھے اپنی پہنچ سے دور ہوتے دیکھا تو اس نے ایک دقیانوسی زمانے کے خوں خوار پرندے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اب وہ اُڑ کر مجھ پر حملہ آور ہوا، اس کا ایک پنجہ میری کمر پر لگا تو درد کی شدت سے میں کراہنے لگا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری کمر میں کسی نے ایک ساتھ پانچ چھریاں ماردی ہیں۔ شاید زخموں سے خون بہنے لگا تھا۔ ادھر دھوپ کی حدت اور درد کی شدت سے میرا بدن پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ اس بار اس نے دوبارہ حملہ کرنا چاہا مگر میں نے نیچے بیٹھ کر اپنا دفاع کیا۔ اس بار اس نے میرے منہ پر حملہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بچالیا تھا۔ میں مزید دفاعی کارروائی اس لیے نہیں کر سکتا تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ میں زیادہ اچھل کود کرنے کی کوشش کرتا تو پہاڑ سے نیچے گر کر موت کے منہ میں بھی جا سکتا تھا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں اس آسیب نما پرندے سے جنگ کرتا ہوا اور بدن پر زخموں کے وار سہتا ہوا نیچے اُترتا رہا۔ میں نے نوٹ کیا کہ میں جیسے جیسے زمین سے قریب ہوتا جا رہا ہوں، وہ ویسے ویسے حملہ تیز کرتا جا رہا ہے۔ اس بار وہ اپنے پنجوں میں کہیں سے ایک بہت لمبی اور موٹی لکڑی اُٹھا لایا تھا۔ شاید وہ اس سے مجھے کچوکے مار کر نیچے گرانا چاہتا تھا۔ شاید اللہ تعالیٰ کو میری جان بچانا تھی کہ جیسے ہی اس نے وہ درخت کا تنا میرے سر پر مارا تو میں نے لپک کر اس تنے کو پکڑ لیا۔ جب اس نے میری یہ حرکت دیکھی تو وہ تنے کو زور زور سے ہلانے اور جھٹکے دینے لگا۔ میں نے بڑی مضبوطی سے اس تنے کو تھاما ہوا تھا۔ وہ غصے میں مجھے گرانے کی کوشش کرتا ہوا اُڑتا رہا۔ شاید اسے خیال نہ رہا کہ وہ زمین سے قریب تر ہو گیا۔ جیسے ہی وہ ایک درخت کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا گزرا..... میں نے درخت پر چھلانگ لگا دی۔ یہ ایک گھنا اور سرسبز درخت تھا جس کی ہری بھری اور پتوں سے لدی شاخوں نے مجھے کسی قسم کی چوٹ نہیں لگنے دی۔ میں با آسانی درخت سے زمین پر اُتر گیا۔ تب میں نے اس پرندے کو لاکھ تلاش کیا مگر وہ نظر نہ آ سکا۔ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا وہ۔ اسے آسمان نے اُچک لیا تھا یا زمین نگل گئی تھی۔ بہر حال میں اس جگہ سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا کیوں کہ مجھے اپنے زخموں کا علاج بھی کرانا تھا اور زخموں کے آرام ہونے تک آرام بھی کرنا تھا۔ میں نے ایک قریبی اسپتال کا رخ کیا اور ایمرجنسی وارڈ میں جا کر ایک بیڈ پر لیٹ گیا۔ اسٹاف نرس نے میری شرٹ اُتار کر زخموں کو پائیوڈین سے دھویا اور پولی فیکس کے ساتھ دوسری کریم لگا کر مرہم پٹی کر دی۔ میں اسٹاف نرس اور ڈاکٹر کی فیس اور ان کا شکریہ ادا کر کے رخصت چاہ رہا تھا کہ ایک بوڑھی عورت کو بری طرح روتے پیٹتے دیکھا۔

"مائی جلد کرو، اپنے کسی رشتے دار کو بلاؤ تاکہ وہ تمہاری بیٹی کو خون دے اور اس کی جان بچائی جا سکے۔" آپریشن تھیٹر سے نکلنے والے شخص نے بڑی بی کو ہدایت کی۔

"ہائے بیٹا میں کس کو لاؤں، میرا تو اس بھری دنیا میں اس بچی کے سوا کوئی نہیں ہے اور وہ بچی بھی تمہارے میٹرنٹی ہوم میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔" یہ کہہ کر وہ عورت زور زور سے رونے لگی۔

"اماں کیا تمہارا داماد نہیں آیا۔ اس کو خون دینے کے لیے کہہ دو۔" میں نے بوڑھی عورت کا درد بٹانا چاہا۔

"ارے بیٹا..... یہ اسی کم بخت کی وجہ سے تو ہوا ہے۔ جب الٹراساؤنڈ کے ذریعے اسے پتا چلا کہ اس کے یہاں بیٹی پیدا ہو گی تو اس کم بخت نے نہ صرف اس زچگی کی حالت میں اسے مارا پیٹا بلکہ طلاق بھی دے گیا۔ اللہ پوچھے ایسے بدنصیبوں سے۔" اس بار اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"چلو اماں! میں تمہاری بیٹی کے لیے خون کا عطیہ دیتا ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔" میں نے اماں کو بازو سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"اللہ تیرا بھلا کرے..... بیٹا۔ تیری جوانی کو نظرِ بد سے بچائے۔ اللہ تیرے دل کی مرادیں پوری کرے۔"

وہ عورت مجھے ڈھیروں دعائیں دینے لگیں۔

میں بلڈ بینک تک اس کے ساتھ آیا۔ پھر میں نے اماں کو مزید دلاسا دے کر باہر ٹھہرنے کو کہا اور خود اندر چلا گیا۔

"آپریشن تھیٹر کے اس مریض کے لیے خون درکار ہے، میں حاضر ہوں۔" میں نے اس عورت کے مریض کے نام کی پرچی لیبارٹری ٹیکنیشن کو دیتے ہوئے کہا۔

"مگر اس مریضہ کے لیے تو دو بوتلیں خون درکار ہے۔" لیبارٹری ٹیکنیشن نے بتایا۔

"پلیز کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ آپ میرے جسم سے دو بوتلیں خون حاصل کر لیں۔" میں نے اپنا بازو پھیلاتے ہوئے گزارش کی۔

"دیکھیے مسٹر ہم ایسا کبھی نہیں کرتے، ایک انسان سے ایک وقت میں ایک ہی بوتل خون کشید کرتے ہیں۔ یہی ہمارا اصول ہے۔" لیبارٹری ٹیکنیشن نے وضاحت کی۔

"سر پلیز..... میں نوجوان ہوں۔ میری صحت اس قابل ہے کہ میں دو بوتلیں خون دے سکتا ہوں اور پھر میری پرورش ایک پُر فضا گاؤں میں ہوئی ہے جہاں کی خوراک خالص اور پانی زود ہضم ہوتا ہے اور آب و ہوا آلودگی سے پاک۔" میں نے دلائل دیئے اور ساتھ ہی بوڑھی عورت کے اکیلا ہونے کی خبر بھی دی اور مزید درخواست بھی کی۔ تبھی وہ مان گیا۔

"کیا تم نے کبھی کسی قسم کا نشہ کیا ہے۔؟" اس نے مجھے بیڈ پر لیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں، میں تو سگریٹ تک نہیں پیتا۔" میں نے اپنے چمک دار دانت دکھاتے ہوئے بتایا۔

"کیا کبھی تمہیں یا تمہارے والدین کو کوئی بیماری لاحق رہی ہے۔" اس نے ایک بلڈ بیگ اسٹینڈ پر لٹاتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں، کبھی کبھار ہلکی سی کھانسی کو ہم بیماری نہیں کہہ سکتے۔" میں نے وضاحت کی۔

"اس سے پہلے کب خون دیا تھا۔" اس نے میری کس میں ایک موٹے ناکے کی سرنج داخل کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی خون دینے کا تو یہ پہلا موقع ہے مگر خون کئی مرتبہ بہا ہے۔ آج بھی میری کمر پر دیکھو تو زخموں کے نشان ہوں گے۔" میں نے چند گھنٹے پہلے والا واقعہ یاد کرتے ہوئے بتایا۔

"یہ زخم تھوڑی ہیں، یہ تو دو چار معمولی خراشیں ہیں۔" اس نے میری کمر سے پٹی ہٹا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے دو بوتلیں خون دے کر قد آور آئینے میں اپنی کمر کو بہ مشکل دیکھا تو واقعی وہاں زخموں کی بجائے صرف چند خراشیں تھیں، وہ بھی آرام ہونے والی تھیں۔ اس واقعے نے بھی مجھے حیران کر دیا تھا۔ میں سیدھا اپنے گھر پہنچا اور سوچنے لگا کہ آج چار دن گزر گئے ہیں، کل پانچواں دن ہو گا۔ شمیکا اور جنوں کے سردار سے ملاقات کا دن۔ میں اسی سرشاری میں جلد سو گیا۔

رات جلد سونے کی وجہ سے صبح آنکھ بھی جلد کھل گئی تھی۔ میں نے حسبِ معمول ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کیا اور مزدوری کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ سارا دن محنت مزدوری کر کے تین سو روپے کمائے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر تھا کہ وہ رزقِ حلال عطا کر رہا تھا۔ میں ابھی شام کے وقت مزدوری کر کے گھر لوٹ رہا تھا کیوں کہ شمیکا اور جنوں کے سردار سے ملاقات کی تیاریاں بھی کرنا تھیں اور خود کو بنانا سنوارنا بھی تھا۔ میں نے جلد گھر پہنچنے کے لیے ایک راستے سے شارٹ کٹ لیا۔ یہ راستہ ایک ویران قبرستان سے ہوتا ہوا شہر میں داخل ہوتا تھا۔ میں جب قبرستان کے وسط میں پہنچا تو ایک بوڑھے شخص نے مجھے آواز دی جو لکڑہارا نظر آ رہا تھا اور اس کے قریب ایک بہت بڑا لکڑیوں کا گٹھا بندھا پڑا تھا۔

"ارے بیٹا..... مجھے صبح سے شام ہو گئی، اس قبرستان میں یہ لکڑیاں جمع کرتے ہوئے۔ اب جمع ہو گئی ہیں تو کوئی اُٹھا کر میرے گھر تک لے جانے کی ہاں نہیں کر رہا ہے۔ کیا تم مجھ پر مہربانی کر سکتے ہو۔؟"

مجھے شرمندگی محسوس ہوئی کہ ادھیڑ عمر شخص نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھ سے التجا کی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ خود میں نے اس کی مدد کرنے میں پہل کیوں نہ کی۔

"بابا جان آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔ بتایئے یہ لکڑیوں کا گٹھا کہاں لے کر جانا ہے۔"

میں نے لکڑیوں کا گٹھا بڑی مشکل اور زور آوری کے بعد اُٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ ان لکڑیوں میں وزن بہت زیادہ ہے۔ اگر میں نے چند مہینے مزدوری کی عادت نہ ڈالی ہوتی تو میرے لیے اس قدر بھاری گٹھا اُٹھانا مشکل ہی نہیں..... ناممکن بھی ہوتا۔

"بیٹا اس طرف لے چلو۔" بابا نے اپنے دائیں ہاتھ کی جانب اپنے عصے سے اشارہ کیا اور خود بھی آگے چلنے لگا۔ میں تھکن سے چور ہو چکا تھا۔ کیوں کہ مزدوری کر کے گھر لوٹ رہا تھا اور سر پر اس قدر بھاری لکڑیوں کا بوجھ اُٹھایا ہوا تھا۔ کافی دور چلنے کے بعد ایک جھونپڑی کے سامنے رک کر بزرگ نے کہا کہ بیٹا یہاں رکھ دو۔ میں نے لکڑیوں کا گٹھا وہیں رکھ دیا جہاں بابا نے اشارہ کیا تھا۔ بابا نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور وہ خود جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔ میں اتنی دیر میں اپنے پسینے خشک کرنے لگا جتنی دیر میں بابا اندر سے واپس آیا۔

"بیٹا میں حکیم ہوں۔ میرے پاس روپیہ پیسہ تو نہیں ہے کہ اس محنت کا معاوضہ ادا کروں، بہر حال یہ رکھ لو۔" بابا نے ایک چنے کے برابر موٹی گولی میری ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابا میں آپ کی خدمت کا محنتانہ وصول نہیں کروں گا۔" میں نے گولی بابا کو واپس کر دی اور چلنے لگا۔

"بہت خوددار اور باادب معلوم ہوتے ہو۔ اچھا ٹھیک ہے محنت کے عوض میں تم کو دعائیں دیتا ہوں کہ خدا تمہیں زندگی کے ہر مقصد و امتحان میں کامیاب و کامران کرے اور تحفے کے طور پر یہ گولی قبول کرو۔" بابا نے مسکراتے ہوئے گولی دوبارہ میرے ہاتھ میں تھما دی۔

"بابا یہ ہے کیا۔؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"بیٹا یہ ایک نایاب گولی ہے جو دنیا کے کسی ڈاکٹر، حکیم یا طبیب کے پاس نہیں ہے۔ یہ گولی اس شخص کو کھلائی جاتی ہے جس کی زندگی کو ڈاکٹر خدا حافظ کہہ چکے ہوں۔ حکیم اس کی بیماری سے عاجز آ چکے ہوں اور طبیب منہ موڑ چکے ہوں اور مسیحا چھوڑ کے جا چکے ہوں اور آخری سانس لیتے ہوئے مریض کو یہ نایاب گولی کھلا دی جائے تو اسے شفا نصیب ہو جاتی ہے، اگر اس کی قسمت میں موت نہ لکھی ہو، وہ معجزانہ طور پر صحت یاب ہو کر اپنی عامیانہ اور معمول کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔" بابا کی بات سن کر میری آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"لیکن بابا، آپ ایسی قیمتی شے مجھے کیوں دے رہے ہیں۔؟" میں نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔

"بیٹا یہ میرے پاس ایک نہیں اور گولیاں بھی ہیں۔ تم رکھ لو..... ہو سکتا ہے زندگی میں اس کی ضرورت پیش آ جائے۔ کوئی پڑوسی، عزیز و اقارب یا دوستوں میں سے کسی کی موت واقع ہونے والی ہو تو اس کو یہ گولی کھلائی جا سکتی ہے۔"

بابا نے گولی کی اہمیت کا احساس دلایا تو میں نے وہ گولی احتیاط سے جیب میں رکھ لی۔ مگر میں حیران تھا کہ کیا ایسی کوئی گولی بھی ہو سکتی ہے جو آخری سانس لینے والے شخص کو زندگی عطا کر دے۔ سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کی دوا اُتاری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوا قریب المرگ مریضوں کے لیے ہی ہو۔ میں ان سوچوں میں سرگرداں گھر پہنچ چکا تھا۔ ذرا دیر آرام کرنے کے بعد، نہایا دھویا اور شیو کرنے کے لیے باربر کی دکان پر چلا گیا۔ میں باربر کی دکان سے نکلا تو خود کو سجا سنورا پایا اور جسم کو بھی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ ایک خیال آتے ہی میرے قدم منے بھائی کی دکان کی طرف اُٹھ گئے۔

"منے بھائی، دو کلو اچھی سی مٹھائی پیک کر دو۔" میں نے منے بھائی کو سلام کرنے، ان سے مصافحہ کرنے اور معانقہ کرنے کے بعد کہا۔

"ارے یار ارسلان..... کیا تو بھی جنوں میں سے ہو گیا ہے جو آج جنوں کے بارے میں پوچھتے

ہیں..... مت پوچھو۔ چلو آؤ پہلے کھانا کھا لیتے ہیں، پھر جہاں تم چاہو گی، چلیں گے اور ہاں یہ مٹھائی تمہارے لیے میری طرف سے تحفہ ہے۔" میں نے اس کی طرف مٹھائی کا ڈبہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارسلان..... آج کھانا کیفے میں نہیں بلکہ گھر میں کھائیں گے۔" شمیکا نے اپنی آنکھوں میں آنے والی خوشی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب! میں سمجھا نہیں۔" میں نے ششدر ہو کر پوچھا۔

"ہاں آج تم میرے ساتھ پہلے میرے گھر چلو گے اور پھر جنوں کے سردار سے ملاقات کے لیے روانہ ہوں گے۔" اس بار تو شمیکا نے حد کر دی تھی۔ اس نے اپنا بازو میرے بازو میں حمائل کر دیا تھا۔ مجھے ایک عجیب و غریب خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں اس کا چہرہ، حسن و جمال اور سراپا دیکھنے میں اتنا مگن ہو گیا تھا کہ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ ہم کدھر کدھر اور کن کن راستوں سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی مگر پرانی حویلی تھی۔ دور سے اس حویلی پر ویرانے کا گمان ہوتا تھا۔ شمیکا خراماں خراماں چلتے ہوئے مجھے اس حویلی کے اندر لے گئی۔ شمیکا کے قدموں کی آہٹ پا کر حویلی کا مین گیٹ ایک دل دہلا دینے والی چرچراہٹ سے آٹومیٹک طور پر کھلا اور ہمارے اندر داخل ہوتے ہی آٹومیٹک طور پر اسی چرچراہٹ سے بند ہو گیا۔ میں نے بہ غور دیکھا کہ مین گیٹ کو کھولنے اور بند کرنے پر کوئی جن یا انسان مامور نہیں تھا۔ شمیکا مجھے ایک راہ داری سے لے کر آگے بڑھ رہی تھی۔ اس حویلی کے صحن میں ایک بڑا سا تالاب تھا جو خشک پڑا تھا۔ تالاب کے چاروں طرف گھاس کے پلاٹ تھے جو سوکھ چکے تھے۔ تالاب کے سامنے لال پکی اینٹوں سے بنے فرش تھے اور انہی لال اینٹوں سے یہ حویلی بنائی گئی تھی۔ اس حویلی کی عمارت تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی لگ رہی تھی۔ شمیکا نے اس کی بارہ دری جیسے کمروں میں سے ایک کمرے کا رخ کیا۔ اس کمرے کا دروازہ بھی خود بہ خود کھلا اور بند ہو گیا۔ جب ہم اس

"ہاں شمیکا..... یہ پانچ دن کیسے گزرے پوچھتے مٹھائی خرید رہا ہے۔" منے بھائی نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"بات کچھ ایسی ہے۔ میرا مطلب ہے، منے بھائی، میں کب تک اکیلا زندگی گزاروں گا۔ سوچا ہے، کیوں نہ شادی کر لوں۔ گھر بھی بس جائے گا اور مارا مارا بھی نہ پھروں گا اور یوں گھر میں بیوی کے ساتھ مگن رہوں گا، تمہیں ستانے کے لیے بھی نہیں آؤں گا۔ اس لیے آج ایک لڑکی سے ملاقات ہے۔ اس کو اس خوشی میں مٹھائی پیش کروں گا۔ دعا کرنا بات پکی ہو جائے۔" میں نے منے بھائی کو جھوٹی سچی بات بتائی۔

"ارے یار ارسلان..... مذاق چھوڑ، سچ بتا .....کیا بات ہے۔" منے بھائی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" منے بھائی نے کہا اور مٹھائی تول کر ڈبے میں پیک کر کے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ شاید اسے ابھی تک میری بات کا یقین نہیں آیا تھا اور حیران کن نظروں سے مجھے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں اسی کیفے کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا جہاں ہم نے چکن تکے کھائے تھے۔ جوں جوں گھڑی کی سوئیاں رات کے ایک بجے کی طرف سفر کر رہی تھی توں توں میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ کیوں کہ میں شمیکا سے ملنے والا تھا۔ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں۔ کیا یہی پیار ہے کہ ابھی تک ہم نے اظہارِ محبت بھی نہیں کیا اور میں اس کے لیے اس قدر بے چین و بے قرار ہوں۔ اس کی ایک جھلک کو ترس رہا ہوں۔ اس کو پانے کے اور اپنا بنانے کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ ایک خیال نے مجھے افسردہ کر دیا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ ایک جن زادی، آدم زاد سے بیاہ رچا سکے۔ میں سوچوں میں ڈوب گیا۔ مجھے اپنے کاندھے پر کسی نرم و نازک چیز کا احساس ہوا تو میں خیالوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔

"کیا تم میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔؟" شمیکا کی مترنم آواز نے مجھے سرشار کر دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے میں داخل ہو رہے تھے، تب نہ جانے کتنے مختلف قسم کے پرندے اُڑ اُڑ کر باہر چلے گئے تھے۔ اس حویلی کی دیواروں کو برسوں سے صاف نہیں کیا گیا تھا۔ دیواروں اور چھتوں پر بے شمار مکڑیوں کے جالے لٹک رہے تھے۔ جگہ جگہ سوکھے پتوں کا بکھراؤ نظر آ رہا تھا۔ اس حویلی کے سناٹے کو بھی انہی سوکھے پتوں کی سرسراہٹ توڑ رہی تھی۔ یہ پتے ہمارے پیروں کے نیچے آ کر چیخ رہے تھے کہ ہمیں ایک طرف کردو، ہمیں اذیت نہ دو۔ اس کمرے میں داخل ہو کر شمیکا نے قندیل روشن کی تو مجھے ایک میز نظر آئی جس پر کچھ مختلف قسم کے کھانے چن دیے گئے تھے اور کولڈ ڈرنکس بھی رکھی تھیں۔ شمیکا نے ایک کرسی مجھے پیش کی اور مٹھائی کا ڈبہ بھی میز پر رکھ دیا۔

''ارسلان..... آج مجھے تم سے مل کر خوشی محسوس ہو رہی ہے اور فخر بھی کہ میں نے اپنی دوستی اور مدد کے لیے ایک خدا ترس، شریف النفس، رحم دل، غریب پرور اور نڈر شخص کو چنا ہے۔'' شمیکا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری تعریف کی۔

''مگر شمیکا! ابھی تو ہم ایک ساتھ نہیں رہیں۔ ابھی سے تم نے یہ کیسے جان لیا کہ میں خدا ترس، شریف النفس، نڈر، رحم دل اور غریب پرور شخص ہوں۔'' میں نے کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''میں نے تمہیں پانچ دن کی مہلت دی تھی۔ کیا ان پانچ دنوں میں تمہارے ساتھ پانچ واقعات پیش نہیں آئے۔''

شمیکا نے میرے سامنے ماضی کے پانچ دن کھول کر رکھ دیے تھے۔

'لیکن تمہیں ان پانچ دنوں میں میرے ساتھ پیش آنے والے پانچ واقعات کا علم کیسے ہوا۔'' شمیکا کی ایک اور بات نے مجھے حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ سن کر وہ مسکرائی تو جیسے اندھیرے کمرے میں روشنی سی ہوگئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے تین تالیاں بجائیں تو حویلی کے سناٹے میں چھ قدموں کی چاپیں سنائی دینے لگیں۔ رفتہ رفتہ وہ آوازیں ہمارے نزدیک تر ہوتی گئیں۔ کچھ لوگ کمرے میں داخل ہوئے جو انسانی شکلوں اور حلیے میں تھے۔ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت کی شکل و صورت کچھ دیکھی بھالی لگی۔ ان میں سے ایک عورت آگے بڑھی اور اس نے چٹکی بجائی تو اس نے اس بوڑھی عورت کا روپ دھار لیا تھا جس کا نوجوان بیٹا گولی سے مر گیا تھا اور اس کے کفن دفن کے انتظام کے لیے عورت کے پاس پیسے نہیں تھے۔ میں نے اپنی محنت مزدوری سے حاصل ہونے والی رقم اس کو بیٹے کی تجہیز و تکفین کے لیے دے دی تھی۔

''کیا تم نے اس عورت کی مدد نہیں کی۔؟'' شمیکا نے سوال کیا۔

''ہاں میں نے اس کی مدد کی تھی۔'' میں نے برجستہ جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم ایک خدا ترس انسان ہو۔ ورنہ اس افراتفری کے دور میں کون کس کی مدد کرتا ہے۔ سبھی کو خود غرضی اور مطلب پرستی سے کام ہوتا ہے۔'' شمیکا نے دوسرے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ شخص اپنے چھ ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھا اور چٹکی بجاتے ہی وہ ساتوں آدمی بن گئے جنہوں نے ایک کھلے میدان میں مجھ پر حملہ کیا اور مار کھا کر بھاگ گئے تھے۔

''کیا تم نے ان سات مردوں کا جواں مردی سے مقابلہ نہیں کیا تھا۔''

''ہاں مقابلہ کیا تھا۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم ایک جواں مرد اور بہادر انسان بھی ہو۔'' یہ کہتے ہوئے شمیکا نے ایک خوب رو لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ اشارہ پا کر وہ خوب رو لڑکی آگے بڑھی اور پہلے والے اشخاص جا چکے تھے۔ خوب رو لڑکی نے چٹکی بجائی تو وہ وہی کافر ادا حسینہ بن گئی جو اوباش لڑکوں سے بچنے کے لیے میری پناہ میں آئی تھی۔

''کیا تم نے اس لڑکی کے ساتھ گناہ کا رہوتے سے خود کو نہیں بچایا تھا۔ جب کہ تمہارے پاس موقع تھا، تنہائی تھی، طاقت تھی، جوانی تھی، جوبن اور پھر خود سپردگی کی دعوت تھی۔؟''

''جی ہاں! میں نے زندگی بھر زنا نہیں کیا۔'' میں نے گردن جھکا کر جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم شریف النفس انسان بھی ہو۔''

شمیکا نے اس بار ایک مکروہ چہرے والے شخص کو اشارہ کیا تھا۔ اس مکروہ صورت والے شخص نے چٹکی بجائی تو وہ وہی خوں خوار پرندہ بن گیا جس نے پہلے میمنے اور پھر خوں خوار پرندے کا روپ دھار کر پہاڑ پر مجھ پر حملہ کیا تھا۔

''کیا تم اس مکروہ صورت اور خوف ناک پرندے سے شانت نہیں رہے تھے۔ کیا تم نے ایسے مشکل وقت میں ہمت نہیں ہاری تھی جس وقت ایک ذرا سی غلطی تمہاری جان لے سکتی تھی۔''

''جی میں نے خود کو اس کے حملوں سے بچایا تھا اور بہ حفاظت پہاڑ سے نیچے اُتر آیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم حوصلہ مند اور نڈر بھی ہو۔''

شمیکا نے آخر میں بچ جانے والی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس آخری عورت نے چٹکی بجائی تو وہ وہی بڑھیا بن گئی جو مجھے اسپتال میں ملی تھی اور جس کی بیٹی کو موت سے بچانے کے لیے میں نے دو خون کی بوتلیں دی تھیں۔

''کیا تم نے اس عورت کی مدد کرنے اور اس کی بیٹی کو موت کے منہ میں جانے سے بچانے کے لیے اپنا خون نہیں دیا تھا۔''

''ہاں شمیکا! میں نے ایسا ہی کیا تھا۔'' اس بار میں نے شمیکا کو سمجھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم رحم دل اور غریب پرور انسان بھی ہو۔ پھر بھی تم کہتے ہو کہ میں نے تمہاری تعریف کی ہے۔ ہاں تم تعریف کے لائق ہو۔ تم میں ایک اچھے انسان والی تمام صفات بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ ارسلان میں نے ان پانچ دنوں کی مہلت تمہیں آزمانے کے لیے دی تھی۔ تاکہ اطمینان کرلوں کہ میں نے اپنی دوستی کے لیے اور جنوں کے سردار سے نجات پانے اور اپنے والدین کو چھڑانے کے لیے کسی غلط یعنی عیاش، بزدل، ظالم اور لالچی شخص کا انتخاب تو نہیں کیا۔ تم میری آزمائشوں اور میرے معیار پر پورے اُترے ہو۔ لہٰذا آج سے ہماری دوستی پکی۔''

شمیکا نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے شہادت اور اس سے ملحق دو انگلیاں میری جانب بڑھا دیں۔ میں نے بھی اس کی انگلیوں کو تھام کر گہری دوستی برقرار رکھنے کا عہد کیا۔

''اب ہمیں جنوں کے سردار کے پاس کب چلنا ہے، تاکہ جلد از جلد تمہارے والدین کو اس ظالم کی قید سے نجات دلائی جاسکے اور تمہاری جناتی شکتیاں بھی حاصل کی جاسکیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے ہم کھانا کھالیں اور پھر آج ہی اس ظالم سے ملاقات کریں گے۔''

شمیکا نے کھانا شروع کرتے ہوئے بتایا۔ کھانا بہت مزے دار اور انتہائی لذیذ تھا۔ کھانا کھانے، کولڈ ڈرنک پینے کے بعد شمیکا نے مجھے اور میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مٹھائی کھلائی۔

''تیار ہو جاؤ..... اب ہمیں اپنی منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہونا ہے۔''

شمیکا نے کھانے سے فراغت کے بعد کہا۔

''میں ہر طرح تیار ہوں۔''

میں نے اپنی آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ میں کھانے کے دوران شمیکا کے بارے میں سوچتا رہا کہ اس کی جناتی شکتیاں چھن جانے کے باوجود اس نے مجھے پانچ آزمائشوں میں ڈالا اور نگاہ بھی رکھی۔ جناتی شکتیاں بحال ہونے کے بعد اس کی طاقت کا کیا عالم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگا۔ شمیکا نے تمام تر واقعات مجھے سنوا دیے تھے۔ مگر حکیم بابا والا واقعے کا اس نے ذکر نہیں کیا تھا۔ میرا خیال ہے اس واقعے میں شمیکا کا کوئی عمل دخل نہیں تھا، ورنہ ضرور اس کو اس واقعے کی خبر ہوتی اور وہ اس بابا کو بھی پیش کرتی یا کم از کم مجھ سے جان بچانے والی گولی کا ذکر ضرور کرتی۔ میں نے بھی شمیکا کو اس بابا والے واقعے یا گولی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ گولی کا خیال آتے ہے میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ نہ جانے میں نے وہ گولی تیار ہوتے ہوئے کہاں رکھ دی تھی۔ میں نے فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو محسوس ہوا کہ وہ گولی جیب میں موجود ہے۔ شمیکا نے بھی سرسری تیاری کی اور مجھے لے کر ایک ویرانے کی طرف روانہ ہوگئی۔

یہ ویرانہ ایک جنگل سے ہوتا ہوا صحرا کی طرف جا نکلے گا اور پھر وہاں سے نہ ختم ہونے والا پہاڑی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس پہاڑی سلسلے کے وسط میں جنوں کا سردار رہتا ہے..... جس کا نام قسطنطنیہ ہے۔ یہ بات مجھے شمیکا نے بتائی تھی۔

راستہ دشوار گزار ہو یا ہموار، آسان ہو یا مشکل یا پُرخطر، مجھے تو تمہارے ساتھ قسطنطنیہ کے پاس ہر حال میں جانا ہے۔ میں نے بھی وضاحت کر دی تھی۔ جنگل میں چلتے چلتے ہمیں ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ اب بہت گھنے اور خطرناک جنگل کا وہ حصہ شروع ہو چکا تھا جس میں جنگلی جانور چہل قدمی کرتے اور درندے اپنے شکاری کی تلاش میں دندناتے پھرتے ہیں۔ کچھ شیر، ریچھ اور چیتے تو ورزش کی غرض سے پھرتے رہتے ہوں گے۔ مجھے درختوں سے گرنے والے زرد پتوں کی ڈھیریاں نظر آ رہی تھیں۔ مگر ایک جانب سے اچانک ہمارے قدموں کے علاوہ بھی کوئی چاپ سنائی دی تو میں ٹھٹک گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی دبے پاؤں ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ سوکھے پتوں پر چلنے سے آواز پیدا ہوتی ہے جس سے معمولی سے جانور کی پیش قدمی کا پتا بھی چل جاتا ہے۔ میں نے ایک نظر شمیکا پر ڈالی تو وہ مجھ سے بے پروا ہو کر میرے بائیں طرف دیکھ رہی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ شاید کوئی خوں خوار درندہ ہے جو ہمیں نشانہ بنا کر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ میں بڑے محتاط انداز میں رک گیا تھا اور میرا ہاتھ خود بہ خود اپنے اس تیز دھار خنجر کی طرف اُٹھ گیا تھا جو میں نے اپنی حفاظت کے لیے ساتھ لیا تھا۔ آواز نزدیک سے نزدیک تر ہوتی جا رہی تھی۔ خوں خوار درندہ کسی بھی وقت ہم پر حملہ کر سکتا تھا۔ یہ درندے انسان کے جانی دشمن ہوتے ہیں اور انہیں انسان کا گوشت بڑا لذیذ اور مزے دار لگتا ہے۔ اسی لیے درندے انسان کا شکار بڑی مہارت سے کرتے ہیں اور پھر اپنے دوستوں کے ساتھ مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ شمیکا کیا کر رہی تھی، اس کا ردِعمل کیا تھا، مجھے اس قدر دیکھنے کی مہلت بھی نہیں تھی، کہیں وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو۔ اس کی طرف سے بھی کوئی آہٹ یا آواز نہیں آ رہی تھی، لگتا تھا کہ وہ بھی دم سادھے چپ چاپ کھڑی ہے لیکن شمیکا کو میری طرف پناہ لینے آنے کی بجائے میری مخالف سمت جانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ایک دم مجھ سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ میرے سامنے والی جھاڑیوں سے ایک چیتا نمودار ہو گیا تھا۔ میں نے ایکشن لیتے ہوئے اپنا وہ ہاتھ ہوا میں لہرایا جس میں تیز دھار خنجر تھاما ہوا تھا۔ ایک خوف میری رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا مگر بہت جلد میں نے محسوس کیا تھا کہ چیتا مجھے نہیں بلکہ میرے بائیں جانب کسی شے کو گھور رہا ہے۔ اور پینترے بدل رہا ہے مگر اس میں آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ چیتا ایک خوں خوار درندہ ہے، وہ کس چیز سے خوف کھا رہا ہے، ایسی کون سی چیز ہے جو اس سے زیادہ بھیانک اور خطرناک ہوگی۔ جب کافی دیر گزر گئی تو میرے کانوں سے شمیکا کی آواز ٹکرائی۔

''تمنو! تم کیوں آئے ہو۔؟''

شمیکا کا سوال سن کر میں نے جانا کہ شاید اس چیتے کا نام تمنو ہے جو شمیکا کا جاننے والا ہے، مگر دوسری آواز نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔

''شمیکا جی!..... مجھے معلوم ہے کہ آپ ایسی

صورت میں کسی کا احسان نہیں لینا چاہتی، جب کہ آپ کی جناتی طاقتیں سلب ہیں مگر میں آپ پر احسان نہیں کر رہا ہوں۔ میں اپنے قبیلے کی جانب سے ایک قبیلے کا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو..... نا، یہ گھنا جنگل خوں خوار درندوں اور جنگلی جانوروں سے بھرا پڑا ہے۔ ایسے میں نہ صرف آپ کی جان کو خطرہ ہے بلکہ ارسلان صاحب کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ ایسی صورت میں آپ اپنی اور ارسلان صاحب کی کیسے حفاظت کر سکتی ہیں اور ارسلان صاحب مانا کہ نوجوان، حوصلہ مند، باہمت اور ایک بہادر مرد ہیں مگر بے شمار جنگلی جانوروں سے ایک تنہا انسان کب تک لڑ سکتا ہے۔ جانور تازہ آتے جائیں گے اور یہ تھکاوٹ سے چور ہوتے جائیں گے۔ تب کیا ہوگا۔'' تمنو نے مودبانہ انداز میں کہا۔

''تمنو تم کیا چاہتے ہو۔؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی، ذرا کھل کر بات بتاؤ۔'' شمیکا نے کہا۔ تب میں نے آہستہ آہستہ نظریں گھما کر دیکھا تو ایک دراز قد شخص جو مضبوط جسم کا مالک تھا، شمیکا کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

''شمیکا جی میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری منزل تک میں تمہارا ساتھ دوں۔ میرا مطلب ہے کہ قسطنطنا تک پہنچانے میں میری خدمات حاصل کریں۔'' اس کی باتوں میں انکساری اور لہجے میں عاجزی اور گزارش شامل تھی۔

''ٹھیک ہے..... لیکن تم فقط ہمیں اس جنگل کے بعد اس لق و دق صحرا کے آخری سرے پر اُتار دینا، باقی ہم اس وادی اور پہاڑی علاقے تک سفر خود کریں گے جو قسطنطنیہ کی رہائش گاہ اور آبادی پر مشتمل ہے۔''

شمیکا نے بڑی مشکل سے اس کی بات مان لی تو اس کے چہرے پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ پر تولنے لگا۔ میں حیرت زدہ تھا کہ چیتا ابھی تک اسی حالت میں جوں کا توں کھڑا تھا۔ ایسے، جیسے کہ اس کے بنجوں کو زمین نے جکڑ لیا ہو۔ یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی۔ تمنو ایک جن تھا اور وہ قسطنطنیہ تک پہنچنے میں ہماری مدد کرنا چاہتا تھا مگر شمیکا کی خوددار طبیعت کے سامنے وہ بول نہیں پا رہا تھا اور چیتا بھی اسی واسطے اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا کہ اگر اس نے مجھ پر یا شمیکا پر حملہ کیا تو وہ جن اسے کچا چبا جائے گا۔ تمنو نے ایک گھوری دی تو چیتا دم دبا کر ایسا بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

''ارسلان تم اپنی آنکھیں بند کر لو اور اس وقت تک بند رکھنا جب تک میں چاہوں۔ جب ہم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے تو میں تمہیں آنکھیں کھولنے کی اجازت دے دوں گی اور ہاں ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہیں۔ تمنو ہمیں چند منٹوں میں سینکڑوں کلومیٹر کا فاصلہ طے کرا دے گا۔ تم میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لو۔'' شمیکا نے مجھے ہدایات دے کر اپنا ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے شمیکا کا ہاتھ بہت مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق مگر میں خود بھی اس کا ہاتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھامنا چاہتا تھا، سدا کے لیے، اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ جب کوئی انسان خوب صورت اور قیمتی لباس زیبِ تن کرتا ہے تو اپنے آپ کو ایک شہزادے کی طرح سمجھنے لگتا ہے اور وہ ہواؤں میں سفر کرتا ہے یا کوئی شخص نئی کار خرید کر پہلی بار اسے چلاتا ہے تو خود کو دنیا کا خوش نصیب اور خوش بخت انسان تصور کرتا ہے۔ وہ کار چلاتے وقت خود کو چاند پر اُڑتا محسوس کرتا ہے۔ وہ لباس کے قیمتی پن اور کار کی خوب صورتی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے خود کو قیمتی اور خوب صورت تصور کرتا ہے۔ یہ تصور اس میں ایک عجیب قسم کا غرور و تکبر پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت میری حالت بھی کچھ ایسی تھی۔ میں نے ایک ایسی حسین و جمیل دوشیزہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا جس کا حسن لاثانی تھا، جس کا جوبن لاجواب اور شباب بے مثال تھا۔ اس کی کالی، گھنی اور ریشمی زلفوں کے آگے گھٹائیں شرماتی تھیں اور اس کا چمکتا دمکتا چہرہ دیکھ کر چاند اپنا راستہ بھول جاتا تھا۔ وہ قدرت کا ایسا شاہکار تھی جس کے قدموں میں بادشاہ اپنا تخت، شہزادے اپنا تاج اور انسان اپنا دل نکال کر رکھ دینا چاہتے تھے۔ میں بھی شمیکا کے اس خوب صورت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور تراشیدہ پیکر کی ہمراہی میں خود کو ایک امیر کبیر شخص تصور کر رہا تھا۔ جیسے میں نے حسن کے خزانے کو پالیا ہے اور میں دنیا کا سب سے زیادہ رئیس آدمی بن گیا ہوں۔

میں نے شمیکا کا ایک حکم تو اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام کر مان لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا دوسرا حکم آنکھ بند کر کے مان لیتا میری آنکھوں نے ایک پُرتجسس منظر دیکھا تو میں ششدر رہ گیا۔ شمیکا نے ایک نظر گردن گھما کر میری طرف دیکھا تو مجھے دوسری جانب بڑے انہماک سے دیکھتے ہوئے پایا۔ ایک سایہ سا میرے سامنے والے درخت سے نکل کر دوسرے درخت کے پیچھے جاتے نظر آیا تھا۔ یہ میرا وہم نہیں تھا بلکہ کسی کے چلنے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ آواز اتنی تیز تھی کہ جیسے کوئی دوڑ رہا ہو۔ کیوں کہ جنگل میں خس و خاشاک، گھاس پھونس اور سوکھے ہوئے پتوں کا جگہ جگہ ڈھیر پڑا تھا اور یہ بات ہر شخص سمجھتا تھا کہ سوکھے پتوں پر کسی انسان کے قدم پڑتے ہیں تو وہ شور مچانے لگتے ہیں۔ جب خزاں رسیدہ پتوں پر چلنے سے آواز پیدا ہوتی ہے تو ان پر دوڑنے سے کتنا شور نہیں ہو رہا ہوگا۔ میں نے معذرت خواہ نگاہوں سے شمیکا کو دیکھا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ دوڑا۔ ٹیلے کی اونچائی اس قدر تھی کہ دور تک جنگل کا یہاں سے باآسانی نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اس طرف دیکھا جس طرف سے کسی کے دوڑنے کی مسلسل آواز آرہی تھی اور جس طرف وہ سایہ درخت کے آڑ میں ہو گیا تھا۔ درختوں کا جھنڈ ہونے کی وجہ سے وہ ٹھیک طور پر میری نظروں کی گرفت میں نہیں آرہا تھا۔ کیوں کہ کبھی وہ درختوں کی اوٹ میں ہو جاتا اور کبھی سامنے آکر چند قدم بھاگتا۔ ایک دم اس کی جسامت پر میری نظر پڑی تو میں ٹھٹک سا گیا۔ حیرت کا پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ کوئی سایہ نہیں تھا بلکہ ایک نوجوان اور کم سن لڑکی تھی جس نے آدھی آستینوں کی ٹی شرٹ اور جینز کی تنگ و چست پینٹ پہن رکھی تھی۔ وہ بدحواسی میں بھاگتے چلے جارہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ نہ جانے کون سا اَن جانا خوف تھا جو اسے بھاگنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ بار بار پلٹ کر دیکھتی اور پھر اپنی رفتار اور تیز کر دیتی۔ اب اس کی تیز رفتار کوشش کے باوجود سست پڑ چکی تھی اور اس کی چال میں لنگڑاہٹ بھی پیدا ہو گئی تھی جس نے اس کی رفتار کو کم کیا تھا۔ اس کا سبب بھی مجھے جاننے میں وقت نہیں لگا۔ وہ ننگے پاؤں دوڑ رہی تھی اس کے پیروں میں کوئی چپل یا سینڈل نہیں تھی۔ جب وہ چند ثانیوں کے لیے اپنی سانسیں درست کرنے کے لیے ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی تو اتفاق سے اس کا چہرہ میری طرف تھا۔ میں حیران رہ گیا تھا کہ وہ اس قدر حسین و جمیل اور خوب صورت تھی، کسی بھی مرد کو بہکا سکتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی ہرن جیسی آنکھوں میں شراب کا سا خمار بھرا ہوا تھا۔ ایک بار کوئی شخص اس کی آنکھوں میں جھانک لے تو مہینوں اس پر ان آنکھوں کا خمار چھایا رہے۔ اس کے نرم و نازک ہونٹ اتنی دور سے دیکھنے پر فقط ایک پنسل سے بنائی ہوئی باریک سی لکیریں نظر آرہے تھے۔ شاید میر تقی میر کے محبوب کے ہونٹ بھی ایسے ہی باریک، نازک اور دل کش ہوں گے۔ تبھی تو اس نے اپنے جذبات کا منظوم اظہار یوں کیا تھا۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس کی سیاہ، گھنی اور دراز زلفوں کو منہ زور ہواؤں نے بکھرا دیا تھا۔ اس نے پسینہ صاف کرنے کے لیے ان کھلی ہوئی زلفوں کو سر پر کیا تو اس کا حسین و جمیل اور تیکھے نقوش والا چہرہ چاند کی طرح روشنی بکھرانے لگا۔ اس کے گال سرخی مائل ہو رہے تھے۔ شاید بھاگنے کی وجہ سے لہو کی گردش تیز تھی اس لیے بھی گال سرخ ہو گئے ہوں گے یا پھر خوف اور ڈر کی وجہ سے بھی لال ہو سکتے تھے۔ اس کے جسم و بدن کے نشیب و فراز آدھی آستینوں کی ٹی شرٹ اور تنگ و چست پینٹ کی وجہ سے مزید نمایاں ہو گئے تھے۔ ٹی شرٹ میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا جس کا سبب اس کے سینے میں دل خطرے بھانپ کر زور زور سے دھڑک رہا ہوگا۔ اس کے گلے،

سر یا گردن میں کوئی اسکارف یا دوپٹا نہیں تھا۔ کوئی اسکارف نہ ہونا اور پیروں میں چپل یا سینڈل کا نہ ہونا، اس بات کا پکا ثبوت تھا کہ وہ بدمعاشوں سے اپنی عزت بچا کر بھاگ رہی ہے یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے عاشق کی چکنی چوپڑی باتوں میں آکر اس ویران اور سنسان جگہ پر آگئی ہوگی یا پھر کسی مرد کو اس تنہائی میں اس کے پُرکشش بدن نے اکسایا اور بھڑکایا ہوگا۔ کچھ دیر کے لیے میں بھی اس کا پُرجوبن بدن دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ اس سناٹے اور ویران جگہ پر اگر کسی نے اس کی جوانی سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے تو اس میں اس لڑکے یا مرد کا قصور نہیں ہوگا۔ اس ہیجان خیزی میں سراسر اور سو فی صد قصور اس لڑکی کے حسن و شباب اور مست جوانی کا ہوگا۔ عام انسان تو خطا کا پتلا ہے اگر اس موقعے پر کوئی زاہد اور پارسا بھی ہوتا تو وہ بہک سکتا تھا۔ شاید کسی خوف سے اس نے آنکھیں کھول دی تھیں اور وہ پھر بے تحاشا دوڑنے لگی تھی۔ اس کی اس بدحواسی اور بے وقوفی پر مجھے شک ہو چلا تھا۔ ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے دل میں لپکا۔ کہیں یہ لڑکی کسی کو قتل کرنے کے بعد تو فرار نہیں ہوئی ہے۔ کہیں اس کے پیچھے پولیس تو نہیں لگی ہے جس سے بچنے کے لیے یہ یوں دیوانہ وار دوڑی چلی جارہی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ حیرانی اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ اس طرف بھاگ رہی تھی جس طرف جنگل گھنا اور خطرناک ہوتا جاتا تھا۔ ابھی ابھی وہ چیتا بھی تمنو سے ڈر کر اسی جانب بھاگا تھا۔ وہ اس طرف کیوں بھاگ رہی ہے۔ اس طرف تو تمام کا تمام جنگل درندوں سے پُر ہے اور پھر اگر وہ قسمت اور اچھی تقدیر ہونے کی بنا پر جنگل پار بھی کر جاتی ہے تو اس کے آگے صحرا ہے جیسا کہ شمیکا نے بتایا تھا اور پھر اس صحرا کے بعد پہاڑی علاقہ تھا اور اس پہاڑی سلسلے کے بعد قسطنطنیہ جنوں کے سردار کا علاقہ شروع ہوتا تھا یعنی جنوں کی آبادی اس جگہ سے شروع ہوتی تھی۔ یہ لڑکی اس طرف تو بھاگتے بھاگتے تھکن سے چور ہو کر گر پڑے گی اور آسانی سے کسی درندے کا لقمہ

اسلم راہی ایم اے کی تحریر کردہ بہترین کتابیں

حضرت ابوبکر صدیقؓ
حضرت عمر فاروقؓ
حضرت عثمان غنیؓ
حضرت علیؓ
حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ
حضرت سعد بن ابی وقاصؓ
حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ
حضرت زبیر بن عوامؓ
حضرت سعید بن زیدؓ
خالد بن ولید
عمر بن عبدالعزیزؒ
حجاج بن یوسف
محمد بن قاسم
طارق بن زیاد
ہارون الرشید
مامون الرشید
رکن الدین بیبرس
سلطان ملک شاہ سلجوقی
سلطان الپ ارسلان

قیمت فی کتاب -/25 روپے

Ph:32773302

شیخ بک ایجنسی نوید اسکوائر اردو بازار کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بن جائے گی۔ اگر بالفرض ایسا نہ ہوا تو بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر جان دے دے گی مگر شہر جانے کا راستہ نہ پا سکے گی۔ ایسی بھی اس لڑکی سے کیا خطا ہو گئی ہے جو اس قدر خوف زدہ اور پریشان ہے۔ شاید اس کے پیچھے کوئی کالج کا لڑکا پڑا ہے جو اسے شادی کے عہد و پیماں کر کے سبز باغ دکھا کر اس ویرانے میں لے آیا ہوگا اور موقعے سے فائدہ اُٹھا کر اس کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا ہوگا مگر یہ اس سے اپنی عزت بچا کر بھاگنے میں کام یاب ہو گئی ہے۔ فی الحال اس کا رخ اسی سمت ہو گیا ہوگا اور یہ اَن جانے میں اسی سمت بھاگنے لگی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی شخص اس لڑکی کو قتل کرنا چاہتا ہوگا اور اس نے اس پر حملہ بھی کر دیا ہوگا، تبھی اس کے گلے میں کوئی کپڑا اور پیروں میں چپل یا سینڈل نہیں ہے۔ یہ عجلت میں اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑی ہوئی ہوگی۔ ایک تیسرا خیال بھی مجھے ستا رہا تھا..... وہ یہ کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی گروہ اس کو تاوان کے لیے اغوا کر کے یہاں لایا ہوگا۔ اس نے اس لڑکی کے گھر والوں سے اس کی رہائی کے عوض ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا ہوگا۔ مگر بعد میں اس گروہ کے سرغنہ کی نیت خراب ہو گئی ہوگی۔ اس قدر چھریرے اور متناسب بدن کی کم عمر لڑکی کو بے بس و لاچار اور مجبور پا کر وہ پہلے اس سے عیش و نشاط کے لمحات حاصل کرنا چاہ رہا ہو اور پھر اغوا کیے جانے کا تاوان۔ اس گروہ کے سرغنہ کے ذہن میں یہ خناس سما گیا ہوگا کہ لڑکی کے گھر والوں کو کیا پتا چلے گا کہ نہ صرف ان سے لڑکی کو رہائی دینے کے عوض رقم تاوان کی وصولی بھی کی جا رہی ہے اور لڑکی سے اس کی عزت بھی چھین لی گئی ہے۔ اگر اس لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے تو تاوان میں بہت بھاری رقم کا مطالبہ کیا گیا ہوگا۔ شاید پچاس لاکھ روپے مانگے ہوں گے کیوں کہ لڑکی اپنے لباس اور فیشن سے امیر گھرانے کی معلوم ہو رہی تھی۔ اب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ایک تصور نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں نے اس کی مدد نہ کی اور ٹھیک سمت میں راہ نمائی نہ کی تو یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راستہ بھٹک سکتی ہے اور اگر میں نے اسے اس جنگل میں اپنی پناہ میں نہیں لیا تو کوئی درندہ اس کو لقمہ تر سمجھ کر آسانی سے اپنی خوراک کا حصہ بنا سکتا ہے۔ یہ سوچتے ہی میں نے شمیکا کی بھی پروا نہیں کی کہ وہ کیا سوچے گی یا میرے بارے میں کیا سمجھے گی۔ مجھے شمیکا کا کوئی ڈر یا اس کی فکر نہیں تھی کیوں کہ وہ اپنی حفاظت آپ کرنا جانتی تھی۔ وہ کوئی کم زور انسان تھوڑی تھی۔ وہ تو ایک جن زادی تھی۔ ٹھیک ہے اس کی جناتی طاقتیں اور تمام تر شکتیاں سلب کر لی گئی تھیں مگر اس کے ساتھ ایک جن تمو بھی موجود تھا۔ میں نے حوصلہ کیا اور اس طرف دوڑنا شروع کر دیا جس طرف وہ لڑکی بھاگتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہاں درختوں کا ایک ایسا جھنڈ تھا جس نے ایک غار کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تین اطراف سے ان درختوں کی جڑوں، شاخوں اور پتوں نے سورج کی کرنوں کو بھی اندر داخل ہونے نہیں دیا تھا۔ شاید وہ لڑکی اس جگہ کو محفوظ پناہ گاہ سمجھ کر اس کے اندر داخل ہو گئی ہو کہ کئی گھنٹے یہاں گزار کر جب یہ یقین کر لیں کہ اب اس کا تعاقب کرنے والا کوئی نہیں رہا، تب وہ اس پناہ گاہ میں نکل کر دوبارہ شہر کی طرف بھاگ جائے اور اپنے گھر کی راہ لے۔ میں بھی بلا خوف و خطر ان درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا جہاں وہ لڑکی روپوش ہو چکی تھی۔ ایک لمحے کو میرے اندر کے انسان نے بھی مجھے لرزا دیا۔ مجھے خیال آیا، کہیں اس دوشیزہ کا بے مثال حسن اور لاجواب سراپا مجھے بھی بہکا نہ دے اور میں ایک طوفانِ بلا خیز میں بہ جاؤں۔ میں بھی انسان تھا اور جہاں دو مخالف جنس، اکیلے پن اور تنہائی میں یک جا ہوتے ہیں تو ان کے درمیان شیطان آ جاتا ہے جو ان کو نہ صرف گناہ کی ترغیب دیتا ہے بلکہ مواقع بھی فراہم کرتا ہے۔ وہ کچھ دیر تو ان کے ذہن میں بھول ڈال کر عیش و نشاط کی باتوں کی طرف مائل کر دیتا ہے اور انسان مرد ہو یا عورت اس کم زور لمحے کا دامن تھام لیتی ہے جو اسے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کہیں اس شوخ حسینہ کی منہ زور جوانی مجھے اپنی لپیٹ میں نہ لے

لے۔ کہیں اس کے جسم کا گداز مجھے انسان کے درجے سے نیچے نہ گرا دے، کہیں اس کے جسمانی نشیب و فراز کی مقناطیسی کشش نا چاہتے ہوئے بھی مجھے اپنی طرف کھینچ نہ لے۔ اگر یہ سب باتیں نہ بھی ہوئیں تو کہیں پناہ اور تحفظ دینے اور راہ نمائی کرنے کے عوض اس موقع پر وہ خود سپردگی ظاہر نہ کر دے۔ ایسی صورت میں میں اپنا آپ داغ دار ہونے سے کیسے بچا پاؤں گا۔

پھر میں نے دل ہی دل میں ایک آخری فیصلہ کیا۔ اگر یہ لڑکی بے گناہ ہوئی اور اس نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے تو میں نہ صرف پناہ دوں گا، تحفظ فراہم کروں گا بلکہ اس کی شہر کی جانب راہ نمائی بھی کروں گا اور اسے اس کے گھر تک چھوڑ کر آؤں گا اور اگر یہ کسی کو قتل کر کے، چوری کر کے یا کسی کو نقصان پہنچا کر بھاگی ہے تو پھر میں کیا کروں گا۔ اس بارے میں، میں خود بھی نہیں جانتا تھا اور نہ میں نے اس طرف سوچا تھا۔ پتوں میں ایک زبردست سرسراہٹ پا کر میں نے اس طرف قدم بڑھا دیے۔ میں بڑی احتیاط سے قدم اُٹھا رہا تھا۔ اتفاق سے چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میری اس پر نظر پڑ گئی۔ وہ ایک مضبوط شاخ کو تھام کر آنکھیں بند کیے کھڑی تھی۔ وہ بے ترتیب لباس میں ایسی بے حجاب لگ رہی تھی کہ زاہد بھی اپنی ریاضت داؤ پر لگا سکتا تھا۔ میں نے اس کے حسن کا جادو بہت قریب سے محسوس کیا تھا۔ میں اس کی محبت میں اسیر ہو سکتا تھا۔ اس کا شعلہ بدن اس قدر آنچ دے رہا تھا کہ کوئی پتھر دل بھی پگھل کر پانی پانی ہو سکتا تھا۔ اس کے سراپے اور حدت کے آگے گھٹنے ٹیک سکتا تھا اور ہاتھ جوڑ کر اس کا ہاتھ مانگ سکتا تھا بلکہ اس کے حسن و جمال کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو سکتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو رکھا۔ مجھے خوف لاحق ہو گیا کہ کہیں اچانک اس کی آنکھ کھلے اور غیر متوقع طور پر یہ مجھے اپنے سامنے پائے تو کہیں یہ مجھے اپنا وہ دشمن تصور نہ کرے جس سے بچ کر بھاگ رہی تھی۔ میں نے اپنی موجودگی ظاہر کرنا بہتر سمجھی۔ ایک جست میں اس کے قریب ہو کر اس کی کلائی پکڑ کر پوچھا۔

"کون ہو تم۔؟ اور یہاں کیوں بھاگ کر آئی ہو۔؟"

"تم کون ہوتے ہو میرا اس طرح تعاقب کرنے والے اور مجھے بے بس کر کے پوچھنے والے۔؟" اس نے جواب دینے کی بجائے مجھ ہی سے سوال کر دیا۔

"چھوڑو مجھے جانے دو۔" اس نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی مجھ سے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے۔ مگر میں نے اس کی کلائی پر گرفت اور مضبوط کر دی۔

"سنو بے وقوف لڑکی۔" مجھے اپنا ہم درد سمجھو، دشمن نہیں۔" میں نے اسے اپنے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو تمہیں قتل کرنا چاہتے تھے یا تمہاری عزت لوٹنا، میں نے تو تمہیں دور سے بدحواسی میں اور ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے دیکھا تھا، میں تو تمہاری پریشانی دور کرنے کے لیے تمہاری مدد کو آیا ہوں۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی کلائی چھڑوانے کے لیے زور لگایا مگر بے سود رہا۔ اس بار اس نے پینترا بدلا اور میرے بازو پر تیزی سے جھک گئی تاکہ اپنے تیز دھار دانتوں سے کاٹ کھائے۔ مگر میں نے برق رفتاری سے اس کے ہاتھ کو موڑ کر پیچھے کر دیا۔

"یہ کون سا طریقہ ہے..... مدد کرنا کا۔" وہ درد سے کراہ اُٹھی۔ "میرا ہاتھ چھوڑ دو، مجھے درد محسوس ہو رہا ہے۔ تم نے تو اتنی زور سے میرا ہاتھ موڑا ہے کہ وہ ٹوٹ ہی جائے۔" واقعی اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

"وعدہ کرو کہ تم بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گی، میں تمہارا ہاتھ چھوڑ دیتا ہوں اور مجھے اپنا دوست مان کر پوری بات بھی بتا دو گی۔" میں نے اس کے ہاتھ کا بل سیدھا کیا اور کلائی پر گرفت ہلکی کرتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے میں نہیں بھاگوں گی اور آپ کو بات بھی بتاؤں گی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تو اس کی ریشمی زلفیں بھی لہرانے لگیں۔ میں بھی اس کا ہاتھ جلد اس لیے چھوڑ دینا چاہتا تھا کہ وہ ہاتھ موڑنے سے میرے قریب تر آ گئی تھی۔ یہاں تک اس کا بے حجاب بدن میرے جسم سے ٹکرا رہا تھا۔ اس کے بدن کی آنچ سے میرے اندر کا مرد گرما رہا تھا۔ کہیں اس کے حسن کی حدت سے میں پگھل نہ جاؤں اور دوسری بات یہ تھی کہ اس کا ہاتھ مروڑنے سے اس کے بدن کے فراز مزید نمایاں ہو گئے تھے جو اس ویران اور سنسان جگہ پر مجھے ورغلانے کے لیے ہیجان خیزی پیدا کر رہے تھے۔ میں نے دھیان دوسری جانب کرتے ہوئے اندازے سے کہا۔

"تو پھر وہ تمہیں اغوا کر کے یہاں لائے ہوں گے اور تاوان میں تمہارے والدین سے بھاری رقم کا مطالبہ کر رہے ہوں گے۔" میں نے اپنا اندازہ بیان کیا جو غلط نکلا۔

"نہیں..... ان میں سے کوئی مجھے اغوا کر کے نہیں لایا تھا۔" اس نے اس بار بھی جواب مختصر دیا تھا۔

"تو پھر یقیناً پولیس کا چکر ہوگا۔ تم کسی کو قتل کر کے بھاگ رہی ہوگی کہ پولیس نے دیکھ لیا ہوگا اور تم اس طرف آ نکلیں۔" میں نے ایک اور تیر پھینکا۔

"نہیں..... کیا میں تمہیں کوئی چور، ڈاکو، قاتل اور ایسی ویسی لڑکی نظر آتی ہوں۔" اس نے غصے سے کہا۔

"سنو لڑکی۔" میں نے مزید اسے کریدنے کے لیے کہا۔

"میرا نام اپسرا ہے..... مجھے بار بار لڑکی مت کہو۔" اس نے درمیان سے میری بات کاٹتے ہوئے بتایا۔

"میں تو اس عامل کے پاس آئی تھی جس نے میرے محبوب پر گنڈا تعویذ کر کے اسے میرے خلاف کر دیا ہے۔ اس کی عملیات نے نہ صرف میری رومانی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا ہے بلکہ میری ہنستی بستی دنیا کو اُجاڑ کے رکھ دیا ہے۔" اپسرا کی بات سن کر میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔

"لیکن اس نے تمہارے محبوب کو تعویذ، گنڈوں اور عملیات کی مدد سے تمہارے خلاف کیوں کر دیا ہے۔ کیا وہ خود تم سے جان چھڑانے کے لیے اس عامل کے پاس گیا تھا۔؟" میں نے اپسرا سے مزید سچ اگلواتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ایک دوسری لڑکی میری سوتن کا کردار ادا کر رہی ہے۔ اس کے کہنے اور عامل کی مٹھی گرم کرنے پر اس نے ایسا کیا ہے۔" اپسرا نے وضاحت کی۔

"وہ سوتن کا کردار ادا کرنے والی کیا چاہتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"وہ چاہتی ہے کہ میرے محبوب کو مجھ سے بدظن کر دے۔ وہ مجھے اس سے دور کر کے خود اس کے پہلو میں آنا چاہتی ہے۔ وہ مجھ سے میرا محبوب چھیننا چاہتی ہے تاکہ ایسے اسمارٹ، خوب صورت، دراز قد اور وجیہ شخص کے ساتھ رنگ رلیاں منا سکے۔" اپسرا کے چہرے پر پریشانی چھا گئی تھی۔

"کیا تم نے اپنے محبوب سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔" میں نے بات کو اور آگے بڑھایا۔

"ہاں..... وہ تو میرا غلام بننے کو تیار ہے۔ وہ تو دنیا مجھ پر وار دینا چاہتا ہے۔ اس نے کبھی میری کوئی بات نہیں ٹالی۔ جیسا کہتی ہوں ویسا کرتا ہے۔ وہ مجھ پر دل و جان سے فریفتہ ہے اور میرے پیار میں ہر چیز ایثار کرنے کو تیار ہے۔ مگر جب میں نے بے رخی کی شکایت کی تو اس نے کہا۔

"میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا۔ کوئی ماورائی قوت مجھ سے کرا رہی ہے۔ کوئی غیر مرئی مخلوق نا چاہتے ہوئے بھی مجھے تم سے دور لے جاتی ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں تو ہمیشہ کی طرح تمہیں اپنے روبرو رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے۔" اب اپسرا کے چہرے پر کسی بھی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔

"ظاہر ہے ایسے ملنسار، فرماں بردار اور جورو

کے غلام شخص کو کون ہے جو پسند نہیں کرتا ہوگا۔ ایسے مردوں پر تو عورتیں اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ ان کے لیے اپنا گھر بار اور ماں باپ جیسی ہستیوں کو ٹھوکر مار کر چلی جاتی ہیں۔"

"اسی لیے نہ تو تم اسے کھونا چاہتی ہو اور نہ وہ۔ چلو یہ بتاؤ تم نے عامل سے کیا کہا۔" میں مطلب کی طرف آیا۔

"میں نے اس سے کہا کہ وہ نشو کی دولت کے لالچ کو دل سے نکال دے اور اس کے محبوب کا پیچھا چھوڑ دے۔ پہلے تو وہ کسی بھی قیمت پر مان نہیں رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ نشو نے اسے دولت، اس کی اُمید سے سوا دی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک معمولی کام کرنے سے اس قدر دولت ہاتھ آ سکتی ہے۔ اس پر دولت کی بھوک سوار ہے۔ وہ دولت کو ایمان سمجھتا ہے اور اسے ہر حالت میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شاید دولت کا حصول ہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔"

اپسرا نے عامل کی نیت اور کردار کے بارے میں سچ بتایا تھا۔ دراصل یہ لوگ واقعی دولت کے پجاری ہوتے ہیں۔ دولت کی خاطر ایمان بھی بیچ دیتے ہیں۔ دولت کے حصول کے لیے ہر قبیح اور برا فعل کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

"ٹھیک ہے..... میں اس عامل کو نشو سے بھی زیادہ دولت دوں گا تاکہ وہ تمہارے محبوب کا پیچھا چھوڑ دے اور تم پھر پہلے جیسی پُرسکون اور رومانیت سے بھرپور زندگی گزار سکو۔" میں نے کہا تو اس کی آنکھوں میں چمک کی بجائے حیرت تھی۔

"میں تمہارے لیے ایک اجنبی اور اَن جان سی لڑکی ہوں، ابھی ہماری ملاقات کو ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا ہے۔ پھر تم کس لالچ میں اتنی بڑی رقم میرے لیے خرچ کر سکتے ہو۔" اپسرا نے بڑی حیرت سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"میری نظر میں دراصل انسانیت ہی سب کچھ ہے اور میں یہ مدد بھی انسانیت کے ناتے کر رہا ہوں۔ اس میں میرا کوئی لالچ نہیں ہے۔" میں نے ہر جذبے سے عاری ہو کر کہا۔

"اگر تمہاری وجہ سے میرا محبوب دوبارہ میرا ہو گیا تو میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔" اس نے بڑی ممنویت سے کہا تھا۔

"اس میں احسان والی کوئی بات نہیں ہے۔ بس یہ سمجھ لو ایک انسان دوسرے انسان کی مدد کر رہا ہے۔ ایک ظالم کی بری عملیات سے مظلوم کو چھڑانے کے لیے دولت خرچ کر رہا ہے۔ اس میں احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر....."

میں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ کیوں کہ اس وقت تو میں ایک مشن پر روانہ ہونے جا رہا تھا۔ قسطنطنا سے شمیکا کی جناتی طاقتیں واپس لینے اور شمیکا کے بوڑھے والدین کو اس کی قید سے نجات دلانے۔ اس وقت تو میں خود تہی دامن تھا۔

"مگر..... کیا۔" اپسرا نے حیرانی سے پوچھا۔

"مگر تمہیں دو چار دن صبر سے کام لینا ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت میں ایک بہت ضروری کام سے بہت دور جا رہا ہوں۔ تم مجھے اپنے گھر کا پتا بتا دو۔ میں مشن سے واپسی پر سب سے پہلا کام تمہاری مدد کا ہی سر انجام دوں گا۔ میں اپنے ساتھ وہ روپے پیسے بھی لیتا آؤں گا جو اس عامل کو دینے ہوں گے اور اس سے بات بھی کر لوں گا کہ وہ آئندہ اپنی عملیات کے ذریعے کسی معصوم لڑکی سے اس کا محبوب اور کسی باوفا عورت سے اس کا مجازی خدا نہ چھینے اور نہ اسے ورغلانے کی کوشش کرے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ان میں اعتماد کی روشنی نظر آئی۔ اس نے مجھے اپنے گھر کا پتا لکھ دیا تھا۔ میں اپسرا کا شکریہ ادا کر ہی رہا تھا کہ شمیکا اور تمنو بھی رفتہ رفتہ چل کر ہمارے پاس آ گئے تھے۔

"اپسرا..... یہ شمیکا ہے..... میری دوست اور یہ تمنون شمیکا کے واقف کار اور شمیکا..... یہ اپسرا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے شمیکا اور تمنو کو اپسرا کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ اس کی کہانی بھی سنا دی تھی۔

''تمنو بھائی۔ میں تمہارا احسان لینا اور تمہیں زحمت دینا ہرگز نہیں چاہتا ہوں۔ میں اپنا ہر کام خود کرنے کا عادی ہوں اور شاید اسی قسم کی عادت شمیکا کی بھی ہے۔ تبھی اس نے تمہاری مدد کی پیش کش کو آسانی سے قبول نہیں کیا تھا مگر اپسرا کے ساتھ یہ پرابلم حقیقی ہے۔ اگر میں اسے اس کے گھر تک چھوڑنے گیا تو بہت دیر ہو جائے گی اور پھر شاید میں واپسی میں اس جنگل کا راستہ بھی بھٹک سکتا ہوں۔ مجھے خطرہ اور اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں میرا ضروری کام ادھورا نہ رہ جائے۔ لہٰذا برائے کرم.....''

''ارسلان..... بھائی'' تم نہ صرف شمیکا باجی کے دوست ہو بلکہ میرے بھی، میں تمہاری مدد کر کے تم پر نہیں خود پر ہی احسان کروں گا۔ تم میرا شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں ابھی گیا اور جلد آیا۔'' تمنو نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اپسرا! تم خوف زدہ مت ہونا۔ بس تمنو کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھنا اور جب تک تمنو نہ کہے، آنکھیں مت کھولنا۔ اب تم جاؤ اور میرا انتظار کرنا۔ میں بہت جلد روپے پیسے لے کر تمہارے گھر آؤں گا۔''

میں نے اسے رخصت کرتے ہوئے دلاسا دیا۔ وہ ہمیں اور ہماری باتوں کو سمجھ رہی تھی۔ لہٰذا اس نے ایسا ہی کیا اور تمنو بہت جلد ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ابھی ہمیں ایک درخت کے نیچے ذرا دیر نہیں ہوئی تھی کہ تمنو لوٹ آیا تھا۔ اس دوران شمیکا نے کچھ ہڈیاں اور میں نے کچھ چنے چبا لیے تھے۔ ہم تازہ دم ہو کر اُٹھے اور تمنو کے پروبازو کے زور پر پرواز کرنے لگے۔ میرے لیے یہ تجربہ بالکل نیا تھا مگر میں نے اکثر کہانیوں اور قصوں میں سن رکھا تھا اور ایک بات جو میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائی تھی، وہ یہ ہے کہ میں نے نہ صرف منے بھائی سے جنوں کی معلومات حاصل کی تھیں بلکہ اپنے مطالعے کی عادت سے فائدہ اُٹھا کر تمام خوف ناک، دہشت ناک، ہیبت ناک، لرزہ براندام کر دینے والی، تحیر انگیز، پُر اسرار کہانیاں پڑھ ڈالی تھیں۔ تبھی تو مجھے کسی جن یا جن زادی سے تعلقات اور روابط استوار کرنے کا دل چاہا تھا اور میری یہ تمنا کس قدر جلد پوری ہو گئی تھی۔ اس روز بھی میں منے بھائی کے پاس اس کی مٹھائی کی دکان پر بیٹھا جنوں، پریوں، چڑیلوں، پچھل پیریوں، بھوتوں، ماورائی مخلوق اور غیر مرئی طاقتوں کی باتیں کر رہا تھا کہ وہی عجیب سی خوشبو محسوس ہوئی تھی جو اس ماورائی مخلوق کے جسم سے نکلتی تھی۔ اس مخلوق سے آشنا شخص یا عامل ان کی موجودگی کا اندازہ اسی خوشبو ہی سے لگاتے تھے بلکہ جانور خصوصاً کتوں کو سب سے پہلے یہ خوشبو آتی تھی اور بعد میں وہ غیر مرئی مخلوق کو دیکھ لیتے تھے جس کی وجہ سے بھونکنا شروع کر دیتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ جنوں کی خوراک، پتھر، مٹی اور ہڈیاں ہوتی ہیں، اس لیے میں نے سفر پر روانگی سے قبل کچھ صاف ستھری اور بڑی بڑی ہڈیاں لے لی تھیں۔ کچھ مٹھائی بھی میرے پاس تھی تاکہ بہ وقتِ ضرورت کام میں لی جا سکیں۔ اچانک ہمارے پیروں سے زمین ٹکرائی تو میرے خیالات اور ماضی کی حسین سوچوں کا تانا بانا ختم ہو گیا۔

میں نے دیکھا یہاں پر جنگلات کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ ہر طرف صحرا کی ریت اُڑ رہی ہے۔ ہمارے پیچھے صحرا ہی صحرا ہے، نہ ختم ہونے والا لق و دق صحرا۔ اور سامنے کی طرف پہاڑی سلسلہ ہے۔ پہاڑوں کے درمیان ایک وادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شاید یہی وہ وادی تھی جو جنات کے مکانات پر مشتمل تھی۔

''وہ دیکھو سامنے جو آبادی ہے وہی جنوں کی آبادی ہے۔ جنوں کا سردار قسطنطنا بھی وہیں رہتا ہے۔ ہمیں وہاں تک پیدل چلنا ہوگا۔'' شمیکا نے وضاحت کرتے ہوئے تمنو سے کہا۔

''تمنو بھائی..... تمہارا بہت شکریہ، کہ تم نے ان گھنے جنگلات سے نکال کر یہ وسیع و عریض صحرا بھی پار کرا دیا۔ ہم تمہارے احسان مند رہیں گے۔ میرا خیال ہے اب تم واپس سدھارو، آگے ہمیں اکیلے ہی جانا ہوگا۔''

شمیکا نے تمنو کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔

''شمیکا بہن..... اس میں شکریے کی اور احسان مند کی کون سی بات ہے۔ ایک بھائی ہی اپنی بہن کے کام آتا ہے۔ مجھے یوں شرمندہ نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تم دونوں کی مدد فرمائے اور تمہیں زندگی کے ہر مقصد و امتحان میں کام یابی اور کامرانی نصیب کرے۔'' تمنو ہمیں دعائیں دے کر رخصت ہو گیا اور ہم اس پہاڑی سلسلے کی طرف بڑھنے لگے۔

''شمیکا جی..... میری وجہ سے آپ کو کوئی مسئلہ تو درپیش نہیں ہوگا۔'' میں نے شمیکا سے کہا۔

''نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے اور اگر کوئی مسئلہ درپیش ہوا بھی تو نمٹ لیں گے۔''

''ویسے تمہارا اشارہ کس طرف ہے۔'' شمیکا نے خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے کہ ایک تو میں نے جنوں کو دیکھا نہیں ہے یعنی ان کی اصلی حالت میں۔ سنا ہے ان کی شکل اصل حالت میں بہت ڈراؤنی ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں تو ان کو دیکھ نہیں سکتا ہوں، پھر میں اَن دیکھی مخلوق سے نبرد آزما کیسے ہو سکتا ہوں۔'' میں نے اپنے انسان ہونے کی وجہ سے مجبوریاں ظاہر کیں۔

''ارسلان..... پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی جن تمہارے سامنے اصل شکل میں نہیں آئے گا کیوں کہ تم انسان ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم جن اس وقت ڈراؤنی شکل اختیار کرتے ہیں جب کسی کو ڈرانا مقصود ہوتا ہے۔ مگر تمہارا خدشہ اپنی جگہ درست ہے۔ اسی سلسلے میں عرض گزار ہوں کہ میں فی الحال تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ ہاں مجھے میری جناتی طاقتیں مل جائیں تو میں وہ شیشہ تمہیں لا کر دے سکتی ہوں جس کے آنکھوں پر لگانے سے تمام جن اور اس قبیل کے لوگ تمہیں ہماری طرح چلتے پھرتے اور کام کاج کرتے نظر آ سکتے ہیں۔'' شمیکا نے وضاحت کی تھی۔

''کیا ایسا کوئی شیشہ ہوتا ہے جس کی مدد سے ایک انسان کسی جن کو با آسانی کام کاج کرتے، چلتے پھرتے اور آتے جاتے دیکھ سکتا ہے۔ میں نے تو آج تک کسی کہانی میں نہیں سنا، نہ کسی ناول میں پڑھا اور نہ ہی کسی فلم میں اس بات کا اشارہ موجود ہے۔ ورنہ مجھے بہت سی معلومات آپ لوگوں کے بارے میں انہیں چیزوں سے حاصل ہوئی ہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا۔

''ہاں ایک ایسا شیشہ جسے ہم آشکار عدسہ کہتے ہیں مگر شاذ و نادر ہی کسی انسان کے پاس ہوں۔ کیوں کہ ہم سب جنوں نے یہ عہد کیا ہوا ہے کہ جہاں کہیں بھی یہ آشکار عدسہ دیکھیں اسے ہر حالت میں اور جان پر کھیل کر اُٹھا لائیں اور جنوں کے سردار قسطنطنا کے پاس جمع کرا دیں۔ اس آشکار عدسے کے چند ٹکڑے قسطنطنا کے پاس موجود ہیں۔ جب وہ مجھ کو کسی بھی شرط پر میری جناتی طاقتیں لوٹا دے گا اور میرے والدین کو رہا کر دے گا تب میں اس سے تمہارے لیے ایک آشکار عدسہ بھی لے لوں گی۔ جب تک میں وہ عدسہ نہ لے لوں تب تک تمہیں کوئی جن اگر نظر آئے گا تو انسانوں کے روپ میں ہی نظر آئے گا۔ جب تمہاری ملاقات قسطنطنا سے ہوگی تو وہ اور اس کے تمام چیلے بھی انسانی روپ میں ہی تمہاری نظروں کے سامنے آئیں گے۔ اگر کوئی سرکش جن تمہیں اپنے اصلی روپ میں ڈرانے کی کوشش بھی کرے تو تم سمجھ جانا اور حوصلہ رکھنا۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر میں نے تمہیں دوست بنانے سے پہلے تمہاری آزمائش کر لی تھی۔ جس میں تمہاری بہادری، جرأت مندی، خدا ترسی، انسان پرستی اور جواں مردی سامنے آ گئی تھی۔ تبھی میں نے تمہیں اپنا دوست بنانے اور اس مشن پر لانے کے لیے چنا تھا۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنی عقل و دانش، فہم و فراست اور ہمت و حوصلہ سے ہاری بازی جیت جاؤ گے۔ یہ زحمت تمہیں اس وقت تک ہوگی جب تک میری جناتی طاقتیں بحال نہ ہو جائیں۔ میری جناتی طاقتیں بحال ہونے کے بعد کوئی تمہارا بال بھی بیکا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں کرسکتا۔ چاہے وہ انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے۔ تب میں تمہارے ہر احسان کا بدلا چکا دوں گی اور تمہیں دنیا بھر کی شہرت دلا دوں گی۔'' شمیکا نے بڑے وثوق سے کہا تھا۔ مگر میں چلتے چلتے رک گیا تھا۔

''کیا ہوا..... کیا میری کوئی بات بری لگی ہے۔'' شمیکا نے اچانک سوال کیا۔

''ہاں شمیکا جی..... تمہاری ایک بات بری لگی ہے۔'' میں نے وہیں رک کر بتایا۔

''کون سی بات؟'' اس نے اپنی گھنیری پلکیں اوپر اُٹھا کر پوچھا تو وہ بہت خوب صورت لگی۔

''ایک طرف تو تم مجھے دوست کہتی ہو اور دوسری طرف میرا احسان مان رہی ہو۔ بھلا ایک دوست جب قدم قدم پر دوسرے دوست کے کام آتا ہے تو اس میں احسان والی کوئی بات نہیں ہوتی۔ وہ اس دوست کا فرض ادا ہوتا ہے۔'' میں نے کتابی باتیں دہرائیں۔

''چلو معاف کردو..... خطا ہوگئی۔'' شمیکا نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ اس وقت بہت معصوم اور پیاری لگ رہی تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ایک عجیب و غریب لمس میری رگ و پے میں اُتر گیا۔ ایک ایسا لمس جس سے میں کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ میں نے فرطِ جذبات میں اس کے ہاتھوں کو نہ صرف چوم لیا بلکہ آنکھوں سے بھی لگا لیا۔ وہ مسکرادی اور ہم آہستہ آہستہ پہاڑی کے دامن میں اُترنے لگے۔

''وہ سامنے جو غار نظر آرہا ہے، اسی غار میں قسطنطنا رہتا ہے۔'' شمیکا نے ایک اشارے سے مجھے بتایا تو میں اس غار کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک پہاڑ کو کاٹ کر غار بنایا گیا ہے یا پھر غار کے اوپر پہاڑ کو رکھ دیا گیا ہے۔ غار کا دہانہ دیکھنے کے بعد کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ یہ ممکن بھی تھا کیوں کہ یہ جنوں کا محل تھا اور جنوں کے لیے کوئی مشکل سے مشکل کام بھی دقت طلب نہیں ہوتا۔ وہ ہر ناممکن کام بھی آسانی سے کرگزرتے ہیں۔ اگر شمیکا کی جناتی طاقتیں سلب نہ کی جاتیں تو وہ اب تک نہ جانے کیا کیا کرگزرتی۔ ہمیں یہاں تک آنے میں نہ تو تمنو کی مدد درکار ہوتی، اور نہ ہی اس قدر وقت لگتا۔ بلکہ سفر کی صعوبتیں بھی نہ جھیلنی پڑتیں۔ چند منٹوں میں اُڑ کر یہاں تک پہنچ چکے ہوتے جہاں ہم کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد تھکن سے چور ہو کر پہنچے ہیں۔''

''مگر ایسا ہو جاتا تو پھر ہمیں اپسرا کیسے ملتی۔ اللہ تعالیٰ کو ہمارے ذریعے اس کی مدد کرانی تھی۔ اس لیے ہمیں اس سے ملوادیا اور ذریعہ پیدا کیا۔ اسی طرح وہ مختلف وسیلوں سے ایک انسان سے دوسرے انسان کی مدد کراتا ہے۔ وہ خود تھوڑی زمین پر اُترتا ہے کسی کی مدد یا حفاظت کے لیے۔ وہ انسان ہی کو فرشتہ بنا کر بھیج دیتا ہے۔ اس کے ہر کام میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو شمیکا کی جناتی طاقتیں خود ہی بحال کرا دیتا۔ میرے وسیلے کی ضرورت نہیں تھی مگر اس نے مجھے بھی تو کسی کام سے لگانا تھا۔ میری دعاؤں کو پورا کرنا تھا۔ کیوں کہ وہی دنیا جہان اور پوری کائنات میں سمیع الدعا ہے۔

''کیا سوچنے لگ گئے۔'' شمیکا نے مجھے گہری سوچ میں ڈوبا دیکھا تو پوچھ لیا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ایک گروہ نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

''کون ہو تم اور یہاں کس لیے آئے ہو۔'' ان میں سے ایک نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میرے ساتھ ہے اور یہاں تک اسے اس لیے لے کر آئی ہوں تاکہ اپنے والدین کو رہا کرا سکوں۔'' شمیکا نے تیکھے لہجے میں جواب دیا۔

''ہمیں سردار قسطنطنا سے ملنا ہے۔ جاؤ جا کر ان کو خبر کردو کہ شمیکا آئی ہے۔'' شمیکا کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔

''سردار اس وقت کسی سے نہیں مل سکتا۔'' ان میں سے دوسرے شخص نے جواب دیا۔

''کیوں نہیں مل سکتا۔ ہم بہت دور سے ان سے ملنے کے لیے آئے ہیں اور ہمارا ملنا بے حد ضروری ہی

نہیں بلکہ ناگزیر بھی ہے۔'' اس بار میں نے بات آگے بڑھائی۔

''شمیکا تم تو جانتی ہو کہ سردار کا ایک ہی بیٹا ہے اور وہ بھی کس قدر انتظار اور منتوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ وہ آج کل نہ صرف بیمار ہے بلکہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس لیے سردار اس کے علاج معالجے میں لگا ہوا ہے۔ اس نے دنیا کا کوئی حکیم، کوئی طبیب یا کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا مگر اس کا بیٹا صحت یاب نہ ہوسکا۔ یہاں تک کہ سردار نے روپیہ پیسہ، ہیرے جواہرات، سونا چاندی اور ہر چیز انعام دینے کا وعدہ کرلیا مگر کوئی حکیم اسے جواب دیے بغیر نہ رہ سکے۔ اب سردار مایوس و نا امید ہو کر بے بس و لاچار ہو گیا ہے اور رات دن اسی فکر اور پریشانی میں جل جل کر شمع کی طرح گھل رہا ہے۔ موت اس کے اکلوتے بیٹے کو نگلنے والی ہے مگر اس کے غم میں وہ اور اس کی ماں مرے جا رہے ہیں۔''

تیسرے شخص نے تفصیل بتائی تو شمیکا کو حالات سے آگاہی ہوئی اور اسے بے حد افسوس بھی ہوا۔ کیوں کہ کسی کا بھی بیٹا ہو، وہ اس کا لختِ جگر ہوتا ہے اور کوئی اپنے دل کے ٹکڑے کو موت کے حوالے کیسے کر سکتا ہے۔ جن بھی جان دار ہوتے ہیں، ان کے سینوں میں بھی دل ہوتے ہیں جو انسانوں کے دل کی طرح دھڑکتے ہیں اور اپنے جذبات رکھتے ہیں۔

''ایسی صورت میں تو ہمارا سردار سے ملنا اور ضروری ہو گیا ہے۔ جلدی کرو ہمیں سردار کے پاس لے چلو۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔'' میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا تو میں نے ان سے جلد بازی میں کہا۔

''جاؤ سردار قسطنطنا سے کہو کہ ایک حکیم کا بیٹا ان سے ان کے بیٹے کی بیماری کے لیے ملنا چاہتا ہے۔'' میں نے پہلے شخص سے کہا تو وہ ایک آن میں نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ شمیکا میری جانب حیرت بھری نظروں سے گھور رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں غصہ بھی تھا کہ میں نے جھوٹ سے کام کیوں لیا۔ اس کے نزدیک دھوکا دہی ایک جرم تھا۔

''تم نے یہ کیوں کہا کہ تم اس کے بیٹے کی بیماری کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہو اور تم ایک حکیم کے بیٹے ہو۔'' شمیکا نے وضاحت طلب نظروں سے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

''اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔ میں واقعی اس کے بیٹے کی بیماری کے سلسلے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اور اس کا علاج میرے پاس موجود ہے اور اس میں بھی کوئی جھوٹ نہیں ہے کہ میں ایک حکیم کا بیٹا ہوں۔'' میں نے اس کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے بتایا۔

''سردار تمہیں جلد بلا رہا ہے بلکہ دیکھو وہ غار کے دہانہ پر خود تمہارا منتظر ہے۔'' نظروں سے اوجھل ہونے والے آدمی نے آکر بتایا اور بڑے احترام سے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دور غار کے دہانے پر دیکھا تو واقعی ایک رعب دار، لحیم شحیم سا شخص کھڑا بے چینی سے اسی جانب تک رہا تھا۔ میں نے شمیکا کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور زیرِ لب مسکرا دیا۔ وہ ہکا بکا سی میرے ساتھ چلنے لگی۔

''ارسلان تم جنوں کو سمجھتے نہیں ہو۔ انہیں مذاق برداشت نہیں ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب ان کا اکلوتا بیٹا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ان کے غیض و غضب میں تمہاری جان بھی جاسکتی ہے۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔'' شمیکا نے میرا بازو تھامتے ہوئے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''شمیکا میں کسی قسم کے مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں نے جو کہا ہے وہ سچ اور حقیقت ہے۔ میں ایک حکیم کا بیٹا ہوں اور اس جن لڑکے کا علاج بھی میرے پاس موجود ہے۔ تم اس کو مذاق کیوں سمجھ رہی ہو۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے بتاؤ کہ تمہارے پاس اس جن زادے کا کیا علاج ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب دنیا کے تمام ڈاکٹر اور حکیم یہاں تک کے عامل اور عالم بھی اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں اور آخری جواب دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے ہیں۔ ایسی صورت میں تم کیا علاج کرو گے۔ دکھاؤ تمہارے پاس کیا چیز ہے جس سے تم اس قدر بولڈ ہو گئے ہو، اور اس قدر وثوق سے دعویٰ کر رہے ہو۔'' شمیکا نے رفتار سست کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں تمہیں وہ علاج کر کے دکھاؤں گا۔ تم اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہو اور ہاں اس کی زندگی بچانے کا میرا دعویٰ نہیں ہے۔ زندگی اور موت تو اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بندے تو صرف چارہ جوئی کر سکتے ہیں۔ میں بھی چارہ جوئی کروں گا اور مجھے میرے خدا سے پوری امید ہے کہ وہ میرا بھرم قائم رکھے گا۔'' میں نے اپنا ارادہ اور پختہ کر لیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ گولی نکال لی جو مجھے قبرستان میں اس حکیم نے دی تھی جس کا بھاری سامان اُٹھا کر میں اس کے گھر چھوڑ آیا تھا۔

''یہ ہے وہ علاج جس سے اس جن زادے کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے وہ چنے کے برابر گولی اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی تو اس کی آنکھوں میں اعتماد نظر آنے لگا۔

''مگر یہ ذرا سی گولی اس کا علاج کیسے کر سکے گی۔ جب کہ اس پر کوئی دوا کارگر ثابت نہیں ہو سکی ہے۔'' شمیکا کو کچھ اطمینان ہو چلا تھا کہ میں واقعی جھوٹ نہیں بول رہا ہوں اور نہ مذاق کر رہا ہوں۔

''آؤ..... آؤ..... میرے محسن..... آؤ، کیا تم ہی حکیم کے بیٹے ہو اور میرے بیٹے کا علاج کرنے آئے ہو۔'' قسطنطنا نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''جی سردار! میرے پاس آپ کے بیٹے کا علاج موجود ہے۔ میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے مجھے شمیکا کے ساتھ اسی کام کو سرانجام دینے کے لیے یہاں تک بھیجا ہے۔'' میرے منہ سے شمیکا کا نام سن کر سردار چونکا۔ اس نے تب شمیکا کی طرف دھیان دیا ورنہ وہ تو مجھے اپنے بیٹے کی زندگی کی صورت میں دیکھ رہا تھا۔

''کہاں ہے تمہارا بیٹا، میں بھی تو دیکھوں۔''

میں نے قسطنطنا سے عجلت میں کہا۔

''آؤ..... آؤ..... اندر آجاؤ مہربان، وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے اور اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔'' سردار نے غار کے اندر ان کی راہ نمائی کرتے ہوئے بڑی کرب ناک آواز میں کہا۔ میں نے اس کے بیٹے کو چیک کیا، نبض دیکھی، دل کی دھڑکن سنی اور اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو اس نے آنکھیں کھول دی۔ وہ بالکل چیچنیا، یا تھوپیہ کے قحط زدہ بچوں کی طرح سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ نہ صرف اس کے جسم پر گوشت کا نام و نشان رہا تھا بلکہ اس کی رگوں میں خون بھی جم گیا تھا اور سب سے دکھ بھری بات یہ تھی کہ ان کی آنکھوں میں زندگی کی رمق بھی دم توڑ گئی تھی۔

''سردار..... مایوسی کی باتیں نہ کرو، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔ ابھی چند گھنٹوں میں تمہارا بیٹا اُٹھ بیٹھے گا اور کھائے پیے گا۔ انشاء اللہ میرے علاج سے اس کو دوسری زندگی ضرور ملے گی۔'' میں نے ان میں سے ایک شخص کو ایک گلاس پانی لانے کے لیے کہا۔ پلک جھپکے میں پانی آ گیا تو میں نے جان بوجھ کر وہ گولی جو چنے کے برابر میرے ہاتھ میں تھی، اسے چند لمحوں کے لیے سب کو دکھایا اور پھر اس سے پہلے کہ میں وہ گولی اس جن زادے کو کھلا دیتا شمیکا کی طرف مڑ کر دیکھا۔ شاید میری اس بات کا مطلب سردار سمجھ گیا تھا۔ سردار کسی بھی قبیلے کا ہو، وہ انتہائی ذی شعور اور ذہین و فطین ہوتا ہے۔ تبھی تو اس کو سردار بنایا جاتا ہے اور قسطنطنا تو جنوں کے قبیلے اور نسل کا سب سے بڑا سردار تھا۔ یہ تو بلا کا ذہین اور زمانہ شناس ہوگا۔

''اجنبی..... اگر ایسا ہو گیا تو میں تمہیں منہ مانگا انعام دینے کو تیار ہوں۔ کیوں کہ مجھے میرے اکلوتے بیٹے سے زیادہ دنیا کی کوئی شے عزیز نہیں ہے۔ کوئی ایسی قیمتی اور بیش بہا چیز نہیں ہے جو میں اپنے بیٹے پر صدقہ نہ کر دوں۔'' جنوں کے سردار نے با آواز بلند کہا تھا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ میں جس مشن پر آیا ہوں وہ تو پورا کر کے جاؤں، یہ آواز تمام جنوں نے سنی تھی۔ میں نے دستخط

کے بغیر وعدہ لے لیا تھا۔ تب وہ گولی اس کے بیٹے کے منہ میں رکھ کر پانی پلا دیا۔ تمام جن سکتے کی حالت میں کھڑے ایک دوسرے کا حیرت سے منہ تک رہے تھے۔ اسی اثناء میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پر دوں میں ارتعاش پیدا ہوا، اور پلک جھپکتے میں ایک ادھیڑ عمر عورت ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ چند لمحے میرے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے بولی۔

''مجھے امید ہے تم نے جو علاج میرے بیٹے کا کیا ہے وہ کام یاب ہوگا۔ کیوں کہ تمہارے چہرے پر خدا ترسی اور انسان دوستی کے اثرات نظر آ رہے ہیں اور پھر ایک ماں کا دل گواہی دے رہا ہے کہ اب میرا بیٹا صحت یاب ہو کر ایک طویل عرصے جیے گا۔ اجنبی ہم تمہارے زندگی بھر احسان مند رہیں گے۔ منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ تو قسطنطنا نے کیا ہے مگر کام یابی پر میری طرف سے تم کو پیش کش ہے کہ زندگی بھر جو چاہو گے تمہیں ملتا رہے گا۔ تمہارے اور ہمارے رابطے اور ملاقات کا ذریعہ شمیکا ہی رہے گی۔'' وہ شاید نہیں بلکہ یقیناً اس کی ماں تھی جو اپنے بیٹے کی زندگی ہر قیمت پر چاہتی تھی۔

میری نظر میں اس وقت سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت اس بزرگ کی تھی جس نے مجھے اس قدر نایاب گوہر دیا تھا۔ جس وقت بزرگ نے مجھے اس قدر قیمتی گولی دی تھی تب مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اس کو آزمانے کا موقع نہیں آیا تھا۔ کیا کمال کی چیز تھی۔ اس کے آگے تمام جادو ٹونے، دوائی دارو اور علاج معالجے فیل ہو کر رہ گئے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں اور اس کے جسم سے بے حرکتی دور ہو رہی تھی۔ ماں نے سہارا دے کر اسے اُٹھایا تو وہ اُٹھ بیٹھا۔ تمام حاضرین اور ناظرین کے چہرے پر خوشی رقص کرنے لگی، تب شمیکا نے بھی بڑی لجاجت اور شکر گزار نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''اجنبی..... تم آرام کر لو، ہم اپنے محسن کو اتنی آسانی سے اور جلدی نہیں جانے دیں گے۔ تم بہت دور کا فاصلہ طے کر کے آئے ہو، ہم جنوں کے لیے تو یہ فاصلہ کچھ نہیں ہے مگر تم انسانوں کے لیے بڑی لمبی مسافت ہے..... نہ ختم ہونے والی، یہ تو مجھے میرے جاسوسوں نے بتا دیا تھا کہ تم نے جنگلات اور صحرا پار کرانے میں تمہاری مدد کی ہے مگر وہ نہ ختم ہونے والا پہاڑی سلسلہ پار کرنا اور یہاں تک پہنچنا عام بات نہیں ہے۔'' قسطنطنا نے دو جنوں کو اشارہ کیا تو وہ ہمیں بڑے مودبانہ انداز میں آداب بجا کر چلنے کا اشارہ کرنے لگے۔ میں اور شمیکا ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے۔

کہنے کو تو یہ ایک تنگ منہ کا غار تھا جو سامنے والی پہاڑی کے اندر تھا۔ مگر جب ہم نے اس غار کے دہانے پر پہنچ کر اس پتھر کو بہ غور دیکھا جو غار کے دہانے پر ایک دروازے کی جگہ رکھا گیا تھا اور دروازے کا کام دیتا تھا، میں نے ہاتھ لگا کر اندازہ کر لیا کہ وہ چالیس نوجوان مردوں سے بھی نہیں ہٹ سکتا۔ مگر مجھے حیرت ہوئی جیسے ہی ہمارے ساتھ موجود جن نے انگلی کا اشارہ کیا وہ اس قدر وزنی پتھر جو چالیس نوجوان مردوں سے بھی کھسک نہیں سکتا تھا جن کی انگلی کا اشارہ پا کر خود بہ خود ہٹ گیا۔ وہ جن اندر داخل ہو گئے اور ہمیں بھی اپنے ساتھ غار میں لے گئے تو وہ وزنی پتھر دوبارہ غار کے دروازے پر آ کر غار کے دہانے کا منہ بند کر چکا تھا۔ مجھے تجسس ہوا کہ قسطنطنا نے ہمیں اس غار میں کیوں بھیجا ہے۔ میرے دل کے کسی گوشے میں ایک شک و شبہ پیدا ہوا..... کہیں قسطنطنا ہماری جان لینے کے درپے تو نہیں ہے۔ کیوں کہ شمیکا سے وہ نفرت کرتا تھا۔ شمیکا نے اس کا انتہائی بیش قیمت ہیرا کھو دیا تھا۔ جس کی پاداش میں قسطنطنا نے نہ صرف اس کے بوڑھے والدین کو قید کر لیا تھا بلکہ شمیکا کی تمام جنائی طاقتیں چھین کر اسے بے بس و لاچار کر دیا تھا۔ وہ ایک ناداراور کم زور عورت سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ اسی لیے تو اس نے مجھے اپنی دوستی کے لائق سمجھ کر اپنی مدد کے لیے چن لیا تھا۔ کہیں قسطنطنا ایک انسان کی حکمت کی طاقت دیکھ کر خوف زدہ تو نہیں ہو گیا ہے۔ کہیں وہ ایک جن زادی اور انسان کو یک جا دیکھ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حیران تو نہیں ہے۔ کہیں وہ کسی شک و شبے کا شکار تو نہیں ہو گیا ہے کہ ایک جن زادی نے آدم خاکی سے جوڑا بنا لیا ہو۔ لیکن اس بدگمان جن کو کیا پتا..... ابھی تو ہم اچھے دوست بنے ہیں۔ شاید ہم میں محبت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ ایک دوسرے کی قربت میں رہنے اور لمس آشنا ہونے سے محبت کے جذبات بیدار ہو جائیں اور ہم ایک دوسرے کو اپنا لیں۔ ایک ساتھ رہیں..... ایک ساتھ کھائیں اور پئیں، تمام زندگی ساتھ ساتھ ہم قدم بن کر چلیں۔

''ہمیں یہاں پر لذتوں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے اپنے مطلب کی بات کرنی چاہیے۔'' شمیکا نے کہا تو میں شکوک و شبہات کی دنیا سے نکل آیا۔ ''شاید قسطنطنا ہمارے لیے اپنے بیٹے کی صحت یابی کا جشن منانے کے موقعے پر دعوت کا اہتمام کرنا چاہتا ہے۔ نہ جانے جنوں کے ہاں دعوت پر ضیافت میں کیا کیا پکوان ہوتے ہوں گے۔ ان کے ذائقے کیسے ہوں گے اور ہاں ایسی محافل اور تقاریب میں رقص و سرور اور شباب و شراب کا معیار کیا ہوتا ہوگا۔'' میں نے خیالی دنیا میں تصورات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''کیوں شمیکا..... میرے لیے تو یہ تمام تجربات اور مشاہدات قطعی اجنبی اور غیر مانوس ہیں۔ کتنا مزا آئے گا۔''

''ارسلان..... تم اپنا مقصد مت بھولو، ہم یہاں پر مزے لینے، دعوتیں اُڑانے یا پھر رقص و سرور میں ڈوبنے نہیں آئے ہیں۔'' شمیکا نے مجھے خیالات کی دنیا سے باہر نکالنے کے لیے کہا۔

''میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا، وقت گزارنے کے لیے! اب جو کوئی بھی جن ہمارے پاس آئے تو اس سے بات کر کے سردار کو بلائیں گے اور اپنا منہ مانگا انعام حاصل کر کے یہاں سے چلتے بنیں گے۔'' میں نے شمیکا کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''کیا تم کسی طرح قسطنطنا کو یہاں بلا سکتی ہو۔'' میں نے شمیکا کی حیران کن آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بلا تو سکتی ہوں مگر.....'' شمیکا نے کچھ سوچتے ہوئے بات پوری نہیں کی۔

''مگر..... کیا؟'' بات بتاؤ مجھے کیوں اُلجھا رہی ہو، اب مجھے غیر یا پرایا نہ سمجھو۔ میں تمہارا دوست اور سچا ساتھی ہوں۔'' میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہیں قسطنطنا اکیلے میں بات کرنے سے اپنی بات سے مکر نہ جائیں۔ کہیں وہ اپنے بیٹے کو مکمل صحت یاب پا کر انعام دینے اور ہماری بات ماننے سے انکار نہ کر دے۔'' شمیکا نے ایک خدشہ ظاہر کیا تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ جن بھی اپنے وعدوں سے مکر جاتے ہیں۔ ان میں بھی انسانوں کی طرح وعدہ خلاف، عہد توڑنے والے اور جھوٹے جن ہوتے ہیں۔ یقیناً ایسا ہوتا ہوگا تبھی تو شمیکا نے یہ اندازہ ظاہر کیا ہے۔ مگر میں نے پھر بھی شمیکا سے پوچھ لیا۔

''کیا ایسا ممکن ہے کہ جنوں کا سردار اپنے وعدے کا پاس نہ رکھے۔ اپنی زبان کا بھرم قائم نہ کرے۔'' میں نے حیرت کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! وہ ایک ظالم جن ہے۔ اگر وہ رحم دل ہوتا تو کیا مجھ سے میری جنانی طاقتیں چھین لیتا۔ کیا وہ میرے بوڑھے ماں باپ پر کرم نہ کرتا۔ انہیں قید میں ڈالنے کی بجائے کھلی جگہ پر رکھ کر آزادی سے گھومنے پھرنے اور ہر جگہ آنے جانے دیتا۔ اس کی یہ ظالمانہ کارروائیاں بتا رہی ہیں کہ وہ ایسا کر سکتا ہے اور پھر ہم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔'' شمیکا کے یہ باتیں کہتے ہوئے چہرے پر خوف کے آثار چھا گئے تھے۔

''تو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔؟'' میں نے تذبذب میں سوال کیا۔

''ہمیں اس کے بیٹے کے صحت یاب ہونے پر اس جشن کا انتظار کرنا چاہیے جس میں تمام جن، بھوت پریت، ڈائنیں، چڑیلوں، عفریت اور بدروحیں شامل ہوں گی۔ تب سردار سے ہم بھرے مجمعے میں اپنے مقاصد ظاہر کریں گے۔ وہ تمام جنوں اور بھوت پریت

کی موجودگی میں انکار نہ کر سکے گا اور اپنی سرداری کے جانے کے خوف سے اپنی زبان پر قائم رہے گا اور وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ اگر اس نے ذرا سی بھی چوں چرا کی تو وہ سارے گواہ ہمارے حق میں گواہی دیں گے جن کے سامنے سردار نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی صحت یابی پر انہیں منہ مانگا انعام دے گا۔'' شمیکا نے ایک بار پھر یہ بات دہرائی تھی۔

''اور ہاں اس کی بیوی نے بھی تو اپنے بیٹے کی جاں بخشی اور دوسری زندگی ملنے کی خوشی میں کچھ عنایات کرنے کا وعدہ کیا تھا..... ہم اس سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس جن زادے کی ماں کی پیش کش تو ساری زندگی کے لیے ہے۔'' میں نے شمیکا کو یاد دلایا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازہ حسبِ معمول کھل کر بند ہو گیا تھا، مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ میں نے شمیکا کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا تو وہ اپنی جگہ سیکڑ کر کھڑی ہو گئی اور بڑے غور سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر استعجاب چھا گیا تھا۔ خوف کی لکیریں گہری ہونے لگی تھیں۔ اس نے میرا بازو تھام لیا تھا۔

''کیا بات ہے شمیکا، کون ہے جسے دیکھ کر تم اس قدر خوف زدہ ہو رہی ہو۔'' میں نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے پوچھا۔ اسی لمحے ایک چھوٹا سے چوہا غار کی دیوار پر چڑھنے لگا۔ میں نے چوہے کو دیکھا تو میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''شمیکا یہ چوہوں، لال بیگوں اور چھپکلیوں سے ڈرنا تو عورتوں کا کام ہے، ٹھیک ہے تم بھی عورت ہو، مگر تم جن زادی ہو۔ تمہیں بھلا ان حشرات الارض کے ساتھ ساتھ موذی جانوروں، پرندوں اور درندوں سے ڈرنے یا خوف کھانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور نہ تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔'' میں نے شمیکا کو بازو سے تھام کر اپنے قریب کر لیا۔ پہلے تو وہ چوہا دیوار پر چڑھا اور پھر بڑی عجیب نظروں سے شمیکا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ اس چوہے کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ جیسے ابھی اس کی آنکھوں سے انگارے برس پڑیں گے۔ ایک خوف کی لہر میرے جسم میں سرایت کر گئی۔ تب میں نے سوچا کہ واقعی ڈر اور خوف کی بات ہے، ورنہ شمیکا کو ڈرنے اور دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے مزید بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ چوہا اپنی جگہ سے اچھلا اور زمین پر کود گیا۔ مجھے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب وہ زمین پر آنے کی بجائے ہوا میں ایک چمگادڑ کی شکل اختیار کر کے اُڑنے لگا۔ اب مجھے شمیکا کے خوف کھانے اور دہشت زدہ ہونے کا مطلب سمجھ آنے لگا تھا۔ وہ کوئی چوہا یا چمگادڑ نہیں تھا بلکہ کوئی شریر جن تھا جو ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے اندر گھس آیا تھا۔

''شمیکا یہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟'' میں نے آخر کار تجسس کو ختم کرنا چاہا۔

''ارسلان! یہ ایک سرکش جن ہے، جب میں یہاں رہتی تھی، تب بھی یہ مجھے مختلف حیلے بہانوں سے تنگ کرتا رہتا تھا، اور میری جان کا دشمن بنا ہوا تھا۔'' شمیکا نے ایک جھٹکے سے مجھے بھی نیچے کھینچ لیا، اور خود بھی نیچے بیٹھ گئی۔ کیوں کہ اب اس چمگادڑ نے ایک خونخوار باز کی صورت اختیار کر لی تھی اور ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ میں نے فوراً اپنا تیز دھار خنجر نکال لیا۔

''رہنے دو، یہ بہت ظالم اور طاقت ور جن ہے۔ یہ خنجر اور تلواروں سے نہیں مر سکتا۔ اس کے لیے ہمیں کوئی اور حربہ استعمال کرنا پڑے گا۔'' کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور یہ اشرف ہونے کا شرف انسان کو اس کے علم اور عقل و دانش اور فہم و فراست کی وجہ سے ملا ہے۔ لہٰذا میں سوچنے لگا کہ کسی تدبیر سے اس جن کو باتوں میں لگایا جائے اور پھر کوئی ترکیب اس کو مارنے یا اپنی حرکت سے باز رکھنے کی کی جائے۔ مگر وہ کچھ دیر کے لیے میری نظروں سے غائب ہو گیا تھا۔

''شمیکا یہ جن تمہارے ساتھ سرکشی سے کیوں پیش آ رہا ہے، تمہیں کیوں تنگ کرتا رہتا تھا، آخر اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دشمنی اور سرکشی کی کوئی تو وجہ ہوگی۔'' میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا نام اموکا جن ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور مجھے اپنانا چاہتا ہے۔ مگر میری اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، وہ مجھے اپنی سرکشی اور ضدی طبیعت کی وجہ سے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ میں نے کبھی اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا، اور نہ کبھی اس کو منہ لگایا۔ یہ مجھے جب بھی تنگ کرتا تھا، میں بس اپنا دفاع کرتی تھی۔ تب یہ تھک ہار کر چلا جاتا تھا۔ یہ بضد ہے کہ میں اس سے شادی کروں، مگر مجھے زور و زبردستی ایک آنکھ بھاتی نہیں ہے۔ جناتی طاقتیں سلب ہونے کی وجہ سے میں ان کی دنیا سے دور چلی گئی تھی، لہٰذا اس نے بھی میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ اب میں واپس آئی ہوں تو یہ پھر مجھے تنگ کرنے آ گیا ہے۔'' شمیکا نے اداس لہجے میں کہا تو مجھے اس کی مجبوری اور بے بسی کا دکھ ہوا۔

''نجانے کہاں چلا گیا ہے، کیا ہمیں سردار کی مدد لینا نہیں چاہیے۔'' میں نے شمیکا سے پوچھا۔

''وہ کہیں نہیں گیا ہے، وہ مکھی کی صورت بن کر دیوار پر بیٹھا ہے۔'' میں سمجھ گیا..... تب میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ میں نے با آواز بلند کہا۔

''شمیکا تمہارا دشمن بزدل معلوم ہوتا ہے۔ تبھی مکھی بن کر دیوار پر جا چپکا ہے، ورنہ شیروں کی طرح مجھ سے مقابلہ کرتا۔ پھر میں دیکھتا کہ اس میں کتنی سرکشی موجود ہے۔ ایک جن، ایک آدمی کا مقابلہ کرتے ہوئے گھبرا رہا ہے۔'' میں نے ذرا دیر کو توقف کیا کہ اسے میری باتیں سن کر غیرت کا احساس ہو، اور وہ آگ بگولا ہو کر ہمارے سامنے آ جائے، چاہے وہ شیر ہی کے روپ میں کیوں نہ آئے۔

''شمیکا تم نے واقعی ٹھیک کہا تھا کہ ایسے کمزور، بزدل اور ڈرپوک جن کو منہ نہیں لگانا چاہیے اور لفٹ نہیں کرانی چاہیے۔ اگر تم اس کی محبت کا جواب محبت سے دے دیتی تو وہ تمہاری حفاظت کرنے پر قادر نہیں تھا۔ وہ کسی دوسرے جن سے ہار مان کر تمہیں اس کے آگے چھوڑ کر کسی پالتو کتے کی طرح دم دبا کر بھاگ جاتا..... تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر۔ جب وہ ایک انسان سے مقابلہ کرنا نہیں چاہتا تو بھلا اپنے سے زیادہ طاقت ور جن سے کیا مقابلہ کرتا۔''

اس سے پہلے کہ میری بات ختم ہوتی۔ غار کے اندر ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر چیز ہل رہی ہو۔ پھر ایک جگہ میں نے دھواں اُڑتا دیکھا تو سمجھ آ گیا کہ اس کو میری باتوں سے غیرت آ گئی ہے، اور وہ ہمارے سامنے جلوہ گر ہونے والا ہے۔ میں نے شمیکا کو ایک طرف کھڑا کر دیا تھا، اور خود اس کے آگے ایکشن لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دھواں چھٹا تو میں نے دیکھا کہ وہ جن اپنی ڈراؤنی شکل میں نمودار ہوا ہے، شاید اس کا مقصد مجھے خوف زدہ کرنا تھا۔ میں خوش اس بات سے تھا کہ اسے غیرت دلا کر اپنے سامنے لانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ واقعی وہ ایک جن تھا..... مکروہ شکل والا، اس کی صورت انتہائی کریہہ تھی۔ آدھا چہرہ ایسا تھا جیسے کہیں آگ سے کبھی جھلس گیا ہو، اور آدھے چہرے پر کالے کالے اور موٹے بال اُگے ہوئے تھے، اس کی ایک آنکھ پھیل کر آدھے رخسار تک آئی ہوئی تھی اور دوسری آنکھ کی بناوٹ انسان کی آنکھ کے برعکس تھی، یعنی اس کی اس آنکھ کا ایک کنارہ ماتھے پر اور دوسرا رخسار پر آ گیا تھا۔ اس کا ایک ہونٹ اتنا باریک تھا کہ بہ مشکل دکھائی دے رہا تھا، اور دوسرا نیچے والا ہونٹ، اس قدر موٹا تھا کہ اس کی ناک کو شرما رہا تھا۔ اس کی بھدی، موٹی اور انتہائی بدصورت پکوڑا جیسی ناک اس کو مزید بدصورت بنانے میں کامیاب رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ ان میں جو روشنی ہے، وہ آگ جلنے سے قائم ہے، وہ ہمیں انہیں شعلہ بار نگاہوں سے گھو رہا تھا۔ گو اس کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہیں تھا، مگر اس کے ناخن کسی خنجر کی دھار سے کم نہیں تھے۔ اس نے لوہے کا لباس پہن رکھا تھا جیسا کہ میدانِ جنگ میں سپہ سالار دشمن کی تلواروں کے وار سے بچنے کے لیے پہنتے

تھے۔ اس زرہ بکتر کے پہننے سے وہ بھی جنگ جُو دکھائی دے رہا تھا۔

''اجنبی، تمہاری میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اس لیے تم میرے غضب کا خود کو شکار مت کرواور میرے اور شمیکا کے درمیان مت آؤ۔'' اس نے غضب ناک ہو کر دھاڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھو اموکا، اب شمیکا اور میں الگ الگ نہیں ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے ہیں، اب اس کی عزت، میری عزت ہے اور اس کی حفاظت کرنا اب میرا فرض ہے۔ لہٰذا میں درمیان سے کیوں کر ہٹ سکتا ہوں۔ بہتر ہے تم اپنی سرکشی سے باز آ جاؤ اور ہمارا پیچھا چھوڑ دو، ورنہ یہ جو تم عیاشی کرتے پھر رہے ہو، اور آزادی سے گھوم پھر رہے ہو، سب کچھ ختم ہو کر رہ جائے گا۔'' میں نے اسے دھمکانے کے لیے کہا تھا۔

''کیا ..... کیا کہا تم نے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے ہو۔'' اس نے بڑی حیرت اور دکھ سے پوچھا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کی اس بات کا مطلب کیا تھا۔ میں نے بات کچھ اور سوچ سمجھ کر شروع کی تھی کہ اسے غیرت دلا کر باتوں میں اُلجھا کر پابندِ وعدہ کر دوں گا، مگر اب بات کا رخ دوسری طرف مڑ گیا تھا۔ اس رخ سے اسے پھانسنا انتہائی آسان تھا۔

''ہاں اموکا، ہم ایک دوسرے کے نہ صرف ہو چکے ہیں بلکہ ایک دوسرے میں سما چکے ہیں۔ میں شمیکا کے اور شمیکا میرے دل میں سما چکی ہے، ورنہ تم خود سوچو کوئی انسان یہاں تک اپنی جان ہتھیلی پر لے کر کیوں آتا۔ وہ ایک جن زادی کے لیے سر سے کفن کیوں باندھتا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''اچھا تو تم میرا نام بھی جانتے ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ شمیکا نے تمہیں میرے بارے میں پہلے سے سب کچھ بتا دیا ہے۔'' اموکو نے کسی سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

''ہاں اموکا، جب ہم رات کو ایک ہی بستر پر سونے کے لیے لیٹتے تھے، تب پیار و محبت کے درمیان تمہارا ذکر آتا تھا۔ شمیکا مجھے بتاتی تھی کہ اموکا نے اسے پانے کی سر توڑ کوشش کی تھی۔ تم اسے نہ صرف چاہتے تھے بلکہ اس کے عشق میں بری طرح گرفتار تھے، تم شمیکا کے حسن و جمال اور دلکش سراپے پر مرمٹے تھے۔ تم نے خود کو اس کے حسن کا شیدا کر لیا تھا۔ وہ ایک ساحرہ کی طرح تم پر اپنے جوبن کا جادو کرتی رہی تھی۔ اس کی گھنی، شب رنگ اور ریشمی زلفوں کے تم اسیر ہو گئے تھے، مگر وہ اپنی زلفوں کے جال میں، تمہیں تمہاری سرکشی کی وجہ سے قید کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جب میں اس کے نرم و گداز جسم کو اپنے انتہائی قریب کرتا اور اس کے بدن کی حدت مجھے پگھلائے دیتی، تب میں شمیکا سے کہتا۔

''واقعی تمہیں اموکا دل و جان سے چاہتا ہوگا۔ وہ تم پر دنیا نچھاور کرنا چاہتا ہوگا، وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوگا، اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے، تم چیز ہی ایسی ہو۔ ایک بار جو تمہاری آنکھوں سے شراب پی لے، اس پر سے ساری عمر اس کا خمار نہ اُترے، تب شمیکا جذبات کی رو میں بہہ جاتی، کیوں کہ ہر عورت اپنے حسن کی تعریف سن کر آسمان پر پرواز کرنے لگتی ہے، چاہے وہ تعریف جھوٹی ہو یا سچی اور پھر شمیکا میں تو یہ تمام تر خوبیاں موجود تھیں۔ وہ انتہائی افسانوی انداز میں میرے لمس سے سرشار ہو کر کہتی۔

''دیکھو ارسلان..... جیسے دنیا کا طاقت ور ترین جن حاصل نہیں کر سکا، وہ پکا پھل خود بخود تمہاری جھولی میں آ گرا ہے۔''

پھر میں رات بھر اس پھل کا رس چوستا رہتا اور مزے اُڑاتا، مگر مجھے حیرت تھی کہ میں اس پھل کو جتنا کھاتا، میری بھوک اس قدر بڑھتی رہتی۔ شمیکا نے مجھے آنکھیں دکھائیں تو میں کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا، اور شمیکا کے کان کے قریب منہ لے جا کر سرگوشی کی۔

''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ لہٰذا تم میری محبت ہو اور اموکا سے اس وقت میری جنگ ہو رہی ہے، وہ شکوک و شبہات کے درمیان نبرد آزما ہے۔ میری باتوں سے اس کے اندر ایک اور جنگ کا محاذ کھل چکا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے، وہ اپنے آپ سے برسرِ پیکار ہے۔ لہٰذا مجھے جھوٹ کا سہارا لینے دو۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ میری باتوں کے جال میں با آسان پھنس جائے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرا اور تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا۔'' میں نے ایک بار پھر اموکا کی طرف توجہ دی۔

''تو کیا تم لوگ ایک دوسرے کی قربت میں حسین راتیں بھی گزار چکے ہو۔'' اس بار اموکا کے لہجے میں شکست خوردہ سپاہی کا لہجہ جھلک رہا تھا۔ اس کے الفاظ میں ایک دکھ اور دردناک کرب شامل تھا۔

''ہاں اموکا..... ہم کافی عرصے سے ایک شادی شدہ جوڑے کی طرح زندگی گزار رہے ہیں، اور میاں بیوی کی حیثیت سے ہمیں لوگ جانتے ہیں، ہمارے پڑوسی وغیرہ بھی ہمیں دیکھ کر رشک کرتے ہیں کہ ہم ہر وقت ایک دوسرے کی رفاقت میں رہتے ہیں۔ اب اگر تم ایک بے غیرت شخص کی طرح میرا جھوٹا کھانا پسند کرو تو تم دنیا کے بے غیرت ترین جن ہوں گے، اور میں تمہیں اس بے غیرتی پر عالمی ایوارڈ بھی دلا دوں۔'' اس سے پہلے میں مزید اموکا کو کھری کھری سناتا اور اس کی غیرت کو مزید جوش دلاتا، وہ دھویں میں تحلیل ہو کر غائب ہو چکا تھا۔

''یہ تم نے کیا جھوٹ کا پلندہ کھول دیا تھا۔'' شہکا نے مجھے بازو سے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''شہکا ہمارے پاس اور کوئی تدبیر یا حربہ نہیں تھا، جو اسے قابو میں کرتے، اور اس طرح شکست دیتے۔ تم نے کہا تھا کہ وہ معمولی خنجر اور تلواروں سے بھی نہیں مر سکتا۔ لہٰذا جب میں نے اسے غیرت دلائی تو میں سمجھ گیا کہ وہ تمہیں پانا چاہتا تھا، اس وقت جب کسی جن یا کسی مرد نے تمہیں ہاتھ تک نہیں لگایا ہوگا۔ میں نے یہ محسوس کرتے ہی اسے ان باتوں کی طرف لے آیا تاکہ وہ خود ہی غیرت کھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارا پیچھا چھوڑ دے، اور تم نے دیکھا ہوا بھی یہی ہے۔ وہ بے غیرتی کا عالمی ایوارڈ نہیں لینا چاہتا تھا، وہ کیا کوئی بھی جن اور مرد یہ نہیں چاہتا کہ وہ کسی دوسرے کا جوٹھا کھائے۔ یہ آخری کیل تھی جو میں نے اموکا کے تابوت میں ٹھونک دی۔ میں معذرت چاہتا ہوں اگر میری مصنوعی اور من گھڑت باتوں سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہو۔'' شہکا نے میرا غیر تاثراتی چہرہ اپنے ہاتھوں کے کٹوروں میں بھر لیا، اور ایک رنگین مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔ وہ ایک کلی کی طرح مسکراتی ہوئی قیامت خیز ہو گئی تھی۔ میں نے بھی جذباتی سا ہو کر اس کو دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔ حسن و شباب کی کشش سے ہم ایک دوسرے کی طرف مقناطیس کی طرح کھنچتے چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ ہم ایک دوسرے کے گلے سے لگ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے، اور عیش و شان کی وادی میں گم ہو جاتے، غار کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو ہم دونوں ایک جھٹکے سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہو گئے۔ ایک جن نے اندر داخل ہو کر آداب بجایا۔

''آپ کو سردار بلا رہا ہے۔'' اندر آنے والے جن نے بتایا تھا۔ ہم دونوں اس کے ساتھ چل پڑے۔ راستے میں سے شمیکا نے کہا تھا کہ مطلب کی بات کرنے میں دیر نہ کرنا۔ ہم لوگ اپنا ساحلِ مراد پا کر جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ میں نے بھی چلتے چلتے شمیکا کو تسلی دی تھی کہ اس کے پلان کے مطابق تمام جنوں کے ہجوم کے سامنے ہوتے ہی ہم قسطنطنا سے بات کریں گے۔ ہمارے آگے آگے چلنے والے جن کا رخ سردار قسطنطنا کے غار کی طرف تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ سردار نے ہمیں اپنے دولت کدے پر اپنے بیٹے کی صحت یابی دکھانے کے لیے بلایا ہے۔ بس اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے پوری امید تھی کہ اس نے میری عزت کا بھرم رکھ لیا ہوگا۔ کیوں کہ وہ گولی تو حکیم بابا نے بے موقع عطا کی تھی، شاید وہ کوئی فرشتہ تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے غیب کے علم سے بتایا تھا کہ آئندہ کس قسم کے حالات پیش آنے والے ہیں، لہٰذا اس فرشتے نے مجھ سے پہلے محنت کا کام لیا اور اس کے عوض یہ تحفہ دے دیا جو آج اور عین موقعے پر کام آیا تھا، اور ہماری سب سے بڑی مشکل حل کر دی تھی۔ ورنہ جب میں شمیکا کے ساتھ شہر

سے اس بستی کی طرف اور جنوں کے سردار قسطنطنا سے ملنے روانہ ہوا تھا تو میرے وہم و گمان اور ذہن میں بھی نہیں تھا کہ میں جنوں کا سامنا کیسے کروں گا، اور قسطنطنا سے شمیکا کی جناتی قوتیں واپس کیسے، اور کیوں کر لے سکوں گا۔ ''ہمتِ مرداں، مددِ خدا'' کا سوچ کر میں نے کمر کس لی تھی، اور پھر واقعی خدا نے میری مدد کی تھی۔ ہم غار کے دہانے پر پہنچے تو ہمارے آگے چلنے والا جن اجازت لے کر اندر گیا اور پھر سردار کو اطلاع دے کر ہمیں اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

''آؤ..... آؤ..... میرے محسن! آؤ یہاں..... آؤ۔'' سردار نے انتہائی خوش دلی سے ہمیں مبارک باد دی تھی، اور بڑے پرتپاک طریقے سے ہمارا استقبال کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تمام جن ہمارے ادب میں رکوع کی حد تک جھک گئے تھے۔ ایک بڑی تعداد جنوں کی موجود تھی۔ شاید یہ وہ جن تھے جو سردار کے خدمت گزار تھے، لیکن غار کے اندر ایک بڑا کمرا ہال جیسا بھی تھا جس پر بڑے بڑے پردے لٹک رہے تھے، وہاں سے بھی چہ مگوئیوں اور شور شرابے کی حد تک باتوں کی آوازیں ہی آ رہی تھیں۔ محسوس ہو رہا تھا کہ جن زادے کی صحت یابی کی خبر سن کے سردار کے تمام عزیز و اقارب جمع ہو چکے ہیں۔ سردار کے پاس کھڑے ہوئے ایک نوجوان جن نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ چوم لیا۔ میں ہچکچایا تو سردار نے کہا۔

''میرے محسن..... اے والہانہ محبت اور دلی عقیدت کا اظہار کرنے دو۔ تم ہی وہ مسیحا ہو جس نے تمام ڈاکٹروں، طبیبوں اور حکیموں کے جواب دینے کے بعد اس کی مسیحائی کی، اور اسے دوسری زندگی عطا کی۔'' وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔

''اور ہاں تم کو خدا نے ہمارے لیے ایک فرشتے کی صورت بھیجا ہے، لہٰذا ہمیں اپنی خدمت کا موقع دو۔'' سردار کے چہرے پر مسرتوں کی قوسِ قزح چھا گئی تھی۔ اس کے کیا، تمام جنوں اور رشتے داروں پر خوشیوں کی بہار مسلط ہو گئی تھی۔ سبھی کے چہرے اور دل تر و تازہ گلابوں کی طرح مہک رہے تھے۔ مسکراہٹیں دھنک کی طرح جلوہ گر ہو گئی تھیں۔ فرحت اور راحت و سکون کے آثار پتھر پر لکیر کی صورت جم گئے تھے۔

''آپ لوگوں کی والہانہ عقیدت اور دلی محبت اپنی جگہ، مگر سردار میرا خیال ہے کہ کبوتر، کبوتروں میں اور بلبل بلبلوں میں ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ اپنے ہم نسل اور ہم جنس کے ساتھ زیادہ خوش و خرم اور آرام و سکون و اطمینان سے رہ سکتا ہے، اپنے دل کی بات کر سکتا ہے، اپنے ہم جنس اور اپنے ہم نسل کو راز دار بنا سکتا ہے۔'' میں نے مبہم کے انداز میں بات شروع کی۔

''ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے نوجوان۔'' سردار نے گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تو سمجھ میں آ رہی ہے کہ ہم جن ہیں، اور تم آدم زاد، مگر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔'' سردار کی بات گرج دار آواز میں سن کر سبھی خاموش ہو گئے اور ہمہ تن گوش بھی۔ موقع اچھا تھا، مجھے فائدہ اٹھانا تھا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ لوہے گرم ہو تو ہتھوڑا مار دینا چاہیے۔

''سردار..... میرا مطلب سیدھا سادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم اور میری کوششوں سے تمہارے جانشین، جائیداد اور سرداری کے وارث اور تمہارے لختِ جگر کو نئی زندگی دی۔ اب ہمارا کام ختم ہو گیا ہے، لہٰذا ہم اپنے شہر اپنوں میں جانا چاہتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ خدا تم سب کو بھی سلامت رکھے۔'' میں نے اس کے بیٹے کی طرف اشارے کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے اجنبی..... ہم کب تمہیں یہاں پر سدا کے لیے روکنا چاہ رہے ہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ تمہاری جی بھر کے خدمت کریں، اور تمہیں تحفے تحائف دے کر رخصت کریں، اس دوران ہم دل کھول کر اپنے محسن اور مہمان کی میزبانی کر لیں گے۔'' سردار نے تمام جنوں پر نگاہ ڈال کر کہا جو سبھی اپنی اپنی جگہ، اپنے ہونٹوں پر مودب، خاموش اور مسکان سجائے کھڑے تھے۔

''اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے کہ تم جانا چاہتے ہو تو ہم تمہیں روکیں گے نہیں، مگر تمہیں ہمارے تحائف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے کر رخصت ہونا پڑے گا۔" اس بار سردار کے بیٹے نے باتوں میں حصہ لیا تھا۔

"برادرم! ہمارے لیے اس وقت سب سے قیمتی تحفہ شمیکا کی وہ جناتی طاقتیں ہیں جو سلب کر لی گئی ہیں۔ اگر وہ مل جائیں تو ہمیں ہماری منزلِ مراد مل جائے گی۔"

میری بات پر دیگر جنات چونکے تھے۔ جنوں کے سردار کے چہرے پر کچھ دیر کے لیے اداسی چھا گئی تھی جو ایک دم رفع ہوگئی۔ بیٹے نے اپنے باپ کی طرف دیکھا تو وہ آگے بڑھ کر گویا ہوا۔

"ہاں اجنبی! ہم تمہیں تمہاری پسند کا ہی تحفہ دیں گے، اور ڈھیر ساری دعائیں بھی، کیونکہ تم نے وہ کام کر دکھایا ہے جو بڑے بڑے نامور اور قابل لوگ نہیں کر سکے۔ تم نے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے جس سے ہم جن بھی قاصر تھے۔ لہٰذا آپ سے میں شمیکا کو اس کی وہ جناتی طاقتیں اور تمام ترشکتیاں واپس کر رہا ہوں جو میں نے اس کے ہاتھوں اپنا قیمتی ہیرا کھونے کے بعد سلب کر لی تھیں۔" سردار نے چند لمحوں تک آنکھیں بند کر کے نجانے کیا کیا جنتر منتر پڑھے، اور کچھ دیر بعد سبھی نے دیکھا کہ ایک روشنی کی لکیر غار کے اندر پہاڑ کے سرے سے داخل ہو رہی ہے، حالاں کہ پہاڑ کے اندر روشنی کے داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سردار نے آنکھیں کھول کر اس روشنی کو اپنی مٹھی میں قید کیا، اور اشارے سے شمیکا کے سر سے پاؤں تک ہاتھ پھیرا۔ شمیکا میں ایک بجلی سے در آئی تو وہ خوشیوں میں نہا گئی۔ اس کی مسرت اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

"سردار میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے وعدے کے مطابق مجھے میری جناتی طاقتیں لوٹا دیں۔ سردار سے ایک اور کرم کی درخواست کرتی ہوں۔" شمیکا یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔

"ہاں شمیکا آج ہم بے حد خوش ہیں۔ ہمارے بیٹے کا صدقے آج ہم سے کچھ بھی مانگ لو۔" سردار نے بڑی سخاوت سے کہا۔

"سردار میرے والدین۔" اس نے اپنی بات جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی۔ اسے سردار کی عزت کا بھی خیال تھا۔

"وہ دیکھو۔ پردے کے پیچھے سے جنوں کا ایک جوڑا باہر آ گیا تھا۔ شمیکا نے آگے بڑھ کر ان کے قدموں کو ہاتھ لگایا اور ان کے ماتھوں پر بوسے دیئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ شمیکا کے وہ والدین ہیں جنہیں سردار قسطنطنا نے ہیرا کھونے کی پاداش میں اپنی قید میں رکھ چھوڑا تھا، اور اب انہیں آزاد کر دیا گیا ہے۔ شمیکا میری دوست تھی اور میری دوست کے ماں باپ میرے بھی ماں باپ کی طرح تھے۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر ان کے پیروں کو چھو لیا۔ انھوں نے میرے اور شمیکا کے سروں پر ہاتھ پھیرا تھا اور شفقت دکھائی تھی مگر ان کی آنکھیں ضبط کے بندھن توڑ چکی تھیں۔ آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے موتیوں کی طرح ان کے رخساروں پر مسلسل بہہ رہے تھے۔ وہ میرے بارے میں زیادہ تو نہیں جانتے ہوں گے، مگر انہوں نے اتنا اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ میں شمیکا کا دوست ہوں اور اس کے ساتھ یہاں تک پہنچا ہوں۔

"اجنبی شہزادے تم نے اور شمیکا جی نے تو میرے والد سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق تحفے مانگ لیے، مگر اس سے بھی تو کوئی خواہش کرو، جس کو تم نے نئی زندگی دی ہے۔" سردار کا بیٹا دو قدم آگے بڑھ آیا تھا اور بضد تھا کہ اس سے کسی من پسند تحفے کی فرمائش کی جائے۔ میں چاہتا تھا کہ شمیکا کے لیے کوئی فرمائش کروں، مگر شمیکا چاہتی تھی کہ میرے لیے کوئی سہولت کی چیز مانگ لے۔ شمیکا مجھ سے جیت چکی تھی۔

"چھوٹے سردار...... اگر آپ کی خواہش ہے کہ آپ ہمیں کوئی من پسند تحفہ پیش کریں تو میں آپ سے وہ آشکارا عدسہ مانگتی ہوں جس سے کوئی آدم زاد باآسانی جنات کو غیب حالت میں بھی دیکھ سکتا ہے۔" شمیکا کی بات سن کر کئی جنات تو حیرت کا مجسمہ بن گئے

تھے۔ شاید انھیں علم ہی نہیں تھا کہ ایسا کوئی شیشہ بھی ہے، جس سے انسان انھیں ظاہر ہوئے بغیر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ "ٹھیک ہے...... شمیکا باجی، میں آپ کو وہ آشکارا عدسہ دے دیتا ہوں، مگر اس وعدے کے ساتھ کہ اس کا ناجائز استعمال نہیں کیا جائے گا اور اس کو کسی دوسرے عام افراد کو نہیں دیا جائے گا۔" چھوٹے سردار کی بات اپنی جگہ بجا تھی۔

"نہیں چھوٹے سردار، آپ بے فکر رہیں۔ ہم اس کا خود بھی ناجائز استعمال نہیں کریں گے، اور کسی ایرے غیرے شخص کو بھی نہیں دیں گے۔ میں یہ آشکارا عدسہ ارسلان کے لیے لے رہی ہوں۔ یہ میرا دوست میرے ساتھ رہے گا تو اس کو وہ جن نظر نہیں آئے گا جو مجھ سے بات چیت کر رہا ہوگا یا مجھ پر حملہ آور ہونے والا ہوگا۔ ہم اس نیت سے یہ آشکارا عدسہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ سرکش جنوں کی سرکشی کو نظر میں رکھیں، اور ان سے ہوشیار رہیں۔" شمیکا نے وضاحت کی۔ چھوٹے سردار نے اشارہ کیا تو ایک جن پلک جھپکتے میں ایک براؤن رنگ کے شیشوں کا باریک سا چشمہ لے آیا۔ چھوٹے سردار نے خود اپنے ہاتھوں سے میری آنکھوں پر وہ چشمہ لگا دیا۔ میں نے چشمہ لگایا تو اب ان تمام جنوں کی اصلی صورتیں نظر آنے لگیں، جو میرے آس پاس اور دور فاصلے پر موجود تھے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی بررخ میں آ گیا ہوں، جہاں صرف بدروحیں موجود ہیں۔ ایک عجیب سا خوف و ہراس میرے بدن میں پھیل گیا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے وہ چشمہ اتار لیا۔ اب پھر وہ تمام جنات انسانوں کی شکل میں میرے سامنے موجود تھے۔ میں نے چھوٹے سردار کا شکریہ ادا کیا، اور رخصت ہونے کی اجازت لی۔

"تم نے مجھ سے تو کچھ طلب نہیں کیا۔ تم میری عنایات کے بغیر کیسے جا سکتے ہو۔" سردار کی بیوی نے سامنے آتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ایک ممتا سے بھری اور مشفق مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"اماں جی! آپ کی پیش کش تو تاحیات ہیں۔ پھر کبھی آنے پر آپ کو زحمت دے سکتے ہیں۔" میں نے ان کے قدموں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے...... تمہیں دنیا میں جب کہیں بھی اور کسی بھی قسم کی ضرورت پیش آئے یا مشکل آن پڑے اور میری یاد آئے تو میں اپنے وعدے کے مطابق تم دونوں کی مدد کرنے اور مشکل وقت پر کام آنے کی پابند ہوں۔" اماں جی نے ہمارے سروں پر ممتا بھرا ہاتھ رکھا تو ہمیں بھی ایک قسم کا سکون اور عجیب سا آرام ملا۔ شمیکا نے اپنے والدین کو ساتھ لیا اور ہم نے رخصت کی اجازت چاہی۔

"میری طرف سے یہ حقیر سا تحفہ رکھ لو۔ زندگی بھر تمہارے کام آتا رہے گا۔" اماں جی نے میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بٹوا تھماتے ہوئے پیار کیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور ہم چاروں غار سے نکل آئے۔ سردار، اس کی بیوی اور بیٹا دروازے پر ہمیں الوداع کہنے کے لیے آئے تھے۔ ہم صحرا کی طرف چلنے لگے تو دس بارہ جن ہمیں چھوڑنے یعنی اپنے پروں پر بٹھا کر صحرا پار کرانے کا کہنے لگے۔ میں نے اشارے سے منع کر دیا کیوں کہ شمیکا کی جناتی طاقتیں لوٹ آئی تھیں۔ اس میں ہی وہ تمام صفات در آئی تھیں جو ایک جن میں ہوتی ہیں۔ تمام شکتیاں ملنے کی وجہ سے وہ بے حد طاقت ور اور انتہائی شکتی شالی لگ رہی تھی۔

"بیٹا ہم بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اب ہم سکون سے رہ کر اپنی زندگی کے دن گزارنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں خوشی ہے کہ تم لوگوں کی کوششوں سے ہم آزاد ہو گئے ہیں، مگر ہم اس بستی سے دور جا کر کہاں رہیں گے، اور جہاں بھی رہیں شاید خوش نہ رہ سکیں۔ جیسے ارسلان بیٹا تم نے کہا تھا کہ کبوتر، کبوتروں میں اچھا لگتا ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی ہمارے ساتھیوں میں رہنے دو۔" شمیکا کے باپ نے التجانہ انداز میں کہا تو ہمیں بھی احساس ہوا کہ واقعی ان لوگوں کو آزاد کرانا مقصد تھا جو پورا ہو گیا۔ یہ ان سے الگ نہیں ہونا چاہتے تو ٹھیک ہے۔ انہیں یہیں رہنے دیا جائے۔ آزادی کے ساتھ نکلی

Courtesy www.pdfbookstree.pk

آب وہوا میں سانس لے کر اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا حق بھی کو حاصل ہے۔

"جی مائی باپ جیسے آپ کی خوشی، ہم آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔ میری خواہش تھی کہ آپ میرے ساتھ شہر چل کر رہیں۔ میں اور ارسلان آپ کی خدمت کریں۔ اگر آپ یہیں رہنا چاہتے ہیں تو آپ کی خوشی اور رضا میں ہماری خوشی اور رضا ہے۔" شمیکا نے اپنے والدین کو دلاسا دیا۔

"اماں جان یہ ارسلان ہیں۔ میرے بچپن اور سچے دوست، اب میں انھیں کے ساتھ رہ کر غریب، نادار، بے بس و مظلوم انسانوں کی فلاح و بہبود کا کام کروں گی۔ ارسلان بھی ایک خدا ترس اور رحم دل انسان ہیں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔" شمیکا نے بڑی عزت اور نرم لہجے میں میرا تعارف کراتے ہوئے نہ صرف اجازت طلب کی، بلکہ آئندہ زندگی گزارنے کا مقصد بھی بتا دیا تھا۔

"اللہ تعالیٰ سدا تم دونوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور تمہیں خوشیاں نصیب کرے۔" شمیکا کے والدین نے دل سے دعائیہ کلمات ادا کیے تو ہم دونوں نے جلدی سے آمین کہا۔ وہ مسکراتے ہوئے رخصت ہو رہے تھے تو ان کے چہرے مہرے سے شاش بشاش ہونے کے ثبوت مل رہے تھے، جس نے ہمیں بھی مطمئن کر دیا تھا۔

ایک بار پھر شمیکا نے میری جانب اپنا خوب صورت اور نازک سا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ میں نے بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ شاید وہ پرواز کی تیاری کر رہی تھی، کیوں کہ ہمیں یہ صحرا پار کر کے ان جنگلات سے ہوتے ہوئے شہر جانا تھا۔ میں نے اپنا چشمہ اور بٹوہ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ اب میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شمیکا کی پرواز بہت ہلکی تھی۔ شاید اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ وہ ایک عرصہ دراز کے بعد پرواز کے قابل ہوئی تھی اور پھر میں اس کے ساتھ تھا، اس پر پرواز کا لطف دوبالا ہو گیا تھا۔

"اگر تمہیں خوف اور ڈر محسوس نہ ہو تو تم آنکھیں کھول سکتے ہو۔" شمیکا نے کہا۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ پیار کیا تو ڈرنا کیا اور پھر میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ جب ایسی ایسی جنات کی ڈروانی صورتیں دیکھ کر مجھے ڈر نہیں لگا تو پھر اس اونچائی سے پرواز کرتا ہوا کیوں ڈروں۔ لوگ جہاز میں بیٹھ کر بھی تو اسی طرح زمین و آسمان کا نظارہ کرتے ہیں۔ اب مجھے بھی کچھ نظر آ رہا تھا۔ جسے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ جنات کی پرواز کی رفتار ہوائی جہاز سے بھی تیز تھی۔ تبھی تو وہ پلک جھپکتے میں ہر کام کو انجام دے دیتے تھے۔ اکثر لوگوں نے جنات کے قصے سنے ہیں۔ پریوں کی کہانیاں مشہور ہیں۔ چڑیلوں کا خوف ذہنوں پر سوار ہے اور پھر بھوت پریت کو لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا بھی ہے۔ بدروحوں نے تو نجانے اپنے کتنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ یہ ماورائی مخلوق اور ان سے سرزد ہونے والے واقعات بھی فرضی اور من گھڑت نہیں ہے۔ کچھ ناہنجار لوگ جنات اور دیگر مافوق الفطرت مخلوقات کا انکار کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں کہ جنات کا ذکر دنیا کی سب سے مقدس کتاب قرآن پاک میں موجود ہے۔ "سورہ جن" کے نام سے پوری سورت ہے، لہٰذا جنات کا انکار کرنا قرآن کی آیت کا انکار کرنا ہے، جو کفر ہے اور ایک مسلمان کو ایمان سے خارج کر دیتا ہے۔ لہٰذا جنات کا وجود ہے۔

"ٹھہرو! وہ دیکھو" میں نے صحرا کے درمیان میں دو ہیولے دیکھے تھے۔ تیز رفتاری کے سبب وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے۔ میری آواز پر شمیکا نے اس طرف دیکھا، جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ دو افراد تھے، ایک سیدھا لیٹا تھا اور دوسرا صحرا کے بیچ میں صحرا کی ریت ہٹا کر گڑھا بنا رہا تھا۔ مجھے حیرت نے گھیر لیا کہ اس قدر دھوپ میں اور تپتی ہوئی ریت پر کوئی کیوں اور کیسے لیٹا ہے اور اس جھلسا دینے والی گرمی میں دوسرا شخص اس قدر محنت اور مشقت کیوں کر رہا ہے۔ شمیکا

نے اپنی پرواز کا رخ ان کی طرف کر لیا تھا۔ جوں جوں ہم ان کے قریب ہو رہے تھے، ہماری حیرت بڑھتی جا رہی تھی اور ہم پر ان کی پُراسراریت کے راز افشا ہونے لگے تھے۔ جو شخص سیدھا لیٹا تھا وہ رسیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر انتہائی درد و کرب کے آثار نمایاں تھے۔ وہ رسیوں کی جکڑن اور دھوپ کی حدت کے سبب بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ شاید صحرا کی تپتی ریت نے اس کی کمر کی کھال کو جلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ بار بار اپنی کمر کو ریت سے اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بے بسی اور لاچاری پر ہمیں بہت ترس آیا۔ دوسرے شخص پر نظر پڑی تو مجھے تجسس نے گھیر لیا۔ یہ شخص مسلسل ریت ہٹا رہا تھا اور ایک بڑا اور قدرے گہرا گڑھا کھودنے میں مصروف تھا۔ اس دوسرے شخص کے چہرے پر کسی قسم کا خوف اور ڈر نہیں تھا۔ اس کا پورا وجود کسی بھی دہشت ناکی یا ہیبت ناکی سے عاری تھا۔ بس اس کے ماتھے پر محنت و مشقت کرنے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اس لق و دق صحرا میں کسی انسان کی مجال نہیں تھی کہ وہ اتنا طویل سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے۔ مسافت کا خیال آتے ہی میں نے ان کے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کہیں سے اونٹ یا گھوڑا نظر آ جائے جس میں ان لوگوں نے سواری کی ہوگی، مگر دور دور تک کسی جانور یا سواری کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ میرے تجسس میں اضافہ ہونے لگا۔ اس قدر گرمی اور دھوپ کی شدت تھی کہ اس ریت پر پاؤں رکھنا جلتے توے پہ پاؤں رکھنے کے مترادف تھا۔ پھر یہ لوگ یہاں تک کس طرح پہنچے۔ ایک خیال میرے ذہن کے گوشے میں یکا یک اُبھرا۔ میں نے سوچا کہ ایسی جگہ پر ایک انسان نہیں آ سکتا اور اگر وہ کسی بھی طرح آ گیا تو پھر دھوپ کی حدت اور پیاس کی شدت اسے بن موت مار دے گی۔ یہ سوچتے ہی میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر میری پینٹ کی جیب میں چلا گیا۔ میں نے آشکارا چشمہ نکال کر انھیں بغور دیکھا۔ کیوں کہ میرے دل نے گواہی دی تھی کہ اگر اس خطرناک اور نہ ختم ہونے والی مسافت کو انسان طے نہیں کر سکتا ہے تو پھر جنات تو یہاں تک با آسانی پرواز کر کے آ سکتے ہیں۔ جس طرح تمو ہمیں گھنے جنگلات اور اس صحرا سے بھی پرے لے گیا تھا اور پھر آج اب شمیکا اسی طرح سے صحرا پار کر رہی تھی کہ ہماری نظر ان اشخاص پر پڑی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ شخص جو اب تک بہت بڑا اور قدرے گہرا گڑھا کھود چکا تھا، وہ ایک جن تھا۔ آشکارا چشمے نے میری مشکلات کو کس قدر آسان اور سہل کر دیا تھا۔ اب میں ان ریاکار اور بہروپ بھرنے والے جنات کو بھی پہچان سکتا تھا جو انسان کے روپ میں آ کر انسانوں کو تنگ کرتے تھے اور نقصان پہنچاتے تھے اور پکڑے نہیں جاتے تھے۔ مجھے اس شخص پر ترس آ رہا تھا جو رسیوں میں جکڑا ہوا بے بس اور مجبور پڑا تھا۔ وہ آدم زاد تھا۔ وہ جن نہیں تھا۔ اب کچھ کچھ معاملہ مجھے سمجھ آ رہا تھا۔

"کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" شمیکا نے جن کو باتوں میں الجھایا اور میں آدم زاد کی رسیوں کو کھولنے لگا۔ گڑھا کھودنے والا جن اچانک اپنے سامنے ہمیں پا کر بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کے ہاتھ ایک دم رک گئے اور وہ خود ساکت ہو گیا، مگر کدال پر اس کی گرفت پہلے سے بھی کہیں زیادہ مضبوط ہو گئی۔ شاید اس کو ہماری غیر متوقع آمد کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہمیں اپنے سامنے پا کر غصے سے بے قابو ہونے لگا تھا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے پوچھا ہے کہ تم کون ہو اور یہ یہاں کیا کر رہے ہو؟" شمیکا نے اس بار غضب ناک انداز میں بات کی تھی۔ کسی بزدل انسان کے پاس معمولی سا چاقو بھی ہو تو اس کی ہمت بندھ ہو جاتی ہے۔ بندوق ہو تو وہ اپنی طاقت کو دوگنا تصور کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ شمیکا نے غضب ناک لہجے میں بات کی تھی۔ اس کے پاس چاقو، تلوار یا بندوق تو نہیں تھی مگر ان سب پر اس کی وہ جناتی طاقتیں بھاری تھیں جو اس سے چھین لی گئی تھیں، اب تو وہ تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ، ہر قسم کے اسلحے سے لیس تھی۔ پھر اسے اپنی شکتیوں پر ناز کیوں نہ ہوتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم بہرے ہو گیا...... جو میرے بات سن نہیں رہے ہو، یا گونگے ہو کہ جواب نہیں دے سکتے۔ تم سیدھی طرح بتاتے ہو یا تم سے اُگلوانا پڑے گا۔" شہکا نے اس کے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔

"تم میں سے جن کون ہے۔" اس شخص نے سیدھا کھڑے ہو کر بجائے جواب دینے کے سوال کردیا۔ وہ بار بار اپنی ناک کے نتھنوں کو جنبش دے رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بھی ایک جن ہے اور اپنی نسل کی خوشبو سونگھ کر پہچاننے کی کوشش رکر رہا ہے۔ اس دوران میں نے دوسرے شخص جو کہ آدم زاد تھا کو کھول کر سیدھا کھڑا کردیا تھا۔ اس کی کمر پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔ وہ شخص رسیوں کی قید سے آزاد ہوا، اور سیدھا کھڑا ہوتے ہی چاک و چوبند ہو گیا تھا مگر کمر کا درد اور تپتی ریت کی جلن اسے حد درجہ پریشان کررہی تھی۔ میں نے اس کی کمر سہلانے کے لیے ہاتھ پھیرا تو وہ آہ و فغاں کرنے لگا۔ میرا ہاتھ اس کے پسینے سے تر بتر ہو گیا تھا مگر مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ میرے ہاتھ پر پسینہ نہیں اس کی کمر سے جھلنے کے باعث بہنے والا خون لگا ہے۔ آدم زاد کا خون دیکھ کر میری رگوں میں خون گردش کرنے لگا۔

"ہم میں سے جن کوئی نہیں ہے۔ تم بتاؤ یہاں کیا کرر ہے ہو۔ جلدی بتاؤ، ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ ورنہ ہم اس کا بدلہ بھی لے لیں گے۔" شمیکا نے اسے دھوکا دینے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔

"یہ ممکن نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی جن نہ ہو۔ تم ہو سکتی ہو یا یہ نوجوان۔ میں سالہا سال سے جنات کے درمیان رہا ہوں۔ میں اچھی طرح اپنی خوشبو کو سونگھ کر پہچان سکتا ہوں۔" اس نے ہمیں باتوں میں الجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"اب بتاتا ہے کہ تیرے ہوش ٹھکانے لاؤں۔" میں نے اس کے چہرے پر مکا رسید کرنے والا ایکشن کیا تو وہ مجھ سے بھی زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس نے اپنا وہ ہاتھ بلند کیا جس میں کدال تھام رکھی تھی۔ پلک جھپکتے میں اس نے پوری قوت سے کدال میرے سر پہ دے ماری۔ حملہ اس قدر تیز رفتاری سے کیا تھا کہ مجھے بچنے کی تو کیا، سوچنے کی بھی مہلت نہیں ملتی تھی۔ بس میں نے آنکھیں جھکا کر ذرا سا سر نیچے کرلیا تھا۔ چند ساعتوں کے بعد نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو کدال جس لکڑی میں تھی اس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے اور وہ شخص حیران و پریشان سا شمیکا کی طرف یک لخت دیکھے جا رہا تھا۔

"ابھی بھی بتاتے ہو کہ تم کون ہو اور یہاں کیا کرر ہے تھے یا پھر مزید کوئی قوت دکھانی پڑے گی یا پھر نئی ترغیب آزمانا ہو گی۔" شمیکا نے اسے گھورا تو وہ سمجھ گیا کہ اس کی دال گلنے والی نہیں ہے۔ وہ گویا ہوا۔

"میں ایک گورکن ہوں۔ جن گورکن۔ جو جنات کے انتقال پر انہیں دفناتا ہے اور اس طرح کا بڑا وسیع و عریض اور گہرا و کشادہ گڑھا کھود کر دفنا دیتا ہے۔ یہ شخص جنات کا دشمن ہے۔ روایتی حریف۔ اس کو ایک وظیفہ یاد ہے جس کی مدد سے اس نے نجانے کتنے جنات کو زندہ جلا دیا ہے۔ اس بار ہم کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس کو قابو کرنے اور بدلہ لینے میں۔ لہٰذا میں اس کو انتقاماً دفنا رہا ہوں۔ اس گہرے گڑھے میں تاکہ یہاں سے کسی طرح بھی اسے نکالا نہ جا سکے۔" وہ خاموش ہوا تو وہ شخص فوراً بولا۔

"نہیں بیٹا...... یہ جن جھوٹ بول رہا ہے۔ دراصل میں ایک عامل ہوں اور ان جنات کو باز رکھنے کی کوشش کرتا ہوں جو سیدھی سادی اور بھولی بھالی معصوم سی مسلمان لڑکیوں پر عاشق ہو کر انہیں جسمانی اذیت میں مبتلا کرتے ہیں اور ان کی اس گھناؤنی حرکات و سکنات کی بنا پر نہ صرف اس لڑکی کا گھر بار اور خاندان ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے بلکہ اس کی منگنی بھی ٹوٹ جاتی ہے اور بعض اوقات تو شادی شدہ عورت کو طلاق بھی ہو جاتی ہے۔ ان سرکش جنات کی وجہ سے ان کا بسا بسایا گھر خواہ مخواہ اُجڑ جاتا ہے۔ اور یہ جنات ایسا فقط اپنی عیاش طبیعت کی بنا پر کرتے ہیں۔ وہ ان مسلمان

لڑکیوں کے حسن و جمال اور جسمانی نشیب و فراز پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ اس میں ان لڑکیوں کا کیا قصور۔ وہ حسن تو انہیں قدرت کا عطا کردہ ہوتا ہے۔ ان کا حسین اور خوب صورت چہرہ تو خدا کی صناعی کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے۔ پھر نجانے کیوں یہ لوگ انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ حالاں کہ جنات میں بھی حسن و جمال والی اور خوب صورت عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ اور سب سے بڑھ کر بات جنات میں یہ بھی کہ ان کی عورتیں جس لڑکی کی چاہے شکل اختیار کرلیں اور جس عمر کی بننا چاہیں بن جائیں۔ پھر یہ نجانے ایسا کیوں کرتے ہیں۔ موصوف جن نے بھی ایک ایسی ہی حرکت کی تھی۔ وہ میرے دوست کی ایک کنواری اٹھارہ سالہ لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس کو جسمانی اذیت میں مبتلا کر رہا تھا۔ میرے دوست نے مجھے بتایا تو میں نے کلامِ الٰہی سے اس کا علاج شروع کیا۔ بیٹا کلام اللہ میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ یہ سرکش جن بھی اس کلام سے قابو میں آتے ہیں۔ ورنہ دنیا کی کوئی طاقت انہیں زیر نہیں کرسکتی۔ میں نے اسے قابو میں کرلیا تھا مگر اس نے حضرت سلیمانؑ کی قسم کھا کر مجھ سے وعدہ کیا کہ مجھے چھوڑ دیا جائے۔ میں پھر کبھی اس طرف کا رخ نہیں کروں گا، مگر اس نے اس پیغمبر کی قسم بھی توڑ دی جن کے یہ لوگ تابع ہوتے ہیں۔ یہ جھوٹا جن نہ صرف اس طرف آیا بلکہ اپنے پورے خاندان سمیت اس پر اور مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ مجھے تو یہ لوگ قابو کر کے یہاں لے آئے مگر خدا جانے وہ لڑکی کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔" وہ شخص حقیقت بیان کر کے خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی ایک ایک بات پر سچ کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ واقعی خدا ترس بندہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔

"بیٹا اس نیک کام کی پاداش میں یہ سفاک جن مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صحرا کے بیچ اس گڑھے میں زندہ دفن کرنے والا تھا۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بچانے کے لیے آپ لوگوں کو کسی فرشتہ کی صورت بھیج دیا ورنہ یہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میرا بچنا ناممکن تھا اور اگر یہ مجھے اس گڑھے میں دفن کردیتا تو ساری عمر میرے گھر والے میرا انتظار کرتے رہتے۔ نہ انہیں میرے مرنے کی خبر ملتی اور نہ میں ملتا۔ وہ ساری زندگی اسی کشمکش میں مبتلا رہتے۔ نجانے میں زندہ بھی ہوں یا مر گیا ہوں۔ میں تم دونوں کا احسان مند رہوں گا۔ خدا تمہاری جوڑی سلامت رکھے۔" وہ شخص رحم طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے دوسرے شخص کو گھور کر دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ اس کا بھید کھل گیا ہے۔ اب اس کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچانے سے ان لوگوں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ میں نے شمیکا کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا کہ وہ اسے اس ظالم کارروائی کی سزا ضرور دے۔ شمیکا کو ایک بجلی کا سا جھٹکا لگا اور وہ اپنی جگہ سے اچھل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کسی تیز رفتار پرندے کی طرح آسمان کی وسعتوں میں پہنچ گئی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ شمیکا نے میری بات کا غلط مطلب تو نہیں سمجھ لیا۔ اس نے میری پوری بات بھی نہ سنی اور اُڑان بھرنے لگی۔ ایسا کیوں ہوا۔ میں نے ان دو افراد کی طرف گھوم کر دیکھا تو وجہ خود بخود مجھے سمجھ آ گئی تھی۔ وہ جن اپنے کرتوتوں اور سیاہ کاریوں کا راز افشا ہونے پر اور خود کو مجرم ثابت ہونے پر فرار ہو چکا تھا۔ اسے فرار ہوتا دیکھ کر شمیکا اس کے تعاقب میں لپکی تھی۔ وہ دونوں ایک آن میں شاید دوسرے آسمان پر پہنچ چکے تھے۔ میری نظر آسمان کی وسعتوں میں انہی کو تلاش کر رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی آگ کا گولہ آسمان سے گرا ہے اور پھر نیچے آتے آتے بجھ گیا ہے۔ ایسا چار پانچ بار دکھائی دیا۔ اگر ایک دو بار ہوتا تو میرا وہم ہو سکتا تھا مگر یہ میرا وہم نہیں تھا۔ میں نے متعجب نظروں سے بابا کی طرف دیکھا تو وہ میری حیرانگی کا سبب جان چکے تھے۔

"بیٹا۔ جنات اور شیاطین کو آسمان کی حدود پار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے مقرب فرشتوں کو آسمان کی حدود پر مقرر کیا ہوا ہے، جب بھی کوئی جن یا سرکش شیطان اس طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ فرشتے آگ کا گولہ ان کی طرف پھینکتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ جس سے ڈر کر وہ جن یا شیطان واپس زمین کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ لہٰذا وہ سفاک جن اور جس کا نام تم شمیکا لے رہے تھے، وہ آسمان کے قریب پہنچی ہوگی تو اللہ کے مقرب فرشتوں نے وہ آگ کے گولے ان کی طرف پھینکے ہوں گے جو تمہیں نظر آرہے تھے اور پھر آسمان سے زمین کا فاصلہ اس قدر زیادہ ہے کہ بڑے سے بڑا آگ کا گولہ زمین پر گرنے سے ہزاروں کلو میٹر پہلے ہی راکھ بن جاتا ہے۔ جب کافی دیر ہوگئی تو میں نے متوحش نظروں سے بابا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کہیں شمیکا کو وہ جن کوئی نقصان نہ پہنچادے۔'' ''کیا میں اپنی شمیکا کی کچھ مدد کرسکتا ہوں۔'' میں نے بابا سے التجائیہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم بیٹا کہ تم عملیات کا علم جانتے ہو یا نہیں لیکن میں اس علم سے فائدہ اٹھا کر شمیکا کی مدد کروں گا، کیوں کہ تم دونوں کی نیت اخلاص پر مبنی ہے اور تم انسانیت کے کام آنے والے لگتے ہو۔ ٹھہرو میں دائرہ کھینچ کر عمل شروع کرتا ہوں۔ تم میرے قریب آجاؤ۔'' بابا نے مجھے اپنے پاس بلا کر ایک ہاتھ کے اشارے سے کچھ پڑھ کر اپنے اور میرے گرد حصار قائم کیا اور کئی اوراد و وظائف پڑھنے لگے۔ ابھی ذرا سی دیر ہی ہوئی تھی انھیں عمل شروع کیے ہوئے کہ وہ سفاک جن اس طرف دور کہیں سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ایک باز کی طرح ہوا میں بڑی مہارت سے پرواز کر رہا تھا اور شمیکا بھی ایک طیارہ سمجھ کر میزائل کی طرح بالکل اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ سفاک جن بڑی آسانی سے شمیکا کو ہر بار دھوکا دے کر دوسری طرف نکل جاتا تھا۔ اس بار وہ ہماری طرف آیا تو بابا نے اپنی مٹھی کھول دی اور کھڑے ہوگئے۔ جیسے ہی وہ ہمارے سروں پر سے گزرنے لگا، بابا نے وہ مٹھی بھر ریت اس کی طرف اچھال دی۔ ریت جو شاید بیس گز اوپر بھی نہیں گئی تھی مگر وہ سفاک جن کی رفتار توڑنے میں بڑی کام آئی۔ شاید اس کی آنکھوں میں اس ریت کے ذرّے گر چکے تھے، تبھی وہ پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھوں سے آنکھیں مل رہا تھا۔ کسی کی آنکھ میں معمولی سے ذرّہ بھی چلا جائے تو وہ تڑپا کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی دونوں آنکھوں میں تو ہزاروں ریت کے ذرّے چلے گئے تھے اور وہ بھی علم کی پڑھائی کیے ہوئے۔ شمیکا نے اس موقعے سے فوراً فائدہ اُٹھایا، اور اسے بے قابو کر کے ہمارے پاس لے آئی۔ بابا نے انھی رسیوں سے اس جن کو جکڑ دیا جس سے وہ انھیں باندھ کر لایا تھا۔ رسیوں سے جکڑنے کے بعد اسے اسی گڑھے میں پھینک دیا گیا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کھودا تھا۔ کسی دانش ور نے کیا خوب کہا ہے کہ جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے، وہ خود اسی میں گرتا ہے۔ بابا نے شمیکا کو اشارہ کیا کہ وہ دونوں اس گڑھے کو جلد از جلد ریت سے پُر کردیں۔ جب وہ مٹی ڈال رہے تھے تو بابا نے ایک خطرناک عمل کے ذریعے اسے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ شاید مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میں اور شمیکا ریت کو ہموار کر کے فارغ ہوئے تو میں بابا کی طرف متوجہ ہوا۔

''بابا اگر ہم ہمیشہ کے لئے اس جن کو اس مٹی میں دفن کر دیتے تو کیا یہ سزا اس کے لیے کافی نہیں تھی؟ اس کو جلانے کی کیا ضرورت تھی؟'' نجانے میرا دل اس قدر نرم کیوں تھا۔ مجھ سے کسی گناہ گار یا بے گناہ کی موت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

''بیٹا! شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ جنات کی عمر ہزاروں سال کی ہوتی ہے۔ دنیا میں آبادی کس تیزی سے بڑھ رہی ہے اگر دو یا تین سو سال کے بعد آبادی یہاں تک آجاتی اور مکانات بنانے کے لیے اس جگہ کو کھودا جاتا تو اس جن کو رہائی مل جاتی اور پھر یہ ہم سب سے انتقام لیتا۔ ہم نہیں ہوتے تو یہ ہماری نسلوں کو بھی نہیں بخشتا۔ لہٰذا ایسے ظالم، ستم گر اور سفاک جنات کو جلا کر ان کا قصہ ختم کر دینا پڑتا ہے۔'' بابا کی بات سن کر شمیکا کی کسی ناگواری کا احساس نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ برے کام کا برا نتیجہ ہوتا ہے۔

''بابا ہم آپ کو کہاں چھوڑ دیں۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔'' میں نے بابا سے پوچھا۔

(بقیہ آئندہ شمارے میں پڑھیے)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk